

Darr Digest January 2017

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 4 جنوری 2017ء

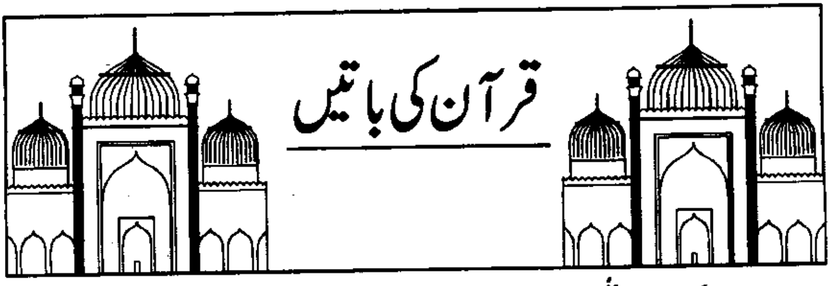
ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/60 روپے
سالانہ قیمت -/1080 روپے



ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391



قرآن کی باتیں

☆ اور ہم تم لوگوں کو آزمائیں گے تا کہ جو تم میں جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں، ان کو معلوم کریں اور تمہارے حالات جانچ لیں۔ (سورۃ محمد 47 آیت 31)

☆ اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے ہیں ان کا شکر گزار ہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جو کو تو پسند کرے۔ اور میرے لئے میری اولاد میں اصلاح وتقویٰ دے میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔ (سورۃ احقاف 46 آیت 15)

☆ پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں، جب تک کافروں کو قتل کر کے زمین میں کثرت سے خون بہا دے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے اگر اللہ کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو فدیہ تم نے لیا ہے اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا تو جو مال غنیمت تمہیں ملا ہے اسے کھاؤ کے وہ تمہارے لئے حلال طیب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اے پیغمبر جو قیدی تمہارے ہاتھ میں گرفتار ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی معلوم کرے گا تو جو مال تم سے چھن گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عنایت فرمائے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں گے تو یہ پہلے ہی اللہ سے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو تمہارے قبضے میں کر دیا اور اللہ دانا حکمت والا ہے۔ (سورۃ انفال 8 آیت 67 سے 71)

☆ مومنو تم کو مقتولوں کے بارے میں قصاص یعنی خون کے بدلے خون کا حکم دیا جاتا ہے اس طرح پر کہ آزاد کے بدلے آزاد مارا جائے اور ملازم کے بدلے ملازم اور عورت کے بدلے عورت۔ اور اگر قاتل کو اس کے مقتول بھائی کے قصاص میں سے کچھ معاف کر دیا جائے تو وارث مقتول کو پسندیدہ طریق سے قرارداد کی پیروی یعنی مطالبہ خوں بہا کرنا اور قاتل کو خوش خوئی کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔ یہ رب کی طرف سے تمہارے لئے آسانی اور مہربانی ہے جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لئے دکھ کا عذاب ہے۔ اور اے اہل عقل حکم قصاص میں تمہاری زندگانی ہے کہ تم قتل وخونریزی سے بچو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 178 سے 179)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

Top Of The Month

ایس حبیب خان کراچی سے لکھتی ہیں:

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ السلام علیکم! سب سے پہلے محترم خالد علی، محترم شاہد علی، ڈر کی پوری ٹیم، تمام رائٹرز اور پڑھنے والوں کو سال نو کی مبارکباد! دعا ہے کہ آنے والا نیا سال سب کے لئے خوشیوں کی نوید لے کر آئے (آمین)، دسمبر 2016ء کا ڈر، جو کہ رواں سال کا آخری رسالہ ہے۔ تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ خطوط میں انعم شہزادی کی بات سے متفق ہوں کہ تمام مہمانوں کو خطوط میں گپ شپ کے ذریعے اس محفل کو دلچسپ بنانا چاہئے۔ ہر بار کی طرح ڈر ابتداء سے انتہا تک بہترین ثابت ہوا اور ہوگا بھی کیسے نہیں؟ کیونکہ ڈر وہ واحد رسالہ ہے جو طویل مدت سے اپنے اعلیٰ معیار کے ساتھ ہارر اور خوفناک کہانیوں کو ماہانہ بنیادوں پر شائع کر کے خوفناک ادب پڑھنے والوں کی تشنگی دور کر رہا ہے اور بلاشبہ اس میدان میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں!! پورے سال بہترین تحریریں شائع کرنا پوری ٹیم کی سوجھ بوجھ اور انتھک محنت کی عکاسی کرتی ہے جس کا اندازہ پورے سال شائع ہونے والی کہانیوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

سلسلہ وار کہانیوں میں "ضدی ناگن" "دشمن روحیں" اور "اسرار" ہیں، جنوری فروری میں "آسیبی آئی لینڈ" "پراسرار آواز" "خونی مقابلہ" "طلسم کی رات" مارچ "لال جوڑا" "فرعون کے سپاہی" "کٹھن راستہ" "عجیب کہانی" "اندھیرے کی آواز"، اپریل "زندہ مردہ" "جن زادی" "پراسرار سفر" "سنہری آنکھیں" "نغمۂ شب" مئی: "پچھتاوہ ابدی" "حیوانی انتقام" "سونے کی تلاش" جون: "دیوی کا داس" "سفلی عمل" "دستک" جولائی: عجیب ترکہ" "پراسرار دستک" "تیسرا رخ" "زندہ گڑیاں" اگست: زندہ لاشیں" "خوف" "جھوٹ" "بھاری رات" "جنگل کا قصاب" ستمبر "خونی مکڑی" "سیاہ جھیل" "میں جن ہوں" "ہاتھ کی لکیریں" اکتوبر: آئینہ کا راز" "مقبرہ" "موت کی آواز" "سدرہ" نومبر: "آب حیات" "شیطانی محل" "کتابی کردار" "مہنگی دوستی" "وہ کون تھا" دسمبر میں "ہولناک حادثہ" "جادوگر" "خوش اخلاق" "رات کی کہانی" "قرض" "انگوٹھی" "عاشق جن"

ویسے تو ڈر میں لکھنے والے تمام رائٹرز عمدہ لکھتے ہیں مگر میری رائے کے مطابق جن رائٹرز نے پورے سال ہی بہترین کہانیوں سے دل جیتے ہیں ان کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ چھٹی پوزیشن پر "احسان سحر"، پانچویں پوزیشن "رضوان علی سومرو اور رضوان قیوم" نے مشترکہ طور پر Share کی ہے۔ چوتھی پوزیشن پر "ناصر محمود فرہاد"، تیسری پوزیشن پر "ضرغام محمود" اور "احسان الحق" نے دوسری پوزیشن پائی ہے، جبکہ "Writer Of The Year" کے حقدار ٹھہرے ہیں "ایس امتیاز احمد! Congratulation"، آپ سب کے لئے دعا ہے کہ یونہی اچھی اچھی تحریریں اپنے فینز کے لئے لکھتے رہیئے، آخر میں ڈر کے لئے کہوں گی کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید کامیابیاں عطا کرے اور وہ ترقی کی مزید منازل طے کرتے ہوئے اوج ثریا کو چھو لے!

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: پورے سال کی اچھی کہانیوں کی تعریف اور تجزیہ لکھا، اس کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا یہ تجزیہ تمام قارئین اور رائٹرز کو پسند آئے گا۔ ویسے آپ بھی مبارکباد قبول کریں کیونکہ 2016ء میں آپ کی بھی کئی کہانیاں شائع ہوئی ہیں جو کہ تعریف کے قابل ہیں اور ایک اچھا منصف وہی ہوتا ہے جو اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں کرتا۔ خیر اب نئی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

خطوط

ساحل دعا بخاری بصیر پور سے، ڈر ڈائجسٹ ملا...... اچھا تھا حسب معمول...... لیکن ہماری تحریر ہنوز غائب...... کیوں آخر کیوں؟ ہمیں تو "ہادی عالمؐ" کا انتظار تھا...... یہ تحریر وہ واحد ہے جو خود ہمیں بھی بہت اچھی لگی...... کافی عرصے سے ارادہ تھا اس ٹاپک پر لکھنے کا...... مگر ہمیشہ یہی سوچا کہ "ہمارا قلم اس قابل کہاں کہ اس قدر عظیم ہستی کی شان میں ذرہ بھر بھی کچھ بیان کر سکیں۔" مگر پھر سوچا کہ وہ طاقت تو قلم میں کبھی آ ہی نہیں سکتی اور وہ واقعہ یاد آیا کہ جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو آتش نمرود میں ڈالا گیا تو ایک پرندہ اپنی چونچ میں پانی کا قطرہ لئے جانے لگا۔ کسی نے پوچھا "یہ پانی لئے کہاں جا رہے ہو؟" کہا "حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جا رہا ہے۔ یہ پانی اس آگ پر پھینکوں گا۔" کہا گیا "اس ایک قطرے سے آگ بجھ جائے گی؟" جواب دیا "نہیں...... "لیکن میرا نام تو ان لوگوں میں شامل ہو جائے گا جنہوں نے آگ بجھانے کی کوشش کی۔" الفاظ میں شاید اختلاف ہو مگر اس واقعہ کا مفہوم یہی ہے...... تو اسی طرح ہم نے بھی سوچا کہ چلیں ان لوگوں میں ہمارا نام تو شامل ہو جائے گا جنہوں نے وجہ کائنات سے اللہ کے محبوب حضرت محمد ﷺ کی شان میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ وگرنہ ان کی شان تو صرف اللہ ہی بیان کر سکتا ہے۔ خیر اب آتی ہوں تحریروں کی طرف تو ہاں جل پری کے لئے کتنا انتظار کروائیں گے؟ مرگ وفا اور کفارہ بھی ہیں آپ کے پاس...... اسرار، رولوکا اور دشمن روحیں تینوں ہی اچھی بہت اچھی جا رہی ہیں۔ پیا سحر، اقرا قریشی اچھا اور الیس حبیب خان بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ناصر محمود فرہاد ایک بہن کی فرمائش پر "مکڑی" پر ایک عدد مکمل ناول لکھ سکتے ہیں؟ مدثر بخاری آپ کا مخصوص انداز تحریر ہمیں بہت پسند ہے، سرسری سی ورق گردانی سے علم ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر مدثر بھائی کی ہے۔ صفحہ نمبر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ضرغام محمود کی تحریریں نکھر رہی ہیں لیکن یہ بلقیس خان اور ہمارے بھائی عثمان غنی کہاں غائب ہیں؟ آخر میں سب کو سلام اور دعا کہ اللہ رب العزت ہر کسی کی ہر قسم کی پریشانی دور کرے اور ہر جائز حاجت کو پورا کرے۔ آمین۔

☆☆ ساحل صاحبہ: "ہادی عالمؐ" کمپوز ہو چکی ہے، مگر آج کل کے ملکی حالات اور واقعات کے پیش نظر تحریر شامل اشاعت سے رک گئی ہے۔ آج کل ہمارے ملک میں بے شمار لوگوں کے الگ الگ نظریات جس کی وجہ سے لوگ آپس میں ہی دست و گریبان ہیں، یعنی فرقہ واریت اور مسلکوں کے چکر میں پڑ گئے ہیں اور پھر دوسری بات کہ اس کہانی میں "شاتم رسول" ایک مغربی شخص ہے اور ویسے بھی مغرب کے لوگ مسلمانوں کے خلاف ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ امید ہے آپ ان چند لائنوں پر ضرور غور فرمائیں گی۔ آپ کی تحریر رک گئی اور یقیناً دل و دماغ پر بار گزرے گا اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ دیگر تحریریں آئندہ ضرور شائع ہوں گی۔

اقراء قریشی راولاکوٹ سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کا تمام اسٹاف، رائٹرز اور ریڈرز خیریت سے ہوں گے۔ اس مرتبہ ڈر کا انتظار کرتی رہی، لیکن نہیں ملا۔ آج ہی خرید کر لائی ہوں۔ سب سے پہلے تو ٹائٹل بہت عمدہ لگا۔ پھر خطوط پڑھے۔ ابھی سب خطوط نہیں پڑھے۔ سب لوگ جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا ان کا شکریہ، خاص کر فلک زاہد، اسلم ساگر، ضرغام محمود اور محسن عزیز حلیم کا بہت بہت شکریہ۔ ویسے ہر ماہ کی طرح ڈرا اپنی مثال آپ ہے اور کہانیوں کا کیا کہنا۔ تمام کی تمام کہانیاں اپنی اپنی انفرادیت اور خوبی کی وجہ سے لاجواب ہیں۔ محفل خطوط میں بھی سب نے بہت خوب لکھا ہے اور اپنے قلم کا جوہر دکھلایا ہے۔ پچھلے ماہ میں میری کہانی شائع نہیں ہوئی اس کا ملال ہے اور اب امید ہے کہ جنوری کے شمارے میں میری کہانی ضرور شائع ہو گی۔ کچھ اشعار اور غزل لکھی ہیں۔ ارسال کر رہی ہوں، پسند آئے تو ضرور شائع کیجئے گا۔ ویسے میری دلی دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ترقی کرتے ہوئے افق پر جگمگائے گا۔

☆☆ اقراء صاحبہ: خوش ہو جائیں، آپ کی کہانی خونی شکار شامل اشاعت ہے، اور اب یہ بھی امید ہے کہ پہلی فرصت میں کوئی نئی کہانی ضرور ارسال کریں گی۔ کہانیوں اور ڈر کی ترقی کے لئے شکریہ۔

ملائکہ تاج ایبٹ آباد سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ سب خیر خیریت سے ہوں گے۔ ڈر بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ ڈر سے جڑے ہوئے مجھے پندرہ ماہ ہو گئے ہیں۔ ہر ماہ ہمارے پیارے بھائی شہباز ڈر لاتے ہیں۔ میں تو گاؤں سے باہر بہت کم جاتی ہوں۔ خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ دسمبر کا شمارہ 25 نومبر کو بھائی جان لائے۔ ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے خوفناک رات پڑھی۔ بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ پھر جل پری پڑھی یہ بھی اچھی تھی۔ پھر شاہان کی کہانی بھی اچھی تھی۔ حافظ آباد سبق آموز کہانی تھی۔ خونی انتقام بھی

ٹھیک تھی۔ نحوست زدہ بھی اچھی کہانی تھی۔ قوس قزح میں اور میری بڑی بہن لائبہ اور چھوٹی بہن نمرہ ہر بار بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ بہت ہی اچھے اشعار اور غزلیں ہوتی ہیں۔ آخر میں سب کو سلام۔

☆☆ ملائکہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم ڈر ڈائجسٹ آپ کو پسند ہے اور اس کی تمام کہانیاں آپ کو اچھی لگتی ہیں اس کے لئے بہت بہت شکریہ اور قوی امید ہے کہ ہر ماہ خلوص نامہ ارسال کر کے ضرور شکریہ کا موقع دیں گی۔

رابعہ عباس بستی فتے والی سے، السلام علیکم! امید ہے آپ تمام چاہنے والے بخیر ہوں گے دعا ہے کہ ڈر سے منسلک تمام نفوس کو سو بہار رب ہنستا مسکراتا اور مہکتے گلابوں کی مانند تر و تازہ رکھے۔ آمین ثم آمین، اب جو کہ سورج اپنا رخ چھپا چکا ہے اور رات کی تاریکی اپنے پنکھ پھیلا چکی ہے تو ہم قلم اور کاغذ تھامے ڈر پر تبصرہ کرنے بیٹھے ہیں۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نگاہ ڈالی تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ پھر قرآن کی باتیں پڑھ کر روح و قلب کو منور و روشن کیا۔ اور پھر آئے خطوط کی جانب سب خطوط پڑھے۔ سبھی نے اچھا لکھا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دشمن روحیں پڑھی جو کہ اچھی لگی۔ اے وحید صاحب ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے آپ کی تعریف کی جائے۔ بہت خوب، محمد خالد شاہان کی کہانی اسرار پڑھی تو مزہ آ گیا، خالد بھائی ذرا توجہ دیں تو ایک بات کہوں شاہان کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے سن لیا ہاں جی، (ہاہاہاہا) اور پھر قوس قزح میں گئے تو قدیر رانا کو غائب پایا، کہاں ہیں جلدی حاضری ہوں، نہیں نہیں غصہ نہیں میرا مطلب ڈر میں واپس آئیں، سبھی غزلیں اور شعر اچھے تھے۔ یعنی کہ کچھ کھٹے تو کچھ میٹھے، مزہ آ گیا۔ باقی کہانیاں پڑھی نہیں کیونکہ ڈر لیٹ ملا تھا، جتنی پڑھی انہی پر تبصرہ کر دیا، تمام قارئین سے ایک ریکویسٹ ہے کہ جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو اپنی دعاؤں میں کشمیر کو ضرور یاد رکھیں، اللہ تعالیٰ کشمیر کے حال پر رحم فرمائے، خیر تو اب ہم چلتے ہیں پھر ملیں گے تب تک کے لئے رب راکھا، پاکستان زندہ باد، اللہ حافظ۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، ہماری تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں جہاں جہاں مسلمان جبر و ظلم کا شکار ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے، انہیں خوشیوں سے نوازے اور آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کرے، خیر آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ ہاں یاد آیا۔ آئندہ جب بھی خط ارسال کریں تو ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھا کریں۔ Thanks۔

احسان الحق، السلام علیکم محترم ایڈیٹرز اینڈ ڈر ڈائجسٹ ٹیم، کراچی۔ نیز تمام دوست بھائی بہن رائٹرز اور ڈر ریڈرز۔ اس ماہ ڈر ڈائجسٹ تو تادم تحریر ملا نہیں اور بازار سے خرید کیا۔ پچھلے ماہ بھی 24 تاریخ کو شمارے کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ کیا وجہ ہو سکتی ہیں اس تمام تاخیر کی آیئے مکتوب کے مندرجات کی جانب۔ بندے کی صحت گو زیادہ بحال نہیں لیکن بقول خود۔ مانا کہ ہم بیمار سہی، اتنے بھی بیمار نہیں۔ ایک عدد تبصرہ تو خاکسار کی جانب سے بھائی شاہد علی صاحب کے قدموں میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اپنے عزیز رائٹرز کی خدمت میں۔ سب سے پہلے تہہ دل سے مشکور ہیں کہ ایس حبیب خان صاحب، فلک زاہد صاحبہ، شرف الدین جیلانی صاحب، طارق محمود صاحب، ضرغام محمود صاحب، محمد ندیم عباس میوانی صاحب، اسلم ساگر صاحب، سید محمود حسن صاحب، محمد قاسم رحمان صاحب، اسحاق انجم صاحب اور نعیم اللہ صاحب نے میرے ناول ’آب حیات‘ کے متعلق پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ آپ سب کا بے حد شکریہ۔ اللہ تعالیٰ سے آپ تمام خواتین و حضرات کے لیے دعا گو ہوں۔ سال نو کا اختتام ہونے کو ہے اور جب یہ مکتوب آپ سب کی خدمت میں پیش ہوگا تو نیا عیسوی سال اپنے پہلے ماہ کی پرواز پکڑ چکا ہوگا۔ میری جانب سے آپ تمام ڈر ٹیم اور رائٹرز اینڈ ریڈرز کو یہ نیا عیسوی سال 2017ء مبارک ہو ان تمناؤں کے ساتھ کہ یہ سال 2016 کی مانند بھاری اور دکھی سال نہ ہو۔ بارش کا نام و نشان نہیں۔ خشک ٹھنڈ ہے اور ہم بھی اپنے اعمال پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ آئمہ حضرات کو حکومت کہے تو صلوۃ الاستسقاء پڑھاتے ہیں ورنہ خود اس بابت میں اب وہ بھی آبادی سے مجادلہ نہیں کرتے۔ پہلے ایسا نہ تھا، لیکن اب ہے۔ دعا کیجیے کہ ہم آنے والے کسی قحط کا شکار نہ ہو جائیں۔ پانی زندگی ہے اور پانی سے ہی صحت ہے۔ دسمبر کے ڈر کے صفحات پر پہلی کہانی ”ابدی زندگی“ مغربی ہارر اسٹوری ثابت ہوئی۔ ”رات کی کہانی“ دوسری کہانی ہے جو بہت دلچسپ فکشن اسٹوری ہے۔ ”ہولناک سانحہ“ ایک دلخراش کہانی تھی۔ ”خونی انتقام“ بھی اچھی کہانی تھی۔ رولو کا سلسلہ وار کہانیوں میں بہترین کہانی ہے۔ ”جادوگر، حافظ آباد اور آسیبی دلہن“ بھی خوب رہیں۔ ”خوش اخلاق“ البتہ ہارر کہانی تو نہ تھی لیکن زبردست سبق آموز کہانی تھی۔ ”دشمن روحیں“ کا تو میں فین ہوں۔ تھینکس ایم اے راحت صاحب۔ ”نجات دہندہ اور جل پری“ نے تو سچ کہیے دل جیت لیا۔ ویسے جل پریوں سے ڈرانا تو کوئی آپ سے سیکھے شکیل نیازی صاحب۔ ورنہ ان جل پریوں کے تو نوجوان خواب دیکھا کرتے ہیں۔ (Smile) ”خوفناک رات، نحوست زدہ اور عاشق جن“ بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ طویل داستان ”اسرار“ بہت ہی زبردست ہارر فکشن ہے، پلیز محترم جاری رکھیے

گا۔اس داستان کو جلد ختم کرنے پر جرمانہ ہو جائے گا ورنہ اور یہ بات میں پہلے بھی اپنے ایک مکتوب میں کہہ چکا ہوں۔ دل آزاری مت کیجیے گا اسے جلد THE END کروا کر۔ صفدر شاہین صاحب کی کہانی ”خوفناک مندر“۔۔۔ واہ کیا کہنے۔ ٹاپ آف دی اسٹوریز۔ اب اجازت دیجیے۔ پھر ادھوری آدھی ملاقات ہوگی۔ بہ شرط یہ کہ زندگی رہی۔ اپنا خیال رکھیے گا، خیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: آپ کو ڈر کے لئے بہت بہت انتظار کرنا پڑا، اس کے لئے معذرت، خیر ہم تمام لوگ ڈاک کے نظام سے واقف ہیں، کاش کہ یہ لوگ دوسروں کی تکلیف کا احساس کرلیں، نئی کہانی ”بزرگی با کمال“ مل گئی ہے اس کے لئے ویری ویری تھینکس، شکریہ، قبول کریں کہ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار ہے۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے۔ السلام علیکم تمام ڈر اسٹاف ریڈرز اینڈ رائٹرز کو میری طرف سے Lovely ہیپی نیو ایئر۔۔۔۔۔ دسمبر کا شمارہ سامنے ہے۔ سب سے پہلے جلدی سے شمارے کے اندر اتری ماری قرآن کی باتیں پڑھیں جو کہ ہم سب کے لئے باعث مشعل ہیں اور پھر بزم یاراں میں اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں کے تبصروں سے مستفید ہوئے فلک سسٹر جو کہ میری فیورٹ رائٹر ہیں، ان کا تبصرہ پڑھا تھینکس۔ قرض ساحل دعا میری پیاری آپی جن کا نام پڑھتے ہی تصور میں ایک حجاب اوڑھے لڑکی ظاہر ہو جاتی ہے، قرض عرض مرض اور فرض جیسے الفاظ کا احاطہ کرتی یہ کہانی ہمیشہ کے لئے ہمارے ذہن میں نقش ہوگئی۔ ویری گڈ، خونی انتقام پرویز احمد گزشتہ کہانیوں سے ملتی جلتی کچھ خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ احسان الحق انگوٹھی لے کر آئے جو کہ زیادہ ہارر نہیں تھی۔ بس گزارا ہی ہوا۔ حافظ آباد محمد وارث آصف ویری ویری بیسٹ۔۔۔۔۔ خوش اخلاق احسان سحر خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ ہولناک حادثہ امتیاز بھائی بس گزارہ، جادوگر ملک این اے کاوش ویری بیسٹ، بہت اچھے، آسیبی دلہن قیصر جمیل ویلڈن کمال کردیا، آپ نے خوفناک مندر صفدر شاہین ویری ویری بیسٹ، نجات دہندہ طارق محمود بہت زبردست، شکیل نیازی جل پری لائے اور کمال کردیا، خوفناک رات گلاب خان سولنگی، سمپل اسٹوری بہت اچھی رہی، عاشق جن سلیم اختر ویری بیسٹ قسط وار کہانیاں بھی بہت اچھی جارہی ہیں، اسلم ساگر خط کی پسندیدگی کے لئے شکریہ، قوس قزح میں سبھی نے اچھا لکھا۔۔۔۔۔ خط تھوڑا لیٹ ارسال کر رہا ہوں وجہ بھانجی رافعہ کی شادی تھی، باقی سب گھر والے مصروف ہیں، شادی والے گھر سے صرف میں گاؤں واپس آیا تا کہ خط ارسال کرسکوں، پلیز مکمل شائع کیجیے گا اور ضرور کیجیے گا اب میرے بارے میں بھی کچھ سوچیے گا آپ سمجھ گئے ہوں گے۔۔۔۔۔؟ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ محسن صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، بھانجی کی شادی بہت بہت مبارک ہو، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا اور قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے۔ السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا ”ڈر ڈائجسٹ“ سامنے ہے۔ ٹائٹل نے متاثر نہیں کیا! تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز کا جواب نہیں۔ غزلیں اور مراسلے خوب رہے۔ ہمارا آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، مسٹرز آپ کے پاس ہیں، پلیز دیکھیے گا! مزید Ad میٹرز میں، قبرستان مراسلہ، غزل ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں، آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ”ڈر ڈائجسٹ“ کے تمام کوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام، اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: آئندہ ماہ قلبی لگاؤ سے تجزیہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

گلاب خان سولنگی کراچی سے، محترم ایڈیٹرز السلام علیکم! سب سے پہلے ڈر کے رائٹرز، ریڈرز اور اسٹاف کو سال نو 2017ء کی آمد مبارک ہو، دسمبر 2016ء کا شمارہ ملا، سرورق سے لے کر خطوط کی محفل تک کا سفر شاندار تھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو مستقل کہانیاں حسب روایت اپنی مثال آپ تھیں، ابدی زندگی، ساحل ابڑو کی ایک یادگار تحریر تھی۔ رات کی کہانی، فلک زاہد کیا خوب کہانی تھی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، فلک جی! آپ نے اگر اپنے ناولوں کو کتابی صورت میں شائع کرلیا ہے تو برائے کرم ہمیں بھی ایک کتاب ارسال کیجیے گا، ہولناک حادثہ ایس امتیاز احمد کی بھی شاہکار اسٹوری تھی۔ خونی انتقام، مہر پرویز احمد نے بھی کہانی کے ساتھ انصاف کیا۔ جادوگر، ملک این اے کاوش نے کیا خوب الفاظ کی جادوگری کی ہے۔ حافظ آباد، محمد وارث آصف کی حقیقت کے قریب کہانی لگی۔ آسیبی دلہن عین ڈر کے فارمیٹ کے مطابق تھی۔ احسان سحر کی طرح ان کی کہانی بھی خوش اخلاق لگی۔ قرض ساحل دعا بخاری نے ایک اچھے موضوع کا انتخاب کیا اور کامیابی حاصل کی۔ نجات دہندہ طارق محمود کا بہت ہی خوب صورت ٹائٹل تھا، میرا پسندیدہ موضوع۔ جل پری، شکیل نیازی بھی خوب رہے۔ اسرار میں واقعی اسرار و رموز پنہاں ہے۔ انگوٹھی، احسان الحق نے حسب سابق معیاری اور اصلاحی کہانی پیش کی، ایسی

بہترین کہانیاں صرف احسان صاحب کا خاصہ ہے۔ نحوست زدہ، عروہ ہادی نے بہت محنت کی ہوگی۔ عاشق جن، سلیم اختر کی اچھی کاوش، کیا ہم ڈر کی محفل میں پہلے بھی مل چکے ہیں سلیم بھائی؟ خوفناک مندر، صفدر شاہین نے ڈر کے لئے اپنا فرض نبھایا۔ قوس قزح کے بھی سارے رنگ نرالے تھے۔ آخر میں کہانی حاضر ہے، امید ہے کہ سال نو کے موقع پر قارئین کے ذوق کا مظہر ہوگی۔ شکریہ۔

☆☆ گلاب صاحب: خط لکھنے کہانیوں کی تعریف اور نئی کہانی کے لئے بہت بہت شکریہ، نئی کہانی لیٹ موصول ہوئی، اس لئے شامل اشاعت نہ ہوسکی، آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔ پلیز آئندہ ماہ ٹائم کا خیال رکھئے گا۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈر کے جملہ ممبران کو ڈر کے تمام قارئین و رائٹرز حضرات کو حفظ و امان میں رکھے آمین، رسالہ 16-11-18 کو ملا بہت خوشی ہوئی، ہاکر آپ کو دعائیں دیتا گیا، ٹائٹل کی طرح پاکستان لہولہو ہے اللہ سب کو ہدایت دے۔ ضرغام محمود کا تبصرہ بہت خوب صورت تھا۔ مگر لکھاریوں پر تنقید کا انداز و بیان غلط تھا۔ انجم شہزادی صاحبہ کا خط بہت دلچسپ تھا۔ رولوکا کی طرح اسرار دلچسپ جاری رہی ہے، سب کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ شرف الدین صاحب: بہت بہت شکریہ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے پلیز! آئندہ خط میں فون نمبر ضرور ارسال کیجئے گا۔ Thanks۔

محمد احمد راجپوت منڈری بورے والا سے، جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! جناب عالی امید ہے اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ٹھاک ہوں گے ماہ نومبر 2016ء کا ڈر ڈائجسٹ میرے سامنے موجود ہے۔ جناب عالی میں نے ایک دفعہ 2008ء میں آپ کے رسالہ کا مطالعہ کیا تھا اب ماہ ستمبر سے ہر ماہ باقاعدگی سے بندہ ڈر ڈائجسٹ حاصل کرتا ہے اور اکثر یہ سلسلہ رہتا ہے کہ اسٹیشن آفس میں کبھی کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے کبھی کسی کے ہاتھ میں کوئی تو سرسری سا ہاتھ میں لے کر ڈر کے مارے رکھ دیتا ہے اور کوئی مسافر اسٹیشن کا ملازم اس کی جان ہی نہیں چھوڑتا اب سوچنا شروع کر دیا ہے کہ میں ڈر ڈائجسٹ خرید لیا کروں تاکہ ایک تو میرے ہاتھ میں رہے، ماہنامہ کے سبھی رائٹر تعریف اور ستائش کے قابل ہیں سبھی کے لئے دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اسی طرح نوازش عنایت جاری رکھے بندہ ان قریب ایک عدد کہانی ارسال خدمت کرے گا۔ انشاء اللہ ہر ماہ بشرط زندگی حاضری ہوتی رہے گی۔ خدا تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو جاری و ساری رکھے۔

☆☆ محمد احمد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کو ڈر ڈائجسٹ اچھا لگتا ہے، اس کے لئے شکریہ اور امید ہے کہ آئندہ بھی ہر ماہ خلوص نامہ ارسال کرتے رہیں گے، شکریہ۔

طارق محمود کامرہ اٹک سے، السلام علیکم! دسمبر کا ماہنامہ ڈر اپنے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ملا تو بہت خوشی ہوئی، ہر ماہ اس کا بے تابی سے انتظار رہتا ہے۔ قرآن کی باتیں اور پھر خطوط کی محفل کے خوش رنگ تبصروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد کہانیوں کی محفل میں پہنچے، ہر کہانی نہایت اچھے طریقہ سے لکھی گئی تھی، ڈر کے مطابق لوازمات اور ہارر اسٹوریز رسالہ کے تمام سلسلہ اچھے جا رہے ہیں۔ اس دفعہ کہانیاں تو سب ہی اچھی تھیں۔ لیکن سلسلہ وار کہانیاں، بہت ہی اچھی رہیں۔ "ابدی زندگی" اور "خوفناک مندر" دونوں کہانیاں طویل اور دلچسپ تھیں۔ اس کے علاوہ "عاشق جن" "آسیبی دلہن" "ہولناک حادثہ" "خونی انتقام" "حافظ آباد" "رات کی کہانی" ہارر اور ڈر سے مزین اسٹوریز" جادوگر" بھی ایک اچھی اسٹوری تھی۔ ساحل دعا بخاری کی "قرض" نے ڈر کا لطف دوبالا کیا۔ "نحوست زدہ" "جل پری" اور "انگوٹھی" سبق آموز اور مزے کی اسٹوریز تھیں۔ قوس قزح کے رنگ اچھے لگے۔ کہانی جو بھی ہو اس میں ڈر کا پہلو تو ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ ڈر رسالہ ڈر سے ریلیٹڈ جو ہے۔ ایک کہانی ارسال ہے اس سے پہلے بھی کچھ کہانیاں ادارے کے پاس ہیں پلیز دیکھ لیجئے گا۔ شکریہ۔

☆☆ طارق صاحب: خوش ہوجایئے، جنون شامل اشاعت ہے امید ہے آئندہ ماہ بھی تجزیہ ارسال کر کے شکریہ کا موقع دیں، Thanks۔

عبدالجبار رومی انصاری لاہور سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں اپنے دوسرے خط کے ساتھ حاضر خدمت ہیں، پہلا خط شائع ہوا، بہت خوشی ہوئی اور حوصلہ افزائی کرنے پر ادارے کے لئے دعا گو ہیں۔ سب سے پہلے احسان سحر کی آب حیات پڑھی جو کہ اچھی لگی۔ ایس امتیاز احمد کی شیطانی محل بھی فکر انگیز اچھی کہانی تھی۔ اقرا قریشی کی آسیبی گھر نے بھی کچھ کچھ سنسنی پیدا کر ہی دی، ایم اے راحت کی دشمن روحیں بھی بہت دلچسپ جارہی ہے۔ محمد خالد شاہان کی "اسرار" دم بخود کر دیا اور جسم میں سر دلہر دوڑ گئی۔ "اسرار" واقعی پراسرار ہے۔ آب حیات نے ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور کر دیا، بہت ہی سحر انگیز کہانی تھی۔ بہر حال اسٹوری زبردست رہی۔ "رولوکا" بھی دل کو بھا گئی۔ باقی کہانیاں بھی سنسنی خیز اور دہشت انگیز رہیں، جنہیں پڑھ کے ڈر کی کیفیت پیدا ہو جاتی، قوس قزح میں جاوید، محسن عزیز اور غزل میں چوہدری قمر جہاں، ریاض حسین قمر، مہک عرفان اور شائستہ کا کلام اچھا رہا۔

☆☆ عبدالجبار صاحب: آپ کا قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس اور اگلے ماہ کے خط کے لئے بھی شکریہ قبول کرلیں۔

محمد سفیان انیس بھکر سے۔ السلام علیکم! امید ہے تمام رائٹرز، ریڈرز اور ڈر کا اسٹاف خدا کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوگا۔ دسمبر کا ڈر ڈائجسٹ 27 نومبر کو ملا۔ ٹائٹل ہر بار کی طرح شاندار رہا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں جن سے کافی رہنمائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد کہانیوں پر نظر گئی تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ جل پری، قرض، جادوگر وغیرہ کافی اچھی کہانیاں تھیں۔ رولو کا نے ہر بار کی طرح اس بار بھی سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ دشمن روحیں اور اسرار بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ مختصراً کہ اس بار ڈر میں بہترین کہانیاں شامل تھیں۔ اب ذرا میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرادوں کہ میں ڈر کا پرانا قاری ہوں، اپریل اور مارچ میں میرے دو خط شائع ہوئے تھے۔ جن کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں اپریل کے بعد امتحانوں کی وجہ سے نہ تو کوئی خط بھیجا اور نہ ہی کہانی، البتہ ہر ماہ کا ڈائجسٹ خریدتا رہا، امتحانوں کے بعد کچھ گھریلو پریشانیوں سے بھی خط اور کہانی لکھنے کو دل نہ چاہا۔ رزلٹ آیا آپ لوگوں کی دعاؤں سے اور خدا کے فضل و کرم سے امتحان میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوگیا۔ اب میری کوشش ہوگی کہ ہر ماہ خط لکھوں میرے پرنسپل منیر بلوچ نے سمجھایا تو ان کے مشورے پر دوبارہ لکھنے کا سلسلہ شروع کردیا۔

☆☆ سفیان صاحب: یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنے پرنسپل کی بات کو اہمیت دی، اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

شہباز احمد ایبٹ آباد سے۔ السلام علیکم! میں امید کرتا ہوں کہ ڈر کے تمام لکھاری و قاری اور ادارے والے ٹھیک ٹھاک ہوں گے، دسمبر کا شمارہ 25 نومبر کو مل گیا تھا، سب سے پہلے کہانی حافظ آباد پڑھی بہت ہی اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ اس کے بعد اپنی موسٹ فیورٹ سلسلہ وار کہانی "اسرار" پڑھی اس کہانی کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ جادوگر، ویری ویلڈن، ہولناک حادثہ بھی بہت اچھی کہانی تھی، باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں، امید ہے کہ وہ بھی اچھی ہوں گی، خط کے ساتھ کہانی بھی بھیجی ہے، اگر آپ نوک پلک سنوار کر شائع کریں گے تو اگلی کہانی اس سے بہتر لکھ سکوں گا، اب اگلے ماہ کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ شہباز صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور چھپے گی، امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، کام سے وقت نکال کے بڑی مشکل سے شہر جانا نصیب ہوا، ماہ دسمبر کے تازہ پرچے سے ملاقات ہوگئی، سرورق بڑے کمال کا تھا۔ غزل شائع کرنے کا شکریہ، اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ سردی کا آغاز ہوچکا ہے۔ آج کل ویسے بھی زندگی بسر کرنا ایک فن ہے۔ اس بار خط ذرا لیٹ ہوگیا ہے تمام کہانیاں اور غزلیں خوب سے خوب تر تھیں۔ یہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے اس مہنگائی کے دور میں ایسا پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ آپ ہم سے کافی دور ہیں مگر خط سے آدمی ملاقات ہوجاتی ہے۔ سوچتا کچھ ہوں تحریر کچھ اور کر جاتا ہوں معذرت خواہ ہوں آپ کی نظر عنایت اور جذبہ خلوص کی وجہ سے اور اپنی دل کی بے تابی سے ہم خط تحریر کرتے ہیں۔ اگلا شمارہ ماہ جنوری کا ہوگا۔ اس جاتے ہوئے سال میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ ناکامیوں اور اشکوں کے نذرانوں اور زمانے کی بے حسی کا دور تھا۔ خدا کرے نیا آنے والا سال ہم سب کے لئے پھولوں سے حسین اور خوشگوار یادوں سے لبریز ہو۔ غزل ارسال خدمت ہے۔ شائع کردیں۔

☆☆ اسلم صاحب: خلوص نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، غزل، اشعار شامل اشاعت ہیں، ہر ماہ خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور آئندہ کے لئے شکریہ قبول کریں۔

محمد خالد شاہان صادق آباد سے، دیگر احوال یہ ہے کہ دسمبر کا ڈر ڈائجسٹ اپنی مقررہ تاریخ پر ہی مل گیا اور فرنٹ پیج زبردست تھا۔ قرآن کی باتیں ایک بہترین سلسلہ ہے اور پسند آیا۔ خطوط کی محفل بھی بڑی بہترین اور ایڈونچر رہی۔ کہانیوں میں ایم اے راحت صاحب کی دشمن روحیں بہت ہی اعلیٰ اور زبردست تحریر رہی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ایم اے راحت صاحب کو صحت یابی عطا فرمائے۔ آمین اس کے بعد رولو کا اے وحید صاحب دوسرے نمبر پر چھائے رہے، پھر ناگن کا انتقام این اے کاوش اچھی تحریر لے کر آئے، رہنمائی احسان سحر کی دل کو چھوتی ہوئی تحریر تھی۔ آب حیات احسان الحق ان کی سوچ کے ساتھ اسٹوری بھی لاجواب رہی۔ وہ کون تھا۔ ضرغام محمود

صاحب کی کیا ہی بات ہے۔ آپ کی اسٹوری کے ویلڈن، آپ کا شکریہ میری تحریر پسند کرنے کا ضرغام صاحب پوچھا، ناصر صاحب ان کی ایک بہترین کوشش تھی، جن میں کامیاب رہے۔ شیطانی محل الیس امتیاز صاحب زبردست رہی۔ ایم الیاس صاحب کی ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ محمد پرویز احمد، رضوان علی سومرو، اقرا سسٹر، شکیل نیازی، مریم سسٹر، محمد شعیب، ماریہ سسٹر، رضوان قیوم سومرو ان سب کی تحریریں بھی بہت پسند آئیں، ایک تحریر رہ گئی ہے اس کا تو قارئین رائے دیں گے اسرار سٹوری کا کہ ان کو کیسی لگی اور ادارے والوں کا بھی بہت مشکور ہوں کہ وہ میری اسٹوری کی نوک پلک سنوار کر اسٹوری شائع کر رہے ہیں۔ شاہین گروپ والوں نے اس بار زبردست انٹری کی ان سے امید کروں گا کہ وہ ہر ماہ اپنی انٹری برقرار رکھیں۔ شکریہ۔

☆☆ خالد صاحب: "اسرار" کے بارے میں کوئی خیال دل میں نہ لائیں، احسن طریقے سے نوک پلک سنوار کر شائع کی جارہی ہے۔ بس آپ اپنا کام جاری رکھیں، باقی کا ہم پر چھوڑ دیں۔ Thanks۔ دیگر کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks۔

عبدالعزیز بلوچ کراچی سے۔ السلام علیکم! سب سے پہلے میری طرف سے سب کو نیا سال 2017ء مبارک۔ سال کا آخری شمارہ 21 تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ قرآن مجید کی باتیں پڑھتے ہوئے خطوط تک آئے، یہاں بھی سب ہی دوستوں نے اچھے خطوط لکھے۔ مگر میرا خط غائب تھا۔ خطوط سے کچھ آگے بڑھا تو کہانیوں کی فہرست میں پہلی کہانی ساحل ابڑو کی ابدی زندگی تھی۔ کہانی اچھی تھی۔ فلک زاہد کی رات کی کہانی اور ایس امتیاز احمد کی ہولناک سانحہ، پرویز احمد دولو کی خونی انتقام، اس میں بھی کوئی ہارر سین نہ تھا لیکن کہانیاں اچھی انداز سے تحریر کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ محمد وارث آصف کی حافظ آباد ایک عمدہ قسم کی کہانی تھی۔ قیصر جمیل پروانہ کی آسیبی دلہن بہترین کہانی تھی۔ احسان سحر کی خوش اخلاق ایک دلچسپ کہانی تھی، پڑھ کر اچھا لگا اور گلاب خان سولنگی کی خوفناک رات، احسان الحق کی انگوٹھی، شکیل نیازی کی جل پری مزیدار کہانیاں تھیں۔ قوس قزح میں سارے ہی اشعار عمدہ تھے۔ اگر زندگی رہی تو انشاءاللہ اگلے ماہ پھر ڈر کی محفل میں حاضر ہوں گے۔

☆☆ عبدالعزیز صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ پچھلے ماہ آپ کا خط لیٹ موصول ہوا تھا۔ اس لئے شائع ہونے سے رہ گیا۔ امید ہے آئندہ ذرا جلدی کا خیال رکھیں گے۔ شکریہ۔

مظہر عباس ہڑالی سے۔ امید ہے سب خیریت سے ہوں گے دسمبر کا ڈر اس دفعہ جلدی مل گیا۔ سرورق دیکھ کر دلی خوشی ہے، ہمارے ہاں رسالہ عموماً بہت دیر سے آتا ہے۔ پلیز اسے جلد بھجوا دیا کریں۔ مجھے اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ساحل ابڑو کی کہانی "ابدی زندگی" واہ کیا کہانی اور سبق دیا ہے مزہ آ گیا۔ رات کی کہانی، ہولناک حادثہ، رولوکا کا سلسلہ بہت اچھا چل رہا ہے، خونی انتقام، جادوگر، حافظ آباد، آسیبی دلہن، خوش اخلاق، دشمن روحیں، قرض، نجات دہندہ، خوفناک رات، جل پری، انگوٹھی، اسرار، عاشق جن، نحوست زدہ، خوفناک مندر، تمام کہانیاں بہترین اور زبردست ہیں۔ طارق محمود صاحب میں آپ کے قلم کا شیدائی ہوں کیا کمال کے لکھتے ہیں ہر ماہ آپ کا انتظار رہتا ہے اچھی سوچ ہے آپ کی۔ آخر میں، میں نے ایڈیٹر صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں نے کچھ کہانیاں لکھی ہیں آپ انہیں رسالے میں جگہ دیں گے تو میں جلد ارسال کروں گا۔ میں "ڈر ڈائجسٹ" کے توسط سے "نعیم اللہ" کو سلام کرتا ہوں۔ امید ہے آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے۔ اللہ "ڈر" کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ (آمین)

☆☆ مظہر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، آپ کے نوازش نامہ کا اگلے ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے لئے شکریہ قبول کریں، کہانیاں ارسال کردیں اچھی ہوئیں تو ضرور شائع کردی جائیں گی۔ Thanks۔

محمد سفیان رحیم یار خان سے۔ السلام علیکم! میں ڈر ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں، امید ہے ڈر کی تمام ٹیم خیریت سے ہوگی، جناب میرے اندر مطالعہ کا جنون ہے اور میں آپ کے رسالے کے لئے کچھ اچھا لکھنا چاہتا تھا، بہت عرصہ میں نے خود کو تیار کیا اور اب جا کر ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے، امید ہے آپ کو میری یہ کوشش پسند آئے گی۔ بزرگ جن میری پہلی کہانی ہے جو کہ حقیقت پر مبنی ہے امید ہے کہ آپ میری کہانی کو اپنے رسالے میں جگہ دیں گے تاکہ میری حوصلہ افزائی ہو اور میں آگے بھی آپ کے رسالے کے لئے اچھا لکھنے کی کوشش جاری رکھوں گا، آپ کے اور آپ کے ادارے کے لئے نیک تمنا، خدا حافظ۔

☆☆ محمد سفیان صاحب: آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور اگلے شمارے میں جلوہ گر ہوگی، ویسے اپ اپنی کوشش جاری رکھیں کیونکہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری یعنی رائٹر بن جاتا ہے۔

☆☆

خونی حویلی

ملک این اے کاوش۔سلانوالی سرگودھا

دوشیزہ کے وجود پر ہانڈی میں موجود پانی کا پڑنا تھا کہ دوشیزہ کے حلق سے ایک دلدوز درد ناک چیخ بلند ہوئی اور وہ غرائی تو ایسا لگا کہ کوئی درندہ غرا رہا ہے اور پھر……

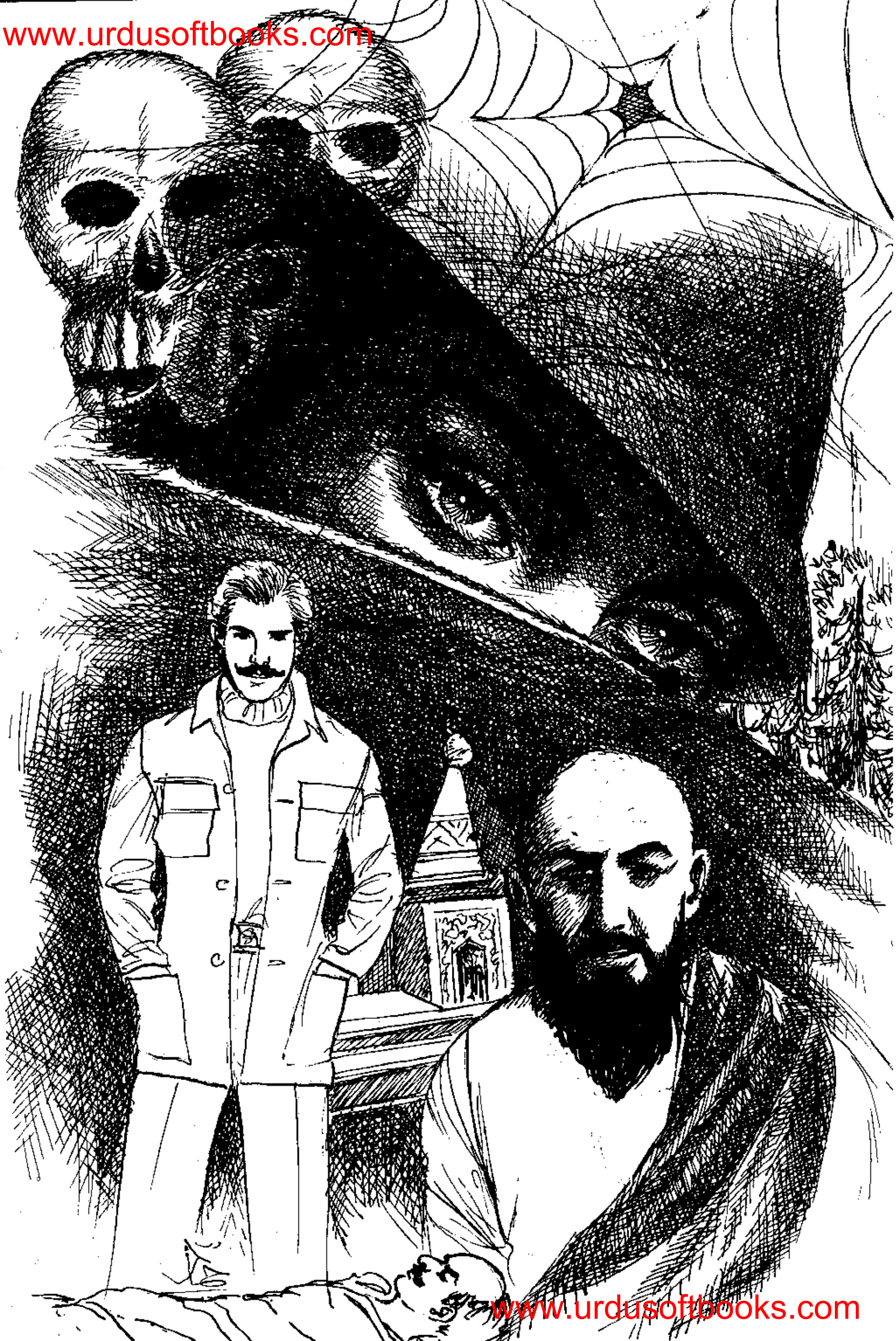
خوفناک حیرت ناک، دہشت ناک اور وحشت ناک کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے تحفہ خاص

ہیبت خان تیرہ برس بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے لندن میں مقیم تھا۔ اس نے لندن میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر ہوم جاب کرنے کے بعد وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ جلد ہی اس کا شمار اچھے ڈاکٹروں کی لسٹ میں ہونے لگا تھا۔ اس کی شادی کے دو سال بعد اس کا باپ یکبارگی دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے لقمۂ اجل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کی موت شدید خوف کی وجہ سے واقع ہوئی ہے لیکن گھر کے اندر کوئی ایسا واقعہ بھی رونما نہ ہوا تھا۔ جسے بنیاد بنا کر اس بات کو سچ تسلیم کیا جا سکتا۔

ہیبت خان کا باپ وجاہت خان اپنے علاقے کا وڈیرہ گردانا جاتا تھا۔ علاقے کے اندر سب سے بڑی حویلی وجاہت خان کی ہی تھی۔ علاوہ ازیں وجاہت خان ساڑھے چار مربع زمین کا مالک تھا۔ اس کی وفات کے بعد سب کچھ ہیبت خان کے کنٹرول میں آ گیا تھا۔ چار کنال کی اراضی میں چار دیواری ڈال کر ایک سائیڈ پر ایک کنال پر عظیم الشان کوٹھی تعمیر کروائی گئی تھی جبکہ اس کے بالکل سامنے ایک کنال پر چھوٹا سا گراؤنڈ نما پارک بنایا گیا تھا۔ ساتھ والی دو کنال جگہ میں حویلی کے بالکل پیچھے ملازموں کے لیے کوارٹر بنوائے گئے تھے۔ جبکہ ایک سائیڈ پر ایک چھوٹا سا قبرستان بنایا گیا تھا۔ جہاں وجاہت خان کے والدین اور بہن کو دفن کیا گیا تھا۔

وجاہت خان اپنے وقت کا ایک ظالم، جابر اور بے غیرت قسم کا انسان گزرا تھا۔ پیسہ اور حسن دونوں ہی وجاہت خان کی کمزوریاں تھیں۔ کتنی ہی معصوم اور بے گناہ دوشیزاؤں کی عصمت کا اس نے جنازہ نکالا تھا۔ غریب لوگوں کے اندر اس کے خلاف زبان کھولنے کی سکت نہ تھی۔ اس کے ظلم کی انتہا تو اس وقت ہوئی جب اس کی حویلی میں رانا الفت نے آنا شروع کر دیا۔

رانا الفت کا تعلق انڈر ورلڈ کی دنیا سے تھا۔ شروع میں اس نے وجاہت خان کے ذریعے منشیات فروشی کے دھندے کو فروغ دیا جب اس کا وجاہت خان پر اعتماد پیدا ہو گیا تو اس نے وجاہت خان کے ذریعے نوجوان دوشیزاؤں کو اغواء کروانا شروع کر دیا۔ پیسہ پہلے ہی وجاہت خان کی کمزوری تھا۔ رانا الفت نے وجاہت خان کو سر سے پاؤں تک پیسے میں چھپا دیا تھا۔ وجاہت خان نے بھی رانا الفت پر حد سے زیادہ اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا لیکن وجاہت خان اس بات سے قطعی آشنا نہ تھا کہ رانا الفت کس قدر آتش کا پرکالا ہے۔ رانا الفت وجاہت خان پر پیسے کی بارش کر رہا تھا تو دوسری طرف وجاہت خان اپنے چیلوں کے ذریعے اسے لڑکیاں پہنچا رہا تھا۔ لیکن ایک رات وجاہت خان دل



کا شدید دورہ پڑنے کی وجہ سے خالق حقیقی سے جاملا۔
باپ کی وفات کے بعد ہیبت خان اپنی فیملی سمیت لندن شفٹ ہوگیا تھا۔ پیچھے کا سارا انتظام اس نے منشی فیض رسول کے سپرد کردیا تھا۔ لندن رہ کر وہ وقتاً فوقتاً منشی فیض رسول سے حالات وواقعات کے متعلق آگاہی لیتا رہتا تھا۔ منشی فیض رسول ایک نہایت ہی ایماندار اور قابل اعتماد انسان تھا۔
خالق حقیقی نے اسے تین بچوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑا بیٹا راشد خان جو کہ اب میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوا تھا۔ اس سے چھوٹا بیٹا ظہیر خان چھٹی کلاس میں پڑھ رہا تھا جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا حیدر خان چوتھی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ ہیبت خان کی اہلیہ مونا خان نے ایم اے انگلش کیا ہوا تھا اور لندن میں ہی ایک پرائیویٹ فرم میں بطور سیکرٹری خدمات سرانجام دے رہی تھی۔
وقت پر لگا کے گزرتا چلا گیا اور تیرہ سال کا طویل عرصہ پلک جھپکتے میں بیت گیا۔ تیرہ برس بعد ہیبت خان اپنی فیملی کے ساتھ واپس اپنے گاؤں آرہا تھا۔ تیرہ برس بعد جب وہ اپنے علاقے میں داخل ہوا تو اسے حیرت ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ کچی آبادی پکی عمارتوں کا روپ دھار چکی تھی۔ گاؤں کا گاؤں شہر میں بدل چکا تھا۔ ضرورت زندگی کی ہر سہولت دستیاب تھی۔ اس کے تخیل میں وہ گاؤں آیا جب یہاں کچی آبادیاں تھیں لیکن آج یہ تبدیلی دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔
ہیبت خان اور اس کی فیملی کو لینے کے لیے منشی فیض رسول ایئرپورٹ پر آیا تھا۔ منشی فیض رسول کو جب اس نے دیکھا تھا تو وہ بالکل جوان تھا لیکن آج اس کے بالوں میں سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی اس سے پنہاں نہ تھی۔
"آپ کی زندگی کا سورج بھی ڈھلتا جارہا ہے۔" ہیبت خان نے منشی فیض رسول کو راستے میں چھیڑتے ہوئے کہا تو سب کی ہنسی نکل گئی۔
"یہ سفیدی ایسے ہی نہیں آگئی۔" منشی فیض رسول نے بتایا۔ "آپ لوگوں نے میرے ناتواں کندھوں پر بہت بڑا بوجھ لاد دیا تھا۔ ہر وقت چنتا کھائے رہتی تھی کہ کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہوجائے۔ زندگی میں آج تک آپ کے باپ دادا سے بھی دھوکہ نہیں کیا تھا۔"
"آپ کی وفاداری کا میں بچپن سے ہی قائل ہوں۔" ہیبت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"یہ سب آپ کی محبت ہے۔" منشی فیض رسول گاڑی حویلی کے اندر داخل کرتے ہوئے بولا۔
گاؤں میں ہیبت خان اور اس کی فیملی کی واپسی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ سب لوگ اس کا استقبال کرنے کی غرض سے اس کی حویلی میں مجتمع تھے۔ عین اس وقت جب گاڑی حویلی میں داخل ہوئی سب گاؤں والے گاڑی کے آلے دوالے (چہار سو) پھیل گئے تھے۔ ہیبت خان اور اس کی فیملی جب گاڑی سے باہر نکلے تو گاؤں والوں نے ان پر پھولوں کی پتیوں کی بارش کردی۔ ہیبت خان گاؤں والوں کی چاہت اور محبت کا گرویدہ ہوکر رہ گیا تھا۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ گاؤں والے جلد ہی یکے بعد دیگرے لوٹ گئے۔
شام کے دھندلکوں نے جب ہر شے کو اپنی آغوش میں بھرنا شروع کردیا تو جنوب کی جانب سے گہرے سرخ بادلوں نے اٹھنا شروع کردیا۔ گہری تاریکی کے باعث بادلوں کی رنگت کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ بادل خاموشی سے نیلے فلک پر چھارہے تھے۔ جیسے جیسے کچھوے کی رفتار سے بادل چھارہے تھے۔ ویسے ویسے ماحول میں بے چینی اور گھبراہٹ اور حبس بڑھنا شروع ہوگئی تھی۔ حبس جیسے جیسے بڑھ رہی تھی۔ ہر کس وناکس مضطرب ہونے لگا تھا۔
حبس بے جا کی وجہ سے لوگ گھروں سے باہر نکلنے یا چھتوں پر چڑھنے پر مجبور ہوگئے تھے مگر کوئی فرق محسوس نہ ہوا تھا۔ سب کی حیرت ہویدا تھی کہ نجانے آج ماحول میں اتنی حبس کیوں بڑھ چکی تھی۔ تبھی یک لخت موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر تو سب کے پیروں تلے زمین کھسک گئی کہ بارش کے قطروں میں پانی کی بجائے خون کی بوندیں اور لوتھڑے گر رہے تھے۔ جس جس نے بھی یہ منظر دیکھا تو فوراً سے بھی پہلے پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ استغفار کا ورد شروع ہوگیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آسمان سے خون گرنے کی وجہ کیا ہے؟

دوسری طرف سفر کی تھکاوٹ کے باعث ہیبت خان اوراس کی فیملی جلد ہی خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگے لیکن انہیں سوئے ابھی تھوڑی ہی دیر بیتی ہوگی کہ یکدم سکوت زدہ فضا میں دلخراش چیخیں گونج اٹھیں۔یوں لگ رہا تھا جیسے ایک ساتھ درجنوں لوگ چیخ وپکار کررہے ہوں۔ہیبت خان اوراس کی ساری فیملی سہم گئے۔ہیبت خان کے بچے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہوگئے تھے۔ہیبت کان نے فوراً ہی منشی فیض رسول کواپنے کمرے میں بلوالیا اوران چیخوں کے بارے میں دریافت کیا مگروہ خود کچھ جانتا ہوتا تواسے کچھ بتاتا۔

"معذرت چاہتا ہوں سرکار۔" منشی فیض رسول بے چارگی کے عالم میں بولا۔"پوری حویلی چھان ماری ہے لیکن کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ آوازیں حویلی کے کس حصے سے آرہی ہیں۔نہ ہی یہ پتہ چل رہا ہے کہ چیخ کون رہا ہے؟"

منشی فیض رسول کی بات سن کر ہیبت خان سمیت اس کی فیملی حیران رہ گئے۔

"تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" ہیبت خان نے منشی فیض رسول کو حیران کن انکھیوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔"فوراً سے بھی پیشتر مجھے وضاحت چاہیے۔"

ہیبت کا لہجہ تحکمانہ لیکن حیرت والا تھا۔اسے منشی فیض رسول کی ذہنی حالت پر حیرت ہورہی تھی۔ہیبت خان کا حکم سنتے ساتھ ہی منشی فیض رسول نے مڑنا چاہا ہی تھا کہ یک لخت آوازیں آنا بند ہوگئیں۔

"تم جاسکتے ہو لیکن یادرکھنا ایک تو اب کوئی خلل برداشت نہیں کروں گا دوسرا اس واقعے کی مکمل تحقیقات کرواؤ مجھے صبح وضاحت چاہیے۔"

منشی فیض رسول منہ سے تو کچھ نہ بولا بس سر ہاں میں ہلاتا ہوا چپ چاپ دبے قدموں واپس لوٹ گیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ بڈھا عقل سے پیدل ہے۔" موناخان لیٹتے ہوئے بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" ہیبت خان نے منشی فیض رسول کی حمایت میں کہا۔

"کیا یہ حیرت زدہ بات نہیں ہے کہ ایک عجیب وغریب واقعہ رونما ہوا اور حویلی کا خاص بندہ بزرگوں کے سے جواب دے۔" موناخان بولی۔

"چھوڑو اس بات کو سو جاؤ۔" ہیبت خان لاجواب ہو کر بولا۔"بچوں کو بھی سلاؤ ایسی باتوں سے بچوں کے ذہنوں پر برا اثر پڑسکتا ہے۔"

موناخان منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن خوف کی ایک سرلہر اس کے پورے شریر میں سرایت کرچکی تھی۔اس نے بچوں کو ساتھ لٹالیا تھا۔لیکن یوں لگتا تھا جیسے نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور جاچکی تھی۔اس کی چھٹی حس اسے انجانے ان دیکھے خطروں سے آگاہ کررہی تھی۔بے شک جس ماحول کے وہ عادی تھے۔وہاں ان باتوں کو حقیقت تصور نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ ذہنی فتور تصور کیا جاتا تھا۔لیکن جو کچھ بھی تھا اس نے موناخان کو سوچنے پر ضرور مجبور کردیا تھا۔

☆......☆......☆

منشی فیض رسول کے ساتھ مل کر روزانہ ہیبت خان نے اپنی زمینوں کا چکر لگانا شروع کردیا تھا۔بچوں کو تین ماہ کی چھٹیاں تھیں۔اوراس بار اس نے یہ چھٹیاں اپنے گاؤں میں گزارنے کا ارادہ بنالیا تھا۔ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔منشی فیض رسول کی ایمانداری اور محنت کا ہیبت خان مزید گرویدہ ہو کر رہ گیا تھا۔منشی فیض رسول نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔زمینیں سونا اگل رہی تھیں۔اس ک علاوہ ہر طرف قدآور درخت دکھائی دے رہے تھے۔

انہی درختوں میں ایک بیر کا درخت بھی تھا جس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی اور جھکی ہوئی تھیں۔منشی فیض رسول اور ہیبت خان دونوں چلتے ہوئے اس درخت تک جاپہنچے۔

"سرکار اس درخت کا پھل بہت میٹھا اور رسیلا ہے۔" منشی فیض رسول نے بتایا تو ہیبت خان نے درخت کو بغور دیکھا۔"پھل دار درختوں کے پھل وقتاً فوقتاً گاؤں والوں میں تقسیم کرواتا رہتا ہوں۔غرباء میں اناج بھی تقسیم کرواتا رہتا ہوں۔"

"ہوں۔" ہیبت خان نے ہونٹ بھینچتے ہوئے خوشی سے کہا۔"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔اللہ پاک رزق میں برکت پیدا کرتے ہیں۔ویسے بھی یہ ہماری رعایا ہے۔اگر ہم

نے ان کا خیال نہیں رکھنا تو اور کس نے رکھنا ہے۔ اگر ہم لوگ ان کا خیال نہیں رکھیں گے تو ہم سے بھی پوچھ گچھ ہوگی۔ جس قدر ممکن ہو گاؤں کے غریب ضرورت مند لوگوں کی ہر ضرورت پوری کیا کرو یہی نہیں گاؤں سے باہر کا بھی کوئی آجائے تو کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا سرکار۔" منشی نے جواب دیا۔

ہیبت خان نے درخت کی ایک لٹکی ہوئی شاخ کو پکڑ کر اس سے ایک موٹا تازہ بیر توڑا لیکن بیر توڑنے کی دیر تھی کہ اگلا منظر دیکھ کر ہیبت خان سمیت منشی فیض رسول بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رہ گیا۔ جس ٹہنی سے بیر توڑا گیا تھا اس جگہ سے خون کی بوندیں ٹپکنا شروع ہوگئی تھیں۔ ہیبت خان نے حیران کن آنکھوں سے منشی فیض رسول کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بیر سرعت سے ایک طرف پھینک دیا۔ منشی فیض رسول سرعت سے ہیبت خان کی اور بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے یوں لگا جیسے موسلادھار بارش شروع ہوگئی ہو۔ بارش کیا تھی خون کی بوندیں پورے درخت سے ٹپک رہی تھیں۔ ہیبت خان اور منشی فیض رسول دونوں ہی پوری طرح سے خونی بارش کی زد میں آچکے تھے۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلتا جا رہا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے دونوں اس بیر کے درخت کے نیچے سے نکلے لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت ہویدا رہ گئی کہ ان کے درخت سے نکلتے ساتھ ہی خونی بارش یکدم تھم گئی۔ یہی نہیں ان کے کپڑے اور جسم یکدم یوں خشک اور صاف ہوگئے جیسا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" ہیبت خان نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

ہیبت خان پوری طرح سے خوف کی زد میں آچکا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بس وہ متواتر منشی فیض رسول کو تکے جا رہا تھا۔ منشی فیض رسول خود انگشت بدنداں رہ گیا تھا کہ یہ سب ہو کیا گیا تھا۔

"معافی چاہتا ہوں سرکار میں خود کچھ بھی نہیں جانتا۔" منشی فیض رسول کے لہجے سے بے بسی اور بے چارگی عیاں تھی۔ "لیکن حالات و واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ سب کالے جادو کا کوئی کھیل ہے۔ ممکن ہے کوئی آپ کے جاہ و جلال اور مرتبے سے جیلس ہوتا ہو۔ آپ کی کامیابی اس کے دل پر نشتر کے جیسے پڑتی ہو اور اس نے آپ پر زبردست کالا جادو کروا دیا ہو۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" ہیبت خان غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

"سرکار ایسی باتیں نہ کریں۔" منشی فیض رسول نے تڑپ کر کہا۔ "ایسے حالات و واقعات کو پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ حالات بھی بتا رہے ہیں دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ کسی اللہ والے سے ضرور حساب کتاب کروالینا چاہیے۔"

"لگتا ہے واپس آکر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔" ہیبت خان نے بے بسی سے کہا۔ "میری فیملی کے اندر خوف بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی فیملی بہت پیاری ہے۔ انہیں اس حال میں میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر مزید کوئی ایسا واقعہ ہوا تو میرا یہاں رکنا ناممکن ہو جائے گا۔"

منشی فیض رسول کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا اس لیے اس نے چپ ہی رکھی۔ دونوں چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ ہیبت خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی جبکہ منشی فیض رسول اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ ہیبت خان نے گاڑی حویلی کی اور موڑی اور اسے گیئر میں ڈال دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے.....؟

☆......☆......☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ ہر کوئی گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ہیبت خان کی حویلی میں بھی گہرا سکوت طاری تھا۔ سارے مکین گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ ہیبت خان اور اس کی اہلیہ مونا خان الگ جبکہ تینوں بچے الگ کمرے میں سوتے تھے۔

تینوں بھائی گہری نیند سو رہے تھے۔ جب یکبارگی ظہیر خان کی آنکھ کھٹکے سے کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ کمرے کے اندر زیرو کے بلب کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جو ہر شے کو مکمل واضح تو نہیں کر رہی تھیں مگر اتنا ضرور تھا کہ چیز کی پہچان بغور دیکھنے سے کی جاسکتی تھی۔ ظہیر خان ہمہ تن گوش

ہوگیا۔ آواز اٹیچ باتھ کے اندر سے آرہی تھی۔ باتھ کے اندر پڑے ٹب میں پانی گر رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اندر نہا رہا ہو۔

ظہیر خان نے اپنے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اس کے دونوں بھائی اس کے ساتھ بیڈ پر دراز تھے۔ ظہیر خان کی حیرت ہویدا رہ گئی۔ اس کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگ گئی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر کمرے کے دروازے کو دیکھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت بڑھ گئی کہ دروازے کی اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔

ظہیر خان بنا آواز پیدا کیے اپنی جگہ سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ باتھ روم کے دروازے کے پاس جا کر اس نے کان لگا کر سننا چاہا لیکن کسی نتیجہ خیز مرحلے پر نہ پہنچ سکا۔ باتھ روم کے دروازے کی اندر سے چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ظہیر خان نے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ٹب کے اندر پیہم پانی گر رہا تھا۔ لیکن نہانے والا کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ظہیر خان باتھ روم کے اندر داخل ہو گیا لیکن اندر کوئی ہوتا تو اسے دکھائی دیتا۔

ظہیر خان نے پانی بند کیا اور باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی مڑا تھا۔ کسی نے اس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ظہیر خان نے سہم کر فوراً پیچھے دیکھا لیکن یہ دیکھ کر گنگ رہ گیا کہ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ قبل اس کے کہ وہ واپس پلٹتا کسی نے یک لخت اس کی گردن سے پکڑا اور پیچھے دھکیل دیا۔ ظہیر خان اس افتاد کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ ظہیر خان لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل زمین پر گرتا چلا گیا۔ خود کو آہنی شکنجوں سے نجات دلانے کے لیے ظہیر خان ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی گردن پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چیخنا چلانا چاہتا تھا تاکہ مدد کے لیے اپنے بھائیوں کو بلائے لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان تالو سے چپک گئی ہو۔

حیرت و خوف کے مارے اس کے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ یکدم اس کے سر کو پکڑ کر کسی نے سرعت سے پانی سے بھرے ٹب میں ڈبو دیا۔ ظہیر خان ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے ناک منہ میں مکمل پانی بھر چکا تھا۔ سانس تک لینا دشوار ہو چکا تھا۔ موت کی پرچھائیاں اس پر سایہ فگن ہو چکی تھیں۔ اس کی ہر کوشش دھیرے دھیرے ناکام پڑتی جا رہی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان وہ پنڈولیم کی طرح لٹک کر رہ گیا تھا۔ اسی کشمکش میں اس کی ہر سعی ناکام پڑ گئی اور ظہیر خان لقمۂ اجل ہو گیا۔ موت زندگی پر حاوی آ گئی۔ ظہیر خان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ظہیر خان کا بے جان جسم لڑھک گیا۔

☆......☆......☆

ایک سماعت شکن چیخ نے وری حویلی میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا۔ چیخ کسی اور کی نہیں بلکہ راشد خان کی تھی۔ راشد خان اٹھ کر باتھ گیا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک سماعت شکن چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ حیدر خان جو کہ ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ راشد خان کی چیخ پر حیدر خان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا اور وہ بھی فوراً باتھ روم کی طرف بڑھا۔ اگلا منظر دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے بھی طوطے اڑ گئے۔ دوسری طرف چیخ کی آواز سن کر ہیبت خان اور مونا خان بھی ان کے کمرے کی اور بڑھے اور زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

دونوں بھائیوں کے رونے کی آوازیں پیہم ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ راشد خان تو ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر دھواں دھار روئے جا رہا تھا۔ حیدر خان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ساتھ ہی ہیبت خان اور مونا کے علاوہ اکٹھے ہو جانے والے ملازم بھی اندر داخل ہو گئے۔

"ابو۔" حیدر خان نے روتے ہوئے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ "بھیا"

حیدر خان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی جب باتھ روم کی طرف بڑھے تو اگلا منظر دیکھ کر ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔ جو منظر ان کے سامنے تھا اسے دیکھ کر انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں منشی فیض رسول بھی پہنچ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ہیبت خان کو دلاسہ دیا جبکہ ملازموں کو فوراً حکم دے کر ظہیر خان کے جسد خاکی کو بیڈ پر لٹایا گیا۔ پلک جھپکتے میں پوری حویلی میں ماتم شروع ہو گیا تھا۔ مونا خان کا رو رو کر برا حال تھا۔ حیدر خان

اور راشد خان بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

ظہیر خان کی موت کی خبر پورے گاؤں میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ گاؤں والے یکے بعد دیگرے اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پورا گاؤں جہاں ہیبت خان اور اس کی فیملی کے غم میں شریک تھا۔ وہیں حیران و ششدر بھی تھا کہ ظہیر خان کی موت کیسے واقع ہو گئی؟ یہ معمہ کسی طور حل نہیں ہو پا رہا تھا۔ رو رو کر سب کا برا حال تھا۔

لیکن کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا بلکہ یہ ایک دستور ہے۔ انسان ہمہ وقت آنکھوں سے دکھائی دینے والی حقیقتوں کو نہیں مانتا۔ ایک ماں بچے سے اتنی محبت کرتی ہے کہ وقت آنے پر اپنی اولاد کی خاطر سولی پر لٹکنے سے بھی گریز نہیں کرتی لیکن جب اس کی اولاد لقمۂ اجل ہو جائے تو اس کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے ساتھ اس کی قبر میں نہیں جاتی۔ دنیاوی رشتہ دنیا میں ہی کھو جاتا ہے۔ بس ایک یاد بن جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک باپ جو تاحیات اپنی اولاد کے روشن مستقبل کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگائے پھرتا ہے۔ اپنی اولاد کے ساتھ قبر میں کیوں نہیں اترتا۔ بھائی جو بھائیوں کی جان ہوتے ہیں۔ ان کی محبت بھی دنیا میں رہ جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ بہنیں ماؤں سے زیادہ اپنے بھائیوں سے محبت کرتی ہیں لیکن قبر میں وہ بھی ساتھ نہیں جاتی۔ تو کیوں ہم حقیقتوں کو سمجھنے سے انکاری ہیں کہ یہ سب دنیاوی رشتے ہیں۔ اصل رشتہ تو اللہ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ کا ہے۔ جس نے بھی اللہ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ سے پکا رشتہ اپنا لیا اس کے لیے دنیا بھی بہتر اور آخرت بھی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کے درمیان رہنے والا انسان جب مر جاتا ہے تو اسے منوں مٹی تلے دفن کرنے کے بعد کوئی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ قبرستان کو ردحوں کا بسیرا قرار دے دیا جاتا ہے۔ کیا وہ روحیں ہمارے ان اپنوں کی نہیں ہوتی جو کبھی ہمارے درمیان ہوتے ہیں......؟

ہم لوگ اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے نجانے کتنے پاپڑ بیلتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچا کہ اولاد کا بہتر مستقبل اچھا گھر، کام اور اچھا رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ بہتر مستقبل مرنے کے بعد کا ہے۔ لیکن موت کسے یاد ہے۔ قبرستان میں جائیں یا کسی کی فوتگی پہ جائیں تو مومن بن جاتے ہیں جبکہ بعد میں رات گئی بات گئی والی بات بن جاتی ہے۔

آنسو، بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ جب بہتے ہیں تو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو انسان کا ہمت و حوصلہ تک بہا کر لے جاتے ہیں۔ لیکن جب دل کا غبار نکل جاتا ہے تو انسان کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اسے سکون میسر آجاتا ہے۔ صبر بھی مل جاتا ہے لیکن کچھ گھاؤ ایسے ہوتے ہیں جو دل و دماغ میں چھید کر کے رکھ دیتے ہیں اور کبھی نہیں بھرتے۔

ہیبت خان اور اس کی فیملی رونے دھونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ مجرم کافی شاطر تھا جسے بند دروازے بھی اندر داخل ہونے سے نہ روک پائے تھے۔ نہ جانے وہ کن کونوں کھدروں سے اندر داخل ہوا تھا اور ظہیر خان کو ابدی نیند سلا کر چلا بنا تھا۔ ظہیر خان کو سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں ہیبت خان کے گھرانے کو مصیبتوں نے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔ اسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ وہ اپنی فیملی کو لے کر یہاں کیوں آیا تھا لیکن اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ مجرم کو ابدی نیند سلائے بنا یہاں سے نہیں جائے گا۔ مجرم نے بے دردی سے اس کے لخت جگر کو ابدی نیند سلایا تھا۔ ہیبت خان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ایک بار مجرم سامنے آجاتا تو وہ اس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتا۔

☆......☆......☆

"یہ گھر کتنا منحوس ہے میرے لخت جگر کو نگل گیا ہے۔" مونا خان نے روتے ہوئے کہا۔

اس وقت سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ ہر کس و ناکس کی آنکھوں سے گوہر ہائے آبدار بہہ رہے تھے۔ جوان بیٹے کے غم نے ہیبت خان اور اس کی اہلیہ کو نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ راشد خان اور حیدر خان کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔

"ممابھیا کو آخر کس نے مارا ہے؟" راشد خان نے سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اندر سے تو چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں بھائی بھی سو رہے تھے۔ آخر مجرم کہاں سے

آیا؟"

"ہمیں واپس چلے جانا چاہیے ابو۔" حیدر خان نے ہیبت خان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں آپ کے دشمن ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جو ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا بیٹا ہم اس طرح کیسے تمہارے بھائی کے مجرم کو زندہ چھوڑ کر جاسکتے ہیں؟" ہیبت خان گویا ہوا۔

"اس طرح تو مجرم کا حوصلہ مزید بڑھ جائے گا۔ وہ ہیں بزدل سمجھے گا۔ اور یوں وہ کوئی بڑا وار بھی کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ میں اپنے لخت جگر کا اس سے انتقام لیے بنا جانے والا نہیں ہوں۔"

"ممکن ہے کوئی آپ کے جاہ وجلال سے جیلس ہوتا ہو اور آپ کو نیچا دکھانے یا آپ کا سب کچھ ہڑپ کرنے کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہا ہو؟" مونا خان نے سوال داغا تو ہیبت خان سوچ میں مبتلا ہوگیا۔

اسے منشی فیض رسول کے الفاظ یاد آگئے جب اس نے بیر توڑا تھا اور درخت سے خون کی بارش شروع ہوگئی تھی تو منشی فیض رسول نے کہا تھا کہ ممکن ہے کوئی آپ کے جاہ وجلال سے جیلس ہو رہا ہو۔

"ممکن ہے۔" ہیبت خان نے مختصر سا جواب دیا۔

"اپنے دشمن کو پہچانیے ورنہ وہ گاہے بگاہے وار کرتا رہے گا اور نقصان پہنچاتا رہے گا۔" مونا خان بولی۔ "میں مزید کچھ بھی برداشت نہیں کرپاؤں گی۔ پہلے ہی کلیجہ چھلنی چھلنی ہوچکا ہے۔"

اتنا کہہ کر مونا خان سسکیاں بھرنے لگیں۔ ہیبت خان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ جلد اپنے دشمن کو پکڑ کر ایسی موت مارے گا کہ دوبارہ کسی میں اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں ہوگی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ منشی فیض رسول کی بات پر عمل کرتے ہوئے کسی سیانے گیانے بندے سے صلاح مشورہ کرے اور حساب کتاب کرواکر اپنے دشمن کی پہچان کرے۔

☆......☆......☆

"تمہارے گھر کے اندر مافوق الفطرت مخلوق کا بسیرہ ہے۔" سلمان شاہ بولا۔

ہیبت خان نے منشی فیض رسول سے بات کی تھی کہ وہ اسے کسی عامل کامل کے پاس لے جائے۔ تھوڑی تگ ودو کے بعد انہیں سلمان شاہ کا پتہ چلا۔ سلمان شاہ ان کے گاؤں سے تین گاؤں چھوڑ کے 169 شمالی میں رہتا تھا۔ سلمان شاہ کے پاس نوری علم تھا۔

جب ہیبت خان نے سلمان شاہ کو ساری بات سے آگاہ کیا تو اس سلمان شاہ نے آنکھیں بند کرکے تھوڑی دیر ورد کیا اور پھر جو اسے بتایا اسے سن کر ہیبت خان سمیت منشی فیض رسول کے پیروں تلے سے بھی زمین کھسک گئی تھی۔ ہیبت خان ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب فرضی اور ڈرامائی حد تک باتیں ہیں۔ سلمان شاہ کی بات نے اسے حیران کردیا تھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ اس سائنسی دور میں ان باتوں پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟"

"مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ سائنسی دور کا مخلوقات سے کیا تعلق ہے؟" سلمان شاہ پیچ وتاب کھا کر بولا۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ سائنس ایسی مخلوق کی موجودگی کو نہیں مانتی۔" ہیبت خان نے وضاحت کی۔

"ویسے کتنی حیرت کی بات ہے۔" سلمان شاہ ہونٹ بھینچتے ہوئے افسردہ سے لہجے میں گویا ہوا۔ "ہم لوگ بھی نام کے ہی مسلمان رہ گئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ عزوجل اپنی مقدس کتاب میں جن وانس کا اکٹھا ذکر فرمارہے ہیں تو کیا سائنس ہماری مقدس کتاب قرآن مجید سے زیادہ افضل ہوگئی ہے؟"

"میرے کہنے کا مطلب تھا کہ....." ہیبت خان نے بولنا چاہا لیکن سلمان شاہ نے اسے ٹوک دیا۔

"آپ کے گھر کے اندر ایک دو نہیں بلکہ درجنوں ارواح کا بسیرہ ہے۔" سلمان شاہ نے موضوع بدلا۔

"تو ان سے کیسے جان چھڑوائی جاسکتی ہے؟" ہیبت خان نے پوچھا۔

"آج رات میں ایک وظیفہ کروں گا۔" سلمان شاہ گویا ہوا۔

"آپ لوگ کل صبح مجھے لینے آجانا ضرور کوئی نہ کوئی حل

نکل آئے گا۔"

☆......☆......☆

پچھلی رات کا وقت تھا۔ ہر کس و ناکس گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ مونا خان اور ہیبت خان ایک ہی کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے۔ یکدم مونا خان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دائیں پاؤں کی ہتھیلی میں کسی نے زور سے گدگدی کی ہو۔ مونا خان جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ایک نگاہ ہیبت خان کو دیکھا لیکن وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ مونا خان انگشت بدنداں رہ گئی۔ تبھی اس کی سماعت سے کسی کے چلنے کی آواز ٹکرائی۔ باہر کوئی تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ مونا خان کو تشویش ہوئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ہیبت خان کو اٹھائے لیکن پھر اس کی نیند میں خلل ڈالنا اس نے بہتر نہ سمجھتے ہوئے خود ہی اٹھ کر دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی۔ جلدی سے دروازہ کھول کر وہ باہر راہداری میں نکلی اور ادھر ادھر دیکھا۔

تبھی اس کی نگاہ راہداری کی نکڑ پر یوٹرن لیتی ایک دوشیزہ پر پڑی۔ اس دوشیزہ کی رفتار کافی تیز تھی۔ نجانے کیوں اس کے دل کے مندر میں خوف کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں۔ ایک بار پھر اس نے سوچا کہ ہیبت خان کو اٹھائے لیکن پھر اس کے دماغ میں بات آئی کہ ممکن ہے تب تک وہ کہیں روپوش ہوجائے۔ نجانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس دوشیزہ کا ضرور اس کے لخت جگر کی موت سے کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔ دوشیزہ یوٹرن لے کر مڑ چکی تھی۔ ضرور وہ حویلی کی کوئی ملازمہ تھی۔ مونا خان تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے ہو چلی۔ جیسے ہی اس نے یوٹرن لیا اس نے دوشیزہ کو ملازموں کے کوارٹر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اب تو اس کا پارہ ہائی ہوگیا۔ ایک دو ٹکے کی ملازمہ نے اس کے لخت جگر کو ابدی نیند سلایا تھا۔ ضرور یہ لوگ ان کے سب کچھ کو ہڑپ کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ مونا خان نے تہیہ کرلیا کہ اس دوشیزہ کو اپنے ہاتھوں ابدی نیند سلا کر قلبی سکون حاصل کرے گی۔

دوشیزہ ایک کوارٹر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ مونا خان بھی تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے پہنچ گئی اور سرعت سے دروازہ کھول کر کوارٹر میں داخل ہوگئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے اس کی بینائی ہی چھن گئی ہو۔ جلد ہی اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں۔ وہ اپنے لیے راستے کا تعین کرسکتی تھی اور بخوبی دیکھنے پر دوسرے کی موجودگی کو بھانپ سکتی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوچکی تھیں۔ ایک انجانے خوف نے پوری طرح سے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ راہداری سے گزر کر وہ صحن میں داخل ہوگئی۔ تاریک رات ہونے کی وجہ سے چہار سو گھپ اندھیرے کی گہری چادر تنی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوچکی تھی۔

عورت ذات کو اللہ تعالیٰ نے عجیب سانچے میں ڈھالا ہے۔ دل کی کمزور مگر ارادوں کی پختہ۔ یقین کامل اور ہمت ناپختہ۔ لیکن جب کسی بات پر ڈٹ جائے تو اس کے ارادوں میں پہاڑوں کی سی پختگی اور مردانہ حوصلہ عود کر آتا ہے۔ مردوں کو پچھاڑ دیتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عورت کی بہادری کے پیچھے بالکل اسی طرح کسی مرد کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے جیسے کسی کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

مونا خان کے سامنے دو کمرے تھے۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان میں سے ایک کے اندر اس کا دشمن چھپا ہوا تھا لیکن فی الوقت اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس کمرے میں ہوگا؟ دائیں طرف والے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر وہ کان لگا کر سنتی رہی لیکن اندر سے کوئی آواز پیدا ہوتی تو اسے سنائی دیتی لیکن جیسے ہی وہ دوسرے دروازے کے پاس پہنچی اسے فوراً اندر سے کسی کی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ غراہٹ ایسی تھی جیسے کوئی درندہ غرا رہا ہو۔ مونا خان غراہٹ کی آواز سن کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ مونا خان نے سوچا کہ ممکن ہے دشمن کو پتہ چل گیا ہو کہ اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور اب وہ ڈرانے کی غرض سے جانوروں کی سی آوازیں نکال رہا ہو۔

اس خیال کے آتے ہی مونا خان نے بنا کچھ سوچے سمجھے کمرے کا دروازہ کھٹاک سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ساتھ ہی غراہٹ کی آواز آنا یک لخت بند ہوگئی۔ مونا خان تھوڑی دیر کھڑی دیکھتی رہی لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بالآخر تمام

ترہمت یکجا کر کے وہ اندر داخل ہوئی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی اس کے نتھنوں سے بدبو کے بھبھوکے ٹکرائے۔ تبھی اس کو یوں لگا جیسے اس کے علاوہ بھی کوئی کمرے میں موجود ہو لیکن وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تت...... تم کون ہو؟" مونا خان نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "جو کوئی بھی ہو سامنے آؤ۔"

جواباً ایک بار پھر غراہٹ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ مونا خان نے آواز کی سمت دیکھا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اس کے سامنے ایک درندہ کھڑا تھا۔ جو خونخوار آنکھوں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس کی شکل کسی کتے کی مانند تھی لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔ اس کے پورے جسم پر کالے کالے لمبے بال تھے۔ وہ مسلسل غرا رہا تھا۔ اس کی زبان بار بار منہ سے باہر نکل رہی تھی۔ اور اس سے رال ٹپک رہی تھی۔ بے شک کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ باوجود اس کے کہ مونا خان کو سب کچھ مترشح (واضح) دکھائی دے رہا تھا۔

مونا خان خوف کی شدت کے باعث بری طرح سے کانپ رہی تھی۔ اس کی ساری بہادری نو دو گیارہ ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے تھرتھراتے قدموں سے وہ واپس پلٹنے لگی۔ جیسے جیسے وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ویسے ویسے اس درندے کی غراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مونا خان نے کمرے سے باہر نکل کر دوڑنا چاہا لیکن اگلا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ہر طرف اس درندے جیسے بے شمار درندے اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ پوری طرح سے گھر چکی تھی۔ درندوں نے اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تو مونا خان نے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ مونا خان پیہم ہیبت خان کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

ہیبت خان جو خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ مونا خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانے کی دیر تھی کہ وہ فوراً سے بھی پہلے اٹھ بیٹھا۔ مونا خان کی آواز پیہم اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔ ہیبت خان کے حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے وہ دوڑتا ہوا بیڈ سے اترا اور دروازے تک گیا پھر انہی قدموں پیچھے پلٹا اور رائفل اٹھا کر باہر نکلا۔ تب تک ملازموں کی بھی دوڑیں لگ چکی تھیں۔

ہیبت خان پیہم دوڑتا ہوا راہداری کراس کر کے ملازموں کے کوارٹروں کی طرف بڑھا۔ گھر کے ملازم بھی اکٹھے ہو چکے تھے لیکن کسی میں ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اندر جاتا لیکن ہیبت خان دوڑتا ہوا سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سارے ملازم بھی پیچھے دوڑے۔

دوسری طرف مونا خان کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ وہ بری طرح سے پھنس چکی تھیں۔ درندے اسے چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ کمرے میں موجود درندہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ڈر کے مارے مونا خان کے منہ سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ یکدم درندے نے اپنا منہ کھولا تو یوں لگا جیسے وہ منہ نہ ہو بلکہ کسی غار کا دہانہ ہو جو کھلتا ہی جا رہا تھا۔ بدبو کے بھبھوکوں نے مونا خان کے نتھنوں پر دستک دی تو مونا خان کو یوں لگا جیسے اسے ابھی کے ابھی الٹی آ جائے گی۔ بدبو جب حد تک زیادہ بڑھ گئی تو مونا خان نے سانس روکی لیکن کب تک......؟

مونا خان نے جب اس درندے کا بڑا سا منہ کھلتے دیکھا تو خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور اسی لمحے وہ ہو گیا جس کا کسی کو یقین بھی نہیں تھا۔ اس درندے نے اپنا بڑا سا منہ آگے بڑھا کر مونا خان کا چہرہ گردن تک اپنا منہ میں چھپا لیا اور یکدم اتنی زور سے اپنا منہ بند کیا کہ مونا خان کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ مونا خان کی آخری چیخیں تک دب گئیں۔

عین اس وقت جب ہیبت خان اندر داخل ہوا اس نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ اس درندے نے مونا خان کا سر تن سے جدا کر کے مزے لے لے کر چبانا شروع کر دیا۔ مونا خان کی گردن سے لہو کسی فوارے کی مانند نکلا۔ دوسرے ہی لمحے مونا خان کا جسد خاکی دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ ہیبت خان یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ ایک ساتھ کتنی ہی عفریتیں پورے صحن کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ہیبت خان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے اتھر ڈھلک کر زمین پر جا گرے۔ دوسرے ہی لمحے ہیبت خان نے اس درندے کا نشانہ لیا جس نے مونا خان کو ابدی نیند سلایا تھا۔ ٹریگر دباتے ہی کارتوس نکل کر درندے سے ٹکرایا تو ایک ساتھ سارے درندے

یوں غائب ہوگئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

رائفل ہیبت خان کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر جاگری۔ ہیبت خان تھکے ماندے قدموں سے اشک بہاتا مونا خان کی طرف بڑھا۔ تب تک ہیبت خان کے دونوں بیٹے بھی پہنچ چکے تھے۔ ماں کے تڑپتے وجود کو انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ دونوں دھواں دھار روتے ماں کے جسد خاکی کی طرف بڑھے۔ ہیبت خان سے پہلے منشی فیض رسول نے آگے بڑھ کر مونا خان کے ٹھنڈے پڑجانے والے وجود پر اپنی چادر اتار کر ڈال دی۔ ہیبت خان کو اس نے گلے سے لگالیا۔ ہیبت خان دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ منشی فیض رسول نے اشارہ کیا تو ملازم فوراً چارپائی لے آئے۔ مونا خان کے وجود کو چارپائی پر ڈال دیا گیا۔

مونا خان کا وجود غسل کے قابل نہیں تھا۔ منشی فیض رسول کے کہنے پر ملازم مولوی صاحب کو بلا لائے تھے۔ حالات وواقعات سے آگہی کے بعد مولوی صاحب نے فوراً جنازہ پڑھانے کی تاکید کی اور ساتھ میں قبر کی کھدائی شروع ہوگئی۔ مونا خان کو درجنوں سوگواروں کی موجودگی میں فوراً سے بھی پیشتر سپرد خاک کردیا گیا۔ ہیبت خان اور اس کی اولاد کی حالت دیدنی تھی۔ دونوں بیٹے بری طرح سے ڈرے سہمے ہوئے تھے اور باپ سے لپٹے ہوئے۔ کتنی دیر تک ہیبت خان قبر کے پاس بیٹھ کر روتا رہا۔ شاید اسے مونا خان کی موت کا یقین نہیں ہو پارہا تھا۔ مولوی صاحب کو سختی سے تاکید کی گئی کہ حالات وواقعات کے بارے میں گاؤں میں یا کہیں بھی کسی کو پتہ نہ چلے۔ مولوی صاحب وعدہ کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

منشی فیض رسول نے ہیبت خان کو سہارا دے کر اٹھایا اور ٹی وی لاؤنج میں لے جاکر صوفے پر بٹھا دیا۔ راشد خان اور حیدر خان دونوں باپ کے ساتھ سائے کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔

"سب کچھ ختم ہوگیا۔" ہیبت خان نے روتے ہوئے منشی کو مخاطب کیا۔

"میں آپ کا درد سمجھ سکتا ہوں سرکار۔" منشی نے نم آلود لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں منشی۔" ہیبت خان گویا ہوا۔ "جو مجھ پہ بیت رہی ہے۔ وہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

منشی ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ہیبت خان نے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ چپکالیا۔ "میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے اب مجھے اپنی جان بھی کیوں نہ دینی پڑجائے۔"

ہیبت خان کی بات سن کر منشی فیض رسول نے پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

"سرکار پانی پی لیجئے آپ کا حلق خشک ہوچکا ہے۔" منشی فیض رسول بولا۔

"اب اس وقت تک مجھ پر کچھ بھی کھانا پینا حرام ہے منشی جب تک میں اپنے فرزند اور اہلیہ کے قاتل کو ابدی نیند نہ سلالوں۔" ہیبت خان گلا پھاڑ کر بولا تو منشی فیض رسول نے فوراً گلاس نیچے میز پر رکھ دیا۔

"ہم علی الصبح سلطان شاہ کے ہاں جائیں گے سرکار۔" منشی فیض رسول تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"علی الصبح نہیں۔" ہیبت خان بولتے ہوئے رکا اور ایک دردبھری سانس خارج کی پھر گویا ہوا۔ "ہم لوگ ابھی جائیں گے۔"

"کیا ان کی نیند میں خلل نہیں ہوگا؟" منشی فیض رسول نے پوچھا۔

"میری دنیا اجڑ چکی ہے اور اگر اس شخص کی نیند میں خلل پیدا ہوجائے تو کوئی حرج ہے؟" ہیبت خان صوفے سے اٹھتے ہوئے غصے سے پیچ وتاب کھا کر بولا۔

"دیکھ رہے ہو ان بچوں کی طرف (بچوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) کیا ان کے اندر جھانک کر تم دیکھ سکتے ہو.....؟ تم جانتے ہوئے ہم لوگوں پر کیا گزر رہی ہوگی.....؟ کبھی تم نے کسی اپنے کو کندھا دیا ہے.....؟ لیکن تو گواہ ہے کہ میں نے اپنے فرزند اور اہلیہ کو کندھا دیا ہے۔ میرا دل کٹ کر ٹکڑوں میں منقسم ہوچکا ہے۔ اگر میرے ساتھ یہ دو بچے نہ ہوتے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا دیا بجھا دیتا.....اور تم.....تم کہتے ہو کہ اس شخص کی نیند میں خلل نہ پیدا ہوجائے۔"

آنسو ہر بند توڑ کر جاری وساری تھے۔ ہیبت خان کو کچھ

سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اس کی ہر ہمت جواب دے چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ زمین کی عمیق گہرائیوں اور آسمان کی وسعتوں سے بھی اپنی اہلیہ اور فرزند کے قاتلوں کو ڈھونڈ کر سپرد خاک کردیتا۔ منشی فیض رسول کی بات پر وہ بیچ پا ہوگیا تھا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر منشی فیض رسول کے کندھے پر دونوں ہاتھ رکھا اور گویا ہوا۔

"میں آپ کی عزت اپنے والد کی طرح کرتا ہوں۔"

"میں اس عزت افزائی کا بہت مشکور ہوں سرکار۔" منشی فیض رسول سر جھکا کر بولا۔

"میں کیسے آپ کو سینہ چیر کے دکھاؤں کہ میرا دل جل بھن کر رہ گیا ہے۔" ہیبت خان ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے میرے جینے کا حق چھین لیا گیا ہے۔ ایسے میں اگر وہ شخص مزے کی نیند سو رہا ہے تو آپ بتائیے کیا وہ ٹھیک ہے۔ کیا ایسے انسان پر ہم مزید اعتماد کرسکتے ہیں نہیں ناں...... پھر ہمیں دوبارہ پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہم کسی نہ کسی سے ضرور ملیں گے۔ میں آج ہی ان عفریتوں کو ختم کروں گا۔ بہر صورت۔"

ہیبت خان کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔ منشی فیض رسول نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ہیبت خان کی آنکھوں سے جاری اشک صاف کیے۔

"سرکار آپ کی حالت دیکھ کر آپ کے صاحبزادوں کی حالت مزید ابتر ہوسکتی ہے۔" منشی فیض رسول نے یاد دلایا تو ہیبت خان نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پایا اور پیچھے ہٹ کر دونوں بیٹوں کو گلے لگالیا۔

"میرے بچو۔" ہیبت خان ہونٹ بھینچتے ہوئے اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"تم چنتا مت کرو۔ دیکھنا وقت دور نہیں۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے بھائی اور ماں کے قاتل آگ میں سڑیں گے۔ اگر ان کو عبرت ناک موت نہ ملی تو مجھے بھی تاحیات سکون میسر نہیں ہوگا...... میں تم دونوں کی اندرونی کیفیت سے آشنا ہوں کیونکہ میری حالت بھی تم دونوں جیسی ہی ہے لیکن...... لیکن اب ہمیں فولاد کی طرح مضبوط ہونا پڑے گا کیونکہ اب سر پر کفن باندھنے کا وقت آچکا ہے۔"

"ابو میں ماروں گا سب کو۔" راشد خان دائیں ہاتھ کے کف سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں میں۔" اس کے بولتے ساتھ ہی فوراً حیدر خان بول اٹھا۔

"شاباش میرے شہزادوں۔" ہیبت خان نے دونوں کو سینے سے چپکاتے ہوئے کہا۔

"آج فخر سے میرا سر بلند ہوگیا ہے۔ تم دونوں نے ثابت کردیا ہے کہ تم ہیبت خان کے فرزند اور وجاہت خان کے پوتے ہو۔ شیروں کے بچے ہمیشہ شیر ہی ہوتے ہیں۔ شیر کی کھال اوڑھ لینے سے کبھی گیدڑ کی اولاد شیر نہیں بنتی۔ پس پشت وار کرنے والا درحقیقت قاہر ہوتا ہے۔ اس کے اندر اتنی سکت نہیں ہوتی کہ کھل کر مقابلہ کرسکے لیکن وہ جو کوئی بھی ہے ہم سب مل کر اس کا خاتمہ کریں گے۔ چلو ہمیں ایک کام جانا ہے۔ اس کے بعد اگلا لائحہ عمل مرتب کریں گے۔"

ہیبت خان اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں بچوں نے اشک صاف کیے۔ منشی فیض رسول معصوم بچوں کے ٹھوس ارادے دیکھ کر گنگ رہ گیا۔

"میرے بچے شیر ہیں۔" ہیبت خان فخر سے سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔

"ہم لوگ پٹھان ہیں اور پٹھان کبھی حالات کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتے۔ عزت اور غیرت کے نام پر ہم لوگ جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ ہم لوگ کسی کا برا نہیں سوچتے لیکن جب کوئی ہماری طرف انگلی کرتا ہے تو ہم اس کا ہاتھ ہی کاٹ دیتے ہیں اور جب کوئی میلی آنکھ سے دیکھتا ہے تو اس کی سرتن سے جدا کردیتے ہیں۔

مجھے فخر ہے کہ میرے بچے چٹانوں کے سے مضبوط ارادوں اور ہمت و حوصلے والے ہیں۔ تم دیکھنا منشی کہ اگر مد مقابل کو ناکوں چنے نہ چبانے پر مجبور کردیا تو میرا نام بھی ہیبت خان نہیں ہے۔"

منشی فیض رسول تصدیق میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیبت خان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ہمت

مرداں،مدد خدا۔ جب بھی انسان اپنے اللہ تعالیٰ پر مکمل یقین رکھ کے کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہی تو انسان کو اس کی اصل پہچان کرواتا ہے۔ لفظ اشرف المخلوقات سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن اس لفظ کی حقیقت سے قسمت والے ہی آشنا ہوسکتے ہیں۔ تبھی تو ڈاکٹر علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

یہ محنت بہت کم لوگ اپنی زندگی میں کرتے ہیں۔ اور جنہوں نے بھی محنت کی اللہ تعالیٰ نے ان کے نام ہمیشہ کے لیے زندہ کردیئے۔ کسی کو خواجہ معین الدین بنادیا تو کسی کو داتا علی ہجویری، کوئی فرید الدین شکر گنج بنا تو کہیں سے بلھے شاہ کا نام گونج اٹھا۔ ایسے ہی لوگ اپنی حقیقت کو پہچانتے ہیں اور جب پہچانتے ہیں تو قرب الٰہی ان کو نصیب ہوتا ہے اور جسے قرب الٰہی نصیب ہوجائے اس کے اندر سے حق کی گونج اٹھتی ہے۔ پھر چاہے کربلا کے شہیدوں کی طرح نسلیں کیوں نہ قربان کرنی پڑجائیں وہ طاغوت کے سامنے لبیک نہیں کہتے کیونکہ جنہوں نے خود کو پہچان لیا انہوں نے خدا کو پہچان لیا اور جنہوں نے خدا کو پہچان لیا انہوں نے حق کو پہچان لیا۔

☆......☆......☆

گاڑی منشی فیض رسول ڈرائیو کررہا تھا۔ جب کہ پچھلی سیٹ پر ہیبت خان اپنے دونوں بچوں کو سینے سے لگائے پریشان تھا۔ ابھی وہ سلمان شاہ کے گھر سے چند قدم پیچھے تھے کہ منشی فیض رسول نے گاڑی روک دی۔

"کیا ہوا......؟" ہیبت خان نے پوچھا۔ "گاڑی کیوں روک دی ہے؟"

"سامنے سے سلمان شاہ صاحب آرہے ہیں۔" منشی فیض رسول نے بتایا۔

"کیا......؟" ہیبت خان بے یقینی کے عالم میں بولا اور جب سامنے والے شیشے سے باہر جھانکا تو گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں اسے سلمان شاہ سرعت سے ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

ہیبت خان دونوں بچوں سمیت گاڑی سے اتر گیا۔ منشی فیض رسول بھی گاڑی سے اتر آیا۔ اتنی دیر میں سلمان شاہ ان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

"لگتا ہے آپ کہیں جارہے ہیں؟" منشی فیض رسول نے سلمان شاہ کے قریب پہنچنے پر پوچھا۔

"جی نہیں۔" سلمان شاہ نے جواب دیا۔ "میں آپ لوگوں کا منتظر تھا کیونکہ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ آپ لوگ میری طرف آرہے ہیں۔"

"لیکن کیسے......؟" ہیبت خان نے ہکابکا ہوکر پوچھا۔ "کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"آپ لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھ پائیں گے۔" سلمان شاہ بولا۔ "میں وہ سب کچھ بھی جانتا ہوں جو آپ لوگوں پر بیت چکی ہے۔ تبھی تو میں گھر سے باہر نکل کر تم لوگوں کا انتظار کررہا تھا۔"

"مطلب آپ جانتے ہیں کہ......" ہیبت خان بولنا چاہتا تھا لیکن سلمان شاہ نے اسے چپ کروادیا۔

"سنبھالیے خود کو۔" سلمان شاہ بولا۔ "ہر کام میں اوپر والے کی طرف سے بہتری پنہاں ہوتی ہے۔ رونے دھونے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ مسائل کے ساتھ ساتھ انسان کے ہمت و حوصلے بھی پست ہوجاتے ہیں۔ آپ لوگوں نے جو قربانیاں دینی تھیں دے لیں۔ اب ظالموں کا وقت آخر آچکا ہے۔ ہمیں فوراً آپ کی حویلی میں چلنا ہے۔"

سلمان شاہ کی بات سن کر ہیبت خان نے خود آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔ سلمان شاہ کے ہاتھ میں ایک کپڑے کا تھیلا تھا۔ اسے سنبھالتا ہوا وہ اندر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ساتھ ہی ہیبت خان نے دروازہ بند کیا اور بچوں کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں منشی فیض رسول بھی اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔ گاڑی کو واپس موڑ کر حویلی کی طرف اس کا رخ کردیا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ حویلی میں پہنچ چکے تھے۔ حویلی کے سارے ملازم جاگ رہے تھے۔ ان لوگوں کے واپس آتے ساتھ ہی سب اکٹھے ہوگئے۔ سلمان شاہ نے فوراً سب مکینوں کو بلایا اور سب کو ایک دائرہ کھینچ کر اس میں بٹھایا اور ساتھ ہی سختی سے تاکید کی کہ کوئی بھی دائرے سے

باہر نکلا تو اپنی موت کا خود ہی ذمہ دار ہوگا۔ پھر ایک دائرہ کھینچ کر اس کے اندر ہیبت خان، اس کے دونوں بچوں اور منشی فیض رسول کو بٹھا دیا۔ پھر تیسرا دائرہ کھینچ کر اس کے اندر خود بیٹھ گیا۔ تینوں دائرے ایک ساتھ سیدھے کھینچے گئے تھے۔

اپنے دائرے میں بیٹھنے کے بعد سلمان شاہ نے تھیلے میں سے مٹی کی ایک چھوٹی سی ہانڈی نکالی اور اسے دائرے سے باہر رکھ دیا۔ پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر پانی کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس ہانڈی کو لبالب بھر دیا۔ پھر اس ہانڈی کے چہار سو ان گنت اگربتیاں لگائیں۔ ہر سو اگربتیوں کی خوشبو پھیلنے لگی۔ سلمان شاہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ بھی رہا تھا۔ سلمان شاہ نے ایک بار پھر تھیلے کے اندر ہاتھ ڈالا اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی۔ پھر سلمان شاہ نے تھیلا اپنے سامنے رکھ دیا۔ چھڑی کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس کا دوسرا سرا ہانڈی کے اندر بھرے پانی میں ڈبو دیا۔ سب سلمان شاہ کو دیکھ رہے تھے۔

سلمان شاہ متواتر منہ ہی منہ میں قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے بلند آواز سے تلاوت کلامِ الٰہی کرنا شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فضا میں ایک سماعت شکن چیخ گونجی۔ سب کے دل حلق کو آن لگے۔ ہیبت خان کے دونوں بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ہیبت خان نے جلدی سے دونوں کو سینے سے چپکا لیا۔ عین اسی وقت سب نے دیکھا کہ جس طرف رہداری ملازموں کے کوارٹروں کی طرف جا رہی تھی۔ اس طرف سے ایک نہایت ہی حسین و جمیل الھڑ مٹیار شان بے نیازی سے چلتی ہوئی سلمان شاہ کی طرف بڑھنے لگی۔

سلمان شاہ پیہم قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ وہ دوشیزہ آ کر سلمان شاہ کے سامنے دوزانوں بیٹھ گئی۔ ہیبت خان سمیت سب اسے انگشت بدنداں آنکھوں سے گھورنے لگی۔ سلمان شاہ نے اپنی تلاوت ختم کی تو اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" سلمان شاہ نے پوچھا۔

"چاندنی۔" دوشیزہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"پورا نام۔" سلمان شاہ نے دوبارہ پوچھا۔

"نندنی ملہوترا لیکن سب پیار سے چاندنی کہتے تھے کیونکہ میں چاند سے بھی زیادہ حسین تھی۔"

"اس گھر میں کیوں گھسی ہوئی ہو؟" سلمان شاہ نے پوچھا۔

"میں خود نہیں آئی۔" چاندنی نے جواب دیا۔

"تو......؟" سلمان شاہ نے اسے گھورا۔

"اس کا باپ زبردستی لے کر آیا تھا۔" چاندنی نے کھا جانے والی نگاہوں سے ہیبت خان کو گھورتے ہوئے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے اس کے بیٹے اور اہلیہ کو کیوں مارا؟" سلمان شاہ نے پوچھا۔

"کیوں کہ اس کے باپ نے میرے پورے پریوار کو ابدی نیند سلا دیا تھا۔" چاندنی ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی۔ "ہماری خوشیوں کو ملیامیٹ کر دیا تھا اس ظالم نے۔ برسوں بعد ہمارے گھر میں خوشیوں نے پڑاؤ ڈالا تھا لیکن اس ظالم انسان نے ان خوشیوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ جس طرح اس نے میری فیملی کو بے موت مارا بالکل ویسے ہی میں اس کی ساری فیملی کو اذیتیں دے دے کر ماروں گی۔"

"وضاحت دو۔" سلمان شاہ گویا ہوا تو چاندنی نے کھوئی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد وہ بولتی گئی اور سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن سنتے رہے۔

☆......☆......☆

"چاندنی...... ارے او چاندنی...... سن تو۔" دیپک نے چاندنی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا لیکن مجال ہے کہ اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔

چاندنی پیہم چھوٹی سی پگڈنڈی پر تیز تیز ڈگ بھرتی چلتی جا رہی تھی۔

"دیکھو تو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟"

دیپک نے ایک بار پھر کہا لیکن چاندنی اپنی مستی میں مگن چلتی ہی رہی۔

"ایک خوبصورت سی پائل لایا ہوں جو تمہارے

خوبصورت پیروں کو اور بھی زیادہ خوبصورت کردے گی۔"

پائل کا نام سنتے ہی جیسے چاندنی کے پیروں کو زمین نے جکڑ لیا ہو۔ وہ فوراً مڑی۔

"کیا واقعی تم پائل لائے ہو؟" چاندنی نے سوالیہ نگاہوں سے دیپک کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواباً دیپک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پائل نکال اور اس کی ایک سائیڈ انگلی اور انگوٹھے میں دبا کر بقیہ کو ہوا میں جھلاتے ہوئے اسے دکھلایا۔ پائل اتنی خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کر چاندنی دوڑتی ہوئی دیپک کے پاس آرکی اور جلدی سے پائل پکڑنا چاہی لیکن دیپک نے پائل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔

"میں خود پہناؤں گا۔" دیپک نے ضد کی۔

"چل ہٹ پگلے۔" چاندنی کے لب ولہجے میں شرم وحیا کی جھلک عیاں تھی۔

"میں تمہارا ہونے والا پتی ہوں۔" دیپک نے اسے یاد دلایا۔

"لیکن ابھی تک بنے تو نہیں۔" چاندنی نے اسے چھیڑا۔

"بس اب جلدی ہی بن جاؤں گا۔" دیپک خوشی سے بولا۔ "اب تو میری جاب بھی لگ گئی ہے۔ اب میں اتنا کما رہا ہوں کہ پتاجی کو کبھی کام نہیں کرنے دوں گا۔ میں سارے گھر کا خرچہ اب خود اٹھاؤں گا۔"

"اب تو تم شہری بابو بن گئے ہو ہے ناں؟" چاندنی نے دیپک کے قریب کھڑے ہو کر اس کے سینے پر دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارے لیے وہی پینڈو دیپک ہی ہوں۔" دیپک بولا اور چاندنی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اب پہناؤ بھی۔ ترساؤ مت۔" چاندنی نے للچائی ہوئی آنکھوں سے پائل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دیپک نے اپنے ہاتھوں سے پائل چاندنی کے بائیں پاؤں میں پہنائی۔ چاندنی خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے پائل کو تکنے لگی تھی۔

"تمہیں پسند آئی کیا؟" دیپک نے پوچھا۔

"بہت خوبصورت ہے۔" چاندنی نے جواب دیا۔ "بالکل تمہارے جیسی۔"

دیپک زیرلب مسکرادیا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پگڈنڈی پر چلتے ہوئے گھر کی طرف ہو لیے۔ دونوں نہیں جانتے تھے کہ ان کو کچھ آنکھیں بغور دیکھ رہی تھیں۔

وہ کوئی اور نہیں بلکہ وجاہت خان تھا۔ جو اپنے کارندوں کے ساتھ کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وجاہت خان للچائی ہوئی آنکھوں سے پیہم چاندنی کو گھورے جا رہا تھا۔ اس نے گاڑی پگڈنڈی کے سامنے سڑک پر روک دی تاکہ جیسے ہی چاندنی اور دیپک قریب پہنچیں۔ وہ چاندنی کو لائن مار سکے۔ جب چاندنی اور دیپک اپنی موج مستی میں چلتے ہوئے ان کے قریب سے گزرنے لگے تو وجاہت خان سرعت سے گاڑی سے اتر کر ان کے سامنے آگیا۔

"بہت جلدی میں ہو کیا؟" وجاہت خان نے پوچھا۔

"راستہ چھوڑو ہمارا۔" دیپک پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولا۔

"تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟" وجاہت خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ "چل اپنا راستہ پکڑ ورنہ بھیجہ نکال کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

"تم ہوتے کون ہو ہمارا راستہ روکنے والے؟" دیپک غصے سے بولا۔

"یو ایڈیٹ۔" وجاہت خان دانت پیستے ہوئے بولا۔

اس کا اشارہ پاتے ساتھ ہی اس کے کارندے دیپک کر پاگل کتے کی طرح ٹوٹ پڑے اور انہوں نے دیپک کو مار مار کر لہولہان کرکے رکھ دیا۔

"جاؤ اور بتا دینا کہ جس میں ہمت ہے آکر اسے لے جائے۔" وجاہت خان متواتر دانت پیستے ہوئے بولا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے چاندنی کو اٹھا کر گاڑی میں یوں پھینکا جیسے کوئی کوڑا کرکٹ گھر سے باہر پھینکتا ہے۔ چاندنی نے گاڑی سے باہر نکلنا چاہا لیکن وجاہت خان اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اسے قابو کر لیا۔ پلک جھپکتے میں وجاہت خان چاندنی کو لے کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

دیپک گرتا پڑتا جب گھر پہنچا تو اس کی حالت زار دیکھ کر سب کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ دیپک سیدھا چاندنی کے گھر گیا تھا۔

"یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟" چاندنی کے باپ نے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔

"میری چنتا مت کرو چاچا۔" دیپک کراہتے ہوئے بولا۔ "وہ ظالم تیری بیٹی کو اٹھا لے گیا ہے۔ اسے بچانے کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا ہے۔"

"تو کس کی بات کر رہا ہے دیپک؟" چاندنی کا باپ پریشان ہو کر بولا۔

"وجاہت خان۔" دیپک دھیمے سے لہجے میں بولا تو چاندنی کا باپ سہم سا گیا۔

"اے بھگوان۔" چاندنی کے باپ نے آسمان کی طرف منہ کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میری بیٹی کی رکھشا کرنا۔"

اتنا کہہ کر چاندنی کا باپ گھر سے باہر نکلا اور سرعت سے قریبی ہندو گھرانوں سے چند افراد کو ساتھ ملا کر فوراً وجاہت خان کی حویلی کی طرف لپکا۔ جس وقت وہ لوگ وجاہت خان کی حویلی کے پاس پہنچے اس وقت وجاہت خان چاندنی کو حویلی کے پیچھے بنے ملازموں کے کوارٹر میں اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کے پھینک کے اپنی حویلی میں آ گیا۔ لوگوں کا جم غفیر اس کی حویلی میں داخل ہوا تو اس کے کارندوں نے ان کا راستہ روکا۔

"کہاں ہے وہ خبیث۔ باہر نکالو اسے۔" ایک ہندو نوجوان نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تجھے زندگی پیاری نہیں ہے۔" وجاہت خان کے ایک کارندے نے اپنی رائفل کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

حالات کی کشیدگی کو بھانپتے ہوئے چاندنی کا باپ سامنے آ گیا اور اس نے ہاتھ جوڑے۔

"بھگوان کے لیے میری بچی کو چھوڑ دو۔" چاندنی کے باپ کے لہجے میں التجا تھی۔

"کونسی بچی؟" اس کارندے نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اتنے نادان مت بنو۔ میں تم لوگوں کی منتی کرتا ہوں بھگوان کے لیے میری بچی کو چھوڑ دو۔" چاندنی کا باپ متواتر منت کر رہا تھا۔

اتنی دیر میں وجاہت خان شان بے نیازی سے چلتا ہوا حویلی سے باہر آیا تو سارے ہندوؤں نے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وجاہت خان نے دور سے ہی کھڑے ہو کر پوچھا تو ملازم اس کی طرف ہمہ تن گوش ہوئے۔

"مالک یہ لوگ عجب ہی واویلا کر رہے ہیں کہ ہماری بچی کو چھوڑ دو۔" ایک کارندے نے وجاہت خان کو جواب دیا۔

"کون کہتا ہے؟" وجاہت خان نے پوچھا تو اسی کارندے نے چاندنی کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے میری طرف بھیجو۔"

وجاہت خان کے حکم پر چاندنی کے باپ کو جانے کی اجازت ملی تو اس کے ساتھ کچھ جوانوں نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس کے کارندوں نے ان کا راستہ روک لیا۔

"صرف ایک ہی آدمی ملاقات کر سکتا ہے۔ جس کا جی چاہے۔" وجاہت خان کا کارندہ گویا ہوا۔

"تم لوگ رکو میں خود جاتا ہوں۔" چاندنی کے باپ نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دبے قدموں چلتا ہوا وجاہت خان کی طرف بڑھا اور سیدھا جا کر اس کے قدموں میں گر گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ ہم لوگ آپ کے سامنے پلید ہیں۔" چاندنی کے باپ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "لیکن پھر بھی آپ کی منت کرتا ہوں کہ بھگوان کے لیے میری بچی کو چھوڑ دو۔"

"شاید تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو؟" وجاہت خان نے اسے سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کھڑے ہو جاؤ اور وضاحت سے بتاؤ کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

چاندنی کے باپ نے دیپک کی سنائی ہوئی کہانی اس کے گوش گزار کی تو وجاہت خان نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"کون ہے وہ جس نے مجھ پہ یہ الزام تھوپا ہے کیا اسے میرے سامنے لا سکتے ہو؟" وجاہت خان نے غصے سے پیچ

دناتے کھاتے ہوئے پوچھا۔

"بھگوان کے لیے ہم پہ رحم کیجئے آپ ہی ہمارے مائی باپ ہیں۔" چاندنی کے باپ نے وجاہت خان کے قدموں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"میری پوری حویلی کی تلاشی لے لیجئے آپ لوگ۔" وجاہت خان غصے سے تقریباً دھاڑتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں نے سوچ کیسے لیا کہ میں ایسی گھٹیا حرکت کا مرتکب ہوسکتا ہوں؟"

وجاہت خان کی بات سن کر چاندنی کا باپ کھڑا ہوگیا اور اس نے اپنے بہتے اشک صاف کیے۔

"ہماری بیٹی کو لوٹا دیجئے ورنہ آپ کی اس جھوٹی شان وشوکت کا جنازہ نکال کر رکھ دیں گے۔" چاندنی کے باپ نے الٹے قدموں آتے کہا تو وجاہت خان نے کھاجانے والی آنکھوں سے اسے گھورا۔

"تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کررہے ہو؟" وجاہت خان نے چاندنی کے باپ کو گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

چاندنی کے باپ کو گریبان سے پکڑنا تھا کہ ہندو مشتعل ہوگئے جس کی وجہ سے فوراً ہی وجاہت خان نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

"میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہماری بیٹی کو ہمارے سپرد کردو۔" چاندنی کے باپ نے وجاہت خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"دھکے دے کر باہر نکال پھینکو ان حرام زادوں کو۔" وجاہت خان غصے سے دھاڑا۔

دوسرے ہی لمحے وجاہت خان کے کارندوں نے سب کو گن پوائنٹ پر کرکے حویلی سے باہر نکال دیا۔ سارے ہندو آپے سے باہر ہوچکے تھے۔ دوسری طرف دیپک کو وید سے مرہم پٹی کروادی گئی تھی۔ ہندو جب واپس پہنچے تو باقی سارے بھی ان کے پاس اکٹھے ہوگئے اور ان کی زبانی ساری بات سن کر مشتعل ہوگئے۔

"وہ بہت کمینہ ہے۔" چاندنی کا باپ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بولا۔

وہ اپنے ضبط پر قابو پانے کی سعی کررہا تھا لیکن پھر بھی اشک اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

"تو چنتا کائے کو کرتا ہے چاچا۔" وکرم اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "چاندنی ہماری عزت ہے۔ ہم سب اسے لے کر آئیں گے۔"

چاندنی کا باپ روتا بلکتا اپنے گھر میں گھس گیا جہاں اس کی اہلیہ کو محلے کی عورتیں دلاسہ دے رہی تھیں۔ اپنے خصم کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر اس نے دھواں دھار رونا شروع کردیا تھا۔

☆......☆......☆

وجاہت خان حالات وواقعات سے آشنائی حاصل کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گرم کھانے سے اپنا ہی حلق جلاتا تھا۔ اس کے ذہن میں فوراً ترکیب آئی اور وہ اس کوارٹر میں گیا جہاں اس نے چاندنی کو مقید کرکے رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر چاندنی نے کسمسانا شروع کردیا۔ وجاہت خان نے فوراً اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ منہ پہ بندھا کپڑا بھی کھول دیا۔

"بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" چاندنی نے ہاتھ باندھ کر التجا کرتے ہوئے کہا۔

"ایک شرط پر تمہیں چھوڑوں گا۔" وجاہت خان تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

جواباً چاندنی منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کی سوالیہ نگاہیں پیہم وجاہت خان کے چہرے پر مرتکز ہوگئیں۔

"تم کسی کو بھی نہیں بتاؤ گی کہ تمہیں میں اغواء کرکے لایا تھا۔" وجاہت خان بولا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" چاندنی فوراً سے بھی پہلے بولی۔

"میں تمہارا کیسے یقین کرلوں؟" وجاہت خان نے پوچھا۔

"میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ میری عزت محفوظ رہ جائے۔" چاندنی بولی۔ "اپنی عزت بچانے کی خاطر ایک لڑکی ایک تو کیا ہزاروں جھوٹ بول سکتی ہے پھر یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے ساتھ جولڑکا تھا اس نے میرا نام لے

لیا ہے۔" وجاہت خان دھیمے لہجے میں بولا۔
"اس کی چھان بین کیجئے۔" چاندنی نے یقین دہانی کروائی۔
"لیکن اگر ایسا ہوا تو دوبارہ مجھ سے اچھے کی کوئی امید نہ رکھنا۔" وجاہت خان چاندنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
"میرا وشواس کیجئے۔" چاندنی بولی۔
"میرے ساتھ آؤ۔" وجاہت خان بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
چاندنی ڈرتی ہوئی اس کے پیچھے اٹھ کر چلنے لگی۔ وجاہت خان اسے لیے اپنی گاڑی میں آ گیا اور پھر گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا چاندنی کے علاقے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ کسی بھی کارندے کو لانا مناسب نہ سمجھا۔ پورے راستے وہ چاندنی سے بار بار معافیاں مانگتا آیا۔ چاندنی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ ایک ظالم اور جابر انسان ایسے یکدم کیسے نرم دل بن سکتا ہے۔
چاندنی کے محلے میں گاڑی کیا داخل ہوئی۔ سارے ہندوؤں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ سارے ہندو چاندنی کے گھر کے سامنے مجتمع تھے۔ وجاہت خان کی گاڑی میں چاندنی کو دیکھ کر گنگ رہ گئے۔ دیپک بھی وہیں پر موجود تھا۔ چاندنی گاڑی سے باہر نکلی تو ہندوؤں نے کھا جانے والی آنکھوں سے وجاہت خان کو دیکھا اور پھر ہندوؤں کے پنڈت نے آگے بڑھ کر چاندنی کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"بیٹا تو کہاں گئی تھی؟" پنڈت نے پوچھا تو سب چاندنی کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔
"مجھے چند غنڈوں نے اغواء کر لیا تھا۔" چاندنی نے بتایا۔
"یہ تو بھلا ہو انسان کا بہت بھلے مانس ہیں۔ انہوں نے میری نہ صرف عزت بچائی بلکہ میری جان بھی بچائی۔ یہ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ اگر آج یہ نہ ہوتے تو غنڈے میری عزت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتے۔"
چاندنی روتے ہوئے پاس کھڑے اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی۔ چاندنی کے باپ نے حیرت و یاس کے عالم میں وجاہت خان کی طرف دیکھا۔ سارے ہندو بھی حیرت و پریشانی کے عالم میں کبھی چاندنی تو کبھی وجاہت خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔
دوسری طرف چاندنی کے الفاظ سن کر وجاہت خان کا سینہ چوڑا ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ چاندنی واقعی اس کے حق میں گواہی دے گی۔
"یہ جھوٹ بول رہی ہے کاکا۔" دیپک نے چاندنی کی بات سن کر چلاتے ہوئے کہا۔
"اسی خبیث انسان نے نہ صرف چاندنی کو اغواء کیا تھا بلکہ مجھے بھی زدوکوب کروایا (چاندنی کو مخاطب کرتے ہوئے) تم اس کی طرفداری کیوں کر رہی ہو تمہارے سامنے اس نے میرا برا حال کروایا تھا اور اسی نے تمہیں اغواء کروایا تھا۔ اس خبیث انسان کو زندہ جلا دو؟"
دیپک کی بات سن کر چاندنی آگے بڑھی اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک زوردار تھپڑ دیپک کے منہ پر رسید کیا۔
"تمہیں شرم آنی چاہیے۔" چاندنی دانت پیستے ہوئے بولی۔ "ایک مہان انسان کی تم اس طرح بے عزتی کر رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کوئی چوٹ تمہارے دماغ پر بھی لگی ہے جس کی وجہ سے تمہیں انسان کی پہچان نہیں ہو رہی۔ یہ میرے محسن اور بھلے مانس انسان ہیں۔"
"چاندنی۔" دیپک اپنے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں گویا ہوا۔
"تم نے مجھے تھپڑ مارا.....؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ....."
"جسٹ شٹ اپ۔" چاندنی نے دیپک کا جملہ پورا بھی نہ ہونے دیا۔
دیپک بنا کچھ کہے واپس پلٹ گیا۔ چاندنی کا دل کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ وہ سب کو چلا چلا کر وجاہت خان کی حقیقت بتا دے لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اگلی بار اس کی عزت کے ساتھ ساتھ اس کی اور اس کے اہلِ خانہ کی جان بھی جا سکتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وجاہت خان کتنا خطرناک آدمی ہے۔ انسان کے روپ میں وہ ایک بھیڑیا ہے۔
وجاہت خان چپ چاپ گاڑی میں بیٹھا اور واپس چل

دیا۔ چاندنی کا باپ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن اسے موقع ہی نہ مل سکا..... جان بچی سو لاکھوں پائے..... انہیں ان کی بچی مل چکی تھی۔ خوشی کے مارے وہ پھولے نہ سما رہے تھے۔

☆......☆......☆

"کتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟" رانا الفت نے پوچھا۔

جواباً وجاہت خان نے شروع تا آخر ساری روداد اسے کہہ سنائی۔

"تو اب کیا چاہتے ہو؟"

رانا الفت نے پوچھا تو وجاہت خان نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "اس لونڈیا کو اس کے یار سمیت ایسا مزہ چکھانا چاہتا ہوں کہ ان کی عقل ٹھکانے لگ جائے۔" وجاہت خان بولا۔

"تو پھر تو پریشان کیوں ہے؟" رانا الفت نے پوچھا۔ "ویسے ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے کہ تیرے پاس ہر چیز بھی۔ شان وشوکت بھی اور تیرے تو ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ پھر اس لونڈیا کو تو نے چھوڑ کیوں دیا؟"

"جلد بازی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔" وجاہت خان شیطانی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے بولا۔

"ممکن ہے پنڈ والے کوئی واویلا مچاتے اور حالات مزید گرگوں ہوتے۔ ایسی صورت میں ہمارا بھانڈہ بھی توپھوٹ سکتا ہے۔ میں نے ایسا تیر پھینکا ہے کہ پنڈ والے میری طرف سے مطمئن ہو چکے ہیں۔ اب اگر میں کچھ کروں گا بھی تو وہ مجھ پر شک کرنے سے پہلے ہزار بار سوچیں گے۔"

"کافی عقل مند ہے تو۔" رانا الفت نے تعریف کی۔ "اب آگے کیا کرے گا؟"

"لاشوں کے انبار لگادوں گا۔" وجاہت خان ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا۔

"لیکن....." رانا الفت نے بولنا چاہا لیکن وجاہت خان نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کروا دیا۔

"کوئی ایسی بات نہ منہ سے نکالنا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ بس تو دیکھتا جا کہ ہوتا کیا ہے؟"

رانا الفت نے وجاہت خان کی بات سن کر بس سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وجاہت خان کس حد تک جا سکتا ہے؟

☆......☆......☆

"باپو..... ارے او باپو" چاندنی نے دیپک کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دیپک کا باپ اس وقت جانوروں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ چاندنی کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

"دیپک کہاں ہے؟"

چاندنی نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ "یہیں کہیں ہوگا؟" دیپک کے باپ نے جواب دیا۔

"مگر یہاں تو کہیں نہیں ہے؟" چاندنی نے بتایا۔

"ابھی تو یہیں تھا۔" دیپک کے باپ نے جواب دیا۔ "ممکن ہے کسی دوست کے ہاں گیا ہو یا پھر یہیں کہیں ہوگا۔"

چاندنی کندھے اچکاتی ہوئی واپس پلٹی۔ پہلے اس نے سوچا کہ گھر چلی جائے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ قریبی باغیچے میں جا کر پتہ کرلے ممکن ہے دیپک وہاں ہو کیونکہ اکثر وبیشتر وہ وہاں ہی ملتا تھا۔ یہ سوچ کر چاندنی باغیچے کی طرف چل دی۔ دیپک کو آوازیں دیتی چاندنی نے ابھی چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ یکدم کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا اور اس کے منہ پر کپڑا رکھ دیا۔ چاندنی اس افتاد کے لیے قطعاً تیار نہ تھی۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے لیکن جلد ہی اس کا جسم ڈھلک گیا۔

☆......☆......☆

چاندنی کی آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اجنبی جگہ پر پایا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ وہ باغیچے میں دیپک کی تلاش میں گئی تھی اور کسی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ فٹ سے اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اس کے ایک طرف زخموں سے چور دیپک پڑا تھا۔ جس کے زخموں سے لہو ابھی تک رس رہا تھا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر چاندنی کا دل مٹھی میں بھر آیا تھا جبکہ دوسری طرف وجاہت خان اور اس کے ساتھ ایک نئی صورت

دکھائی دے رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہی کہتا ہے وجاہت خان۔" رانا الفت کی آواز سکوت زدہ فضا میں گونجی۔"ان ہندوؤں نے کیا اپسرا چھپا کے رکھی ہوئی تھی۔ جانتا ہے تو کہ یہ تو ہیرے جواہرات کے عوض جائے گی۔"

"تم؟" وجاہت خان کے بولنے سے قبل چاندنی حیرت سے بولی۔

"ارے یہ تو تمہیں جانتی بھی ہے۔" رانا الفت نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"ہماری بڑی پرانی جان پہچان ہے رانا۔" وجاہت خان نے کھا جانے والی آنکھوں سے چاندنی کو دیکھتے ہوئے رانا الفت کو بتایا۔

"میں نے کہا تھا ناں....." دیپک کی کانپتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی تو چاندنی سمیت وجاہت خان اور رانا الفت بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کہ یہ بہت خبیث انسان ہے.....لیکن.....لیکن تم نے اس کی.....حمایت کی تھی۔"

"ارے یہ پگلی ہے۔" چاندنی کی جگہ وجاہت خان قہقہہ مار کے ہنستے ہوئے بولا۔

"یہی بات تو اسے معلوم نہیں تھی۔ یہ کونسی بھلا تیرے جیسی دوراندیش تھی۔ بس اس نے مجھ پہ اندھا دھند اعتماد کرلیا لیکن یہ جانتی نہیں تھی کہ میری دشمنی سانپ کے زہر سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی حرام زادے۔" چاندنی غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر وجاہت خان کی طرف دوڑی۔

وجاہت خان اور رانا الفت دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوگئے۔ صنف نازک میں کہاں اتنا دم کہ ایک مرد سے مقابلہ کرسکے۔ پھر یہاں تو ایک نہیں دو مرد تھے اور ان دونوں نے مل کر چاندنی کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں۔ دیپک بھی کچھ نہ کرسکا۔ چاندنی عزت کا جنازہ نکل جانے پر دھواں دھار رو رہی تھی تبھی اس کی نگاہ ایک سلاخ پر پڑی جو دروازے کے ایک جانب پڑی تھی۔

وجاہت خان اور رانا الفت ان دونوں کو اندر قید کرکے جا چکے تھے۔ چاندنی نے فوراً لوہے کی اس سلاخ کو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دیپک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر حد سے زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی محبوبہ کی عزت لوٹ لی گئی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہ کر پایا تھا۔

دوسرے ہی لمحے کمرے کی سکوت زدہ فضا میں چاندنی کی دلخراش چیخ گونجی۔ اگلا منظر دیکھ کر دیپک کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔

☆......☆......☆

چاندنی اور دیپک دونوں نے بند کوٹھڑی کے اندر جان دے دی۔ وجاہت خان اور رانا الفت کو جب اس بات کا علم ہوا تو ان کے حواس باختہ رہ گئے۔ بالآخر دونوں نے دگرگوں حالات سے بچنے کے لیے ان دونوں کو اس بند کوٹھڑی کے اندر گڑھا کھدوا کر دبوا دیا۔ یوں چاندنی اور دیپک کا راز ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دفن ہوگیا۔

چاندنی اور دیپک کے گھر والوں نے ان دونوں کو بہت تلاش کیا لیکن انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے۔ کئی ہندوؤں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ وجاہت خان پر زور دے کر پوچھیں لیکن انہوں نے انکار کردیا کہ پہلے ایک بار بھی اس پر الزام لگا کر ان سے بہت بڑی بھول ہو چکی ہے اور ایسا اب کبھی نہیں ہوگا۔

دوسری طرف ایک رات وجاہت خان اپنے کمرے میں سویا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے علاوہ بھی کوئی کمرے کے اندر موجود ہے۔ جب اس نے لائٹ جلائی تو کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے پھر لائٹ آف کردی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے من میں عجیب سی بے چینی اور اضطرابیت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ تبھی اس کی نگاہ یکدم بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر پڑی اور اگلا منظر دیکھا اس کا اوپر سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے اٹک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے صوفے پر دیپک اور چاندنی براجمان تھے۔ دونوں خون میں بالکل ویسے ہی لت پت تھے جیسی

حالت میں انہیں گڑھے میں دبایا گیا تھا۔

دوسرے دن صبح بار بار کھٹکانے پر بھی جب وجاہت خان نے دروازہ نہ کھولا تو اس کا دروازہ توڑا گیا لیکن اگلا منظر دیکھ کر سب کی حیرت ہویدا رہ گئی۔ وجاہت خان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس کا وجود ٹھنڈا پڑ چکا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا خوف دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خوف کی شدت کے باعث کی اس کی موت ہوئی ہو۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وجاہت خان کی موت کی وجہ کیا ہے؟ بس جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہی کہا اور انہی الفاظ کے ساتھ اسے بھی منوں مٹی تلے دبا دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

سب کی نگاہیں اس مہ جبیں پر مرکوز تھیں۔ ساری روداد سنانے کے بعد وہ چپ کر گئی۔

"تم دونوں نے اپنا وجاہت خان سے انتقام لے لیا تھا۔" سلمان شاہ بولا۔ "تو اب ان بے قصور لوگوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہوئی ہو۔"

"کوئی بھی بے قصور نہیں ہے۔" دوشیزہ ہٹ دھری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیا میرے والدین بے قصور نہیں ہیں۔ جو جیتے جی مر چکے ہیں۔ دیپک کے والدین کا بھی یہی حال ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ وجاہت خان کی پوری نسل کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔"

"اب تم ایسا نہیں کر سکتے۔" سلمان شاہ نے ہانڈی کے اندر ڈوبی ہوئی چھڑی کو اٹھایا اور اس پر لگے پانی کو اس دوشیزہ پر چھڑک دیا۔

دوشیزہ کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔ پھر وہ یوں غرائی جیسے کوئی درندہ غرا رہا ہو۔ تبھی راہداری میں سب نے ایک لڑکے کو آتا دیکھا۔ وہ لڑکا بھی سیدھا آ کر دوشیزہ کے ساتھ براجمان ہو گیا۔

"میں آخری بار تم دونوں کو متنبہ کر رہا ہوں لیکن اگر اب کی بار تم لوگوں نے میری بات نہ مانی تو میں تمہارا برا حال کر کے رکھ دوں گا۔" سلمان شاہ نے دوبارہ چھڑی کو ہانڈی میں ڈبوتے ہوئے کہا۔

"تم ہمیں انتقام لینے سے نہیں روک سکتے۔" اب کی بار دیپک نے گرجتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے سلمان شاہ نے پلک جھپکنے میں چھڑی کو ہانڈی سے باہر نکال کر زمین پر مارا تو یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر اس نے ہانڈی کا پانی ان دونوں پر پھینک دیا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اتنا بڑا دھوکہ" دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

دوسرے ہی لمحے دونوں کے جسم دھوئیں میں تحلیل ہو گئے اور پھر سب نے اس دھوئیں کو آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھا۔

سلمان شاہ نے سب کو دائرے سے باہر نکل آنے کا حکم دیا اور پھر اگربتیاں بجھا دیں۔ سب فوراً سے بھی پیشتر دائروں سے باہر نکل آئے۔

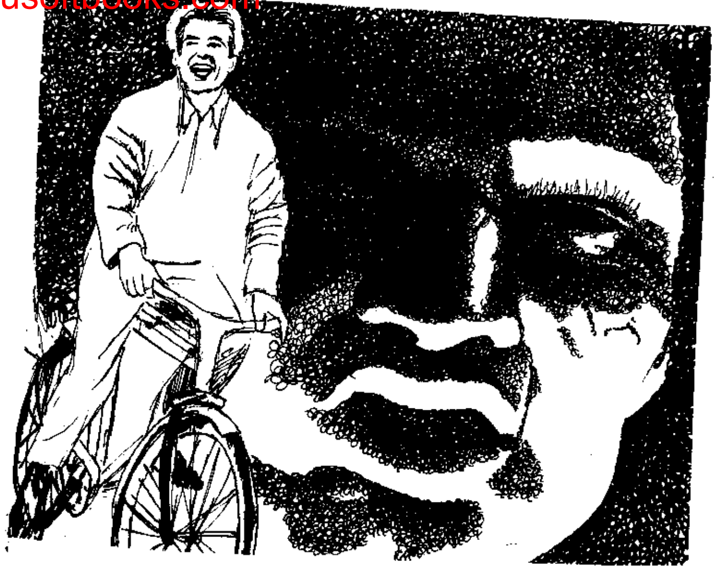
"تمہیں مبارک ہو ہیبت خان کہ بلا تمہارے سر سے ٹل گئی ہے۔" سلمان شاہ نے ہیبت خان کو مبارک دیتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔" ہیبت خان بولا۔

"نہیں اس رب کا شکر ادا کرو۔" سلمان شاہ بولا۔ "اللہ تعالیٰ عزوجل ہر انسان کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور بناتا ہے۔ اب کبھی بھی اس گھر کے اندر کوئی ایسا واقعہ نہ ہونے دینا۔ اللہ کے کلام کی تلاوت جس قدر زیادہ ہو اس گھر کے اندر ہو گی۔ شیطانی طاقتیں اس تیزی سے اس گھر سے دور بھاگیں گی۔"

"ان شاء اللہ" ہیبت خان نے جواب دیا۔

ہیبت خان دونوں بچوں، منشی اور سلمان شاہ کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندر داخل ہو گیا اور سب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ نماز فجر کا ٹائم ہونے والا تھا۔ سلمان شاہ نے انہیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور سب ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔



خونی بنگلہ

ساحل ابڑو۔بلوچستان

کمرے کے تمام دروازے اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں، مگر جب دروازہ توڑا گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے، پھر کمرے میں پنکھے سے دو وجود لٹکے پڑے تھے وہ مرچکے تھے مگر انہیں پھانسی دینے والا کون تھا۔

ہوس پرستی کی ایک لرزہ خیز داستان حیرت، پڑھنے والے انگشت بدنداں رہ جائیں گے

یہ اس دور کا ذکر ہے جب پرائمری کلاسوں کے نصاب میں انگریزی راج کی برکتوں کو گنوانے کا خاص اہتمام اس نظریے کے تحت کیا جاتا تھا کہ قوم کی نرم ونازک کونپلوں کی آبیاری شروع سے ہی ایسے انداز سے کی جائے کہ ان کے ذہنوں پر انگریز کے بلند کردار عدل اور احسان کے گہرے نقوش ثبت ہوجائیں اور وہ انگریزی راج کو دوام بخشنے میں ممد ومعاون ثابت ہوں۔

کوئٹہ چھاؤنی میں فری مسن لاج (Free Masons Lodge) جسے عرف عام میں "جادو گھر" کہا جاتا تھا (اب اس جگہ کوئٹہ ٹیلی ویژن کی عمارت اور اسٹوڈیوز ایستادہ ہیں) کے قریب میں ایک بنگلہ تھا، جس میں ایک انگریز فوجی افسر کیپٹن ایڈمنڈ معہ اپنی میم رہائش پذیر تھا۔ ایک روز مسز ایڈمنڈ نے کوئٹہ کے انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس جاکر رپورٹ کی کہ "اس کے خاوند کو گزشتہ

شب کسی نے سوتے میں قتل کر دیا ہے۔"

اس زمانے میں کسی انگریز سے اہانت آمیز لہجے میں بات تک کرنا قابل تعزیر جرم قرار دیا جاتا اور قانون کی متعدد دفعات متحرک ہو جاتیں، کوئٹہ میں تہلکہ مچ گیا۔ ایس پی صاحب نے خصوصی احکامات مجرم کی فوری گرفتاری کے لئے جاری کئے اور چھاؤنی پولیس پوری شدومد سے حرکت میں آ گئی۔ انسپکٹر دلدار سنگھ (جو بعد میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہوئے) کی زیر نگرانی تفتیش شروع ہوئی۔ ابتدائی رپورٹ جو مسز ایڈمنڈ کی طرف سے لکھی گئی تھی جس کا لب لباب یہ تھا۔

"وقوعہ کی شب کھانے کے بعد میں اور میرا خاوند کافی دیر تک بنگلہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اور تقریباً بارہ بجے ہم اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ اپنے خاوند کی چیخ کی آواز سے کھلی۔ میں گھبرا کر اٹھی اور ٹارچ لے کر ملحقہ کمرے میں درمیانی دروازے سے داخل ہوئی۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نے اپنے خاوند کو بستر پر خون میں لت پت پایا۔ میں دوڑ کر قریب گئی وہ مر چکے تھے۔ میری چیخوں سے ملازمین اپنے کوارٹروں سے بھاگتے ہوئے آئے۔ میرے خاوند کو نہ جانے کس نے قتل کیا ہے، میرا کسی پر شک نہیں۔"

ابتدا میں پولیس نے کافی سرگرمی دکھائی اور ملاحظہ موقع کے بعد پوچھ گچھ کا سلسلہ بنگلہ کے ملازمین سے شروع کیا اور پھر ان کے بیانات کی روشنی میں ایک اور انگریز کیپٹن اسمتھ کو شامل تفتیش کرنا چاہا تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور دلدار سنگھ انسپکٹر کی بے عزتی کر ڈالی۔ انگریز ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ وہ انسپکٹر سے حالات مقدمہ معلوم کر کے اور تفتیش کا رخ بھانپ کر کیپٹن اسمتھ اور مسز ایڈمنڈ سے جا ملا اور پولیس کی سرگرمی یکدم سرد پڑ گئی۔

کئی دنوں تک کوئی گرفتاری عمل میں نہ آ سکی اور تمام کارروائی صیغہ راز میں رکھی جانے لگی۔

ایک دن اچانک بنگلہ پر جز وقتی مالی کا کام کرنے والے اور سوات کے مکین انار گل کو پولیس نے شامل تفتیش کر لیا اور اس سے کافی دنوں تک پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ ایک روز باقاعدہ گرفتاری عمل میں آئی۔ ریمانڈ ختم ہونے پر زیر دفعہ 142 ضابطہ فوجداری اس کا اقبالی بیان قلمبند کرانے کے لئے اسے علاقہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا گیا۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر بیان قلمبند نہ ہوا اور ملزم واپس پولیس کی تحویل میں آ گیا۔ جس کا پھر جسمانی ریمانڈ لے لیا گیا۔ ریمانڈ ختم ہونے پر پولیس نے ملزم کو کوئٹہ شہر کے سٹی مجسٹریٹ دیوان ہوت چند کی عدالت میں پیش کر کے اس کا اقبالی بیان قلمبند کرا لیا۔

اپنے بیان میں ملزم نے بتایا کہ "وہ کیپٹن ایڈمنڈ کے بنگلہ پر جز وقتی مالی کا کام کرتا ہے۔ لیکن کیپٹن مذکور اسے ہر وقت سخت سست کہا کرتا تھا۔ ایک دن کیپٹن ایڈمنڈ نے اسے پھولوں کو پانی نہ دینے پر انگریزی میں گالی دی تو وہ مشتعل ہو گیا۔ اور اسی رات اس نے صاحب کو قتل کرنے کی ٹھان لی۔ دن کے وقت کام کے دوران اس نے آنکھ بچا کر صاحب کے کمرے کی کھڑکی کی اندرونی چٹخنی کھلی رکھی۔ لیکن کوارٹر بند رہنے دیئے تاکہ کسی کو کھڑکی کے کھلا ہونے کا شک نہ پڑے۔

رات گئے وہ بنگلہ پر آیا اور باغیچہ میں چھپ کر انتظار کرتا رہا، حتیٰ کہ صاحب کے کمرے کی بتی گل ہو گئی، تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد جب اس نے اندازہ لگایا کہ صاحب سو گیا ہوگا تو وہ دبے پاؤں اپنی کمین گاہ سے نکلا اور کھڑکی کے راستے اندر جا کر صاحب کا کام تمام کر ڈالا اور اسی راستے سے واپس نکل کر اپنے گھر پہنچ گیا۔

ملزم کے اس اقبالی بیان کے چند پہلوؤں کی تائید میں پولیس نے کچھ شہادتیں بھی اکٹھا کر لیں اور کیس کی تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ مقدمہ چلا، ملزم نے عدالت میں بھی اقرار جرم نہایت اطمینان سے کر لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ سیشن جج نے اسے پھانسی کی سزا سنا دی۔ سزا کا سننا تھا کہ انار گل پکار اٹھا کہ "نہیں نہیں مجھ سے دھوکا کیا گیا ہے۔ میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ مجھے تو پولیس نے اقبالی بیان دینے پر مجبور کیا تھا اس وعدے کے ساتھ کہ مجھے کسی صورت سزا نہیں ہونے دی جائے گی۔ میں بے گناہ ہوں۔"

انسپکٹر دلدار سنگھ جو کہ وہاں موجود تھا، انار گل نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "سردار صاحب مجھے تو پھانسی کی سزا

ہوگئی۔ اور آپ اور آپ کی پولیس والے کہتے تھے کہ سزا ہرگز نہیں ہونے دی جائے گی۔"

تیر کمان سے نکل چکا تھا اور کیس کا فیصلہ سنایا جاچکا تھا۔ اس مرحلہ پر اس کی چیخ و پکار کچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ ایک غریب سادہ لوح شخص تھا اور اپیل کرنے کی صورت میں مزید چارہ جوئی کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ پھانسی پاگیا۔

چونکہ یہ کیس بھی عوام میں ان دنوں موضوع بحث بنا تھا اور ہر طبقے کے لوگوں نے اپنے طور پر اس ظلم کی مذمت بھی کی تھی۔ لیکن انگریزی راج ایسا تھا کہ عوامی سطح پر صدائے احتجاج بلند نہ کی جاسکتی تھی۔

میں نے اپنے طور پر اس کیس کو بعد میں کریدا تو حقائق جو میرے سامنے آئے تھے کہ مسز ایڈمنڈ ایک عیاش انگریز عورت تھی اور اس کا معاشقہ کیپٹن اسمتھ سے عرصے سے چل رہا تھا۔ جب کیپٹن ایڈمنڈ کو اس سلسلہ میں شک گزرا۔ تو اس کے تعلقات اسمتھ سے کشیدہ ہوگئے اور اس نے اپنی بیوی کو اس کے میل جول رکھنے سے سختی سے منع کردیا۔ لیکن میم صاحب باز نہ آئی اور وہ ایسی عورت نہ تھی اس لئے اس کا اپنے خاوند سے آئے دن جھگڑا رہتا تھا۔ بنگلہ کے ملازمین یعنی بیرا خانساماں وغیرہ جو کہ گھر کے بھیدی تھے، کے مطابق کیپٹن ایڈمنڈ کی غیر موجودگی میں کیپٹن اسمتھ اکثر آکر میم صاحب کے ساتھ گھنٹوں وقت گزارتا تھا۔ وقوعہ کے روز ایڈمنڈ گھر پر یہ کہہ کر سر شام ہی باہر چلا گیا تھا کہ "وہ کھانا باہر کھائے گا اور نصف شب کے بعد ہی گھر واپس لوٹے گا۔"

اس پر میم صاحب نے اسمتھ کو میدان صاف ہونے کی خبر کردی تھی۔ اسمتھ آگیا۔ کھانا بھی اس نے وہاں کھایا۔ ابھی وہ میم صاحب کے کمرے میں موجود تھا کہ ملازم فارغ ہوکر اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے۔ رات کے آخری حصہ میں میم صاحب کی چیخ و پکار پر ان کی نیند کھلی اور دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے صاحب کو خون میں لت پت مردہ حالت میں اپنے بستر پر پڑا پایا۔

ملازمین حیران تھے کہ صاحب کے کمرے میں کوئی کیسے داخل ہوکر اسے قتل کرگیا۔ جبکہ اس کے کمرے کا برآمدہ میں کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے قتل کرنے کے لئے تو کوئی میم صاحب کے کمرے سے ہی درمیانی دروازے کے ذریعے داخل ہوسکتا تھا۔ ورنہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اور جب صبح پولیس بنگلے پر پہنچی تھی اور اس نے ملاحظہ موقع واردات کیا تھا۔ تو میم صاحب کے کمرے سے انہیں ایک ٹوپی ملی تھی۔ جسے تمام ملازمین نے شناخت کیا کہ وہ کیپٹن اسمتھ کی تھی۔

ملازمین کے بیانات سے پولیس نے کیپٹن اسمتھ کے قتل میں ملوث ہونے کا واضح اشارہ پاکر پوچھ گچھ کے لئے جب اس سے رجوع کیا تو وہ بگڑ گیا۔ اور انگریز ہونے کے بل بوتے پر پولیس کو دھمکیاں دیں۔ انگریز ایس پی تک معاملہ پہنچا تو اس نے خود مداخلت کرتے ہوئے سارے حالات معلوم کیے۔ اور جو شہادتیں پولیس اخذ کرچکی تھی۔ جن کی بنا پر کیپٹن اسمتھ سے پوچھ گچھ ضروری سمجھی گئی تھی ان کا جائزہ لیا۔ اسے سفید چمڑی یعنی حکمران قوم کے وقار کو ٹھیس لگی تو اس نے مسز ایڈمنڈ اور کیپٹن اسمتھ سے رابطہ قائم کرکے نہ معلوم کیا ہدایات تفتیشی پولیس کو دیں اور اس کا جوش و خروش ماند پڑ گیا اور اس سادہ سے بے گناہ سواتی مالی کو قربانی کا بکرا بناڈالنے کا فیصلہ ہوا۔ جو کبھی ایسی گھناؤنی واردات کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

ابتدائی رپورٹ جس کی کسی کیس میں بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں تحریف کی گئی اور مسز ایڈمنڈ کی طرف سے اس میں یہ کہا گیا کہ اسے اپنے بنگلہ کے مالی پر شک ہے اور پھر تشدد کا نشانہ بنا کر جھوٹے وعدے کرکے اور لالچ کا جھانسہ دے کر اس سے ناکردہ جرم کا اقبال کرانا ایس پی کا منشا تھا۔ جس کی تکمیل سے گریز میرے سکھ ہمسر کے لئے اس زمانے میں ممکن نہ تھا۔

مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ انارگل کے پسماندگان کو پولیس نے فنڈ سے ایک خطیر رقم دینے کا لالچ بھی دیا تھا۔ اور ایس پی صاحب کے روبرو پیش کرکے بھی یقین دلایا گیا وہ اقبال جرم کرے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ صرف عدالتی کارروائی کے لئے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔ بھلا

کس کی ہمت ہے جو انگریز ایس پی کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ عدالت اسے بری کردے گی۔

یہ اور اس طرح کے دیگر لالچ دینے کے ساتھ ساتھ اس غریب کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ جب اسے خلاصی کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو اس نے پولیس کے "پکے" وعدوں پر ایمان لاتے ہوئے اقبالی بیان دینے کی حامی بھرلی اور پولیس کے تیارہ کردہ بیان کو اچھی طرح رٹ لیا۔

لیکن جب پہلی بار اسے علاقہ مجسٹریٹ کے روبرو اقبالی بیان قلمبند کرنے کے لئے درخواست کے ساتھ پیش کیا گیا تو مجسٹریٹ نے بیان قلمبند کرنے سے قبل انارگل کو علیحدگی میں ضابطہ کی منشا کے مطابق سمجھایا اگر وہ اس قسم کا اقبالی بیان دے گا تو اس کے خلاف استعمال ہو کر اس کی سزا کے طور پر پھانسی بھی ہوسکتی تھی۔ اس پر اس کا حوصلہ متزلزل ہوگیا تو مجسٹریٹ نے پولیس کو بلا کر کہہ دیا کہ ملزم اقبالی بیان دینے سے انکاری ہے۔ اس لئے اس کی درخواست پر اس قسم کا حکم صادر کررہا ہے۔

پولیس مجسٹریٹ پریشان ہوگیا اور مجسٹریٹ کو ایس پی نے حکم دیا کہ وہ پولیس کی درخواست برائے قلمبندی بیان رکوائی کا حکم صادر نہ کرے اور بس یونہی کاغذات انہیں واپس کردے کیونکہ اگر مجسٹریٹ پولیس کی درخواست پر یہ لکھ دیتا کہ ملزم پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اور وہ اقبالی بیان دینے سے انکاری ہے تو ضابطہ فوجداری کی رو سے اس پر یہ لازم ہوتا تھا کہ ملزم کو واپس پولیس کی تحویل میں نہ دے اور اسے جوڈیشنل لاک اپ یعنی پولیس کی دسترس سے دور جیل میں بھجوادیتا تاکہ پولیس اس پر انتقامی کارروائی نہ کرسکے۔

مجسٹریٹ نے پولیس کی بات تعاون کے طور پر مان لی تھی اور کاغذات انہیں یونہی واپس کردیئے گئے۔ اس طرح پولیس کو موقع مل گیا اور اس نے ملزم کا مزید جسمانی ریمانڈ حاصل کرکے اسے ایسا سبق سکھایا کہ وہ دوسری بار اقبالی بیان دینے سے گریزاں نہ ہوا۔

یہ صریحاً ظلم تھا لیکن یہ زیادتی ایک بااختیار انگریز کے اشارے پر کی جارہی تھی۔ اور وہ غلامی کا دور تھا۔ کس کی مجال تھی کہ انگریز کے ناجائز حکم کے سامنے دم مار سکے۔ ایک بے چارے مالی کی تو بات کی کیا وہاں تو آئے روز نہ جانے کتنے مظلوم انگریز "خودساختہ انصاف" کی بھینٹ چڑھتے رہتے تھے۔ ویسے جس روز انارگل کو پھانسی لگی، اس کے ٹھیک ساتویں دن ایک ناقابل فراموش اور ناقابل یقین دل شکستہ، جسم و جاں پر لرزہ طاری کرتا خونی واقعہ رونما ہوا۔

صبح کے ایک مقررہ وقت پر مسز ایڈمنڈ بیڈ ٹی پیا کرتی تھی اور ایک خاص وقت پر دروازہ کھل جاتا تھا اور ملازم بیڈ ٹی رکھ کر چلا جاتا۔ اس روز وقت مقررہ پر مسز ایڈمنڈ نے دروازہ نہ کھولا تو ملازم اچنبھے میں پڑ گئے۔

گھنٹہ دو گھنٹہ اور اس طرح تین گھنٹے گزر گئے تو ملازموں کو تشویش ہوئی اور انہوں نے یہ خبر اوپر پہنچادی۔ کئی انگریز اور پولیس والے دوڑے چلے آئے، وہ سب بھی خیر خیریت کی دعائیں مانگنے لگے۔ دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ مگر بے سود، دروازہ نہ کھلنا تھا اور نہ کھلا۔ خیر دروازے کا شیشہ توڑ کر کنڈی کھولی گئی۔

مگر اچانک سب کی نظریں پتھرا گئیں۔ رگوں میں دوڑتا لہو منجمد ہونے لگا۔ پورے وجود پر سکتہ طاری ہوگیا، سب پر لرزہ طاری ہوگیا۔ سب کے سب سہمے ہوئے تھے کیونکہ کمرے میں مسز ایڈمنڈ کے ساتھ اسمتھ کا وجود پنکھے سے لٹکا ہوا جھول رہا تھا۔ دونوں کے گلے میں پھانسی کا پھندا تھا۔ دروازہ اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں، اس طرح کسی انسان کا کمرے میں جانا ممکن ہی نہ تھا۔ وہاں پر موجود سب کے سب انگشت بدنداں تھے کہ ایسا ہوا تو کیسے ہوا۔ دونوں بیک وقت گلے میں رسی ڈال کر کیسے لٹک گئے۔

یہ تو پتہ چل گیا کہ رات کے اندھیرے میں اسمتھ مسز ایڈمنڈ سے ملنے آیا ہوگا۔ دونوں کے جسم پر کسی قسم کا تشدد نہیں تھا۔ خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔

علاقے کے لوگوں کی زبان پر یہ بات تھی کہ "انارگل نے اپنی موت کا بدلہ لے لیا۔"



تجربہ

ایس امتیاز احمد-کراچی

ایک موٹی اور کافی فربہ عورت بستر پر لیٹی تو اس کے جسم نے پسینہ اگلنا شروع کردیا اور پھر اچنبھا ہوا کہ عورت کا جسم گھٹنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ عورت مکھی سے مشابہ ہوگئی تو......

ایک عجیب وغریب ایجاد جس نے ڈاکٹر کو ہلا کر رکھ دیا تھا دل دہلاتی ڈراؤنی کہانی

دراصل یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے۔ اور جتنی پرانی ہے اتنی ہی حیرت انگیز اور تحیر خیز مگر یہ ایک ایسی کہانی ہے جس پر شاید آپ کو یقین ہی نہ آئے۔ پھر بھی مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی جھجک اس لئے نہیں ہے کہ یہ کچھ میری اپنی لکھی ہوئی کہانی نہیں ہے نہ میرے دماغ کی اختراع ہے۔ بلکہ دوسروں کی زندگی کی عجیب وغریب اور سچی داستان ہے۔

بوڑھے ڈاکٹر گار کو کون نہیں جانتا......؟ وہ شب طعامی کی محفلوں کو روشن چراغ اور علم وثقافت کے گل ستانوں کا گل شگفتہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب بھی اس قسم کی محفلوں اور ہنگاموں میں کسی اتفاق سے بیگم گار کا نام آجاتا ہے یا کوئی غلطی سے ڈاکٹر گار سے اس کی بیگم کے متعلق کچھ پوچھ بیٹھتا ہے تو ڈاکٹر گار کا چہرہ فق ہوجاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں ایسی خوف ناک

حسرت برسنے لگتی ہے جسے دیکھ کر سوال کرنے والا ایک دفعہ ضرور چونک پڑتا ہے۔

کئی لوگوں کا خیال تھا کہ بوڑھا ڈاکٹر گار رنڈوا ہے اور کئی خواتین اسے بوڑھا کنوارا سمجھتی تھیں۔ مگر جو حیرت انگیز اور دردناک حقیقت ہے اسے شاید دنیا میں دو چار ہی دوست جانتے ہیں بالکل اتفاق سے اس خوفناک راز سے میں واقف ہوں۔ اس وقت آپ مجھ سے کسی رنگین فسانے کی امید نہ رکھئے۔ یہ ایک خشک حقیقت ہے مگر نہایت تعجب خیز اور بے حد خوفناک۔

جس زمانے میں یہ کہانی زندگی کا ایک واقعہ بنی تھی اس وقت میں ڈاکٹر گار کے ساتھ موجود تھی۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر گار میرا خاندانی طبیب تھا۔ اس کے علاوہ بچپن میں میری دیکھ بھال بھی کرتا رہا تھا۔ اس لئے میں اس کی زندگی کے کئی حوادث سے باخبر تھی۔

اصل کہانی کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

موسم خزاں میں، میں ایک طویل نروس بریک ڈاؤن سے اچھی ہوئی تھی۔ مگر جذباتی انتشار کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ مجبوری یہ تھی کہ اب ڈاکٹر گار زیادہ دن میری دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے آنے والی طبی کانفرنس کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ تیار کرنا تھا! اس کے اس مقالے کے لئے اطباء چشم براہ تھے اور اخباروں میں بڑی دھوم مچی ہوئی تھی کہ اس دفعہ ڈاکٹر گار اپنی ایک عجیب و غریب طبی تحقیق دنیا کے آگے پیش کرے گا۔ جس کی بنیاد آج سے شاید تین ہزار سال پہلے رکھی جا چکی ہے۔ یہ باتیں میری سمجھ میں نہ آتی تھیں البتہ میں اتنا جانتی تھی کہ بوڑھے ڈاکٹر گار کو جڑی بوٹیوں کی جانچ پڑتال اور پرانی ادویات کی تحقیق کا پرانا جنون ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر ''انترویدی'' کے سنسان ساحل پر اپنی تجربہ گاہ میں جا گھسا تھا۔

اس کے جانے کے بعد مجھ پر ذہنی انتشار کے ہلکے ہلکے دورے پڑنے لگے۔ جس کی میں نے شکایت لکھ بھیجی۔ ایک دوپہر مجھے اپنے خط کا جواب ڈاکٹر گار کی طرف سے ملا جس کی عبارت مجھے لفظ بہ لفظ اس لئے یاد ہے کہ وہ میری دراز میں اب تک پڑا ہوا ہے لکھا تھا۔

''روزی پیاری۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اعصاب کے لئے بہترین دوا برمائڈ کی گولیاں نہیں بلکہ مسلسل مصروفیت ہے چنانچہ بجائے اس کے میں تمہارے پاس آؤں۔ تم میرے پاس کچھ عرصہ کے لئے انترویدی کے ساحل پر چلی آؤ۔ میں اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں اس سلسلے میں یہیں تمہارے لئے فرصت نکالوں گا۔'' میری بیوی تمہیں پیار کہتی ہے۔

چشم براہ

''گار''

چنانچہ میں 3 ستمبر کی ایک گہرے زرد رنگ کی اداس شام چھ گھنٹوں کا سمندری سفر طے کر کے انترویدی کے سنسان ساحل پر جا اتری چونکہ میں بے اطلاع پہنچی تھی اس لئے بندرگاہ پر مجھے لینے کوئی نہ آیا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر گار سے آج کل اس کی امید نہ تھی۔ کیوں کہ سنا تھا وہ چوبیس گھنٹے اپنے تجربہ گاہ میں بند رہتا ہے۔

ایک پرانی وضع کی کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر میں اس کے گھر پہنچی۔ سارے دروازے اور دریچے بند تھے۔ اطلاعی گھنٹی کاٹ دی گئی تھی۔ مختصر سے باغیچے میں کیلے کے درخت اپنی گہری سبز چھاؤں پھیلائے گم سم کھڑے تھے۔ سمندر کی موجیں ساحل سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی آمد کی اطلاع اندر کیسے اور کیوں کر پہنچاؤں۔ خوف اور مایوسی نے میری ذہنیت پر قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دستی بٹوے میں سے نمکین کی شیشی نکال کر سکون اعصاب کے لئے سونگھی اور ڈاکٹر گار کو دل ہی دل میں گالیاں دینے لگی کہ اچانک باورچی خانے کا دروازہ باغ میں کھلا۔ میں جھٹ اوپر بھاگی وہاں ڈاکٹر گار کی بیوی کا ہیدہ ایک پہاڑ کی طرح کھڑی ہوئی ملیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گلے لگا کر محبت سے اس زور سے بھینچا کہ میرا دل گھٹتے

گھٹتے رہ گیا۔

میں ایک گڑیاں کی طرح ان کے پہلو میں کھڑی تھی۔ حیران و ششدر کیوں کہ چھ مہینوں کے اندر اندر بیگم گار پھول کر کیا ہوگئی تھیں ان کے موٹاپے سے میں ہمیشہ سے نالاں تھی۔ مگر اس دفعہ تو ان کا دائرہ لامحدود ہو چکا تھا۔ یاالٰہی یہ عورت ہے یا پہاڑ! میں نے دل میں کہا پھر ہنسی ضبط کر کے بولی۔ ''تسلیم پھوپھی کاہیدہ آپ کیسی ہیں......؟'' اتنا کہہ کر میں نے ان کے سراپا کو دیکھا پھر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ مگر توبہ توبہ آپ تو اور بھی پھر میں مصلحتاً چپ ہوگئی۔

وہ ایک ہتھنی کی طرح جھومتی ہوئی باورچی خانے کو چلیں۔ جاتے ہوئے شگفتگی سے بولیں۔ ''آؤ آؤ بیٹی روزی معاف کرنا میرے پڑے ڈھنگ کے نہیں باورچی خانے میں آجاؤ۔ تھکی ہوئی ہوگی چائے پیوگی کہ کافی؟''

میں انہیں دیکھ کر بمشکل ہنسی روک رہی تھی۔ بولی ''جو تیار ہو وہ پی لوں گی۔ جہاز سے ناریل کا میٹھا پانی پی کر آرہی ہوں مگر آپ باورچی خانہ میں کیا کررہی ہیں؟ ملازم کہاں ہیں؟ نہ باہر مالی ہے نہ چوکی دار نہ کوئی اور نوکر......!''

یہ سن کر بیگم گار کے چہرے پر شکوہ شکایت کا ایک طوفان چلنے لگا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''روزی اب ڈاکٹر کا جنون اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ انہوں نے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی ہے کہتے ہیں کہ اس دفعہ کی طبیہ کانفرنس میں کوئی معرکتہ الآرا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دن رات تجربہ گاہ میں بیٹھے پرانی دواؤں کی تاثیرات کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ذرا بھی شور یا ہنگامہ ہوا تو دواؤں کی مقدار اور تسلسل میں فرق پڑ جائے گا۔

''میں حیران ہو کر بولی۔'' تو کیا گھر کا تمام کام ان دنوں آپ خود کرتی ہیں۔''

وہ رونے کے قریب ہو کر بولیں۔ ''تو پھر اور کیا کروں؟ کھانا پکانا بستر لگانا، گھر صاف کرنا۔ سارے فرائض میرے ذمے ہیں۔ ہم مشرقی عورتیں بھلا اس قسم کے کاموں کی کب عادی ہوتی ہیں؟ ہمیں تو قدم قدم پر ملازموں کا سہارا لینے کی عادت صدیوں سے پڑتی آئی ہے۔ اور بھلا ذرا سوچو یہ بیگمات کے کرنے کے کام ہیں۔''

میں ہنسی روک کر بولی۔ ''شاید ڈاکٹر گار کو امید ہوگی کام دھام کی مصروفیت سے آپ کا بدن ہلکا ہوجائے گا۔''

وہ ہانپتے ہوئے بولیں۔ ''ارے نہیں بیٹی۔ ہر سانس کے ساتھ میں ایک انچ بڑھتی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کو اپنی طبی علمیت اور اپنی قدیم دواؤں کی تاثیرات پر فخر تو بے حد ہے مگر میری فربہی کا ذرا بھی غم نہیں۔''

میں متاثر نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''شاید ان کے پاس اس کا کوئی علاج ہی نہیں۔''

بیگم گار کو غصہ آ گیا۔ ''ان کے پاس ایسی ایسی عجیب و غریب دوائیں ہیں کہ اگر انسان کھائے تو کبوتر بن جائے اور اگر کبوتر کھائے تو انسان بن جائے۔''

کیا واقعی میں انگشت بدنداں رہ گئی۔

بیگم گار بولیں ہش! آہستہ! کوئی سن نہ لے۔ اسی لئے تو نوکروں کو برخاست کردیا ہے عجیب و غریب دوائیں ہاتھ لگی ہیں بیٹی کیا بتاؤں تم سن کر دنگ رہ جاؤ گی۔ یہ تو میں نے یوں ہی تم سے کہہ دیا۔

میرا اشتیاق بڑھتا ہی چلا گیا میں نے ضد کر کے کہا۔ ''پھوپھی کاہیدہ میں چائے سے پہلے ڈاکٹر گار سے ملوں گی۔ بعد میں ناشتہ کریں گے۔ ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہوا۔''

''ڈاکٹر اپنے کمرے میں بند ہے روزی۔ چاہتی ہو تو باغ کی راہ جا کر تجربہ گاہ کی تیسری کھڑکی کھٹکھٹاؤ۔'' میں دبے پاؤں کیلے کے درختوں میں سے گزر کر باغ میں تیسری کھڑکی کے نیچے چلی گئی اور اسے کھٹکھٹانے لگی۔ جب اندر سے کسی نے رسید نہ دی تو کنجی کے سوراخ میں سے ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے جھانک کر دیکھا تو مجھے شبہ ہوا۔ ڈاکٹر گار کو خلل دماغ ہوگیا ہے وہ مرتبانوں اور صراحیوں کے بیچوں بیچ کھڑا

کوئی رقیق سی چیز امتحانی نلکی میں سے بار بار گزار کر خوردبین سے دیکھ رہا اور مسکرائے جارہا تھا کبھی کبھی ہلکے سے ہنس پڑتا تھا۔

آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ گریبان کھلا ہوا تھا محنت اور فاقوں کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ اور بالکل دیوانہ لگ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کھڑکی کھٹکھٹائی، اتفاق سے اس نے سن لیا۔ دو ایک دفعہ نظر اٹھا کر دیکھا پھر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے کھلتے ہی دواؤں کی تیز مہک نے میرا سر چکرا دیا۔

"کون؟ ارے کون؟" ڈاکٹر گار نے آہستہ لہجے میں پوچھا۔

"تسلیم ڈاکٹر۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے مجھے اندر کرکے دروازہ بھیڑ کر کہا۔ "زندگی اور موت کا معاملہ ہے روزی۔ تم کو قطر ٹپکانے کی مشق ہے۔ یا نہیں اچھا خیر رہنے دو۔ یہ کام میں خود کرلوں گا۔ تم اتنا تو کر سکتی ہو کہ جو مسودہ اس کھڑکی میں پڑا ہے اس کی لفظ بہ لفظ نقل کردو۔ عین وقت پر پہنچیں۔ زندگی اور موت کا مسئلہ!"

میں وحشت زدہ ہوکر بولی۔ "وہ کیسے ڈاکٹر؟ زندگی اور موت کا معاملہ؟"

"اور کیا بیٹی۔" ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔ "اس دوا کی مقدار میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ رتی کا سواں حصہ بھی ایک آدمی کی جان لے سکتا ہے۔ لیکن یہی دوا انسان کے لئے اکسیر بھی ثابت ہوتی ہے بس صرف مقدار کی کمی بیشی پر سارا انحصار ہے۔"

مجھے شبہ ہوا ڈاکٹر دیوانہ ہوگیا ہے میں صراحیوں اور مرتبانوں سے بھری ہوئی میزوں کے درمیان بوکھلائی ہوئی کھڑی تھی۔ اور تیزاب کی بو سے سر پھٹا جارہا تھا میں نے ایک الماری کا سہارا لیا اور کمزور لہجے میں بولی۔

"بتاؤ بات کیا ہے؟"

ڈاکٹر گار سرگوشی میں بولا۔ "کبھی یہ دوا پرانے عبرانیوں کے استعمال میں آئی تھی۔ وہ اس کی صحیح مقدار کو جانتے تھے لیکن میں حیران ہوکر بولی اتنی پرانی دوا...... وہ خراب نہیں ہوگئی؟"

ڈاکٹر گار بولا۔ "بنی بنائی تھوڑا ہی ہاتھ آئی ہے؟ ایک پارہ سنگ سیاہ پر عبرانی زبان میں اس کا نسخہ اور اس کے نیچے باریک باریک تحریر میں اس کی تاثیر لکھی ہوئی دستیاب ہوئی۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

میں دہشت زدہ سی ہوکر پیچھے کو ہٹی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ "تو گویا کلید مراد مل گئی؟"

ڈاکٹر بولا۔ "ساری مصیبت اس کی مقدار کے متعلق ہے روزی ذرا سی کمی بیشی خوف ناک سے خوف ناک نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔"

"آخر یہ کس مرض کی اکسیر ہاتھ آئی ہے ڈاکٹر؟" میں مجسم اشتیاق بن کر پوچھنے لگی۔

"یہ تو اس وقت بتاؤں گا جب باقاعدہ اعلان کردوں گا۔ آئندہ ہفتے اسے میں آزمانے والا ہوں۔"

"کس پر؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"انسان پر میں نے انتظام کرلیا ہے۔ مقامی جیل خانہ سے ایک قاتل میری تجربہ گاہ میں جمعرات کی صبح بھجوایا جائے گا۔ اس مجرم پر میں اپنی دوا آزماؤں گا۔ اور یہ قاتل مجرم وہ مبارک و مقدس آدمی ہوگا جس نے تحلیلی کو اپنے پر آزمانے دیا...... اور......"

اتنا کہہ کر وہ چونک پڑا۔ اور یک لخت چپ ہوگیا جیسے کوئی غلط لفظ منہ سے نکل گیا ہو۔

میری نظر اچانک سامنے کی الماری پر رکھے ہوئے ایک مرتبان پر پڑی۔ جس پر سفید کاغذ کا لیبل لگا ہوا تھا۔ اس پر سرخ روشنائی سے باریک حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"تحلیلی"

اس وقت پائیں باغ میں کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی۔

ڈاکٹر گار بوکھلا گیا۔ دریچی سے باہر جھانک کر دیکھا بولا۔ "کون ہے باغ میں......؟"

میں بولی۔ "کوئی بھی تو نہیں...... شام کی

ہوائیں کیلے کے پتوں کو چھیڑ رہی ہیں۔ آپ اتنے گھبرا کیوں گئے؟"

ڈاکٹر گار بولا۔" کیا بتاؤں روزی، آپ کل ہر قدم پر احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ دیکھو نا دوائیں اکسیر بھی ہوتی ہیں۔ اور زہر قاتل بھی آج کل میں نہ کسی ملاقاتی کو آنے دیتا ہوں نہ ملازم کو رکھتا ہوں۔ بس گھر میں صرف کاہیدہ ہیں یا میں اور اب تم اچھا چلو تھوڑا سا ناشتہ کرلیں۔ آفتاب غروب ہونے والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تخلیلی کا مرتبان پیچھے کو سرکا دیا۔ اور مجھے باہر چلنے کو کہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ مجھے اپنی تجربہ گار سے جلد سے جلد باہر کرنا چاہتا ہے۔ ہم دونوں باہر نکل آئے اور میں نے باغ کی تازہ ہوا میں آ کر لمبی سانس لی اور شکر بجالائی کیونکہ دواؤں کی تیز بو نے مجھے حواس باختہ کردیا تھا۔ باہر باغ میں ستمبر کی ایک گہرے زرد رنگ کی شام پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکے زرد رنگ کا آسمان دمک رہا تھا۔ اور سبز لہلہاتے ابراہوؤں میں منتشر تھے کیلے کے طویل سبز پتوں میں ابابیلیں بیٹھی ہوئی نغمہ سرائی کررہی تھیں۔ کبھی کبھی دور سے کسی کنوئیں کی چرخی کی درد انگیز آواز شام کی اداسیوں میں اور اضافہ کردیتی تھی۔

کھانے کے کمرے میں بیگم گار کسی ہاتھی کی طرح میز کے پاس کھڑی ہمارا انتظار کررہی تھیں۔ میں نے سرسری نظر ڈالی تو دیکھا کہ کھانے کی میز پر درجن بھر طشتریوں میں بھاپ نکلتا ہوا گرم گرم خوشبودار کھانا رکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر گار نے اعتراض کیا۔" یہ ناشتہ ہے یا دعوتی کھانا؟" بیگم گار بولیں۔" دن بھر کی محنت کے بعد مرغن کھانا انسان میں توانائی پیدا کردیتا ہے۔ اور جلد جلد ورنہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔" یہ کہہ کر رکابی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اب میں بیگم گار کی غیر معمولی فربہی کا راز پہچان چکی تھی۔ وہ ایک ایک رکابی پر بے حد شوق سے جھپٹتی تھیں اور بے اندازہ کھانا اپنی پلیٹ میں انڈیل کر جلد جلد کھانے لگ جاتیں۔

تھوڑی دیر بعد کہنے لگیں صبح سے میں نے فاقہ کیا تھا کہ شاید اس سے میرا وزن کم ہوجائے پر اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔" اس پر تمہیں مجھ سے شکایت ہے کہ چراغ تلے اندھیرا۔"

" میں تمہیں دبلا ہونے کی دوا نہیں دیتا۔ جب تک مریض کی بسیار خوری کی عادت بند نہیں چھوٹتی مرض بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

بیگم گار قیمہ اور پیاز کا بھرتا اپنے منہ میں بھرتے ہوئے بولیں۔" اپنا موٹا پا دیکھ کر خوف سے کانپ جاتی ہوں کہ کسی دن کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ نہ پڑوں۔ خدا کے لئے میرا کوئی علاج تجویز کرو۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ وہ بے حد قابل رحم معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے اناس کا ایک سینڈوچ لیتے ہوئے کہا۔" بھوک بند کرنے کی کوئی تیز دوا دے کر آزمایئے ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر گار کالی کافی سوچتے ہوئے بولا۔" اس سے دو دن تو بھوک بند رہتی ہے اس کے بعد بے تحاشہ کھل جاتی ہے جس سے ان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔"

" عجیب بات ہے۔" میں نے حیران ہوکر کہا۔ تو پھر کسی قسم کا ہلکا ذہنی دھچکا لگنا چاہئے۔ تا کہ جذباتی انتشار سے بھوک بند ہو۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔" گزشتہ مہینے شدید دھچکا لگ چکا ہے کاہیدہ کا بھائی ذیابیطس سے اچانک انتقال کرگیا۔"

بیگم گار بولیں۔" لیکن اس حادثے سے میری بھوک اور کھل گئی۔ میں دن رات کھانے لگی...... اور میرا وزن بے چاری رو پڑیں۔"

میں بولی بعض وقت مریضوں میں ذہنی پریشانی شدید بھوک کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور مریض کھا کھا کر پھول جاتا ہے ڈاکٹر گار...... کانفرنس سے واپس آتے ہی آپ کو پھوپھی کاہیدہ کے مرض کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جانا چاہئے۔

بیگم گار بیک وقت دو کباب منہ میں داخل

www.urdusoftbooks.com

کرتے ہوئے بولیں۔

"اگر تم نے میری فکر نہ کی اور علاج نہ کیا تو یا تو میں خودکشی کرلوں گی یا اپنا علاج آپ کرلوں گی اب یہ پہاڑ جسم مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا۔"

ڈاکٹر گار نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں طبیہ کانفرنس سے واپس آتے ہی میں تمہارا علاج شروع کردوں گا۔"

آخر تیسرے دن دوپہر کے ہوائی جہاز سے ڈاکٹر گار طبیہ کانفرنس کے لئے روانہ ہوگیا۔ جانے سے پہلے اس کا چہرہ شادمانی و کامرانی سے دمک رہا تھا۔ اور وہ بڑے فخر سے اپنے مضمون پر آخری نظریں ڈال رہا تھا۔ جسے وہ کانفرنس میں پڑھنے والا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے اور بیگم گار کو مخاطب کر کے کہا۔ "چابی احتیاط سے رکھنا اور اندر نہ جانا جب تک کوئی شدید ضرورت پیش نہ آجائے۔ خدا حافظ۔" اور وہ مسکراتا ہوا غائب ہوگیا اس وقت تک ہم پر کوئی مصیبت نہ آئی تھی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں سکون اعصاب کے لئے ساحل پر ٹہلنے کے لئے نکل گئی اور دیر تک ساحل پر رنگین سپیاں چنتی اور اپنے خواب کے جزیروں میں گھومتی رہی۔

غروب آفتاب کے قریب میں گھر لوٹی۔ گھر پر سناٹا سا طاری تھا۔ میں نے باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا تو بیگم گار سامنے ایک بڑے طباق میں حلوا پکانے کا سامان لئے سر دونوں ہاتھوں میں تھامے کرسی پر یوں بیٹھی تھیں۔ جیسے کسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔ جیسے مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے بعد ایسے حیرت ناک واقعات پیش آئے جن کا جواب نہیں۔ میں خوف زدہ ہوکر دروازے میں داخل ہوئی۔ "کیا ہوا پھوپھی کا ہیدہ؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "سر درد سے پھٹا جا رہا ہے خیال تھا آج بادام کا حلوہ پکاؤں گی مگر ......اف خدایا کیا ہو رہا ہے۔"

بیگم گار کی پھٹی پھٹی نظریں اور سرخ چہرے کو دیکھ کر میں حواس باختہ ہوکر آگے کو بڑھی۔ اور ان کی پیشانی کو چھو کر بولی۔ "ہائے ہائے پیشانی لوہے کی طرح تپ رہی ہے۔ شدید درجہ کا بخار معلوم ہوتا ہے۔ آپ فوراً لیٹ جایئے۔"

انہوں نے سہارے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں بدحواس ہوگئی کیسے میں ان کا بوجھ سہار سکتی تھی۔ تاہم وقت کی نزاکت کو محسوس کرکے باول ناخواستہ میں ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اور وہ میرے سہارے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلنے لگیں۔ قدم قدم پر میری حیرت بڑھنے لگی کیوں کہ وہ مجھے اتنی بوجھل نہ لگیں جتنا کہ میرا خیال تھا۔ بلکہ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کارک کی بنی ہوئی ہوں۔ میں نے سوچا وہ اپنا سارا بوجھ اپنی ٹانگوں پر ڈال کر چل رہی ہیں۔

یہ سوچ کر میرا اطمینان ہوگیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے ان کا بستر درست کیا اور بمشکل انہیں لٹایا۔ وہ کراہ رہی تھیں اور کسی ناقابل بیان بے چینی کا شکار معلوم ہو رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد میری نظر ان کے تکیئے اور پھر بستر پر گئی میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو تکیہ اور بستر گیلا ہو رہا تھا میں نے ان کے سر پر برف بھی نہیں رکھی تھی پھر یہ پانی کہاں سے آیا......؟ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے پانی کے قطروں کے ٹپکنے کی آواز آئی۔ جھک کر دیکھا تو بستر کے نیچے پانی ٹپک رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا جلدی سے غسل خانے سے ایک گیلن لا کر بستر کے نیچے رکھ دیا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں بھاگی ہوئی ٹیلی فون کے پاس گئی وہ ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لے کر آگیا۔ میں اسے مرض کی نوعیت سمجھا نہ سکی۔ اس لئے مریضہ کے کمرے میں لے گئی۔

"ڈاکٹر نے کچھ دیر مریضہ کا معائنہ کیا۔ نبض دیکھی۔ آنکھیں دیکھیں، زبان دیکھی پھر متفکر لہجہ میں پوچھا۔ "یہ حالت کب سے ہے؟"

"ابھی چند گھنٹوں سے۔" بیگم گار نے بمشکل

کہا۔ ان کی آواز بے حد باریک ہوگئی تھی۔

"مگر ڈاکٹر صاحب! یہ پانی کہاں سے آرہا ہے؟ بستر گیلا ہے کئی دفعہ چادر بدل چکی ہوں۔ آسمان پر نہ بادل ہیں نہ گھٹا یہ پانی کہاں سے برسنے لگا؟"

ڈاکٹر نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ دو منٹ بعد بولا۔

"یہ پانی نہیں ہے مریضہ کے مساموں سے پسینہ بڑی شدت سے خارج ہورہا ہے۔"

میں متوحش ہوکر بولی۔ "آخر یہ کیا مرض ہے۔"

ڈاکٹر پریشان سا نظر آرہا تھا بولا۔ "کیا پتہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

میں نے کہا۔ "ان کی آواز بھی سیٹی کی طرح باریک ہوگئی ہے۔"

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "نہ صرف باریک بلکہ اس میں ایک کپکپی سی ہے۔"

میں پریشان ہوکر بولی۔ "آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ گلا خراب ہے؟"

ڈاکٹر نے ان کا منہ کھول کر دیکھا پھر بولا۔ "بظاہر گلے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ایسی علامات میں نے کبھی نہیں دیکھیں مسام کھل گئے ہیں پسینہ بہہ رہا ہے مگر بخار گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی جاتا ہے بہرحال رات تک انتظار کیجئے شاید میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔ میں نرس بھیجے دیتا ہوں۔ وہ مجھے ٹیلیفون پر رپورٹ سنا دیا کرے گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے بیگ اٹھایا۔ اور پلٹ کر خوف ناک نظروں سے مریضہ کو دیکھتا ہوا جلدی سے باہر نکل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اوسان خطا ہوگئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اسپتال سے نرس آگئی۔ وہ رات میری زندگی کی ایک خوف ناک رات تھی۔ میں اور نرس سرہانے بیٹھے خوف ناک نگاہوں سے مریضہ کو دیکھتے رہے۔ ان میں بتدریج عجیب وغریب تبدیلیاں آتی جاتی تھیں۔ مثلاً میں نے بخار دیکھنے کے لئے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر دہشت زدہ ہوکر جلدی سے بستر پر چھوڑ دیا...... وہ بالکل ایک کاغذی ہاتھ معلوم ہورہا تھا گوشت پوست کا بنا ہوا انسانی ہاتھ نہیں پھر نرس نے ان کا سر اٹھا کر تکیہ ٹھیک کیا اور متوحش ہوکر کہنے لگی۔ "ارے یہ سر ہے یا روئی کا گولا! اس میں تو کوئی وزن ہی نہیں۔"

مجھے خوف ودہشت کی وجہ سے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی میں نے بمشکل حلق سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔ "نرس باغ کا دریچہ بند کردو۔"

یہ سن کر نرس پراسرار نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "کیوں؟ آپ کو ڈر ہے کہ ہوا کا جھونکا؟"

میں ذرا تامل کر کے بولی۔ "ہاں وہ بے حد ہلکی ہوگئی ہیں۔ ہوا کا جھونکا انہیں بستر سے نیچے نہ گرا دے۔"

ابھی میرا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک ہلکی باریک سی سیٹی کی آواز آئی۔ ہم نے غور سے سنا تو بیگم گار کہہ رہی تھیں پیاس پیاس جب میں پانی کا گلاس لے کر آئی اور نرس نے انہیں سہارا دیا تو لمحہ بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نرس انہیں بستر پر چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتی ہے اس لئے میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر بیگم گار کو تھام لیا...... اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ نرس پر کیا گزری تھی۔ بیگم گار بالکل ایک بے وزن سی کاغذی گڑیا معلوم ہورہی تھیں۔

رات بھر ہم بستر کی چادریں بدلتی رہیں کیوں کہ وہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد پسینے میں شرابور ہوجاتی تھیں۔

صبح چار بجے کے قریب میں اتنی تھک گئی تھی کہ میرے لئے بیٹھنا محال ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نرس کو مریضہ کے پاس چھوڑ کر گھنٹے دو گھنٹے آرام کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے بستر پر لیٹے نصف گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نرس نے زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ میں گھبرا کر اٹھی دروازہ کھول کر دیکھا تو نرس کھڑی کانپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی مجھے چھٹی دیجیے۔

"مریضہ کا کیا حال ہے؟"

"خود چل کر دیکھ لیجیے۔"

میں بدحواس ہوکر نرس کے ساتھ مریضہ کے کمرے کی طرف بھاگی ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا بستر پر نظر ڈالی اور پریشان ہوکر بولی۔ ''بیگم گار کہاں گئیں؟''

نرس لرزاں تھی۔ بولی۔ ''یہاں ہیں۔''

میں نے بستر کی چادر ہٹادی۔ حیرت واستعجاب سے میرے منہ سے چیخ نکلنے کو تھی جسے میں نے ضبط کرلیا۔ میرے سامنے بستر پر بجائے لحیم وشحیم بیگم گار کے ایک سات آٹھ سال کی بچی پڑی تھی۔ ننھے ننھے ہاتھ پیر مختصر سانقش چھوٹا چھوٹا سا سر۔

میں خوف سے کانپتی ہوئی دروازے سے باہر نکل کر باغ کے زینے پر جا کھڑی ہوئی اور نرس کو آواز دی۔ ''نرس باہر آجاؤ مجھے یہ بتاؤ یہ حیرت انگیز تبدیلی کب اور کیسے ہوئی؟''

نرس ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''بس مجھ سے کچھ نہ پوچھئے ایسا مرض میں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ رات بھر میں پسینے سے ترکئی چادریں بدلتی رہی۔ اور مریضہ گھٹتی رہیں گھٹتی چلی گئیں میں نے ڈاکٹر کو دو تین مرتبہ حالات سنائے انہوں نے کہا کہ یہ مرض انسانی مرض نہیں معلوم ہوتا۔''

''ہائیں!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تو پھر اور کیا مرض ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں معلوم ۔ مجھے جانے دیجیے......''

''نرس نے جلدی جلدی کمرے میں سے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں اس خوف ناک مریضہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔

میں نے ڈاکٹر گار کو تاکیدی تار دے دیا کہ وہ فوراً واپس چلے آئے دوپہر کے گیارہ بجے مقامی اسپتال سے تین چار ڈاکٹر بیگم گار کو دیکھنے آئے جب چادر ہٹا کر دیکھا تو ڈاکٹروں کے چہرے فق ہوگئے ہمارے سامنے دو تین سال کی ایک ننھی سی بچی بستر پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے مجھ پر مختلف قسم کے سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ مگر میرے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان کے مرض کی نوعیت کیا ہے۔ جب معالجوں کو میری طرف سے مایوسی ہوئی تو وہ بیگم گار پر پل پڑے انہیں الٹا پلٹا کر دیکھنے اور چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ نہ بات کرسکتی تھیں اور نہ ہماری کوئی بات سن سکتی تھیں۔ کیونکہ ہماری آوازیں ان کے لئے بے حد کرخت تھیں جب ہم آپس میں سرگوشیوں میں بات کرتے تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اپنے دو ننھے کانوں پر رکھ کر کراہنے لگتی تھیں دو ایک دفعہ انہوں نے اپنی سیٹی کی سی باریک آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آواز بے حد مدھم اور بہت باریک تھی جیسے کوئی مکھی بھنبھنا رہی ہو۔

ڈاکٹروں نے دل بھر کے ارمان نکالے۔ معائنہ ہوئے قیاس آرائیاں ہوئیں موٹی موٹی کتابیں کھولی گئیں بحث مباحثے ہوئے آخر تھک ہار کر غروب آفتاب کے وقت واپس چلے گئے۔ سب کو ڈاکٹر گار کا انتظار تھا۔ شام پڑگئی مگر وہ نہ آیا کیوں کہ آج طبیہ کانفرنس کی پہلی نشست تھی آج وہ اپنی تحقیقی مقالہ پڑھنے والا تھا۔

چند گھنٹے اور گزر گئے میری تنہائی اور بیگم گار کی بیماری بڑھتی گئی۔ اور شام گہری ہوتی چلی گئی۔

میں باغ کے زینے پر بیٹھی کبھی بیگم گار پر نظر ڈالتی اور کبھی خوف سے لرزنے لگتی۔ جب بھی میں مریضہ پر نظر ڈالتی وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور سکڑی ہوئی نظر آتیں۔ یہاں تک کہ وہ اب ایک سال کے انسانی بچے جتنی رہ گئی تھیں۔

مجھے یہ سب کچھ ایک خواب پریشان معلوم ہورہا تھا۔ لیکن افسوس...... کہ یہ خواب نہیں تھا یہ حقیقت تھی ٹھوس حقیقت لیکن کہانی سے زیادہ خوف ناک اور داستان سے زیادہ عجیب۔

اب آفتاب غروب ہوگیا تھا۔ رات کا اندھیرا باغ کے کیلے کے پودوں پر اتر آیا تھا۔ ناریل کے

درخت رات کو ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ اور باغ کے کنویں پر چمگادڑیں چکر کاٹ رہی تھیں میرا دل دھک دھک کررہا تھا۔ میں نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ آج کی رات میں بیگم گار کو کسی اسپتال میں داخل کرا کر خود واپس چلی جاؤں گی۔

میں انہیں خیالات میں غرق تھی کہ باہر گھنٹی بجی میں نے ڈرتے ڈرتے جا کر دروازہ کھولا نہ جانے اب یہاں نئی مصیبت آئے گی مگر میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر گار کو کھڑا ہوا پایا۔

ڈاکٹر گار کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے شدید تردد کے عالم میں پوچھا۔ "کوئی خوف ناک مصیبت؟"

"بیگم گار شدید بیمار ہیں۔"

ڈاکٹر گار یہ سنتے ہی بدحواس ہو کر کمرے کی طرف بھاگا میں بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ ہم دونوں مریضہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دو لمحوں کے لئے خاموش کھڑے ہوگئے نہ جانے ہماری آنکھیں کیا دیکھیں۔

کمرے میں نیم تاریکی سی تھی۔ بستر پر سفید چادر پڑی تھی جس کے نیچے کسی انسانی جسم کی موجودگی پائی نہیں جاتی تھی سارا بستر پسینے سے یوں تر تھا جیسے بارش ہو رہی ہو؟

ڈاکٹر گار نے چادر ہٹا کر دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہاں بالشت بھر کی ایک گڑیا پڑی تھی۔

مجھے پھر شبہ ہوا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ سب کچھ خواب ہے ہاں خواب مگر ڈاکٹر گار کی آواز نے مجھے پھر حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا کہنے لگا۔ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اشاروں میں پوچھا۔

دو لمحے چپ رہا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہنے لگا۔ "اب یہ پسینہ اس وقت تک بند نہ ہوگا جب تک خود مریض تحلیل نہ ہو جائے۔"

"اس کا کوئی علاج۔"

ڈاکٹر گار رو پڑا۔ "اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس مرض کے لئے قبر کھود کر اس معالج کو جگانا پڑے گا جو آج ہزاروں سالوں سے اپنی قبر میں پڑا ابدی نیند سو رہا ہے۔"

مجھے پھر حقیقت پر خوب کا دھوکہ ہونے لگا۔ یہ ڈاکٹر گار کہہ کیا رہا ہے؟

میں دیوانی ہو گئی ہوں یا خواب دیکھ رہی ہوں۔

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔ "بیٹی روزی تم نے میرے تجربہ گاہ میں ایک دفعہ ایک مرتبان دیکھا تھا جس پر کاغذ کے پرزے پر "تحلیل" لکھا ہوا تھا۔ یاد ہے؟"

"ہاں...... ہاں پھر......؟"

"میں اس کے متعلق اپنا مقالہ پڑھنے گیا تھا۔ یہ دوا کسی پرانے یونانی حکیم کی ایجاد ہے۔ یہ آدمی کو تحلیل کردیتی ہے اس کی مقدار کا کسی کو علم نہیں ہے اسی سلسلے میں تجربے کررہا تھا سوئی کی نوک پر رکھ کر رتی کا سوواں حصہ بھی کسی کو کھلایا جائے تو اس کا وزن ہلکا ہونا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ انسان ہو یا ہاتھی گھلتے گھلتے انسانی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی دوا اگر صحیح مقدار میں کھائی جائے تو انسان کی قوت حیات شباب زندگی عود کر آتی ہے اور قائم رہتی ہے لیکن ہائے کاہیدہ نے معلوم ہوتا ہے اپنے موٹاپے کا علاج بغیر سوچے سمجھے اس خطرناک دوا سے کیا...... اور......"

اسی وقت ایک ایسی باریک سی آواز آئی جیسے کسی ربڑ کے کھلونے کو دبانے سے آتی ہے ہم نے پلٹ کر دیکھا تو بدنصیب بیگم گار کچھ کہنے کی کوشش کررہی تھیں اب ان کا قد ایک کیلے کے برابر رہ گیا تھا ڈاکٹر گار نے انہیں آہستہ سے اٹھا کر ایک چھوٹی سی ٹوکری میں رکھ دیا۔

جب میں رات کے نو بجے دوبارہ ڈاکٹر کے کمرے میں آئی تو ٹوکری موجود نہ تھی گھبرا کر میں نے پوچھا۔ "اب کیا خیال ہے؟ ڈاکٹر اداس لہجے میں کہنے لگا۔ "اب وہ اتنی ہلکی ہو گئی تھیں کہ اندیشہ تھا ہوا کا ایک جھونکا انہیں اڑا کر نہ لے جائے۔ میں نے انہیں ماچس کی ڈبیا میں رکھ کر الماری کے اوپر رکھ دیا ہے۔" یہ کہتے

کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "روزی تم اس ماچس کی ڈبیا کا خیال رکھنا۔ میں ذرا اپنے کتب خانے میں جاتا ہوں اس سلسلے میں ایک آخری تدبیر آزمانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے تقدیر کیا دکھاتی ہے۔"

میں اتنے بڑے کمرے میں اداسی کے عالم میں تنہا رہ گئی۔ ڈاکٹر گار کتابوں میں غرق ہو گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں، میں ماچس کی ڈبیا کو کھول کر دیکھ لیتی تھی۔ رات بے حد اور سنسان تھی دور پرے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں ساری کائنات پر ایک ہولناک سکوت مسلط تھا۔

رات کے گیارہ بجے ڈاکٹر گار اپنی تجربہ گاہ سے باہر نکلا اس کا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گئی۔ اب اس کی ساری امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ سیدھا میز کے پاس گیا ماچس کی ڈبیا کھولی میں نے بھی ایک نگاہ ڈالی اب بیگم گار ایک لونگ کے برابر رہ گئی تھیں ڈاکٹر گار نے چھری کی نوک پر انہیں احتیاط سے اٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا پھر انہیں ڈبیا میں بند کرتے ہوئے ایک آہ سرد بھری بولا۔ "اب کوئی امید باقی نہیں رہی......" یہ کہہ کر سر پکڑ کر کوچ پر بیٹھ گیا میں نے کہا۔ "وہ پیاسی ہوں گی۔"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سوئی کے ناکے میں پانی کا قطرہ رکھ کر ٹپکا دو۔"

چنانچہ ہم نے یہی کیا۔ بار بار سوئی کے ناکے سے پانی کی بوندیں بیگم گار پر ڈالتے رہے۔

دریچے سے باغ کی فرحت بخش خنک ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ میں کوچ پر نیم دراز تھی۔ دو دن اور دو راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ اس لئے میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن بارہ بجے ڈاکٹر گار کے دردناک لہجے نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ وہ رو کر کہہ رہا تھا۔ "ہائے کاہیدہ اب نہ جانے کہاں ہیں۔ ماچس کی ڈبیا کے اندر غور سے دیکھنے پر بھی کہیں لگی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ تھوڑی دیر ہوئی جھینگر کی آواز سے بھی زیادہ باریک آواز نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ اب وہ بھی بند ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔ پھر جب ذرا سنبھلا تو فلک شگاف آواز میں پکار کر پوچھا۔ "کاہیدہ کہاں ہو تم؟ کہاں ہو تم؟

میں نے کمرے کی ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھا۔ کاغذ کا ایک پرزہ میز پر رکھی ہوئی دوات قلم کی ٹوپی ......غرض سب کو جھاڑ پھونک کر دیکھا مگر معلوم ہوتا تھا۔ "تحلیلی" اپنا کام کر گئی تھی اور مریضہ فضا میں گھل چکی تھی۔

خوف و دہشت نے مجھے بدحواس کر دیا۔ میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے کانپنے لگی۔ ادھر ادھر نظر ڈالی تو ڈاکٹر گار نظر نہ آیا۔ کمرے میں اپنے آپ کو تنہا پا کر میں اور بھی ڈر گئی۔

اتنے میں باغ کی طرف سے مجھے پھاوڑے سے زمین کھودنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے دریچہ کھول کر باغ میں جھانکا۔ ڈاکٹر گار مزدوروں کی طرح پھاوڑا لے کر زمین کھود رہا تھا۔ میرے سہے سہے اوسان خطا ہو گئے۔ میں باغ میں نکل آئی چیخ کر پوچھنے لگی۔ "ڈاکٹر، ڈاکٹر کیا کر رہے ہو؟"

"قبر کھود رہا ہوں۔" اس نے زور سے پھاوڑے کی ایک ضرب لگا کر کہا۔

"کس کے لئے؟"

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بھاگتا ہوا اپنی تجربہ گاہ میں گیا وہاں سے ایک نیلے رنگ کا مرتبان اٹھا لایا۔ جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اور جس پر لکھا تھا۔ "تحلیلی" میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر گار نے مرتبان اٹھا کر قبر میں انڈیل دیا اور ایک ہلکے سے جنون خیز قہقہہ کے ساتھ بولا۔ "زمین کے خفیہ اور پراسرار دفینوں میں تین ہزار سال پرانے خزانے کا اضافہ ہو گیا۔"

اور اس نے پھاوڑا ایک طرف کو پھینک دیا۔

"مگر اب سوال یہ رہ گیا ہے کہ ڈاکٹر گار شادی شدہ ہے۔ یا رنڈوا۔"



رات کا بادشاہ

مریم فاطمہ۔کراچی

ہوٹل کے مین ہال میں اچانک لائٹ چلی گئی اور پھر چند درد ناک چیخیں سنائی دیں اور جب لائٹ آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ دو شخص مردہ پڑے تھے اور ایسا کیوں کر ہوا تھا۔

لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی خوفناک اور حیرت ناک کہانی

لندن شہر کی ویران وسنسان ایک گلی میں کافی کا ایک چھوٹا سا ہوٹل ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ وہاں پر تھوڑے بہت گاہک بیٹھے گرما گرم کافی کی چسکیاں لے رہے تھے باہر شدید ٹھنڈ پڑ رہی تھی اور تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بڑے گہرے بادل تھے۔ وقفے وقفے سے بجلی چمکتی۔ ایسے میں ایک نوجوان اوورکوٹ پہنے ہوٹل میں داخل ہوا اس کے سر پر ہیٹ موجود تھا وہ بڑے وقار سے چلتا ہوا کاؤنٹر تک آیا اور اپنے لئے ایک کپ کافی کا آرڈر کیا۔ پھر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے سامنے بیٹھے شخص نے اسے بڑے غور سے دیکھا پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ”جوان تمہارا نام جان سکتا ہوں۔“

اس نے اپنا گلا صاف کیا پھر بھاری آواز میں بولا۔ ”میرا نام کرس ہے اور آپ کا؟“

"مجھے سب جوزف کہتے ہیں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کرس نے اس سے مصافحہ کیا۔ جوزف نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا اور کرس کو بھی ایک پیش کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگایا اور پینے لگا۔

"تمہیں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا لگتا ہے کہ شاید تم پہلی بار یہاں آئے ہو۔"

"جی...... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" کرس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آج راستہ کیسے بھٹک گئے؟" جوزف نے پوچھا۔

کرس تھوڑا آگے کو جھکا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ "میں ایک سراغ رساں ہوں اور کسی کیس کو حل کرنے یہاں آیا ہوں۔"

جوزف نے فوراً چونک کر اسے دیکھا۔ "کیس؟ کیسا کیس؟"

"آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟" کرس نے سامنے رکھی میز پر پڑے ہوئے اخبار کی جانب اشارہ کیا۔ جوزف نے جھٹ اخبار اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کرس نے اس کے ہاتھ سے اخبار لیا اور اسے کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا پھر ایک خبر پر انگلی رکھ دی۔ جوزف نے بڑے غور سے دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا تو تم اس لئے یہاں آئے بالکل صحیح۔"

"لندن کے شہریوں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہ جب کبھی اس ہوٹل کے آس پاس سے گزرتے ہیں تو کوئی پیچھے سے انہیں دبوچ لیتا ہے اور اپنے نوکیلے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیتا ہے اس کے بعد کیا ہوتا ہے انہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ بس وہ کسی گلی میں بے ہوش پائے جاتے ہیں۔ میں اسی بات کا پتہ لگانے یہاں آیا ہوں کہ آخر وہ شخص کون ہوسکتا ہے؟" کرس بول کر چپ ہوا تو ویٹر اس کے لئے کافی لے آئی اچانک بڑے زور کی بجلی کڑکی اور اس کے ساتھ ہی تیز موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

ویٹر نے سہم کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا پھر بولی۔ "اوہ! اس طوفان سے تو میرا جی گھبرا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے۔"

اچانک ہوٹل کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نشے کی حالت میں جھومتا ہوا اندر چلا آیا۔ "اے لڑکی کچھ کھانے کو ملے گا کیا؟" اس نے نشے میں ڈوبی آواز میں کہا۔ ویٹر گھبرا کر دور ہٹ گئی۔

ہوٹل کا مالک اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ "نکلو...... یہاں سے...... یہ شرابی لوگوں کا اڈا نہیں ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ اسے دھکے دے کر نکالنے لگا۔

"ابے تو ہوتا کون ہے مجھے یہاں سے نکالنے والا۔" وہ غرایا۔

"میں اس ہوٹل کا مالک ہوں اب سیدھی طرح یہاں سے دفع ہوجاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" ہوٹل کے مالک نے جواب دیا۔

"اچھا بڑا گھمنڈ ہے تجھے اپنے اس چھوٹے سے ہوٹل پر۔ میں تو کہوں آگ لگے تیرے ہوٹل کو۔" اتنا کہہ کر وہ آدمی نشے کی حالت میں گرتا پڑتا باہر نکل گیا۔

"ہونہہ کیا بدتمیزی ہے۔" ویٹر نے منہ بنا کر کہا۔

کرس چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ "ویسے تم اس شخص کا پتہ کیسے لگاؤ گے جو یہ کام کر رہا ہے۔" جوزف نے اپنے منہ سے سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا۔ "آسان ہے، میں مختلف لوگوں سے تفتیش کروں گا۔ ویسے ایک بات تو بتائیں آپ یہاں کب سے آ رہے ہیں؟" کرس نے کہا۔

"بس جب سے میرے باپ نے گھر سے نکالا ہے۔"

"لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟" کرس نے دلچسپی لی۔

"ایسا کرنے کی کوئی وجہ تھی ہی نہیں وہ تو بس میرا باپ ہی ظالم تھا۔"

"اور ماں؟" کرس نے پوچھا۔

"وہ تو میری پیدائش کے وقت ہی مرگئی

تھی۔'' جوزف پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

''آپ کے خیال میں یہ کام کون کرسکتا ہے؟'' کرس نے جھک کر پوچھا۔

''میں کرسکتا ہوں۔'' جوزف نے مسکرا کر کہا اور پھر زور کا قہقہہ لگایا۔ کرس مسکرانے لگا۔ ''بہر حال جو بھی ہو ایک بات تو طے ہے کہ وہ بہت ہی ہوشیار شخص ہے اور صرف رات کے اندھیرے میں اپنا کام کرتا ہے وہ رات کا بادشاہ ہے۔'' کرس نے کہا۔

اچانک ہی ہوٹل کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک لڑکی بارش میں پوری طرح بھیگی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ بہت ڈری اور سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ اندر آتے ہی چیخ کر بولنا شروع ہوگئی۔

''میری مدد کرو باہر کوئی آدمی ہے وہ میرا پیچھا کررہا ہے۔ بڑی مشکل سے میں یہاں تک آئی ہوں وہ مجھے مار ڈالے گا پلیز مجھے بچالو۔''

ہوٹل میں موجود سارے لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ہوٹل کا مالک اور ویٹر بھی آگئے۔ ''آخر ہوا کیا؟'' سب نے ایک ساتھ اس سے پوچھنا شروع کردیا۔

کرس نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہوکے صرف یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں کہاں سے آئی ہیں اور کہاں جارہی تھیں؟''

''آیئے آپ پہلے آرام سے بیٹھ جائیں۔'' ویٹر نے کہا اور اسے لے کر ایک کرسی پر بیٹھا دیا۔

''ٹھہریں میں آپ کے لئے ٹھنڈا پانی لاتی ہوں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کہ جو ڈی اتنی ٹھنڈ میں تم اسے ٹھنڈا پلا کر مارو گی جاؤ جا کر ایک کپ گرما گرم کافی لے کر آؤ۔'' ہوٹل کے مالک نے اسے ڈانٹا۔ وہ خاموشی سے کافی لینے چلی گئی۔

''اب بتایئے کہ آپ کے ساتھ آخر کیا ہوا؟'' کرس نے نرمی سے پوچھا۔

''میرا نام کیٹ ہے۔ میں اپنے کچھ دوستوں

سے مل کر واپس اپنے گھر جارہی تھی کہ مجھے لگا کہ میرے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ پہلے تو میں سمجھی کہ شاید کوئی عام انسان ہوگا لیکن جیسے ہی بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں ،میں نے دیکھا کہ اس کے لمبے لمبے دانت تھے۔“

”وہ لڑکا تھا یا لڑکی؟“

”لڑکا تھا لیکن میں اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی۔“ کیٹ نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

”تو یعنی اگر آپ اسے دوبارہ دیکھیں تو پہچان پائیں گی؟“ کرس نے پوچھا۔

”نہیں مجھے ایسا نہیں لگتا کہ میں اسے پہچان پاؤں گی۔“ کیٹ نے جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ وہی آدمی ہو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نشے کی حالت میں یہاں آیا تھا اور پھر بعد میں گالیاں بکتا ہوا چلا گیا تھا۔“ جوزف نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا وہ شخص نشے کی حالت میں تو بالکل بھی نہیں تھا بلکہ اس کی چال میں بھی بڑا وقار تھا جیسے کہیں کا بادشاہ ہو۔“ کیٹ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”جیسا کہ رات کا بادشاہ ہو؟“ کرس نے مسکرا کر پوچھا۔

”جج جی میں کچھ سمجھی نہیں۔“ کیٹ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”کمال ہے کیا اس سے پہلے آپ نے کبھی رات کے بادشاہ کا نام نہیں سنا؟“

”نن نہیں تو۔ یہ رات کا بادشاہ کون ہے ؟“ کیٹ نے پوچھا۔ کرس نے اسے بتایا کہ ”کیسے آج کل لندن شہر کے اس علاقے میں ایک شخص لوگوں کی راتوں کی نیندیں حرام کئے ہوئے ہے۔“ اتنے میں جوڈی اس کے لئے کافی لے آئی۔

وہ چپ چاپ کافی پینے لگی۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ سردی بھی بہت تھی اسے ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی کرس نے جو اسے یوں کپکپاتے ہوئے دیکھا تو اپنا اوورکوٹ اتار کر اسے پہننے کے لئے دے دیا کیٹ نے دھیرے سے شکریہ کہا اور اوورکوٹ اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر واپس بیٹھ چکے تھے۔ اور اسی موضوع پر بات کررہے تھے۔ تو یہاں دوسری طرف کرس کیٹ سے بات کررہا تھا۔ ”آپ کو یہ یقین کیسے ہے کہ وہ کوئی عام انسان نہیں تھا۔“

”میں بتارہی ہوں ناں وہ کوئی عام انسان نہیں تھا نا معلوم اس میں ایسی کیا عجیب سی بات تھی کہ میں اسے دیکھ کر اتنی بری طرح ڈر گئی کہ آج تک اپنی ساری زندگی کسی بات پر اتنا نہیں ڈری ہوں گی۔“

اچانک پورے ہوٹل کی لائٹس بند ہوگئیں ۔”ارے یہ کیا ہوگیا۔“ کیٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

”آپ گھبرایئے مت بس یونہی موسم کی خرابی کی وجہ سے کچھ گڑبڑ ہوگئی ہوگی ابھی لائٹ آجائے گی ۔آپ سب لوگ پریشان نہ ہوں میں موم بتیاں لے کر آتی ہوں۔“ اندھیرے میں جوڈی کی آواز گونجی وہ گئی اور موم بتیاں لاکر سب کی میزوں پر رکھ دیں۔ اب ہوٹل میں ہلکی ہلکی روشنی ہورہی تھی۔

اچانک ان سب کی نظر ہوٹل کے مالک پر پڑی وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ جوڈی اور کیٹ کے منہ سے چیخ نکل گئی سب لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اوہ !شٹ یہ کیا ہوگیا۔“ کرس نے موم بتی کی روشنی میں اس کی گردن دیکھی اس پر دانتوں کے نشان تھے۔ ”تو یہ رہا رات کے بادشاہ کا نیا شکار اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ یہاں پر موجود کسی شخص میں سے ہی ایک ہے۔ اور اب وہ یقیناً اپنا نیا شکار ڈھونڈنے کے چکر میں ہے۔“ کرس نے سب کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔“ جوڈی نے کیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”یہ کیا بکواس ہے میں نے کچھ نہیں کیا۔“ کیٹ نے فوراً سے وضاحت پیش کی۔ ”ہاں ہاں بڑی بھولی

بنتی ہے۔ بھلا ہم کیوں کر یقین کریں تمہاری کہانی پر چڑیل پتا نہیں تو نے یہ کیا کر دیا۔ اسے دھکے دے کر باہر نکالو۔" جوڈی ہذیانی لہجے میں بولی۔

"ایک منٹ ٹھہر جایئے مس! آپ خواہ مخواہ ہی کیٹ پر الزام لگا رہی ہیں جبکہ آپ کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔" کرس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"آپ رہنے دیجیے میرا یہاں سے چلے جانا ہی اچھا ہے۔ مگر یاد رکھنا اگر مجھ کو کچھ ہوا ناں تو اس کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔" کیٹ نے انگلی اٹھا کر جوڈی سے کہا پھر اس نے کرس کا اوورکوٹ اس کو تھما دیا اور جلدی سے باہر جانے لگی کرس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "رہنے دیجیے جناب اگر آفت ٹلتی ہے تو ٹل جانے دیجیے۔" جوڈی نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ جبکہ کیٹ اس کی یہ بات سن کر رونے لگی اور چپ کر کے وہاں سے باہر چلی گئی۔

☆......☆......☆

جیسے ہی ہوٹل کا دروازہ کھلا تیز ہوا کا جھکڑ اندر آیا اور تمام موم بتیاں بجھ گئیں ایک بار پھر پورے ہوٹل میں اندھیرا ہو گیا۔ جوزف نے فوراً اپنے پاس سے لائٹر جلایا تا کہ روشنی ہو سکے۔ لائٹر کی مدد سے وہ موم بتیاں جلانے لگا کہ تب ہی سب کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو فرش پر بے ہوش پڑے تھے اب وہاں صرف جوڈی، جوزف اور کرس صحیح حالت میں تھے۔ کرس نے موم بتی کی روشنی سے ان کی گردن دیکھی وہاں پر دو نوکیلے دانتوں کے نشان تھے۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ رات کا بادشاہ بڑی تیزی سے اپنا شکار چن رہا ہے۔" کرس نے کہا۔

"تم دونوں اسی وقت ہوٹل سے باہر نکلو۔ ضرور یہ تم دونوں میں سے ہی کسی کا کام ہے۔" جوڈی روتے ہوئے بولی۔

"اچھا بہت خوب ہم پر الزام لگاتی ہو اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اس لڑکی کو یہ کہہ کر نکال دیا کہ تمہاری کہانی پر کون یقین کرے اس کو چڑیل کہا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چڑیل تم ہو۔" جوزف نے غصے سے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل سے عیاری ٹپک رہی تھی۔ "سن لڑکی مجھ سے ہنگامت لو۔" جوزف نے مزید کہا۔

"اچھا چلو بس کرو۔ اس طرح لڑنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔" کرس نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ کہتا تیز ہوا سے کھڑکیاں اور دروازے کھل گئے۔ اور ایک بار پھر کمرے میں اندھیرا چھا گیا کیونکہ ہوا سے موم بتیاں جو بجھ گئی تھیں اب کی بار کرس نے اپنے پاس سے لائٹر نکالا اور جلایا تو اس کی روشنی میں جوڈی اور اس نے دیکھا کہ جوزف بے ہوش پڑا ہے اور اس کی گردن پر بھی دانتوں کے نشان ہیں۔

اسی لمحے بجلی بڑے زور سے چمکی تو اس کی روشنی میں جوڈی نے اپنے سامنے نظر اٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتی ہے کہ کرس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور لمبے لمبے نوکیلے دانت نکلے ہوئے ہیں یہ سب کچھ دیکھ کر اس کی روح جیسے فنا ہو گئی اسے یوں لگا کہ اگر وہ کچھ بولنا بھی چاہے گی تو نہیں بول پائے گی۔

"تت تم۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"درست سمجھی ہو۔ میں ہی ہوں رات کا بادشاہ یعنی ویمپائر۔" اس سے پہلے کہ جوڈی وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتی کرس نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنے لمبے نوکیلے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیئے وہ بے ہوش ہو کر گر گئی، کرس نے اپنا اوورکوٹ پہنا اور ایک طرف دیوار سے لٹکی چھتری اتار کر باہر نکل گیا۔ اس نے اپنے اوپر چھتری کھول رکھی تھی۔

اس سے اگلے روز یہ تمام لوگ پولیس اسٹیشن میں یہ رپورٹ درج کرا رہے تھے کہ رات کے اندھیرے میں کسی نے انہیں پیچھے سے دبوچ کر اپنے نوکیلے دانت ان کی گردن میں گاڑ دیئے تھے اور اس سے پہلے اور بعد میں کیا ہوا انہیں کچھ یاد نہیں، جب انہیں ہوش آیا تو وہ زمین پر بے ہوش پڑے تھے، ملک کے تمام اخبارات میں یہی خبر چھپی تھی کہ "رات کا بادشاہ ایک بار پھر جیت گیا۔"

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:140

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا،اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

ماسٹر شبیر دراصل پڑھانے والے ماسٹر نہ تھے بلکہ وہ درزی کا کام کرتے تھے اس لئے لوگ انہیں ماسٹر صاحب یا ماسٹر جی کہا کرتے تھے، ماسٹر شبیر بہت محنتی اور نیک اطوار تھے، لوگ ان کے اخلاق سے بہت متاثر تھے، ماسٹر شبیر ہر حال میں اللہ کا شکرادا کرتے تھے، ماسٹر صاحب کی بیوی نسیم بیگم بھی بہت نیک کفایت شعار تھیں ہر وقت ان کی نظر گھر اور اولاد پر ہوتی تھی۔ان دنوں ماسٹر صاحب کے گھریلو حالات زیادہ اچھے نہ تھے...... خیر اللہ نے ماسٹر صاحب کی سن لی، کاروبار چمک اٹھا، آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا، اب وہ رشتہ دار جو کہ ماسٹر صاحب اور ان کے گھر کے افراد سے علیک سلیک نہیں کرتے تھے۔اب اچھے حالات کے تحت ماسٹر صاحب کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ان لوگوں میں ماسٹر صاحب کی بہن حمیرا جو کہ مطلب پرست، خودغرض، کینہ پرور تھی، اس نے اب بڑھ چڑھ کر رشتہ داری نبھانے لگی، ماسٹر صاحب کا بڑا بیٹا واحد جو کہ بہت ہونہار قابل اور دیدہ زیب تھا وہ سکینہ کی نظروں میں آ گیا، لہٰذا سکینہ واحد کی تعریف میں لگ گئی، اور دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اپنی بیٹی حمیرا کے لئے واحد کو ہر حال میں پھانس لوں گی، اور اس پروگرام کے تحت سکینہ کو بھی پٹی پڑھائی کہ واحد سے بڑھ کر کوئی اور لڑکا نہیں ملے گا اور پھر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جادوٹونے کا سہارا لیا اور اس طرح واحد کو اپنے قبضے میں کرکے اپنی بیٹی حمیرا اور واحد کا نکاح کرا دیا اور جب یہ خبر ماسٹر شبیر کو ملی تو وہ اپنا سینہ پکڑ کر بیٹھ گئے اور واحد کو بیوی سمیت گھر سے نکال دیا۔اب واحد بے یارومددگار اور بے روزگار ہو گیا، حالات کسمپرسی کی نذر ہو گئے، روٹیوں کا محتاج ہو گیا، ادھر اس کی والدہ نسیم بیگم پر بھی جادو نے اثر کیا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اب ایسا ہوا کہ نسیم بھی حال سے بے حال ہو گئی۔یعنی فالج زدہ ہو گئی۔خیر خاندان کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا کے ماسٹر صاحب کو راضی کر لیا کہ واحد کا قصور معاف کر دیں لیکن ماسٹر صاحب نے شرط رکھی کہ وہ اپنی بیوی حمیرا کو طلاق دے دے اور پھر واحد نے حمیرا کو طلاق دے ڈالا اور اس طرح دھوبی کا کتا نہ گھر کا رہا اور نہ گھاٹ کا...... ویسے جادو شیطان کا وہ خوشنما اور پرفریب مال ہے جس کے ذریعہ وہ اولاد آدم کو اللہ کے خلاف لے جانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔اب یہ انسان پر ہے کہ وہ چند لمحوں کی خوشی چاہے یا اللہ کی رضا میں راضی ہو کر دائمی فلاح پالے۔

(اب آگے پڑھیں)

چند دن پہلے اس بستی میں احمد نام کا ایک جوان داخل ہوا۔احمد نام کا یہ جوان انگریزوں کی فوج سے فارغ ہوا تھا۔جس بستی میں وہ آیا تھا وہ بستی اس کے ماموں کی تھی اور وہ اپنے ماموں سے ملنے کے لئے وہاں آیا ہوا تھا۔

اپنی آمد کے چند روز بعد ایک دن احمد آدھی رات کے قریب رفع حاجت کے لئے بستی سے باہر نکلا۔ان دنوں بستی میں غسل خانوں اور باتھ روم کا کوئی رواج نہ تھا اور ضروریات کے لئے لوگ بستی کے باہر کھیتوں یا نشیبی زمین ہی کی طرف جاتے تھے۔

جس بستی کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔وہ بستی ایک برساتی نالے کے قریب تھی برساتی نالے اور اس کے درمیان ایک بہت بڑا بند تھا اس لئے کہ برسات کے موسم میں اس نالے میں دریاؤں جیسی طغیانی آتی تھی۔ اور اس بند کی وجہ سے وہ بستی اور اس کے پیچھے اور دائیں بائیں جتنی بستیاں تھیں وہ اس بند کی وجہ سے محفوظ رہتی تھیں بند بالکل برساتی نالے کے قریب تھا اور برساتی نالے کے اس پار ایک بہت بڑا جنگل تھا جس نے اس



www.urdusoftbooks.com

برساتی نالے کو کناروں سے باہر پھیلنے سے روک رکھا تھا۔ برساتی نالے کے بند کے اس طرف یعنی بستی کی جانب ایک کافی بڑا قبرستان تھا جس میں کچی پکی دونوں طرح کی قبریں تھیں اور قبرستان کے ایک طرف پرانی بوسیدہ اور اجڑی ہوئی کوئی حویلی تھی اور دائیں جانب پرائمری اسکول کی ایک کافی بڑی عمارت تھی۔

رفع حاجت سے فارغ ہونے کے بعد احمد جب بستی کی طرف پلٹنے لگا تو حیران رہ گیا اس لئے کہ قبرستان کے اندر سے ایک ہیولا نکل کر قبرستان کے پہلو میں جو ویران حویلی اور عمارت تھی۔ اس کی طرف بڑھا تھا احمد نے دیکھا وہ ہیولا چاندنی کی طرح روشن تھا اس کے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین تھی اور دوسرے کندھے پر بھیک مانگنے والا ایک کشکول تھا۔ احمد جو جنگ عظیم میں انتہا درجہ کے خونی مناظر دیکھ چکا تھا اس منظر کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا اس کے جسم پر لرزہ اور کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ وہ سہم سا گیا تھا جہاں وہ کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا اور جو روشن ہیولا قبرستان سے نکلا تھا اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ بیٹھ جانے سے اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ کہیں ہیولے کی نظر اس پر نہ پڑ جائے اور اسے نقصان نہ پہنچائے۔

قبرستان سے نکل کر ہیولے نے ویران عمارت کا رخ کیا تھا اور اس عمارت کی طرف جانے کے لئے ہیولے کو احمد کے قریب ہی سے گزر کر جانا تھا۔ جوں جوں وہ ہیولا قریب آ رہا تھا احمد نے دم سادھنا شروع کر دیا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہیولا احمد کے پاس سے گزرا۔ بالکل روشن تھا جیسے چاند کی تنویروں کو کسی نے تجسیم دے دی ہو۔ جو اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی وہ جلتی جا رہی تھی۔ چاندنی رات میں احمد نے دیکھا، نہ اس ہیولے کا کوئی سایہ تھا نہ اس ہیولے نے ہاتھ میں جو لالٹین پکڑی ہوئی تھی وہ کسی چیز کے سائے کو اجاگر کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ہیولا اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے احمد کے قریب سے گزر کر دائیں جانب جو ویران حویلی تھی اس کی طرف چلا گیا تھا۔

اپنے ماموں کی اس بستی میں احمد کے لئے یہ پہلا مافوق الفطرت واقعہ تھا اس نے اسے اپنی بصارت کا دھوکہ اور فریب قرار دیا۔ تاہم وہ ایک الجھن جستجو اور پریشانی میں پڑ گیا تھا جب تک وہ ہیولا قبرستان سے نکل کر پرانی حویلی میں گھس نہیں گیا اس وقت تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ گو اس واقعہ کو اس نے اپنا خام خیال اور فریب اور سراب سمجھ کر فراموش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوا اس کے دل میں ایک کریدنی ایک جستجو ایک کھوج سا ضرور لگ گیا تھا۔ اس نے اس واقعہ کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا اس خدشے کے تحت کہ لوگ اس کا ٹھٹھہ اور مذاق اڑائیں گے۔

لیکن چند ہی یوم تک یہ حادثہ احمد کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اس لئے کہ آنے والے دنوں میں اس نے دو تین بار ہیولے کو کبھی قبرستان سے نکل کر پرائمری اسکول کی عمارت کبھی بستی کے دائیں جانب بوسیدہ حویلی اور کبھی قبرستان سے نکل کر بند پر چڑھتے اور پھر آگے بڑھ کر برساتی نالے کو عبور کرتے ہوئے بڑے جنگل کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

یہ واقعات اور حادثات جب اس نے لگاتار دیکھے تب حادثے کا ذکر اس نے اپنے ماموں سے کیا۔ احمد دنگ رہ گیا کہ اس واقعہ اس حادثے کو سن کر اس کا ماموں کسی حیرت کسی جستجو کسی پریشانی میں نہیں پڑا تھا بلکہ مسکرا دیا تھا پھر اس نے احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”میرے بیٹے جس واقعہ جس حادثے کا تم ذکر کر رہے ہو اس سے اس بستی کے لوگ خوب آشنا اور اس سے واقف ہو چکے ہیں۔ یہ ہیولا یہ روشن مجسمہ ایک ایسے شخص کی روح ہے جس کا تعلق اسی بستی سے تھا اور یہ روح اگر ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز قبرستان سے نکل کر کبھی حویلی کی طرف جاتی ہے کبھی پرائمری اسکول کی عمارت کبھی برساتی نالے کو عبور کرنے کے بعد اس پار جنگل کی طرف جاتی ہے۔ پہلے لوگ اسے دیکھ کر بڑے پریشان اور خوف زدہ ہوتے تھے لیکن اب ان کی ایسی

کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ اس روح سے شناسا ہو چکے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ روح ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ رات کی تاریکی میں ہماری ہی بستی نہیں آس پاس کی بستی کے لوگ بھی جب اسے دیکھتے ہیں تو وہ کسی خوف زدگی کا شکار نہیں ہوتے وہ اسے معمول کا واقعہ سمجھ کر گزر جاتے ہیں۔ اور فراموش کر دیتے ہیں۔"

اپنے ماموں کے ان انکشافات پر احمد مزید جستجو اور کریدنی میں پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے ماموں سے التجا کی کہ وہ اس شخص کے حالات تفصیل سے سنائے جس کی روح قبرستان سے نکل کر مختلف سمتوں کا رات کے وقت رخ کرتی ہے۔ احمد کے اس سوال پر اس کا ماموں ہنس کر کہنے لگا۔

"میرے بیٹے۔ یہ جو شخص اس بستی کا رہنے والا تھا بعد میں مر گیا اور جس کی روح ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے اس کے حالات قبرستان کا گورکن تمہیں بہترین انداز میں سنا سکے گا۔ اس لئے کہ وہ گورکن اس شخص کا بہترین دوست تھا۔ جس کی یہ روح بھٹکتی پھرتی ہے یہ دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے تم کسی وقت گورکن کے پاس چلے جانا وہ قبرستان ہی میں رہتا ہے اس کا نام رمضان ہے میرا نام لینا تمہیں وہ سارے واقعات تفصیل سے سنائے گا میرے خیال میں اس کے بعد تم مطمئن ہو جاؤ گے۔"

اپنے ماموں کا یہ جواب سن کر احمد نے اسی روز قبرستان کے گورکن رمضان کے پاس جانے اور اس سے اصل واقعات جاننے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لہٰذا اپنے ماموں کے ساتھ گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سیدھا قبرستان کا رخ کیا تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور لوگ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ایسے میں احمد قبرستان میں داخل ہوا تھا۔

احمد جب قبرستان میں داخل ہوا تو بوڑھا گورکن رمضان اس وقت چند گری ہوئی قبروں پر مٹی ڈال کر کر انہیں درست کر رہا تھا۔ جس وقت احمد کو اس نے اپنے قریب آتے دیکھا تب اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کدال قریب ہی پڑے بیلچے کے قریب رکھ دی تھی اس کے بعد وہ ایک تجسس کے انداز میں اپنی طرف آنے والے احمد کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ احمد اس کے قریب گیا اسے سلام کیا پھر بڑی انکساری سے اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"شاید آپ مجھے جانتے ہوں گے۔" اس پر احمد کی بات کاٹتے ہوئے گورکن بول پڑا۔

"میرے بیٹے تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں میں تمہارے متعلق تفصیل سے جانتا ہوں تمہارا نام احمد ہے تمہارے ماموں کو بھی جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

جواب میں احمد تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے بوڑھے رمضان کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو وہ قبرستان کے اندر جو آپ کی کٹیا ہے وہاں چلیں وہاں بیٹھ کر جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں آپ سے تفصیل کے ساتھ کہوں گا۔"

رمضان نے اثبات میں سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے ساتھ کٹیا میں جائے گا پھر وہ زمین پر جھک کر کدال اور بیلچہ اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ اس سے پہلے ہی احمد آگے بڑھا بیلچہ اور کدال اس نے اٹھا لیا پھر وہ بوڑھے گورکن رمضان کے پیچھے پیچھے اس کی کٹیا کی طرف چل دیا۔

کٹیا میں ایک مسہری پر بستر لگا ہوا تھا اور زمین پر بیٹھنے کے لئے ایک چٹائی سی بچھا دی گئی تھی۔ رمضان جوتے اتار کر اس چٹائی پر بیٹھ گیا احمد بھی کٹیا کے ایک کونے میں کدال اور بیلچہ رکھنے کے بعد جوتے اتار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا پھر گفتگو کا آغاز احمد نے کیا۔

"میرے محترم جیسا کہ آپ جانتے ہیں میرا نام احمد ہے میں میں کافی عرصہ بعد اپنے ماموں کی اس بستی میں آیا ہوں حالانکہ اس سے پہلے بچپن میں بھی میں یہاں آتا رہا ہوں لیکن جس وقت جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریزوں نے زبردستی مجھے فوج میں بھرتی کر لیا اس طرح لگ بھگ پانچ چھ سال تک مجھے ادھر آنے کا موقع نہ ملا اس لئے کہ میں فوج میں خدمات سرانجام دیتا رہا اب جنگ عظیم چونکہ ختم ہو چکی ہے لہٰذا فوج کی نوکری چھوڑ کر

www.urdusoftbooks.com

میں گھر آچکا ہوں اور اپنے ماموں سے پہلی بار ملنے آیا ہوں شاید آپ جانتے ہوں گے کہ گزشتہ چند دن سے میں نے اپنے ماموں کے یہاں قیام کیا ہوا ہے۔" جواب میں رمضان، احمد کی بات کاٹتے ہوئے فوراً بول پڑا۔

"عزیزی احمد میں جانتا ہوں تم نے گزشتہ کئی روز سے اپنے ماموں کے ہاں قیام کیا ہوا ہے بلکہ تمہارے ماموں اکثر و بیشتر مجھے نوازتے رہتے ہیں اور گزشتہ تین چار روز قبل وہ جب مجھ سے ملنے آئے تو انہوں نے تمہارا بھی ذکر کیا تھا کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

جواب میں احمد تھوڑی دیر تک خاموش رہا اس کے بعد بڑے غور سے اس نے رمضان کی طرف دیکھا پھر قبرستان کے اس جھونپڑے میں احمد کی آواز گونجی تھی۔

"محترم دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ایک مافوق الفطرت سا معاملہ اس بستی میں دیکھا ہے چند روز پہلے رات کے وقت میں رفع حاجت کے لئے بستی سے نکل کر برساتی نالے کے کنارے آیا جب میں فارغ ہو کر بستی کی طرف لوٹ رہا تھا تو میرے قدم رک گئے اس لئے کہ قبرستان سے ایک ہیولے کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بالکل چاندنی کی طرح روشن تھا ہیولہ کسی انسان کا تھا اس ہیولے کے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین تھی اور دوسرے کندے پر اس نے مانگنے والے فقیروں جیسا ایک کشکول لٹکا رکھا تھا۔

پہلے تو میں نے اس ہیولے کو جو چاند کی طرح روشن تھا ایک واہمہ ایک فریب ایک دھوکہ خیال کیا لیکن قبرستان سے نکل کر وہ ہیولہ دائیں جانب اس حویلی کی طرف گیا تھا جو برسوں پہلے کی اجڑی پڑی ہوئی تھی اور آج بھی اجڑی اور ویران کھنڈر پڑی ہوئی ہے۔ وہ ہیولہ قبرستان سے نکل کر جب اس ویران حویلی کی طرف گیا تھا تو ادھر جانے کے لئے اسے میرے پاس سے گزرنا تھا لہٰذا میں زمین پر لیٹ گیا تھا۔

ویران حویلی کی طرف جانے کے لئے جب ہیولہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے سے گزرا تو میں نے دیکھا تو وہ واقعی جلتے ہوئے شعلوں جیسا ایک انسانی ہیولہ تھا میں رات کی تاریکی میں آنچلوں کی طرح لہراتا ہوا اس کا سفید لباس بھی دیکھ سکتا تھا اس کے ہاتھ میں رات کو پہرہ دینے والے چوکیداروں جیسی لالٹین اور دوسرے کندھے پر مانگنے والوں کا کشکول تھا میں اسے دیکھتا رہ گیا میرے پاس سے گزر کر وہ ویران حویلی کی طرف چلا گیا اور ویران حویلی میں داخل ہونے کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میرے بزرگ پہلے روز تو میں نے اسے اپنی آنکھوں کا وہم دھوکہ اور فریب جانا میں نے کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا میں یہ سمجھتا رہا کہ اگر میں نے اس کا ذکر کسی سے کیا تو لوگ میرا مذاق اور ٹھٹھہ اڑائیں گے۔ اس لئے کہ میں نے اسے اول روز اپنی نظر فریبی اور نگاہوں کا دھوکہ ہی سمجھا تھا لہٰذا وقتی طور پر یا یوں جانیں ظاہری طور پر میں نے اسے فراموش کر دیا تھا لیکن میرے اندر ایک جستجو ایک کریدنی ایک کھوج سا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور میرا جی میرا دل میرا ذہن چاہتا تھا کہ اس روشن ہیولے کا راز ضرور جاننا چاہئے۔

پھر اس کے بعد لگاتار کئی مرتبہ میں نے اس روشن ہیولے کو دیکھا جو میرے خیال میں ایک روح ہے کبھی میں نے اسے قبرستان سے نکل کر ویران حویلی کی طرف جاتے دیکھا کبھی میں نے اسے قبرستان سے نکل کر بستی کے ایک کونے میں جو پرائمری اسکول کی عمارت ہے ادھر جاتے دیکھا کبھی میں نے اسے برساتی نالے کے اس پار جو بہت بڑا جنگل ہے اس کی طرف جاتے اس جنگل کی طرف سے برساتی نالے کے پانی کو پار کر کے قبرستان کی طرف آتے دیکھا۔

جب میں نے کافی بار اسے دیکھا تب آج میں نے اس کا ذکر ڈرتے ڈرتے اپنے ماموں سے کیا اور اس ہیولے کی حقیقت جاننا چاہی جواب میں میرے ماموں نے مجھے تسلی دی کہ وہ دھوکہ اور فریب نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں وہ ایک شخص کی روح ہے اور ساری بستی کے لوگ اس روح سے واقف اور شناسا ہیں پہلے لوگ خوف زدہ ہوتے تھے ڈرتے تھے لیکن اب ایسا

معاملہ نہیں اس لئے لوگوں کو یقین ہوگیا ہے کہ وہ روح انہیں کچھ کہتی نہیں۔

جب میں نے اپنے ماموں سے اس روح سے متعلق تفصیل جاننا چاہی تو میرے ماموں نے مجھے آپ کی طرف بھیج دیا اب میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں تاکہ آپ مجھے اس روح اس ہیولے سے متعلق تفصیل سے بتائیں۔ دیکھئے انکار نہ کیجیے گا۔ ورنہ میں بار بار آپ کے پاس آؤں گا۔ اور اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک مجھے اس روح کی حقیقت کا علم نہیں ہو جاتا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد احمد تھوڑی دیر کے لئے رکا بڑے غور سے وہ بوڑھے گورکن رمضان کی طرف دیکھتا رہا جس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور اس موقع پر اس کی گردن بھی خم تھی۔ رمضان کو یوں خاموش اور چپ دیکھتے ہوئے احمد ایک بار پھر بول پڑا۔

"رمضان چچا دیکھنا مجھ سے کوئی بات پوشیدہ مت رکھنا میرے ماموں نے مجھے یہ تسلی اور ڈھارس دے کر آپ کی طرف روانہ کیا ہے کہ آپ مجھے اس راز کی تفصیل سے آگاہ کریں گے میں آپ سے التماس کرتا ہوں مجھ سے کوئی چیز چھپانا مت۔"

احمد کے ان الفاظ پر بوڑھے گورکن رمضان نے اپنی خم کی ہوئی گردن کو سیدھا کیا تھوڑی دیر تک وہ عجیب سی بے بسی میں احمد کی طرف دیکھتا رہا پھر اسکی مری مری بکھری بکھری سی آواز اس جھونپڑے میں بلند ہوئی۔

"احمد میرے بیٹے اگر تم ضد ہی کرتے ہو تو میں اس کے راز سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں میرے بیٹے یہ بڑی تلخ کہانی ہے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک دلچسپ داستان بھی ہے۔ عام سننے والا جب اسے سنے تو اسے ناقابل اعتبار ہی جانے لیکن چونکہ میں خود اس داستان کا ایک کردار رہا ہوں لہٰذا جو کچھ میں تم سے بیان کروں گا وہ حرف بہ حرف سچ ہوگا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بوڑھا گورکن رمضان ایک بار پھر خاموش ہو رہا کچھ سوچا اس کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

"احمد بیٹے یہ جو ہیولہ رات کے وقت چاندنی کی طرح چمکتا ہوا تم دیکھتے ہو۔ یہ میرا دوست ہے اس کا نام حسن تھا۔ یوں جانو یہ بے چارہ سکون اور آشتی تلاش کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں ادھر ادھر سرگرداں رہتا ہے۔ اکثر و بیشتر اسی طرح اپنے ہاتھ میں لالٹین اور کندھے پر کشکول لٹکائے میرا یہ دوست یا یوں جانو میرے دوست کی یہ روح میری اس کٹیا میری اس جھونپڑی میں بھی داخل ہوئی ہے میں نے اسے اپنے سامنے بالکل جسمی حالت میں دیکھا جس طرح تم میرے سامنے بیٹھے ہو کئی بار وہ سامنے آ کر بیٹھا میں اس سے خوف زدہ نہیں ہوتا جس وقت وہ میری کٹیا میں آتا ہے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا تجسس ایک انوکھا سا اضطراب اور ایک نا آشنا سی آسودگی ہوتی ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا یہ دوست مر چکا ہے اس کا نام حسن ہے اور اس کی یہ روح اب ان علاقوں میں سرگرداں ہے قبرستان سے نکل کر یہ پرانی کھنڈر عمارت کی طرف کیوں جاتی ہے قبرستان سے نکل کر یہ روح پرائمری اسکول کی طرف کیوں جاتی ہے کبھی یہ برساتی نالے کے اس پار جنگل اور پھر وہاں سے نکل کر قبرستان کی طرف کیوں آتی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں پہلے میں تمہیں پوری داستان سناتا ہوں کہ میرا یہ ساتھی کون تھا کیسے اس نے ترقی کی کیسے اسے قتل کیا گیا پھر کیسے انتقامی جذبہ لئے اس کی روح حرکت میں آ گئی۔

احمد بیٹے۔ یہ برسوں پہلے کا ذکر ہے اس وقت میں پندرہ سولہ سال کا نوجوان ہوں گا میرا دوست حسن جس کی یہ روح بھٹکتی پھرتی ہے مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔ ہم دونوں ہی غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے ہم دونوں میں غربت ہی قدرے مشترک تھی اور یہی غربت ہم دونوں کی دوستی اور رفاقت کا باعث بنی تھی۔

آج کل میں اس قبرستان کا گورکن ہوں۔ مجھ سے پہلے میرا باپ اس قبرستان میں گورکن ہوا کرتا تھا۔ ہماری گزر اوقات بڑی مشکل سے ہوا کرتی تھی۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری ماں میرا باپ دونوں

میرے ساتھ اسی کٹیا میں رہتے تھے۔ بستی کا جب کوئی شخص مرتا تھا یا آس پاس کی بستی میں کوئی فوت ہوتا تھا تو ہم دونوں باپ بیٹا مل کر قبر کھودتے تھے بس اس سے ہمیں چند سکے ملتے تھے جن سے ہم بڑی مشکل سے گزر بسر کرتے تھے۔

جہاں تک میرے دوست حسن کا تعلق ہے تو اس کا باپ اپنی بستی میں چوکیدار تھا۔ اس کی دو بہنیں تھیں اور بھائی وہ اکیلا ہی تھا۔ ماں باپ بڑی غربت بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے جس طرح ہمارا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا اسی طرح حسن کے گھرانے کا گزارہ ہم سے بھی زیادہ مشکل تھا اس لئے کہ ہم گھر کے تین ہی افراد تھے جبکہ حسن کے گھر کے پانچ افراد تھے دو اس کے ماں باپ۔ دو بہنیں اور ایک وہ خود، اس طرح وقت گزرنے لگا۔

جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ میرا اور میرے دوست حسن کا گھرانہ دونوں ہی غربت کے مارے ہوئے تھے۔ یہ بھی میں بتا چکا ہوں کہ غربت ہی ہم دونوں کی قدرے مشترک تھی۔ اور اسی بناء پر ہم دونوں میں گہری دوستی اور رفاقت تھی بلکہ یوں جانو میں اور حسن آپس میں دونوں سگے بھائیوں کی طرح تھے میرا بھی کوئی بھائی نہیں تھا حسن کا بھی کوئی بھائی نہیں تھا۔ لہٰذا حسن مجھے اپنا چھوٹا بھائی اور میں اسے اپنا بڑا بھائی خیال کرتا تھا۔ یوں یہ رفاقت چلتی رہی۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ دن رات کام کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ہم پیٹ کے اس دوزخ کو ایندھن فراہم کرتے رہے پھر اس بستی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔

وہ اس طرح کہ ہماری بستی سے باہر سنیاسیوں نے اپنا پڑاؤ کیا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے خیمے نصب کئے تھے۔ ایک ہفتہ ہماری بستی سے باہر جس جگہ یہ پرانی اجڑی ہوئی حویلی ہے یہاں انہوں نے قیام کیا تھا ان سنیاسیوں میں مسلمان بھی تھے سکھ اور ہندو بھی تھے۔ میں اور حسن دونوں بھائی چونکہ فارغ ہوا کرتے تھے غربت کے مارے تھے لہٰذا اکثر و بیشتر ہم ان سنیاسیوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ جنہوں نے ہماری بستی سے باہر آ کر پڑاؤ کیا تھا۔ ان سنیاسیوں کا جو بڑا اور سرکردہ تھا وہ ہندو تھا اور اسے سارے سنیاسی باوا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس باوا کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جس کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ لڑکی بڑی خوب صورت انتہا درجہ کی پرجمال تھی وہ سنیاسی سارے ہی غیر شادی شدہ تھے اور ان کا اہل و عیال سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سنیاسیوں کے بڑے باوا کے ساتھ جو سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی تھی جس کا میں نے ذکر کیا ہے وہ سنیاسی کے چھوٹے بھائی کی بیٹی تھی۔ اس لڑکی کے ماں باپ دونوں چونکہ مر چکے تھے لہٰذا سنیاسیوں کے اس بڑے یعنی باوا نے اپنی بھتیجی کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ یا یوں جانو وہ لڑکی باوا کی مجبوری تھی۔ جسے وہ اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اس لڑکی کی پرورش کرنے والا کوئی اور نہ تھا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بوڑھا گورکن رمضان رکا دم لیا اس کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا تھا۔

"احمد بیٹے...... جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں اور میرے دوست حسن نے ان سنیاسیوں کی خدمت کرنے میں دن رات ایک کر دیا تھا ان کے سامنے ہم ہمہ وقت چوکس اور چوکنے رہتے تھے۔ بھاگ دوڑ کر ان کا کام کرتے تھے اپنی بستی سے ان کے لئے سودا سلف لا کر دیتے تھے۔ ان کے پینے کے لئے بستی سے تازہ پانی مہیا کرتے تھے ان کے پاس لکڑی کے بڑے بڑے ڈرم تھے جنہیں ہم ہر وقت پانی سے بھرا رکھتے تھے اور پھر ان کے بڑے بڑے دیگچوں میں ان کے پڑاؤ ہی میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر ان کے نہانے کے لئے پانی بھی گرم کرتے تھے۔ یوں جانو ان کی خدمت میں ہم دن رات لگے رہتے تھے دراصل ہم غریب تھے سنیاسیوں کے متعلق ہم نے بڑی عجیب اور مافوق الفطرت باتیں سن رکھی تھیں لہٰذا میں اور حسن یہ امید رکھتے تھے کہ ہو سکتا ہے یہ سنیاسی ہماری خدمت سے خوش ہونے کے بعد جب یہاں سے جائیں تو ہمیں نوازتے جائیں۔ اسی بناء پر شاید ہم اپنے

خاندان کی حالت بدلنے میں کامیاب رہیں۔

"بیٹے۔ وہ سارے سنیاسی میری اور حسن کی خدمت سے ایسے خوش ہوئے کہ جس روز انہوں نے ہماری بستی سے پڑاؤ اٹھانا تھا اس سے ایک روز پہلے سارے سنیاسیوں نے اپنے باوا سے یہ التماس کی کہ میں اور حسن ان کی بہترین خدمت کرنے والے ہیں انہوں نے باوا سے ہماری یہ بھی سفارش کی کہ ہم دونوں غریب بچے ہیں لہٰذا ہمیں اپنے ساتھ رکھ لینا چاہئے تاکہ ہم ان کی خدمت کرتے رہیں۔"

سنیاسیوں کے باوا نے اپنے ساتھی سنیاسیوں کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور جس روز شام کے وقت سنیاسیوں نے اپنا پڑاؤ اٹھا کر کوچ کرنا تھا اسی روز دوپہر کے وقت باوا نے مجھے اور حسن کو اپنے خیمے میں بلایا۔ اس وقت خیمے میں باوا کی حسین وخوب صورت بھتیجی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی بھتیجی کی موجودگی میں باوا نے ہمیں یہ پیشکش کی کہ میں اور حسن ان کے پڑاؤ میں شامل ہوجائیں جس طرح ہم دونوں ان کے قیام کے دوران ان کی خدمت کرتے رہے ہیں اگر آئندہ بھی ہم اسی طرح ان کی خدمت کرتے رہیں تو باوا نے ہمیں یقین دلایا کہ ایک سال کے اندر سنیاسی ہم دونوں بھائیوں کی کایا پلٹ کر رکھ دیں گے۔

میں اور حسن اس پیشکش پر بڑے خوش ہوئے ۔دراصل ہم غریب تھے ہم تو چاہتے تھے کہ کوئی ایسا سبب بنے جس کی وجہ سے ہم اپنی غربت کو دور کرکے کم ازکم اپنے ماں باپ اپنے لواحقین کی خوشحالی کا سامان کرسکیں۔ اس بنا پر جب باوا نے ہمیں یہ پیشکش کی تو میں اور حسن نے بڑی رازداری کے ساتھ آپس میں صلاح ومشورہ کیا اس کے بعد ہم نے باوا سے حامی بھرلی کہ ہم اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہم نے باوا کے سامنے ایک شرط رکھی۔"

جب ہم نے مشروط طور پر حامی بھرلی تو باوا نے چونک کر پوچھا تم دونوں کی کیا شرط ہے اس پر حسن نے باوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہماری شرط یہ ہے کہ آپ لوگ اپنا پڑاؤ رات کے وقت یہاں سے اٹھائیں اور ہماری بستی کے کسی بھی فرد کو یہ نہیں پتہ چلنا چاہئے کہ ہم دونوں نے آپ کے پڑاؤ میں شمولیت کرلی ہے اور آپ کے ساتھ ہی ہم روانہ ہوگئے ہیں۔"

باوا نے میری اور حسن کی اس شرط کو فوراً قبول کرلیا اس پر حسن کے ذہن میں شدید کوئی اور سوال ابھرا اس موقع پر حسن نے باوا کو پھر مخاطب کیا۔

"باوا کوچ سے پہلے ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ آپ لوگ یہاں سے کوچ کرکے کدھر کا رخ کریں گے اور آپ کے ساتھ رہتے ہوئے ہمیں کیا کام کرنا ہوگا۔" حسن کے اس سوال پر باوا کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی تھوڑی دیر تک وہ ہلکے سے تبسم میں حسن کی طرف دیکھتا رہا اس کی حالت سے لگتا تھا جیسے اس نے حسن کے اس سوال کو بڑا پسند کیا ہو پھر حسن کی طرف دیکھتے ہوئے باوا نے کہنا شروع کیا تھا۔

"دیکھو حسن تم نے بہت اچھے سوال کئے ہیں یوں جانو تم دونوں کی طرف سے میں ایسے سوالات کی توقع رکھتا تھا یہ سوال کرکے تم نے میرے خیالات ہی کی ترجمانی کی ہے تم دونوں کو آنکھیں بند کرکے ہمارے ساتھ نہیں ہولینا چاہئے بلکہ ہم سے پوچھنا چاہئے کہ ہمارا رخ کن سرزمینوں کی طرف ہوگا اور ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تم لوگوں کو کیا کام کرنا ہوگا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد باوا رکا تھا اس دوران ایک بھرپور نگاہ اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی اپنی بھتیجی پاروتی پر ڈالی تھی اس کے بعد حسن کی طرف دیکھتے ہوئے باوا پھر کہہ رہا تھا۔

"سنو بچو۔ خصوصیت کے ساتھ حسن تم میری بات غور سے سنو۔ اس لئے کہ رمضان کی نسبت تم مجھے زیادہ ذہین لگتے ہو بچے تم نے دوسوال کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ یہاں سے کوچ کرنے کے بعد ہمارا رخ کدھر کو ہوگا اور ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تم لوگوں کو کیا کام کرنے ہوں گے۔

تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں سے

ہم اس شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے جو کشمیر کی طرف جاتی ہے یہ سفر ہمالیا کی بلندیوں تک جاری رہے گا یا یوں جانو ہمالیہ تک ہم اپنے ان خچروں پر سفر کرتے رہیں گے جو ہمارے ساتھ ہیں۔ اب تمہارے پہلے سوال کا جواب تو میں نے دے دیا یعنی کوہستان ہمالیہ تک ہم سفر کریں گے دوسرا سوال تمہارا یہ ہے کہ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں کیا کام کرنے ہوں گے۔

بچو اس پڑاؤ کے دوران جو کام تم کرتے رہے ہو اس کام کی نوعیت سے تم واقف ہی ہو۔ اس کام کے علاوہ تمہیں ہمارے ساتھ رہتے ہوئے ہمالیہ کی بلندیوں میں مختلف پودوں کی کھدائی کرکے جڑیں نکالنا ہوں گی تم لوگ جانتے ہو کہ ہم سنیاسی ہیں۔ مختلف قسم کی ادویات تیار کرتے ہیں اسی سلسلے میں ہم ہمالیہ کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں سے مختلف پودوں کی جڑیں حاصل کرتے ہیں جن سے ہم دوائیاں تیار کرتے ہیں وہی دوائیاں ہم گلی گلی کوچے کوچے بستی بستی شہر شہر گھوم کر بیچتے ہیں بنی نوع انسان کی بہتری اور بھلائی کا کام کرتے ہیں ساتھ ہی اپنے پیٹ کی بھی پوجا پاٹ کرلیتے ہیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد باوا تھوڑی دیر کے لئے رکا تھا اس کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا تھا۔

"میرے بچو۔ میں نے تمہیں یہ بتادیا کہ پڑاؤ اٹھانے کے بعد ہمارا رخ کس سمت ہوگا ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تم دونوں کو کیا کام کرنے ہوں گے اس کے علاوہ بھی میں تم پر انکشاف کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر تم دونوں لگاتار ہمارے ساتھ رہو تو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے آہستہ آہستہ جن جڑی بوٹیوں کا ہم راز رکھتے ہیں اور جن کا ہم کسی پر بھی انکشاف نہیں کرتے تم ان سے بھی واقف ہوجاؤ گے۔ اور پھر ہماری طرح تم بھی انتہائی خوشگوار زندگی بسر کرسکو گے اور اپنے اہل خانہ کے لئے روزی رزق کا اہتمام کرنے کے بھی قابل ہوجائیں گے۔ اب بولو تم ہمارے ساتھ جانے کے لئے کیا تیار ہوں میں تم دونوں کی یہ شرط بھی مانتا ہوں کہ تمہاری بستی کے کسی فرد کو بھی یہ نہیں بتایا جائے گا کہ تم ہمارے ساتھ کوچ کررہے ہو اور کوچ بھی آج رات کے وقت یہاں سے ہوگا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بوڑھا گورکن رمضان رکا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ خلاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر اپنے سامنے بیٹھے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ کہہ رہا تھا۔

"احمد بیٹے یوں میں اور حسن دونوں دوستوں دونوں مصاحبوں نے ان سنیاسیوں کے ساتھ جانے کا ارادہ کرلیا ہماری خواہش کے مطابق اسی روز جس وقت لوگ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے گھروں کو جاچکے تھے سنیاسیوں نے پڑاؤ کو ختم کردیا اور وہاں سے کوچ کیا۔ ان کے پاس خچریں اور گدھے تھے جن پر وہ خود بھی سوار ہوتے تھے اور اپنا سامان بھی لادتے تھے۔ سامان سے لدے ہوئے ایک خچر پر میں دوسرے پر حسن سوار ہوگیا تھا یوں وہ اجنبی کارواں ہماری بستی سے رات کی تاریکی میں کوچ کرتا ہوا کشمیر کے کوہستانی سلسلے کی طرف بڑھا تھا۔

جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں ان سنیاسیوں کے ساتھ ہم اپنے گھر والوں سے اجازت لئے بغیر گئے تھے چونکہ گھر والوں سے چوری ہم نے ان کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا تھا لہٰذا سردی کے باوجود ہم نے اپنے گھر سے اپنے لئے کوئی فالتو یا اچھے کپڑے نہیں لئے تھے۔ بلکہ جن عام سے کپڑوں میں ہم دونوں بھائی ان سنیاسیوں کی خدمت اور چاکری کیا کرتے تھے انہی کپڑوں میں ہم ان کے ساتھ روانہ ہوگئے تھے۔

جوں جوں رات گہری ہوتی گئی تھی سردی بھی زیادہ بڑھتی گئی تھی۔ جن خچروں پر میں اور حسن سوار تھے ان پر کافی کپڑے لدے ہوئے تھے ان میں سے کچھ چادریں نکال کر میں نے اور حسن نے اپنے اوپر لے لی تھیں۔ یوں وہ رات سردی میں کسی نہ کسی طرح کٹ گئی۔ اگلے دن کا کچھ حصہ سنیاسیوں نے ایک جگہ آرام کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر کوچ کرلیا تھا۔ اس طرح آرام اور کوچ کرتے ہوئے وہ کوہستانی سلسلے میں داخل ہوگئے تھے چونکہ موسم اپنے عروج پر تھا لہٰذا جس رات وہ

ان علاقوں میں داخل ہوئے جہاں برف باری تھی تو سردی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ ایک جگہ چاندنی رات میں سنیاسیوں نے پڑاؤ کیا۔ یہ پڑاؤ ایک چشمے کے قریب تھا چشمے کا پانی کوہستانی سلسلے کے اوپر سے گزرتے ہوئے نیچے جاکر چھوٹے سے تالاب کی صورت بناتا تھا اس کے بعد ایک کافی بڑی نالی کی صورت میں کوہستانی سلسلے کے نشیب کی طرف چلا جاتا تھا۔ بس پانی کے اسی چھوٹے سے حوض کے پاس سنیاسیوں نے پڑاؤ کیا تھا۔ خیمے نصب کردیئے گئے تھے۔ اور ٹاٹ کا بنا ہوا ایک بڑا سا شامیانہ تان کر اس کے نیچے خچروں اور گدھوں کو باندھ دیا گیا تھا پھر سنیاسیوں نے اس تالاب کے کنارے مخصوص گھاس کاٹ کر اپنے خچروں اور گدھوں کے آگے ڈال دی تھی۔

احمد بیٹے۔ میں تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ حسن جس کی روح اس بستی کے اطراف میں اب بھی سرگرداں رہتی ہے جس کو تم بھی کئی بار دیکھ چکے ہو وہ انتہائی سیانا، انتہائی عاقل بالغ نوجوان تھا۔ اس کے مقابلے میں یوں جانو میں بالکل کند ذہن سیدھا سادھا تھا۔ حسن کا باپ بھی بڑا تیز بڑا صاحب عقل بڑا دین دار اور ایک عالم شخص تھا۔ گو وہ بستی میں اپنے بیٹے حسن کے ساتھ چوکیدار کا ہی کام کرتا تھا لیکن تھا بڑا صاحب عقل اور صاحب علم۔

احمد میں تمہیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ہمارے پاس سردی کے لئے کپڑے نہیں تھے اور پھر اپنی زندگی میں ہم پہلی بار ایسے علاقوں میں داخل ہوئے تھے جہاں برف پڑی ہوئی تھی۔ لہٰذا حسن تو کسی نہ کسی طرح بچا رہا یا یوں جانو کہ وہ جسمانی صحت کے لحاظ سے مجھ سے بہت بہتر تھا اس بنا پر ابھی تک اس نے سردی کو برداشت کیا تھا لیکن جس وقت سنیاسیوں نے برف سے ڈھکے ہوئے کوہستانی سلسلے کے پاس ایک چشمے کے نواح میں پڑاؤ کیا تو سردی کے باعث مجھے بخار ہوگیا۔ میرا جسم کپکپانے لگا تھا دانت بجنے لگے تھے میری یہ حالت حسن نے بھی دیکھ لی تھی۔ لہٰذا وہ بھاگا بھاگا باوا کے پاس گیا اور اسے میری صورت حال سے آگاہ کیا۔

باوا نے بڑی ہمدردی اپنے خیمے سے نکل کر اپنی بھتیجی پاروتی کے ساتھ وہ میرے خیمے میں آیا۔ میری حالت دیکھی پھر وہ حسن کو پکڑ کر خیمے کے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔ ”تم اپنے ساتھی کا خاص خیال رکھنا اسے نمونیہ ہونے والا ہے دیکھو میں اسے دوائی دیتا ہوں وہ اسے کھلا دینا۔ مجھے امید ہے یہ فی الفور ٹھیک ہوجائے گا۔“

اس کے ساتھ ہی باوا اپنی بھتیجی پاروتی کے ساتھ باہر نکلا۔ حسن کو ان سنیاسیوں کے متعلق بڑی جستجو تھی۔ شاید اس نے اپنی بستی سے کوچ کرتے وقت ہی یہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ سنیاسیوں کے راز حاصل کرنے کی کوشش کرے گا یا ان کے پاس جو سربستہ علوم ہیں ان سے بہرہ مند ہوگا تاکہ اپنی آنے والی زندگی میں انہی علوم کو استعمال کرتے ہوئے اپنی بہتری اور بھلائی کے کام سرانجام دے۔ لہٰذا جس وقت باوا اپنی بھتیجی کے ساتھ میرے جھونپڑہ نما خیمے سے نکلا وہ خیمہ میرے اور حسن دونوں کے استعمال میں تھا تو خیمے کے دروازے کی اوٹ میں حسن کھڑا ہوگیا تھا اور دیکھنے لگا کہ باوا اور اس کی بھتیجی کدھر جاتے ہیں۔

وہ رات بڑی چاندنی تھی چاروں طرف چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر چیز عیاں اور نمایاں تھی۔ رات کے وقت کوہستانی سلسلے پر پھیلی ہوئی برف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ چشمے کا پانی ایک ترنم کے ساتھ گزرتا ہوا حوض کی طرف آرہا تھا باوا اور اس کی بھتیجی پاروتی دونوں چشمے کے اس حوض ہی کی طرف گئے تھے حسن بڑے غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

باوا پانی کے کنارے جاکر جھکا ایک گھاس کی چند پتیاں اس نے توڑیں پھر وہ لوٹا۔ اسے لوٹتا دیکھ کر حسن فوراً جھونپڑہ نما خیمے کے دروازے سے ہٹ کر میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ میرا بستر ننگے فرش پر لگا ہوا تھا اور میں اسی پر لیٹا ہوا تھا میرے بستر کے قریب ہی حسن کا بھی بستر تھا۔ باوا اپنی بھتیجی پاروتی کے ساتھ اندر آیا اور گھاس کی جو پانچ سات پتیاں اس نے توڑی تھیں

وہ اس نے حسن کو تھماتے ہوئے کہا۔

یہ پتیاں لو اور اس میں سے صرف تین اسے دو کہ یہ اپنے منہ میں چبا کر نگل جائے مجھے امید ہے ان پتیوں سے اسے آرام آجائے گا اور پھر بھی آرام نہ آئے تو دو پتیاں جو باقی بچی ہیں وہ بھی اسے کھلا دینا۔ اگر پھر بھی اس کی حالت نہ سنبھلے تو میرے خیمے میں آکر مجھے اطلاع دینا۔" اس کے ساتھ ہی باوا اپنی بیٹی کو لے کر اپنے خیمے کی طرف چلا گیا تھا۔

حسن پہلے بڑے غور سے گھاس کی ان پتیوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے تین پتیاں نکالیں میرے منہ میں ڈالیں اور مجھ سے کہا چبا جاؤ۔ میں نے وہ پتیاں چبا ڈالیں اور نگل گیا۔ ان پتیوں کے کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد میرے جسم میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا۔ سردی کے بجائے میں گرمی محسوس کرنے لگا میرا جسم پسینہ پسینہ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں یوں جاننے لگا جیسے مجھے گرمی کی چلچلاتی دوپہر میں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ اس وقت میں نے اپنے اوپر جو کمبل اوڑھ رکھے تھے وہ بھی اتار دیئے تھے۔

میری یہ صورت حال دیکھتے ہوئے احمد بیٹے میرا دوست حسن بڑا خوش ہوا۔ ایک طرح سے وہ متجسس اور پریشان بھی تھا۔ تین پتیاں وہ مجھے کھلا چکا تھا اور دو پتیاں جن کے ساتھ چھوٹے ڈنٹھل بھی تھے وہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اس موقع پر میں تو اپنے بستر پر ہی بیٹھا رہا لیکن حسن کے ذہن میں نہ جانے کیا سمائی کہ ڈنٹھل والی جو پتیاں اس کے ہاتھ میں تھیں وہ انہیں اپنی ہتھیلی میں لئے رات کے وقت اپنے خیمے سے نکلا چاندنی رات میں وہ تالاب کے کنارے گیا تھوڑی دیر تک وہ گھومتا رہا اس وقت تو میں اندازہ نہ لگا سکا لیکن بعد میں مجھے خیال ہوا کہ وہ انہیں پتیوں کی تلاش میں تھا جو باوا نے کاٹ کر مجھے کھلائی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد حسن مسکراتا ہوا لوٹا تھا۔ شاید اس نے اس گھاس کو پہچان لیا تھا جس کی پتیاں توڑ کر باوا نے مجھے کھلائی تھیں۔ یوں جانو اس غریب الوطنی میں اس کوہستانی سلسلے کے برف زادوں میں حسن کی یہ پہلی کامیابی تھی کہ وہ سنیاسیوں کا ایک راز حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ بعد میں اس گھاس کو حسن عام لوگوں کے لئے استعمال کرتا رہا۔ جنہیں سردی لگ جاتی تھی۔ یا جنہیں نمونیہ ہوتا تھا۔ یہ گھاس حسن انہیں کھلاتا تھا اور لمحوں کے اندر انہیں ٹھیک کر دیتا تھا۔ بہرحال یہ بعد کی باتیں ہیں۔ جو میں تفصیل سے تمہیں بتاؤں گا۔

"میرے بچے میں تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرا اپنا اندازہ ہے بلکہ مجھے پختہ یقین ہے کہ سنیاسیوں نے جوٹاٹ کے بنے ہوئے ایک بہت بڑے شامیانے کے نیچے اپنے خچروں اور اپنے گدھوں کو باندھا تھا تو ان کے آگے دوسری گھاس کے علاوہ اس گھاس کا کچھ حصہ بھی ڈالا گیا تھا جو گھاس مجھے کھانے کو دی گئی تھی تاکہ خچر اور گدھے اس برف باری میں سردی محسوس نہ کریں۔ بہرحال سنیاسیوں نے صرف ایک رات چشمے کے کنارے پڑاؤ کیا پھر اس کے بعد انہوں نے پھر سفر جاری رکھا۔ آخرکار منزل پر منزل مارتے ہوئے وہ سنیاسی ایک بلند کوہستانی سلسلے کے اوپر ایک روز صبح ہی صبح پہنچے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بوڑھا گورکن رمضان رکا کچھ سوچا پھر کہتا چلا گیا۔

"بیٹے۔ اس کوہستانی سلسلے کا منظر بھی خوب تھا۔ بادلوں کی اکثریت اس کوہستانی سلسلے کے نیچے تھی ہم اوپر تھے۔ کوئی بھولا بھٹکا بادلوں کا ٹکڑا اس کوہستانی سلسلے کے اوپر سے بھی گزرتا اور ہر چیز کو بھگوتا چلا جاتا تھا۔ بہرحال اس کوہستانی سلسلے کے اوپر سنیاسیوں نے پڑاؤ نصب کر دیا۔ خیمے بالکل قریب قریب رکھے گئے اور پھر جس وقت خیمے نصب ہو گئے باوا نے ہم دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ میں اور حسن دونوں باوا کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

باوا نے میرے اور حسن کے حوالے دو کدالیں اور دو بیلچے کئے اور ہم دونوں کو یہ حکم دیا کہ "سارے خیموں کے اردگرد ایک گہری کھائی کھود دیں اس کے بعد اس کھائی کے اندر کانٹے دار جھاڑیاں بھر دیں اور یہ کام شام سے پہلے پہلے ہو جانا چاہئے۔"

باوا نے مجھے اور حسن کو یہ بھی تنبیہ کی کہ اس کوہستانی سلسلے کے اوپر ایک انتہائی زہریلا سانپ ہوتا ہے یہ ایسا زہریلا سانپ کہ اگر وہ انسانی جسم کو مس بھی کرجائے تو انسان کو چکر آنے شروع ہوجائیں اور اگر بروقت اس کی پیش بندی نہ کی جائے تو اس کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔"

باوا کی اس گفتگو سے ہم بڑے خوف زدہ ہوئے باوا نے ہمیں مزید بتایا کہ کھائی کھودنے کے بعد اس میں کانٹے دار جھاڑیاں اس لئے بھرنی ہیں تاکہ رات کو جس وقت سب اپنے اپنے خیموں میں زمین پر سوئے ہوئے ہوں تو سانپ خیمہ گاہ میں داخل نہ ہوسکے۔ باوا کا کہنا تھا کہ سانپ جھاڑیاں عبور کرکے اندر نہیں آسکتا خیمہ گاہ میں داخل ہونے کے لئے ایک چھوٹا سا راستہ رکھا جائے گا اور رات سونے سے پہلے اس راستے کو بھی جھاڑیوں سے پاٹ دیا جائے گا۔

باوا کے حکم پر میں اور حسن دونوں حرکت میں آئے کدالیں اور بیلچے ہم نے سنبھالے اندھا دھند کام کرنے لگے میں اور حسن زیادہ سے زیادہ کام کرکے ان سنیاسیوں کی دل جوئی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ہماری بہتری کے لئے فراخدلی سے کام لیں۔ شام سے پہلے ہی پہلے خیمہ گاہ کے ارد گرد کافی گہری کھائی کھود کر اس کے اندر بیلچوں سے جھاڑیاں کاٹ کر میں اور حسن نے کھائی میں جھاڑیاں بھردی تھیں۔ ہماری اس کارگزاری سے باوا ہی نہیں سنیاسی بھی بے حد خوش ہوئے تھے۔"

یہاں تک کہتے ہوئے بوڑھا گورکن رمضان خاموش ہوگیا تھا تھوڑی دیر تک اس کی گردن جھکی رہی شاید وہ اگلے واقعات سے متعلق سوچ بچار کرنے لگا تھا۔ اس دوران احمد بڑے تجسس بڑے انہماک اور بڑی جستجو میں اس کی طرف دیکھے جارہا تھا چند لمحوں کے توقف کے بعد گورکن نے پھر کہنا شروع کیا۔

"بیٹے ان ہمالیائی بلندیوں پر پڑاؤ قائم کرنے کے بعد دو روز تک سارے سنیاسی آرام اور استراحت کرتے رہے۔ اس دوران ہمیں بھی آرام کرنے کا موقع فراہم کیا گیا تاہم جہاں پڑاؤ کیا تھا وہاں قریب ہی ذرا نیچے جاکر پانی کا ایک چشمہ تھا میرے اور حسن کے ذمے یہ کام تھا کہ دن کے وقت ہم وہاں سے پانی لے کر لکڑی کے بڑے بڑے ڈرموں میں بھردیتے تھے اور ضرورت کے وقت سنیاسیوں کو بڑے بڑے دیگچوں میں پانی بھی گرم کرکے دے دیتے تھے میں یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ حسن نے شاید سنیاسیوں کے ساتھ کوچ کرتے وقت ہی ایک مقصد ایک اپنے ذہن میں بیٹھا لیا تھا اس نے شاید تہیہ کررکھا تھا کہ وہ ہر صورت میں سنیاسیوں سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر رہے گا اس کا انکشاف اس نے مجھ پر بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ اسے شاید خطرہ تھا جیسا کہ بعد میں اس نے مجھ پر اظہار بھی کیا اسے ڈر تھا کہ کہیں اگر وہ اپنا راز مجھ پر فاش کردے تو سنیاسیوں کو بھی خبر نہ ہوجائے اور وہ ہمیں نقصان نہ پہنچائیں اسی بنا پر سنیاسی جب بھی کوئی غیر معمولی حرکت کرتے حسن بڑی گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لیتا جہاں تک میرا تعلق ہے میں پہلے ہی بتاچکا ہوں میں ذہنی طور پر بس یونہی ساتھا ویسے بھی شروع ہی سے میرے ذہن میں کوئی ایسا بات نہ تھی کہ میں نے ان سنیاسیوں سے کچھ حاصل کرنا ہے میں تو حسن کے ساتھ بس سنیاسیوں کے گروہ میں شامل ہوگیا تھا تاکہ میں اگر حسن کے ساتھ ان کی خدمت کروں تو شاید وہ مجھے خدمت کا صلہ دیں جن سے میں اپنے ماں باپ کی خدمت کرسکوں بہرحال دو دن کے بعد سنیاسیوں نے اپنے کام کی ابتداء کی۔

وہ اس طرح کہ دو دن بعد کافی رات گئے پڑاؤ میں آوازوں کا شور سن کر میری اور حسن کی نیند کھل گئی میرے اور حسن کے لئے ایک ہی خیمہ تھا جس میں ہم دونوں بھائی فرش پر بستر لگا کر سوتے تھے۔ جن آوازوں سے ہم چونک کر جاگے تھے وہ آوازیں سنیاسیوں اور ان کے بڑے باوا کی تھیں ان میں کبھی کبھی باوا کی لڑکی کی آواز بھی شامل ہوجاتی تھی۔

پہلے ان آوازوں پر چونک کر حسن جاگا تھا پھر اس نے مجھے بھی جگا دیا تھا۔ اس کے بعد حسن خیمے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگا۔

سارے سنیاسی تھوڑی دیر تک خیموں سے باہر باہم گفتگو کرتے رہے اس دوران میں نے اور حسن نے دیکھا پاروتی کے کندھے پر سرخ اور سفید رنگ کے کپڑے کی پٹیاں تھیں پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے آپس میں کچھ صلاح و مشورہ کیا پھر پڑاؤ کے اردگرد جو جھاڑیاں تھیں ایک جگہ سے جھاڑیاں اٹھا کر وہ باہر نکلے اور جھاڑیاں پہلے کی طرح انہوں نے اپنی جگہ پر کر دی تھیں ۔شاید انہوں نے پہلے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم گہری نیند سو رہے ہیں لہٰذا وہ خفیہ طور پر کسی مہم پر نکلے تھے۔

ان کے جانے کے بعد میں اور حسن نے بھی آپس میں صلاح و مشورہ کیا جب کوہستانی سلسلے کے اندر ہمیں ان کے دھندلے دھندلے نقوش نظر آئے تب ہم بھی خیمے سے نکلے باڑھ اٹھا کر باہر نکلے اور ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے پڑاؤ سے تھوڑی ہی فاصلے پر وہ سب رک گئے تھے میں اور حسن لیٹے ہی لیٹے ان کے قریب گئے پھر سارے سنیاسیوں نے پاروتی سے کچھ سرخ اور کچھ سفید پٹیاں لیں کچھ پٹیاں پاروتی نے بھی اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ اس کے بعد وہ سنیاسی اپنے ہاتھوں میں مشعلیں لئے مختلف جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے تھے میں اور حسن زمین پر رینگتے ہوئے مزید ان کے قریب گئے حسن ذہنی طور پر بڑا تیز تھا اس نے تاڑ لیا تھا کہ یہ کوئی اہم کام کرنے والے ہیں حسن اور میں نے دیکھا وہ سنیاسی اور پاروتی کچھ بوٹیوں کے ساتھ سرخ کپڑے اور کچھ کے ساتھ سفید کپڑے باندھنے لگے تھے میں اور حسن نے یہ بھی دیکھا کہ جس بوٹی کے ساتھ وہ سرخ کپڑا باندھتے تھے مشعلوں کی روشنی میں اس کے پتے چمکتے ہوئے اور سرخی مائل روشنی دیتے تھے اور جن بوٹیوں کے پتوں کے نزدیک وہ مشعل لاتے تھے اور اس کے پتے چمکتے ہوئے سفیدی مائل روشنی دیتے تھے ان کے ساتھ وہ سفید پٹیاں باندھنے لگے تھے۔ تاہم دونوں بوٹیوں کے پودے بالکل ایک جیسے تھے اور ان میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا بس جب مشعل ان کے قریب لے جاتے تھے تو کچھ سرخی مائل چمک دیتی تھیں کچھ سفیدی مائل یہی ان میں فرق اور امتیاز تھا۔ اور اسی فرق اور امتیاز کو سامنے رکھتے ہوئے وہ سنیاسی اور پاروتی ان بوٹیوں کے ساتھ سفید اور سرخ کپڑے باندھنے لگے تھے۔

کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا جب میں اور حسن نے اندازہ لگایا کہ ان کے پاس جس قدر سرخ اور سفید پٹیاں تھیں وہ ختم ہونے والی ہیں تب بڑی تیزی کے ساتھ رینگتے ہوئے ہم پیچھے ہٹے پھر پتھروں کی اوٹ میں جانے کے بعد ہم کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے اپنے پڑاؤ میں داخل ہونے کے بعد خیمے میں جا کر اس طرح لیٹ گئے تھے جس طرح ہم گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔

ہمارے پیچھے تھوڑی ہی دیر بعد سنیاسی اور پاروتی بھی پڑاؤ میں آئے ان میں سے کچھ سنیاسیوں نے ہمارے خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اس وقت گو ہم جاگ رہے تھے۔ اپنے چہروں پر ہم نے ہاتھ رکھے ہوئے تھے پر سنیاسیوں نے یہ جان کر کہ ہم گہری نیند سوئے ہوئے ہیں مطمئن ہو گئے اس کے بعد وہ بھی اپنے خیموں میں جا کر آرام کرنے لگے تھے۔

اگلے روز میں اور حسن دونوں صبح سویرے اٹھ گئے تھے میں اور حسن نے مل کر نماز پڑھی تھی تاہم ان میں جو مسلمان سنیاسی تھے وہ بھی سویرے اٹھ کر ہمارے ساتھ فجر کی نماز ادا کرنے لگے تھے باقی سنیاسی اور پاروتی کافی دن گئے تک اپنے خیموں میں سوتے رہے جب دن کافی چڑھ آیا تب بڑا باوا اور دوسرے سنیاسی اٹھے پہلے سب نے مل کر کھانا کھایا اس وقت تک سورج سر پر آ چکا تھا پھر باوا نے مجھے اور حسن کو بلایا میں اور حسن جب باوا کے سامنے گئے تو باوا نے پہلے ہم دونوں کا بغور جائزہ لیا پھر ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”بچو! گزشتہ رات تم گہری نیند سوئے ہوئے

تھے۔ اور ہم نے گزشتہ رات اپنی مہم کا آغاز کر دیا تھا ہم چونکہ سارے سنیاسی رات کو جاگنے کے عادی ہیں لہٰذا ہم نے گزشتہ شب اپنے کام کی ابتدا کی تم جانتے ہو ہم سنیاسی ہیں جڑی بوٹیوں سے کھیلتے ہیں رات کے وقت میں پاروتی اور میرے ساتھی سنیاسیوں نے کچھ بوٹیوں کے ساتھ سرخ اور سفید کپڑے باندھ دیئے ہیں تمہیں اس لئے نہیں جگایا کہ تم لوگ جاگنے کے عادی نہیں ہو ویسے بھی جس وقت ہم بوٹیوں کی تلاش میں گئے تم دونوں گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس لئے ہم نے جگانا مناسب نہیں سمجھا میں اور میرے ساتھی سنیاسی چونکہ رات کے وقت اپنے کام کی تکمیل کر چکے ہیں لہٰذا اب تم دونوں کے کام کی ابتداء ہوگئی۔"

یہاں تک کہنے کے بعد دم لینے کے لئے گورکن رمضان رک گیا تھا تھوڑی دیر تک وہ بغور اپنے سامنے بیٹھے احمد کی طرف دیکھتا رہا کچھ سوچا مناسب الفاظ تلاش کئے اس کے بعد دوبارہ اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

احمد تو میں کہہ رہا تھا باوا نے ہم سے کہا کہ وہ گزشتہ شب اپنے کام کی تکمیل کر چکے ہیں لہٰذا اب میرے اور حسن کے کام کی ابتداء ہوگئی ساتھ ہی باوا نے ہمیں اپنے خیمے میں ساتھ لے جا کر مجھے اور حسن دونوں کو دو لمبے پھل والے کھرپے دیئے اور پھر ہم دونوں کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اور حسن باوا کے ساتھ ہو لئے تھے پاروتی بھی ہمارے ہمراہ تھی۔ باقی سارے سنیاسی بھی ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے۔ باوا ہمیں اس جگہ لے گیا جہاں وہ رات کو بوٹیوں کے ساتھ سرخ اور سفید پٹیاں باندھ رہے تھے۔ ان بوٹیوں کے پاس جانے کے بعد باوا رکا۔ کچھ دیر وہ ان بوٹیوں کا جائزہ لیتا رہا پھر میری اور حسن کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"بچو! یہ تم اپنے سامنے دیکھتے ہو کچھ بوٹیوں کے ساتھ سفید پٹیاں بندھی ہیں کچھ کے ساتھ سرخ، حسن تم ان جڑی بوٹیوں کو کھرپے سے نکالنا شروع کرو جن کے ساتھ سرخ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور تم سفید پٹی والی بوٹیوں کو اپنے اس کھرپے سے کھودنا شروع کرو۔ ایک احتیاط رکھنا۔

اور وہ یہ کہ جب تم ان پودوں کو کھودو گے تو ان کے نیچے گانٹھ دار جڑیں نمودار ہوں گی کسی گانٹھ کو نقصان نہیں پہنچانا۔ سات گانٹھ تک برابر پودے کو کھودنا ہے۔ اس کے بعد تمہاری مرضی کھودو نہ کھودو۔ اگر پودے کو کھینچو اور وہ باہر نکل آتا ہے تو ٹھیک ورنہ ساتویں گانٹھ کے بعد پودے کی جڑ کو کاٹ کر اوپر کھینچ لینا۔ لیکن ہر دو پودے کو کم از کم سات گانٹھوں تک نیچے لے جانا ہے۔ سات سے کم گانٹھ نہیں رکھنی۔

دوسری بات یہ کہ چوتھی یا پانچویں گانٹھ کے آس پاس ان بوٹیوں تلے سانپ بھی پایا جاتا ہے جو انتہا درجہ کا زہریلا ہے وہ اگر ڈس لے تو عام آدمی ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر وہ سانپ صرف انسانی جسم کے ساتھ مس بھی کر جائے تب بھی اس کے جسم میں زہر گھل جاتا ہے اور بندہ سسک سسک کر مر جاتا ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ باوا تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ پھر وہ اپنے دائیں جانب گیا اور دو مختلف بوٹیوں کے اس نے پتے توڑے اس موقع پر میں نے حسن کی طرف دیکھا بڑی تیز نگاہوں سے وہ باوا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن بوٹیوں کے پتے توڑ کر باوا لایا تھا ان میں سے ایک پتے پالک جیسے تھے لیکن چھوٹے بڑے باریک اور پتلے دوسرے کے پتے گاجر جیسے تھے۔ گاجر کے پتے بالکل چھوٹے اور پتلے ہوتے ہیں اس کے پتے بھی گاجر جیسے چھوٹے ہی تھے پر بہت موٹے تھے۔

حسن نے بغور دیکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ باوا نے ان کے قریب ہی کن بوٹیوں کے پتے توڑے ہیں۔ پتے لے کر باوا میرے اور حسن کے قریب آیا پھر دونوں قسم کے پتوں کو اس نے دو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ دونوں قسم کے کچھ پتے اس نے میری جیب میں کچھ حسن کی جیب میں ڈالے پھر کہنے لگا۔

"بچو! اگر تم میں سے کسی کو سانپ ڈس لے

تو جو پتے پالک جیسے ہیں چبالینا اور جس جگہ سانپ کاٹے اس جگہ یہ جو پتے گاجر کے پتوں کی مانند ہیں۔ یہ مڑوڑ کر زخم پر رکھ دینا۔ تم میں سے جس کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آئے اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اور اگر سانپ تم میں سے کسی کے جسم سے مس کر جائے تب بھی یہ جو پالک جیسی پتیاں ہیں انہیں کھالینا تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

اس کے بعد باوا پاروتی اور دوسرے سنیاسیوں نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر بڑا سا ایک ٹاٹ بچھایا اور اس پر بیٹھ گئے تھے میں نے اس موقع پر حسن کی طرف دیکھا۔

جیب سے دونوں قسم کی پتیاں نکال کر تھوڑی دیر تک بڑے غور سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کھرپا اٹھایا تھوڑی دیر تک وہ اپنے سامنے ان پودوں کو دیکھتا رہا۔ جن کے ساتھ سرخ اور سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ پودے قد کاٹھ میں بالکل چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان کا پھیلاؤ زمین پر نہیں تھا وہ سیدھے زمین سے اٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد حسن تھوڑا سا بائیں جانب ان بوٹیوں کی طرف گیا جن کے پتے نوچ کر باوا نے دونوں کی جیبوں میں ڈالے تھے۔ لمحہ بھر کے لئے اپنی جیب میں رکھے پتوں اور ان بوٹیوں کی طرف حسن غور سے دیکھتا رہا۔ شاید اس نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ پتے ان بوٹیوں میں سے کن کن کے تھے۔ جب وہ ایسا کر چکا تو میں نے دیکھا حسن کے چہرے پر بڑی خوشگوار مسکراہٹ تھی پھر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ جن بوٹیوں کے ساتھ جن پودوں کے ساتھ سرخ پٹیاں بندھی تھیں انہیں حسن کھودنے لگا سفید پٹیوں والی جڑی بوٹیوں کی کھدائی میں کرنے لگا سات سات گانٹھوں کے بعد ہم پودے کو یا تو جڑ سے اکھاڑ لیتے تھے۔ یا کاٹ لیتے تھے اور جو سرخ اور سفید پٹیاں ان کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں وہ باوا کی ہدایت کے مطابق ہم اتارتے نہیں تھے۔

لگ بھگ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ پودوں کے بعد سفید اور سرخ پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ میں کوئی پینتیس پودے اکھیڑ چکا ہوں گا کہ ایک دم ایک پودے کی میں نے چارہی گانٹھیں کھودی تھیں کہ چھوٹا سا ایک سانپ برقی کوندے کی طرح سرسراتے ہوئے نکلا وہ میرے جسم کے ساتھ مس بھی ہوا اور بازو پر اس نے کاٹ بھی لیا تھا۔ اس سانپ کا کاٹنا تھا کہ مجھے چکر آنا شروع ہوگئے میں چیخ پڑا حسن اس موقع پر میرے قریب ہی تھا وہ اپنی جگہ سے بھاگ کر اٹھا جو بوٹی پالک کے پتوں جیسی تھی وہ فوراً اس نے میرے منہ میں ڈالی میں اسے چبانے لگا، گاجر کے پتوں جیسی جو بوٹی تھی وہ اس نے میری نشاندہی پر اس جگہ رکھ دی جہاں سانپ نے مجھے ڈسا تھا اس کے علاوہ پاروتی اور دیگر سنیاسی بھی میرے قریب آ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ حسن کی اس چابکدستی اس کی تیزی اور بروقت میری امداد پر سب حسن کو توصیفی انداز میں دیکھ رہے تھے۔

جس وقت سانپ میرے جسم سے مس ہوا تھا اس وقت مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے جسم میں کسی نے برق کے کوندے اتار دیئے ہوں۔ اور جس وقت سانپ نے مجھے ڈسا تھا بازو میں ایسی شدت کی درد اٹھی تھی جو الفاظ میں، میں بیان نہیں کرسکتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر حسن اپنی جگہ سے اٹھ کر بروقت پتے میرے منہ میں نہ ڈالتا تو ہوسکتا ہے مجھ بدحواس کو اتنی بھی توفیق نہ ہوتی کہ میں اپنی جیب سے پتے نکال کر اپنے منہ میں ڈالتا۔ یا دوسرے قسم کے پتے نکال کر اس جگہ رکھتا ہوں سانپ نے ڈسا تھا۔ بہرحال یہ دونوں فعل چونکہ بروقت حسن نے انجام دے دیئے تھے لہٰذا پتے کھانے کے بعد سانپ کے ڈسنے سے جو خطرناک کیفیت مجھ پر طاری ہونا شروع ہوگئی تھی۔ لمحوں کے اندر ختم ہوگئی جو پتے بازو پر زخم کی جگہ حسن نے رکھے تھے انہوں نے بھی ایسا رنگ دکھایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے وہاں نہ کوئی درد رہا میں ایسا محسوس کررہا تھا جیسے میرے ساتھ نہ کوئی حادثہ پیش آیا ہو نہ کوئی سانپ میرے ساتھ مس ہوا ہو۔ نہ مجھے کسی سانپ نے ڈسا ہو۔ اس کے بعد میں پھر کسی تندرست

انسان کی طرح وہ جڑیں کھودنے لگا تھا۔

شام تک ہم یہ کام سرانجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جتنی بوٹیوں کے ساتھ سرخ اور سفید کپڑے باندھے گئے تھے وہ سارے ہم نے اکھاڑ ڈالے۔ جب یہ سارا کام ہو چکا تب سرخ اور سفید بوٹیوں کو علیحدہ کردیا گیا اوران کے ساتھ بندھے ہوئے سرخ سفید کپڑے بھی اتار لئے گئے۔

اب باوا اور سنیاسی اور پاروتی سب مل کر سرخ سفید کپڑے باندھتے اوراگلے روز ہم کھدائی کرتے اس طرح ہفتہ بھر یہ کام جاری رہااور پڑاؤ کے آس پاس دوقسم کے ان بوٹیوں کے ڈھیر لگادیئے گئے تھے۔ جو بوٹیاں ہم نے اکھیڑی تھیں وہ خشک ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

آخر خدا خدا کرکے یہ کام اپنے انجام کو پہنچا۔

اس کے بعد مزید سات آٹھ دن تک باوا اوراس کے ساتھی سنیاسی مجھ سے اور حسن سے دوسری مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اکٹھی کرواتے رہے اورہم یہ سارا کام جوش وخروش سے کرتے رہے۔ اس دوران حسن پریشان اور متجسس تھا، جونئی بوٹیاں ہم کھرپوں کی مدد سے اکٹھی کررہے تھے اس کے متعلق حسن کوابھی تک کچھ معلوم نہ ہوسکا تھاوہ کس نوع کی ہیں اور کس کام آتی ہیں۔ تاہم وہ بڑی جانفشانی کے ساتھ میرے ساتھ کام میں مصروف رہااس طرح کوئی ایک ماہ تک وہ سنیاسی ان ہمالیاتی بلندیوں میں مختلف جڑی بوٹیاں تلاش کرتے رہے اورہم سے وہ بوٹیاں کھدواتے ہوئے جمع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کام ختم ہوا۔

جوسفید اور سرخ کپڑوں والی بوٹیاں تھیں وہ توباوا اور سنیاسیوں نے دھوپ میں خشک ہونے کے لئے رکھ دی تھیں اور بعد میں جو بوٹیاں ہم سے کٹوائی گئی تھیں۔ انہیں جس دن کٹوایا جاتا اس کے دوسرے روز انہیں سائے میں رکھ کر مجھ سے اورحسن سے ان کے پتے علیحدہ علیحدہ کروائے جاتے ہیں اس عمل سے حسن ان ساری بوٹیوں کو پہچان کر گیا تھا۔ جواس دوران ہم نے ان سنیاسیوں کے لئے کاٹی تھیں۔ پھر حسن روز یہ کام تمام ہوااس سے ایک روز پہلے سارادن حسن اور مجھ سے کام لیا جاتا رہا۔ شاید باوا یہ کام جان بوجھ کر ہم سے لے رہا تھا۔ یہ کام چونکہ معمول سے زیادہ تھا کبھی وہ ہمیں پانی لانے کو کہتا۔ کبھی وہ مزید جھاڑیاں کاٹ کر خیمہ گاہ کے اردگرد رکھنے کو کہتا۔ حالانکہ جھاڑیاں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی بہرحال اس نے سارادن ہمیں مصروف رکھا۔ اس غیر معمولی کام سے حسن چونکا تھا میں پہلے ہی بتاچکا ہوں کہ میں چونکہ ذہن کا کمزور تھا۔ لہٰذا میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے میں بس کولھو کے بیل کی طرح جتا ہوا تھا بس کام کرتا رہا۔

تاہم حسن کا ماتھا ٹھنکا تھا کہ آخر وہ سنیاسی اس روز معمول سے زیادہ کام کیوں لے رہے ہیں۔ جب سورج غروب ہوا تب باوا نے مجھے اور حسن کو بلایا اور کہنے لگا۔

”بچو! آج سارادن تم نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے بڑی محنت کی ہے بڑا کام کیا اب تمہارا کام ختم ہوچکا ہے تم دونوں آنے والی شب اپنے خیمے میں مکمل آرام کرو۔ ہم سب ساتھی رات کے وقت ان سب بوٹیوں کو جمع کریں گے۔ جو کہ اب تک ہم نے کاٹی ہیں۔ اورانہیں آپس میں بانٹیں گے۔“

باوا کی اس گفتگو سے میں تو بے بہرہ ہی رہا سستی کا مارا پڑا ہی رہا پر حسن بڑا تیز بڑا چالاک تھا وہ سمجھ گیا تھا کہ باوا اوراس کے ساتھی سنیاسی رات کو کچھ کرنے والے ہیں۔ اس وقت تو اس نے باوا کی بات مان لی۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں اپنے خیمے میں گہری نیند سو گئے جس وقت باوا نے اندازہ لگایا کہ ہم دونوں گہری نیند سوچکے ہوں گے تب تو خیمہ گاہ کے سامنے جو کھلی جگہ تھی وہاں جمع ہوئے۔ پہلے وہاں پتھروں کا ایک چولہا بنایا گیا اس چولہے میں آگ روشن کی گئی۔“

یہاں تک کہنے کے بعد گورکن رمضان رک گیا تھا۔ یہ سارے حالات سنتے ہوئے سامنے بیٹھے احمد کی جستجو اور کریدنی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا گورکن رمضان جب رکا تو بڑی بے تابی سے احمد بول پڑا۔

"رمضان چچا کو نہیں جو سلسلہ تم نے جاری کیا ہوا ہے اسے جاری رکھو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس سے آگے کیا ہوا۔"

احمد کے ان الفاظ سے بوڑھے رمضان کے چہرے پر لحہ بھر کے لئے مسکراہٹ کھیل گئی تھی تھوڑی دیر تک وہ بڑی شفقت سے احمد کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے وہ بولا۔

"احمد بیٹے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہون کہ میں ذہن کا کمزور ہوں اس لئے میں نے شروع ہی سے ان کاموں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جو باتیں میں تم سے کہنے لگا ہوں وہ بعد میں مجھ سے حسن نے کہیں تھیں میں اپنے بستر پر ہی لیٹا رہا سردی بہت تھی میں جھونپڑے سے باہر نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لیکن حسن کمبل اوڑھ کر خیمے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ جس جگہ آگ روشن کی گئی وہ جگہ بالکل ہمارے خیمے کے قریب تھی۔ حسن دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرنے لگے ہیں۔ میں اس لئے اپنے بستر میں دبکا رہا اور دلچسپی نہ لی کہ جب حسن جان جائے گا تو مجھے بھی بتا دے گا اس لئے میں نے کوئی چنداں ضرورت محسوس نہ کی کہ میں خیمے کے دروازے پر جا کر دیکھوں کہ پڑاؤ کے سامنے سنیاسی کیا کرنے لگے ہیں۔

آگ روشن کرنے کے بعد اس کے اوپر سنیاسیوں نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کڑاہی رکھی۔ کچھ دیر تک آگ جلتی رہی یہاں تک کہ وہ کڑاہی خوب گرم ہو گئی۔ اس موقع پر باوا کے علاوہ اس کی بھتیجی پاروتی اور سارے سنیاسی آگ کے اس چولہے کے گرد جمع تھے جب کڑاہی خوب گرم ہو گئی تب باوا نے اپنے لباس کے اندر سے تھوڑا سا سونا نکال کر تپتی ہوئی اس کڑاہی میں ڈالا۔ اس کے بعد اس نے اپنے لباس کے اندر سے ایک چاقو نکالا اور وہ جڑی بوٹیاں جن کے ساتھ سرخ کپڑے بندھے ہوئے تھے اس کی ایک گانٹھ بھی اس نے کاٹی اس گانٹھ کو اس نے لوہے کے دستے سے موٹا موٹا سا کوٹا۔ اس کے بعد کٹی ہوئی اس گانٹھ کو اس نے تپتی ہوئی اس کڑاہی میں ڈال دیا تھا جس میں تھوڑی دیر پہلے اس نے سونا ڈالا تھا۔

تھوڑی دیر تک یہ عمل جاری رہی یہاں تک کہ وہ گانٹھ بالکل ختم ہو گئی اور سونا اپنا حجم اور وزن میں دوگنا ہو گیا۔ اس عمل سے حسن نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ سرخ کپڑے والی گانٹھیں جو ہیں وہ اگر ایک گانٹھ گرم سونے میں ڈالی جائے تو وہ سونے کو دوگنا کر دیتی ہے۔

اس کے بعد سنیاسیوں نے دوسرا تجربہ کیا۔ حسن وہیں کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا انہوں نے سونا نکال کر اتنی ہی وزن کی چاندی تپتی ہوئی کڑاہی میں ڈالی اس کے بعد باوا نے چاقو سے ایک گانٹھ ان بوٹیوں کی کاٹی جن کے ساتھ سفید کپڑے بندھے ہوئے تھے۔ اسے موٹا موٹا دستے سے کوٹا پھر کڑاہی میں ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد پہلی گانٹھ کی طرح وہ بھی گانٹھ غائب ہو گئی اور جو چاندی کڑاہی میں ڈالی تھی وہ دوگنی ہو گئی تھی۔

یہ دونوں تجربے کرنے کے بعد باوا سنیاسی اور پاروتی حرکت میں آئے خیمے میں جا کر سنیاسی باوا پاروتی چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لے آئے پھر انہوں نے سرخ اور سفید کپڑے والے بوٹیوں کی گانٹھیں کاٹنا شروع کر دی تھیں کافی دیر تک وہ یہ عمل کرتے رہے گانٹھیں علیحدہ کرنے کے بعد اوپر جو شاخیں اور پتیاں تھیں وہ انہوں نے ایک طرف پھینک دی تھیں میں اپنے بستر میں اونگھتا رہا سردی کے باوجود حسن دروازے پر کھڑا رہا ساری گانٹھیں کاٹنے کے بعد سنیاسیوں اور باوا نے وہ گانٹھیں آپس میں برابر برابر تقسیم کر لی تھیں۔

جب وہ باوا اور سنیاسی اٹھ کر اپنے خیموں کی طرف جانے لگے تو حسن بھی چپکے سے اپنے بستر میں گھس گیا تھا۔ اس طرح وہ رات گزر گئی۔

اگلے روز باوا نے پھر ہمیں بلایا اور ان دو بوٹیوں کے علاوہ جو ہم نے دوسری بے شمار بوٹیاں کاٹی تھیں اور جنہیں باوا اور سنیاسیوں نے سائے میں رکھا ہوا تھا۔

باوا نے ہمیں حکم دیا کہ ان ساری بوٹیوں کو علیحدہ علیحدہ رکھتے ہوئے ان کے پتے ان سے جدا کریں

اور چتوں کو بھی علیحدہ علیحدہ رکھیں اس کام کی نگرانی پر باوا نے اپنی بھتیجی پاروتی کو مقرر کیا تھا میں نے دیکھا حسن پاروتی کی موجودگی میں بڑی برق رفتاری سے کام کرتا تھا اور جب پاروتی ادھر ادھر ہوجاتی تو وہ اپنی رفتار کم کردیتا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ حسن اپنی طرف سے پوری کوشش کررہا تھا کہ پاروتی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے یا اسے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ اس طرح چند روز تک ان بوٹیوں کے پتے علیحدہ علیحدہ کرکے ہم ڈھیر کرتے رہے اس دوران پاروتی ہمارے ساتھ رہی پاروتی نے جب حسن کو آندھی اور طوفان کی طرح کام کرتے دیکھا اور جو بھی کام پاروتی کہتی وہ بھاگ بھاگ کر دوڑ دوڑ کر کرتا تو حسن کی یہ محنت اس کی یہ جدوجہد رنگ لائی میں نے دیکھا پاروتی اب اکثر و بیشتر حسن کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے خوش بھی ہوتی تھی قہقہے بھی لگاتی تھی اس طرح جب دن گزرنے لگے تو یہ بات یقینی حد تک پہنچ گئی کہ پاروتی حسن کو پسند کرنے لگی تھی۔

گورکن رمضان تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا اس کے بعد اس نے ایک لمحہ کے لئے اپنے سامنے بیٹھے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔

''بیٹے شروع میں حسن نے باوا کی بھتیجی پاروتی کو اپنی طرف مائل کرنے اور اس کے سامنے بھاگ بھاگ کر کام کرنے اور انتہائی جوش اور جذبہ دکھانے کا مدعا صرف یہ رکھا تھا تاکہ جن جڑی بوٹیوں سے متعلق وہ تفصیل حاصل نہیں کرسکا وہ پاروتی سے جان سکے۔ وہ یہ تو جان چکا تھا کہ اگر برف باری میں سردی لگ جائے تو کس گھاس کا ڈنٹھل کھایا جائے تو جسم پسینہ پسینہ ہوجائے وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ سانپ کے کاٹے کے لئے کون سی بوٹی کارآمد ہے وہ یہ بھی جان چکا تھا ہے سونا دگنا کرنے اور چاندی دگنا کرنے کے لئے کس بوٹی کی جڑیں کارآمد ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ سنیاسیوں نے جو ہم سے جڑی بوٹیاں کٹوائی تھیں۔ اور انہیں سائے میں رکھنے کے بعد ان کے پتے ہم سے وہ علیحدہ کروا رہے تھے ان سے متعلق حسن کچھ نہیں جان سکا تھا۔ شروع میں پاروتی کو اپنی طرف مائل کرنے سے اس کا مقصد یہی تھا کہ جن بوٹیوں سے متعلق وہ نہیں جان سکا اگر پاروتی اس کے قریب ہوجائے تو وہ پاروتی سے سارے راز جان سکتا ہے لیکن آہستہ آہستہ پاروتی اور حسن دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت اور الفت میں کھو گئے تھے۔

ان سارے سنیاسیوں نے چند ہفتوں تک انہیں ہمالیائی چوٹیوں پر قیام کئے رکھا جب جڑی بوٹیوں کے پتے علیحدہ ہوگئے تب وہ پتے بھی انہوں نے آجس میں بانٹ لئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ایک مجلس منشور کی جس میں سارے سنیاسیوں کے علاوہ پاروتی اور ہم دونوں بھی شامل ہوئے۔ اب انہوں نے اپنے کوچ کا پروگرام بنانا شروع کیا تھا۔

کوچ اس طرح ہوا کہ دو دو سنیاسیوں کو یکجا کیا گیا اور ان کے لئے مختلف شہر مختص کردیئے گئے یہ سارا کام ان کا باوا سرانجام دے رہا تھا۔

باوا اور اس کے ساتھ ایک دوسرے سنیاسی کے حصے کشمیر کے کچھ شہر اور سری نگر آیا کچھ دوسرے سنیاسیوں کو لاہور دہلی اور دیگر شہروں کی طرف جانے کے لئے کہا گیا۔ جب سنیاسیوں کو یہ بتادیا گیا کہ کس کس نے کس کس شہر کی طرف جانا ہے تب باوا نے ایک سال بعد کی تاریخ مقرر کی یہ وہ تاریخ تھی جس تاریخ کو لاہور میں داتا کا عرس لگتا ہے باوا نے یہ حکم دیا تھا کہ داتا کے عرس کے دنوں میں سارے سنیاسی لاہور میں داتا دربار کے سامنے جمع ہوں گے اس کے بعد اپنے نئے لائحہ عمل کا آغاز کیا جائے گا۔

میرے اور حسن سے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ باوا بوڑھا ہے لہٰذا مجھے اور حسن دونوں کو باوا کی خدمت پر لگادیا گیا اس طرح ہم نے بھی باوا اور ایک دوسرے سنیاسی کے ساتھ کشمیر کے مختلف شہروں کی

طرف جانا تھا۔ جب یہ سارا لائحہ عمل اپنی آخری شکل کو پہنچا تب سارے سنیاسی ان ہمالیائی بلندیوں سے اپنے اپنے شہروں کو کوچ کر گئے تھے۔"

ان سنیاسیوں کے ساتھ سفر کرنا بڑا آسان تھا نہ گرمی کا ڈر نہ سردی کا خطرہ اگر سردی محسوس ہو تو باوا کے پاس اس گھاس کا کافی ذخیرہ تھا۔ جو سردی اور برف باری کے باوجود انسانی جسم کو پسینہ پسینہ کر کے رکھ دیتا تھا اور یہ گھاس خفیہ طور پر حسن نے بھی اپنے پاس جمع کر لی تھی بہر حال سفر جاری رہا سری نگر کی طرف جاتے ہوئے جب میں دونوں سنیاسی حسن اور پاروتی ایک بلند چوٹی سے ہوتے ہوئے نشیب اور پستی کی طرف اترنے والے تھے تب دوران گفتگو باوا اور اس کے ساتھ سنیاسی کو شک ہی نہیں یقین ہو گیا کہ حسن ان کی جڑی بوٹیوں کے خواص سے آگاہ ہو گیا ہے شاید یہ صورت حال گفتگو کے دوران احتیاط نہ برتنے کی وجہ سے پیش آ گئی تھی۔ بہر حال یہ امر طے شدہ تھا کہ باوا اور اس کے ساتھی سنیاسی کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ حسن کچھ بوٹیوں کے خواص سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس وقت تو نہ باوا اور اس کے ساتھ سنیاسی نے اس بات کا اظہار کیا نہ حسن اور مجھ ہی یہ احساس ہوا کہ جس وقت ہم بلند چوٹی پر گفتگو کرتے ہوئے نشیب میں اتر رہے تھے تو گفتگو کے دوران باوا اور اس کے ساتھی کو حسن پر شک ہو گیا تھا ان دونوں نے اپنے چہرے پر کوئی اس طرح کے تاثرات نہیں آنے دیئے تھے۔

نشیب میں اترنے کے بعد پھر ہم نے ایک کوہستانی سلسلے پر چڑھنا شروع کیا سنیاسیوں کے خچر بہت توانا تھے۔ یہاں تک کہ ہم ایک ایسے بلند سلسلے کے اوپر گئے جہاں بادل گہری دھند کی صورت میں چھائے ہوئے تھے اس وقت دن تمام ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہونے کے لئے مغرب کی طرف جھک رہا تھا آسمان پر تاریکیاں پھیلنے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں شفق کے حاشیے سرخ ہونا شروع ہو گئے تھے باوا نے اس کوہستانی سلسلے کی چوٹی پر پڑاؤ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لہٰذا وہاں خیمے نصب کر دیئے گئے۔

میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرے اپنے ذاتی خیال کے مطابق اس وقت باوا اور اس کے ساتھی سنیاسی کو یہ بھی شک ہو گیا تھا کہ باوا کی بھتیجی پاروتی اور حسن ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بہر حال اس وقت تک باوا اور اس کے ساتھی سنیاسی نے اپنے چہرے اپنے اطوار اپنی گفتگو سے کسی قسم کا شک شبہ ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔

کوہستانی سلسلے کی جس چوٹی کا میں نے ذکر کیا ہے جس کے اوپر ہم نے پڑاؤ کیا تھا میں بتا چکا ہوں اس کے اوپر کہر کی صورت گہرے بادل پھیلے ہوئے تھے۔ باوا نے مجھے اور حسن کو خیمے نصب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے لکڑیاں کاٹ کر پڑاؤ کرنے کے لئے کہا خود وہ اپنے ساتھی سنیاسی کے ساتھ ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور دونوں مل کر آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ اس دوران میں نے دیکھا حسن چور نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا حسن کے ساتھ باوا کی بھتیجی پاروتی بھی ہمارے ساتھ کام میں مصروف تھی اور حسن کے ساتھ ساتھ وہ بھی عجیب سے انداز میں اپنے چچا اور دوسرے سنیاسی کی طرف دیکھ رہی تھی اس موقع پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ حسن اور پاروتی دونوں رازدارانہ سرگوشی بھی کرتے جا رہے تھے جسے میں ذرا فاصلے پر ہونے کی وجہ سے سن نہ سکا تھا۔

سب سے پہلے ہم نے وہاں خیمے نصب کئے پھر باوا کے کہنے پر ہم نے کلہاڑے لئے اور کچھ لکڑیاں کاٹ کر ہم نے وہاں ڈھیر کرنی شروع کیں پاروتی حسن سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی کہ جو لکڑیاں میں اور حسن کاٹ رہے تھے۔ وہ اٹھا کر خیمہ گاہ کے آگے رکھنے لگی تھی اس کی اس حرکت کو باوا ہی نہیں دوسرا سنیاسی بھی ناپسند کر رہا تھا دو ایک بار باوا نے پاروتی کو اپنے پاس بلایا اور بیٹھنے کے لئے کہا لیکن پاروتی پھر اٹھ جاتی اور ہمارے ساتھ کام میں لگ جاتی یوں ہم نے خیمہ گاہ کے آگے لکڑیوں کا ڈھیر لگا کے آگ

جلادی تھی۔ جب آگ جل چکی تب باوا اور دوسرا سنیاسی دونوں خیمے میں داخل ہوئے۔

ان دونوں کی ان حرکات کو سب سے زیادہ مشکوک انداز میں پاروتی دیکھ رہی تھی۔ اور پاروتی کے اطوار دیکھتے ہوئے حسن بھی تشویش میں مبتلا تھا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں حسن مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا بڑا توانا بڑا جفاکش اور بڑا زوردار جوان تھا۔ خیمے میں داخل ہونے کے بعد باوا اور سنیاسی دونوں آگے پیچھے باہر آئے باوا سیدھا حسن کی طرف آیا اس موقع پر نہ جانے کیا سوچتے ہوئے پاروتی باوا اور اس کے ساتھی سنیاسی کی پشت پر جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

باوا اپنے ساتھی سنیاسی کے ساتھ جب حسن کے قریب آیا تو میں نے دیکھا باوا کے ہاتھ میں پیتل کی ایک سرمہ دانی تھی جس کے اندر سلائی بھی رکھی ہوئی تھی اور اپنے دائیں ہاتھ سے سرمہ دانی کے اندر سے باوا نے سلائی نکالی اور حسن کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

حسن میرے بیٹے میں آج پہلی بار تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی بستی سے لے کر یہاں تک جو تم نے ہماری خدمت کی ہے کوئی میرا اپنا بیٹا ہوتا تو ایسی خدمت ہرگز نہیں کرتا۔ میں تمہاری اس خدمت کا اعتراف کرتا ہوں اور ساتھ تم سے یہ بھی کہتا ہوں کہ سری نگر پہنچ کر میں تمہیں کچھ اس طرح نوازوں گا کہ اپنی آنے والی زندگی کے سارے دنوں میں تم بغیر کچھ کام کیے عیش کرتے رہو گے۔ بیٹے جس کوہستانی سلسلے کے اوپر ہم اس وقت کھڑے ہیں تم دیکھتے ہو یہاں بادل کہر کی طرح پھیلا ہوا ہے یہاں آنکھوں کی بینائی ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا تم اور رمضان دونوں اس سرمے کی ایک ایک سلائی اپنی آنکھوں میں پھیر لو اس طرح تم بینائی کی محرومی سے محفوظ رہو گے۔ میں اور میرا ساتھی بھی اس کی ایک ایک سلائی ڈال چکے ہیں تم دونوں کے بعد اسی سرمے کی ایک سلائی پاروتی کی آنکھوں میں بھی ڈالی جائے گی تاکہ ہم سب محفوظ رہ کر اپنے سفر کو جاری رکھ سکیں۔"

جس وقت باوا یہ گفتگو کر رہا تھا اس وقت باوا کے پیچھے کھڑی باوا کی بھتیجی پاروتی عجیب سے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے حسن کو اشارہ کر رہی تھی وہ دو طرح کا اشارہ دے رہی تھی۔ "ایک یہ کہ سرمہ مت ڈالو نا دوسرا کبھی کبھی وہ اپنی آنکھوں کی طرف ہاتھ لے جاتی تھی اور یہ اشارہ دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ اگر سرمہ ڈالو گے تو اندھے ہو جاؤ گے۔"

حسن پہلے ہی باوا اور سنیاسی کی طرف سے مشکوک تھا اور پھر پاروتی بھی اشارہ کرتے ہوئے اسے سرمہ لگانے سے منع کر رہی تھی۔ اب مجھے اور حسن کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ باوا کو پختہ یقین ہے کہ حسن کو اس کے کچھ رازوں کی خبر ہو گئی ہے لہٰذا وہ سرمہ ڈال کر باوا مجھے اور حسن کو اندھا کرنا چاہتا تھا باوا کی اس ساری گفتگو کے جواب میں حسن باوا کے قریب ہوا اور بڑی جرأتمندی اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے باوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "پہلے یہ سرمہ تم میری موجودگی میں اپنی آنکھوں میں ڈالو یہ سرمہ اپنے ساتھی سنیاسی کی آنکھوں میں ڈالو اس کے بعد میں اور میرا ساتھی بھی ڈال لیں گے۔" حسن کا یہ جواب سن کر باوا بڑا برافروختہ ہوا پھر اس نے اپنے ساتھی سنیاسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کو پکڑو اس کی آنکھوں میں سرمہ ڈالیں یہ حماقت اور بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔"

باوا کی شہ پر وہ سنیاسی آگے بڑھا حسن ایک طرف ہٹ کر باوا کے قریب ہوا باوا نے جب اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر سنیاسی سے کہا اس کا دوسرا ہاتھ پکڑو تب پشت کی جانب کھڑی پاروتی بارود کی طرح پھٹ پڑی اور باوا کو مخاطب کرتے ہوئے وہ برس پڑی۔

"کیوں تم اس کی آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے اندھا کرنا چاہتے ہو چھوڑ دو۔" اس پر باوا غضب ناک ہو گیا اور اپنی بھتیجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "حرام زادی کیا تو بھی اس کے ساتھ مل گئی ہے ان کے بعد تیرا بھی نمبر آتا ہے لگتا ہے تو میرے ساتھ دھوکہ اور فریب کر رہی ہے اور ان کے ساتھ مل کر میرے

خلاف سازش میں شریک ہے۔"
بہر حال باوا اور سنیاسی نے حسن کو پکڑ لیا تھا لیکن وہ اکیلا ان دونوں کے قابو نہیں آرہا تھا اس موقع پر میں آگے بڑھا میں نے باوا کے ساتھی سنیاسی کو پکڑ کر پیچھے ہٹایا اس نے جب زور لگایا اور میں نے اسے جب دھکا دیا تو وہ ایک سمت لڑکھتا ہوا ایک گہری کھائی میں گر اس کی چیخ بلند ہوئی اور وہ ختم ہوگیا تھا۔
اپنے ساتھی سنیاسی کا یہ انجام دیکھتے ہوئے باوا نے حسن کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور جس سمت گہری کھائی میں اس کا ساتھی گرا تھا باوا کنارے پر آ کر نیچے جھانکنے لگا تھا۔ اس موقع پر حسن پیچھے سے آیا زوردار دھکا اس نے باوا کو دیا باوا چیختا چلاتا گہری کھائی میں چٹانوں پر جا کر گرا اس کا بھی دم نکل گیا تھا یوں باوا اور اس کا ساتھی سنیاسی دونوں ہلاک ہوگئے تھے۔
تھوڑی دیر تک میں حسن اور پاروتی تینوں گم سم پڑاؤ کے سامنے جلتی آگ کے پاس کھڑے رہے تینوں میں سے کچھ دیر تک کوئی بھی نہ بولا اس لئے کہ جو حادثہ رونما ہوا تھا وہ فی الفور اچانک ہی رونما ہوگیا تھا۔ اور سارے اس حادثے پر دنگ اور پریشان تھے۔ پھر پاروتی نے حسن کو مخاطب کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔
"حسن اور رمضان تم دونوں پریشان کیوں کھڑے ہو جو ہونا تھا ہو چکا اب اس پر تاسف افسوس اور پریشانی کا اظہار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"
پاروتی کی اس گفتگو پر حسن چونکا پھر اس نے پاروتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"دیکھو پاروتی! میں تمہیں صحیح کہتا ہوں میں باوا اور اس کے ساتھی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا اگر تم مجھے اشارہ نہ کرتیں تو میں شاید سرمہ لگوا ہی لیتا میں پہلے تو تمہارا انتہا درجہ کا شکر گزار اور ممنون ہوں کہ تم نے مجھے بروقت اشارہ کیا۔ میں نے سرمہ ڈلوانے سے انکار کر دیا بہر حال مجھے افسوس ہے کہ تمہارا باوا مارا گیا۔ اور اس کے ساتھ دوسرا سنیاسی بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب میں پریشان اس لئے ہوں کہ ان سارے سنیاسیوں نے

"ظالم کی اعانت"

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ امراء کی حاشیہ نشینی اختیار کرتے ہیں اور ظالموں کی اعانت کرتے ہیں۔ ان کا انجام سخت خراب ہوگا۔ نہ تو مسلمانوں میں ان کا شمار ہوگا اور نہ وہ میرے حوض کوثر پر آئیں گے، خواہ وہ کتنا ہی اسلام کا دعوی کریں۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

ایک سال بعد جو لاہور میں داتا کا عرس آرہا ہے اس میں ملنے کا لائحہ عمل تیار کیا ہے جب مقررہ کردہ وقت پر باوا اور اس کا ساتھی سنیاسی لاہور نہیں پہنچیں گے تو ظاہر ہے دوسرے سنیاسی باوا اور تمہاری خیریت جاننے کے لئے ہمیں تلاش کریں گے سنیاسی میری اور رمضان کی بستی کے بھی جاننے والے ہیں لہٰذا وہ وہاں آئیں گے پاروتی تم جانتی ہو میں اور رمضان دونوں انتہا درجہ کے غریب آدمی ہیں میرا باپ بستی میں چوکیدار ہے جبکہ رمضان کا باپ ایک معمولی گورکن ہے ہم بڑی مشکل سے گزر بسر کرنے والے لوگ ہیں سنیاسی جب ہماری بستی میں آئیں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں ہمارے لئے مشکلات کھڑی نہ کردیں۔"
حسن کی اس گفتگو سے پاروتی کے چہرے پر بڑی پرسکون مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی پھر وہ کہنے لگی۔
"تم دونوں کو کسی بھی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر پریشانی کیسی جو وقت سنیاسیوں نے لاہور میں داتا دربار میں ملنے کا مقرر رکھا ہے اس وقت مقررہ پر میں تم اور رمضان وہاں جائیں گے میں خود انہیں مطمئن کردوں گی کہ باوا دوسرا سنیاسی کوہستانی سلسلے کے اندر جس وقت ہم ایک ڈھلان میں آگے پیچھے گھوڑوں سے اتر کر پیدل ہی سفر کر رہے تھے تو اچانک باوا کا پاؤں لڑھکا اور اس کے

پیچھے پیچھے ہم تھے باوا کے آگے دوسرا سنیاسی تھا جب باوا کا پاؤں لڑھکا تو وہ اپنے ساتھی سنیاسی پر گرا اس طرح دونوں لڑھکتے ہوئے گہری کھڈ میں گرے اور ہلاک ہوگئے۔ ''میرے خیال میں جب میں انہیں مطمئن کروں گی تو ان میں سے کسی کو شک کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ اب بولو تمہیں کیسی پریشانی ہے۔''

پاروتی کی اس گفتگو سے حسن کافی حد تک مطمئن ہوگیا تھا اس کے چہرے پر تفکرات اور پریشانیوں کے جو آثار نمودار ہوئے تھے۔ وہ بھی جاتے رہے تھے اس نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا پھر وہ باری باری میری اور پاروتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم دونوں یہیں کھڑے رہو میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی زندہ ہو اور میں ان کی تلاشی بھی لیتا ہوں ہوسکتا ہے ان میں سے کسی کے پاس کوئی کام کی چیز نکل آئے میں وہ بھی لیتا آؤں گا۔'' اس کے ساتھ ہی حسن میرا یا پاروتی کا انتظار کئے بغیر پتھر پھلانگتا ہوا نیچے نشیب کی طرف چلا گیا۔

میں نے اس موقع کو غنیم جانا اس سے پہلے مجھے اور پاروتی کو کہیں اکیلے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کا موقع نہ ملا تھا اس لئے کہ پاروتی ہمہ وقت حسن ہی کے ساتھ رہتی تھی میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ قربت عارضی ہے یا پاروتی واقعی حسن کو چاہتی اور اسے پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کی خواہاں ہے۔

حسن چھوٹے موٹے پتھروں اور چٹانوں کو پھلانگتا ہوا جب نشیب کی طرف چلا گیا تو میں نے پاروتی کی طرف دیکھا پھر اسے مخاطب کیا۔

''پاروتی میری بہن سب سے پہلے تو میں تمہارا شکر گزار اور ممنون ہوں کہ تو نے باوا اور سنیاسی کی پشت پر کھڑے ہو کر ہمیں مخصوص اشارہ کیا جس پر ہم نے باوا سے سرمہ ڈالو نے سیا نکار کردیا اس طرح تو نے ہم دونوں بھائیوں کو اندھا ہونے سے بچالیا۔''

پاروتی بے چاری میری اس گفتگو کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے اسے پھر مخاطب کرلیا۔

''پاروتی تو میری بہن کی مانند ہے ایک سوال تم سے پوچھتا ہوں جھوٹ مت کہنا اور میں توقع بھی رکھتا ہوں کہ تم میرے سوال کا جواب حقیقت پر مبنی رکھتے ہوئے دوگی۔'' میرے اس سوال پر پاروتی مسکراتی رہی وہ بڑی خوش تھی۔ شاید باوا کے ساتھ ساتھ مجرد زندگی بسر کرتے ہوئے وہ تنگ آچکی تھی اور باوا اور اس کے ساتھی سنیاسی کے خاتمے کے بعد وہ بڑا سکون محسوس کررہی تھی۔ اس کی اسی خوش دلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فوراً سوال داغ دیا۔

''پاروتی میری بہن اگر میں تم سے یہ پوچھوں کہ تم حسن کو پسند کرتی ہو اس سے محبت کرتی ہو اور اس کے ساتھ شادی کی خواہاں ہو تو پھر میرے اس سوال کے جواب میں تم کیا کہو گی۔''

میرے اس سوال پر پاروتی نے بھرپور قہقہہ لگایا پھر ہنسے ہوئے کہنے لگی۔ ''رمضان بھائی میں جانتی تھی آپ یہی سوال کریں گے اس لئے کہ گزشتہ کئی دنوں سے میں دیکھ رہی تھی آپ میری اور حسن کی طرف بڑی تیز نگاہوں سے دیکھتے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ کیا ہم واقعی ایک دوسرے کے قریب آچکے ہیں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد پاروتی رکی تھی اس کے بعد اس نے پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

احمد میرے بھائی میں تمہارے سامنے سچ اگلوں گی جھوٹ نہیں بولوں گی میں حسن کو اس وقت سے چاہتی ہوں جس وقت مختلف بوٹیوں کے پتے ہمالیائی بلندیوں پر علیحدہ کئے جارہے تھے۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے مزید قریب آتے رہے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے باہم گفتگو کرتے رہے بس اس طرح ہم نے ایک دوسرے کو پسند کرنا شروع کردیا اگر میں حسن کو چاہتی ہوں تو حسن بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور ہم نے یہ عہد و پیاں کرلیا ہے کہ کسی مناسب جگہ پر پہنچ کر ہم

شادی کرلیں گے۔

اس سے پہلے میں ڈرتی تھی کہ باوا مجھے کسی بھی صورت شادی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ جس طرح اس نے سنیاسی کی حیثیت سے اپنی ساری زندگی مجرد طور پر گزاردی ہے اسی طرح مجھے بھی وہ ساری زندگی سنیاسن ہی بنا کر رکھے گا شادی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اور بڑھاپے تک مجھے ان سنیاسیوں کے ساتھ ہی دھکے کھانے پڑیں گے۔ اسی بناء پر جہاں کہیں بھی جانا ہوتا تھا باوا مجھے ساتھ رکھتا تھا اور اس نے مجھے ساری جڑی بوٹیوں کے خواص تک بھی بتائے ہوئے ہیں تاکہ جب وہ مرجائے تو اس کے بعد اس کے کام کو میں سنبھالوں۔

جب تک وہ زندہ تھا میں مایوس تھی۔ حسن کے متعلق اپنی محبت کے لئے سوچتی تھی تو کبھی کبھی پریشان ہوجاتی تھی کہ میرا اور حسن کا کیا بنے گا۔ اس لئے کہ باوا کبھی بھی مجھے نہ اپنے آپ سے علیحدہ کرے گا نہ شادی کرنے کی اجازت دے گا میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ حسن کے ساتھ بھاگ جاؤں اگر میں ایسا کرتی تو باوا اور اس کے سنیاسی ضرور حسن کی بستی کا پیچھا کرتے اور وہاں مجھے اور حسن کو تلاش کرتے پھر حسن کی بستی میں ہماری بڑی رسوائی ہوتی۔ اب جبکہ باوا اور ساتھی سنیاسی میرے خیال میں موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں تو اب میری اور حسن کی محبت کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد پاروتی خاموش ہوگئی اس لئے حسن نشیب سے اوپر آ گیا تھا اس کے ہاتھ میں چمڑے کی دو تھیلیاں تھیں جن میں نقدی تھی۔ وہ لا کر اس نے پاروتی کی طرف بڑھائیں پھر وہ پاروتی کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"پاروتی یہ دو تھیلیاں باوا اور اسکے ساتھی سنیاسی سے ملی ہیں ان میں کافی رقم ہے۔ یہ تم اپنے پاس رکھ لو سفر کے دوران یہ ہمارے کام آئے گی۔" جواب میں پاروتی نے تیز نگاہوں سے حسن کی طرف دیکھا پھر وہ کہنے لگی۔

"حسن یہ چیزیں تمہارے رکھنے کی ہیں۔ مجھے کیوں دے رہے ہو۔ اگر مجھے کبھی ضرورت پڑی تو میں تم سے مانگ لوں گی۔ سب چیزیں سنبھال کر رکھو یہ نقدی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ باوا کے سامان میں اس سے بھی زیادہ نقدی ہوگی میں کہتی ہوں کہ جب باوا کا خیمہ آپ کو دکھاؤں گی اور اس کے صندوقچے کھولوں گی تو آپ نقدی دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔ بلکہ اس قدر رقم یہاں موجود ہوگی جس سے ہم اپنی ساری زندگی بخوشی گزار سکتے ہیں اور پھر جو سنیاسیوں کے راز اور نسخے ہمارے پاس ہیں انہیں کام میں لاتے ہوئے ہم تو کبھی غریب ہو ہی نہیں سکتے۔ اب آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ آپ لوگوں کا لائحہ عمل کیا ہے۔" اس موقع پر حسن کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ احمد اس سے پہلے ہی بول پڑا۔

"پاروتی اب جبکہ خیمے نصب ہو چکے ہیں تو میرا مشورہ ہے آج کی رات ہم یہاں بسر کریں۔ سورج اب غروب ہونے والا ہے۔ تم باوا کے خیمے میں آرام کرنا میں اور حسن باری باری یہاں پہرہ دیں گے۔ اور ساتھ ہی باری باری سوتے بھی رہیں گے۔ علی الصبح یہاں سے ہم سیدھا اپنی بستی کا رخ کریں گے ہمیں نہ سرینگر جانے کی ضرورت ہے نہ کشمیر کے کسی اور شہر کی طرف سیدھا اپنی بستی کی طرف جائیں گے وہاں پورا سال گزاریں گے اور جو دن سنیاسیوں نے داتا دربار میں ملنے کا مقرر کیا ہے اس دن ان سے ملنے کے بعد پھر واپس اپنی بستی میں جا کر اپنے کام دھندے میں لگ جائیں گے یہاں سے جب ہم سیدھا واپس اپنی بستی کی طرف جائیں گے تو سب سے پہلا کام ہوگا وہ یہ کہ تمہاری اور حسن کی شادی کردی جائے گی اور تم پرسکون انداز میں بستی میں زندگی بسر کرسکو گے۔"

ان الفاظ پر حسن نے بڑی تیزی سے گھورتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا۔ میں اس کے گھورنے کے انداز کو سمجھ گیا تھا پھر میں نے اس پر انکشاف کردیا کہ جس وقت وہ نیچے نشیب میں باوا اور اس کے ساتھی سنیاسی کی لاشیں دیکھنے گیا تھا تب میں نے تفصیل کے ساتھ پاروتی سے گفتگو کی اور پاروتی نے مجھ پر انکشاف

کر دیا کہ وہ حسن کو اور حسن اسے پسند کرتا ہے۔ میرے اس انکشاف پر حسن مسکرا کر رہ گیا تھا اس کے بعد ہم تینوں الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر جب سورج غروب ہوا پاروتی نے اپنے اور ہمارے کھانے کا انتظام کیا۔ کھانا کھانے کے بعد پاروتی سوگئی میں اور حسن باری باری جاگتے ہوئے پہرہ دیتے رہے۔ اگلے روز ہم نے اپنا پڑاؤ وہاں سے اٹھایا۔ پاروتی چونکہ ان سارے راستوں سے واقف تھی لہٰذا ہماری رہنمائی کرتی ہوئی وہ ہمیں ہماری بستی کی طرف لائی۔

اس عرصے کے دوران ہماری مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ میری اس غیر موجودگی میں میرا باپ مرگیا۔ اس کی جگہ میں نے اس قبرستان میں گورکن کے فرائض سنبھال لئے۔ بستی میں داخل ہونے کے چند ہی روز بعد پاروتی اور حسن کی شادی کردی گئی۔

وہ خوش وخرم رہنے لگے۔ چند ماہ بعد حسن کے ماں باپ بھی یکے بعد دیگرے فوت ہوگئے۔ اس کی جو دو بہنیں تھیں وہ اپنے اپنے گھروں میں پہلے ہی بیاہی ہوئی تھی۔

اب حسن کا یہ کام تھا کہ روزانہ گھر سے گلے میں کشکول ڈالتے ہوئے نکلتا بظاہر یہی پتہ چلتا کہ وہ بھیک مانگنے کے لئے نکلتا ہے جو کشکول وہ گلے میں ڈال کر نکلتا تھا وہ کشکول بھی اسے سنیاسیوں کے سامان ہی سے ملا تھا۔ لیکن وہ بھیک نہیں مانگتا تھا بھی نالے کے اس پار جنگل میں جاکر کسی درخت کے نیچے لیٹ رہتا تھا یا تھوڑی دیر باہر گھومنے کے بعد واپس اپنی بیوی کے پاس آجاتا تھا۔ ایک سنیاسی اور باوا کے حصے میں سرخ اور سفید کپڑوں والی جو گٹھڑیاں آئی تھیں وہ حسن اور پاروتی کی ملکیت میں تھیں۔ اور پاروتی کے پاس کچھ سونا اور چاندی بھی تھا جو اسے باوا کے سامان سے حاصل ہوا تھا بس دونوں میاں بیوی ان جڑی بوٹیوں کو استعمال کرتے ہوئے سونے کو دوگنا کرتے اس سے میری بھی مدد کرتے اپنی بھی اچھی گزر بسر کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ پاروتی نے ساری جڑی بوٹیوں کے خواص واثرات سے بھی حسن کو آگاہ کردیا تھا۔ اس طرح پاروتی نے حسن کو نہ صرف ایک اعلیٰ سنیاسی بلکہ ایک عمدہ حکیم بھی بنا کر رکھ دیا تھا۔

جب سال پورا ہوا تو ہم تینوں داتا دربار گئے۔ وہاں وعدے کے مطابق دوسری سنیاسی بھی ملے۔ پاروتی نے ان پر انکشاف کیا کہ جس وقت وہ کشمیر کی طرف جارہے تھے آگے چھوٹا سنیاسی اس کے پیچھے باوا اس کے پیچھے ہم تھے باوا کا پاؤں پھسلا وہ دوسرے سنیاسی پر گرا۔ اس طرح وہ دونوں لڑھکتے ہوئے نشیب میں چلے گئے اور مرگئے۔ اس کے بعد پاروتی نے یہ بھی بہانا بنادیا کہ اکیلی ہونے کی وجہ سے وہ حسن اور رمضان کے ساتھ چلی گئی اور حسن سے شادی کرکے ان کی ہی بستی میں رہائش اختیار کرلی ہے۔

ان سارے سنیاسیوں نے اس حادثے کو دل سے قبول کرلیا تھا۔ اس حادثے کی خبر دینے والی پاروتی تھی جو باوا کی سگی بھتیجی تھی لہٰذا اعتبار اور بھروسہ نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یوں سال دوسال بعد جس طرح پروگرام طے ہوتا حسن اور پاروتی دونوں میاں بیوی ان سنیاسیوں کے ساتھ ہمالیائی بلندیوں کی طرف جاتے اور وہاں سے وہ جڑیں اور دوسری جڑی بوٹیاں لاتے۔

حسن اور پاروتی کا یہ معمول تھا کہ بس سونا دوگنا کرکے گزر بسر کرتے بس یوں جانو کہ بڑے اعلیٰ پایہ کی گزر بسر کرتے میری بھی خوب مدد کرتے اور جو دیگر جڑی بوٹیوں کے اثرات سے پاروتی نے حسن کو آگاہ کیا تھا اس سے حسن بستی اور آس پاس کی دیگر بستیوں کے لوگوں کا مفت علاج کیا کرتا تھا۔

آخر سونے کو دوگنا کرتے کرتے حسن اور پاروتی نے خوب دولت جمع کی تھی۔ اسی کو استعمال کرتے ہوئے حسن نے پہلے بستی کے باہر وہ جو سامنے عمارت دکھائی دے رہی ہے وہ بنائی۔ یہاں اس نے پرائمری اسکول کھلوایا اور پرائمری اسکول حکومت سے اس نے منظور بھی کرایا۔ جب یہ پرائمری اسکول خوب چل گیا تو تب اس

نے وہ جو کھنڈر عمارت ویران پڑی ہوئی ہے وہ اپنی رہائش کے لئے تعمیر کی۔ اس میں اس نے اپنی بیوی پاروتی کے ساتھ رہائش اختیار کرلی تھی۔ اس دوران حسن اور پاروتی کے یہاں دو بیٹے بھی ہوئے۔

حسن برابر میرے پیچھے پڑا رہا کہ میں شادی کرلوں۔ لیکن میں انکار کرتا رہا۔ آخر جب اس نے زیادہ زور ڈالا تب ایک قریبی گاؤں کی لڑکی سے حسن نے میری شادی کرادی اور اور حسن نے مجھے اور میری بیوی کو بھی اس نئی حویلی مس رکھ لیا۔ اس طرح ہم بڑی خوش وخرم زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

پھر ان بستیوں میں ایک خونی انقلاب رونما ہوا۔ ہماری اور دیگر بستیوں کے کچھ اوباشوں میں سے چار جو بہت بڑے بدمعاش خیال کئے جاتے تھے۔ ایک مسلمان دو ہندو اور ایک سکھ تھا۔ ان چاروں کا آپس میں بڑا یارانہ تھا۔ انتہائی قسم کے آوارہ بدمعاش اور غیر ذمہ دار انسان تھے۔

انہیں جب خبر ہوئی کہ حسن اور میرا باپ تو انتہا درجہ کے غریب تھے میرا باپ گورکن تھا حسن کا باپ چوکیدار تھا پھر حسن نے کیسے بستی سے باہر ایک عالی شان عمارت اسکول کے لئے بنوادی۔ اور کیسے ایک محل نما رہائش گاہ اپنی بستی سے باہر اپنے لئے بنوا ڈالی۔ یہ کام حسن اور میرے متعلق ان لوگوں کو مشکوک کرگئے تھے۔ اور انہوں نے ہم پر گہری نگاہ رکھنا شروع کردی تھی۔

میں اکثر وبیشتر اسی قبرستان میں رہتا تھا کیونکہ یہ قبرستان پانچ چھ گاؤں کا مشترک ہے لہٰذا یہاں سے میں اکثر وبیشتر وقت گزرتا۔ وہ چاروں بدمعاش ہمارے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اس کریدنی میں تھے کہ آخر اتنی دولت ہمارے پاس کہاں سے آتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی جائزہ لے لیا تھا کہ نہ میں کچھ زیادہ کماتا ہوں نہ ہی حسن کوئی کام کرتا ہے اور یہ کہ دن بھر کشکول گلے میں ڈالے گھوم گھام کر واپس اپنی حویلی میں آجاتا ہے۔ اس سے انہیں یہ شک ہوا کہ کچھ عرصہ میں اور حسن باہر رہے اور باہر سے کسی ہندو لڑکی کو اپنے ساتھ لاکر شادی کرلی تو ضرور ہم باہر کہیں سے دولت سمیٹ کر لائے ہیں اور یہ دولت ہم نے حویلی میں جمع کررکھی ہے۔

پس اسی خام خیالی میں ایک روز جبکہ ساتھ والی بستی کا ایک آدمی فوت ہوا تھا اور رات کے وقت میں اس کے لئے اس قبرستان میں قبر کھود رہا تھا۔ وہ چاروں بدمعاش حویلی میں داخل ہوئے حسن اس کی بیوی پاروتی اس کے دونوں بیٹے اور میری بیوی کو انہوں نے قتل کردیا۔ ساری حویلی کی انہوں نے تلاشی لی اور ان کی بدقسمتی انہیں کچھ نہ ملا۔ اس لئے کہ حسن اس وقت سونے کو دوگنا کرتا تھا اور بازار جاکر بیچتا تھا جب اسے ضرورت پڑتی تھی زائد سونا وہ گھر پر نہیں رکھتا تھا شہر کے سنار سے اس نے بات کررکھی تھی جب بھی ضرورت ہوتی انہی جڑوں کو استعمال کرتے ہوئے وہ سونا یا چاندی دوگنا کرتا اس سنار کے پاس بیچتا اور اپنی ضرورت پوری کرلیتا تھا پہلے شروع میں وہ واقعی کافی دولت جمع کرتا رہا تھا اسی سے اس نے پرائمری اسکول اور اپنی حویلی بنا ڈالی تھی۔ جب حویلی کی تعمیر کے بعد معمول کے مطابق دن گزرنے لگے تب وہ اسی قدر سونا دوگنا کرتا تھا جس سے اس کی بیوی بچوں اور میری بیوی کے اخراجات پورے ہوجائیں۔

لہٰذا ان چاروں اوباشوں نے جب حسن اس کی بیوی بچوں اور میری بیوی کو قتل کرنے کے بعد حویلی کی تلاشی لی تو انہیں کچھ نہ ملا وہ مایوس اور ناامید ہوکر چلے گئے۔ بستی والوں نے ہی نہیں بلکہ آس پاس کی بستی والوں نے بھی بہت کوشش کی کہ قاتلوں کی تلاش کریں۔ مگر کسی کو کوئی سراغ نہ ملا۔

لوگوں نے مجھے بہت کہا کہ میں تھانے جاکر رپورٹ لکھاؤں۔ لیکن اسی دوران رات کے وقت جب میں اس قبرستان میں آکر سوتا تھا تو باہر سے مجھے سرگوشیوں جیسی آوازوں میں دھمکیاں دیتے تھے کلہاڑیاں اور برچھیاں کھٹکھٹاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اگر میں نے تھانے میں جاکر رپورٹ لکھائی تو اسی قبرستان میں میرا گلا کاٹ دیا جائے گا۔ لہٰذا میں چپ ہو رہا۔ جس روز حویلی میں میری بیوی، حسن اور اس

کے اہل خانہ کو قتل کیا گیا تھا اس کے بعد میں نے حویلی کی رہائش ترک کر کے مستقل طور پر اسی قبرستان میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

احمد بیٹے جس وقت تم قبرستان میں آئے تو میں کچھ قبروں پر مٹی ڈال رہا تھا یہ قبریں میری بیوی۔ حسن اور اس کی بیوی اور دونوں بچوں کی ہیں۔

مجھے شک ہو گیا تھا کہ قاتل وہی چاروں اوباش ہیں اس لئے کہ جس وقت رات کے وقت کبھی کبھی آ کر ڈراتے دھمکاتے تھے تو کسی قدر میں ان کی آوازوں سے شناسا ہو گیا تھا لیکن میں نے کسی سے ذکر نہ کیا بہر حال وہ چاروں بدمعاش پہلے کی طرح دندناتے رہے لیکن حسن کی موت کے صرف چند ہی ہفتے بعد ان بستیوں میں خونی انقلاب رونما ہونا شروع ہوا۔ حسن کی روح نمودار ہونا شروع ہوئی، بستی میں ہاتھ میں لالٹین پکڑ کر وہ چوکیداری کیا کرتا تھا اب ایسی ہی اس کی روح قبرستان سے مختلف سمتوں کو جاتی ہے۔ اس میں اضافہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے گلے میں وہ کشکول لٹکا رکھا تھا جو سنیاسی بننے کے بعد اس نے استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ قبرستان سے نکل کر اس کی روح کبھی اپنی حویلی کی طرف جاتی ہے کبھی پرائمری اسکول کی طرف اور کبھی نالے کے سامنے جو بند ہے اسے عبور کرنے کے بعد نالے سے گزرنے کے بعد جنگل کی طرف چلی جاتی ہے جہاں اکثر و بیشتر کشکول گلے میں لٹکا کر وہ وہاں جا کر سو رہتا تھا۔

بظاہر ان ساری بستیوں کے لوگوں اور ان چاروں قاتلوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میری بیوی کے علاوہ حسن اور اس کے اہل خانہ کو جو قتل کیا گیا ہے وہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے چونکہ کسی نے تھانے جا کر رپورٹ ہی نہیں لکھائی تھی لہٰذا پولیس نے کوئی خاص پوچھا بھی نہ کیا تھا۔ اور پھر ان چاروں پر کوئی شک کرنے والا نہ تھا لے دے کر میں تھا مجھے اکثر رات کو وہ قبرستان میں عجیب طرح سے دھمکیاں دیتے تھے۔ پولیس نے جب مجھ سے پوچھ گچھ کی تو میں نے نہ کسی کا نام لیا نہ کسی پر شک ظاہر کیا۔ دراصل میں ان چاروں کے ہاتھوں بدترین موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد گورکن رمضان بے چارہ دکھ اور افسوس کے باعث چپ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ ہونٹ کاٹتا رہا اس کے بعد دوبارہ بول پڑا۔

"احمد بیٹے۔ گو انسان اپنی طاقت اپنی بساط بہت کچھ کرتا ہے لیکن آخری بات اور آخری فیصلہ وہی ہوتا ہے جو اللہ کرتا ہے قاتل مطمئن تھے کہ کوئی ان کا پیچھا کرنے والا نہیں۔ وہ پرسکون تھے کہ انہوں نے اتنے لوگوں کو قتل کر دیا پر کسی نے ان سے باز پرس نہیں کی۔ پر خدا جو ہر چیز کا دیکھنے والا ہے ہر شے پر نگاہ رکھے ہوئے ہے جب اس کی طرف سے مکافات عمل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پھر کوئی اس مکافات سے بچ نہیں سکتا۔ یہی حالت ان چاروں قاتلوں کی ہوئی۔ پہلے اس کی بار آئی جو مسلمان تھا۔

ہوا یوں کہ حسن اور اس کے اہل خانہ اور میری بیوی کے مرنے کے لگ بھگ ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد حسن کی روح نے اس قبرستان میں ظاہر ہونا شروع کر دیا تھا پھر ایک بڑی آندھی اور بڑی طوفانی کی رات تھی جنوری کا مہینہ تھا۔ سردی اپنے زوروں پر تھی اس روز آسمان پر بادل اس طرح کڑک رہے تھے جیسے زمین پر بجلی گرے گی اور ہر شے کو تہس نہس کر کے رکھ دے گی۔ آندھی اس زور سے چل رہی تھی جیسے زمین کو اس کے پاتال تک ہلاک کر رکھ دے گی کئی درخت ٹوٹ گئے تھے شاخیں ٹہنیاں اپنے تنوں سے جدا ہو رہی تھیں طوفان لگتا تھا جیسے طوفان نہیں کوئی عذاب ہو۔ ایسے میں ان چاروں میں سے جو مسلمان قاتل تھا اس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اور پھر اس کا نام لے کر پکارا۔

اس پکار پر وہ قاتل خود اپنے مکان کے بیرونی دروازے پر آیا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو بس ایک چیخ بلند ہوئی تھی اس کے گھر والوں نے جب دیکھا کہ وہ کافی دیر کا صدر دروازے کی طرف گیا ہے اور واپس نہیں لوٹا تو وہ فکر مند ہوئے۔ اس کے گھر والے جب

اٹھ کر دروازے پر آئے تو انہوں نے دیکھا۔

آندھی اور طوفان اسی طرح چل رہے تھے آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی طوفان کے آگے درخت بری طرح جھوم رہے تھے۔ ان کے مکان کا دروازہ کھلا تھا اور دروازے پر اس قاتل کی لاش پڑی ہوئی تھی جو حسن اس کے اہل خانہ اور میری بیوی کے قتل میں ملوث تھا۔

اس قاتل کے لواحقین رشتہ داروں، بھائیوں اور باپ نے اسی وقت گاؤں کی گلی گلی چھان ماری کہ شاید قاتل کہیں مل جائے لیکن وہ قاتل کو تلاش نہ کر سکے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ اس شخص کو ہلاک کس نے کیا ہے۔

اس طرح یہ معاملہ چند دن بعد رفع دفع ہو گیا بات آئی گئی ہو گئی لوگ اس کی موت کو فراموش کر گئے لیکن چند ہی ماہ بعد ایک اور حادثہ رونما ہوا اور وہ اس طرح کہ ان علاقوں میں بیساکھی کا میلہ لگتا ہے اس میلے میں مسلمان ہندو۔ سکھ عیسائی سب ہی شامل ہوتے ہیں وہ دو ہندو بھائی جو حسن اور اس کے اہل خانہ اور میری بیوی کے قتل میں ملوث تھے وہ بھی اس میلے میں گئے تھے۔ اور جب میلہ ہوتا ہے تو کافی رات گئے تک میلہ جاری رہتا ہے اور رات کو لوگ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں بس وہ دو ہندو بھی اپنی بستی کے کچھ دوسرے جوانوں کے ساتھ بیساکھی کے میلے سے واپس آرہے تھے۔ میلہ جو کہ برساتی نالہ ہے اس کے پار لگتا تھا گرما کا موسم تھا اور گرمی میں نالے کے درمیان میں پانی کی ایک چھوٹی سی لکیر بہتی ہے جب وہ دو ہندو قاتل اور ان کے ساتھ ہماری بستیوں کے کچھ دوسرے جوان پانی کی اس لکیر کے قریب آئے تب ان دونوں بھائیوں کے سامنے اچانک حسن کی روح نمودار ہوئی اس کے ہاتھ میں اسی طرح جلتی ہوئی لالٹین اور کندھے پر اس کا سیاہ رنگ کا کشکول تھا۔

حسن کی روح کو دیکھتے ہوئے بستی کے لوگ لرز کانپ گئے اور بھاگ لئے۔ وہ بے تحاشہ بھاگتے ہوئے اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بستی کی طرف آئے جبکہ وہ دونوں بھائی جو قاتل تھے وہ بھاگ نہ سکے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ان کے پاؤں کسی نے زمین کے ساتھ باندھ دیئے ہوں۔ پھر کیا ہوا کسی کو کچھ خبر نہیں دوسرے جوان جب بھاگے بھاگے بستی میں آئے اور اس واقعہ کا ذکر انہوں نے آکر بستی والوں سے کیا تب بستی والے بھاگے بھاگے برساتی نالے کی طرف گئے تھے انہوں نے وہاں جا کر دیکھا پانی کی پتلی لکیر کے پاس دونوں بھائیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اس کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ اس طرح حسن کی روح نے اپنے تین قاتلوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اب لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ حسن اور اس کے اہل خانہ کو انہی لوگوں نے قتل کیا تھا اس لئے کہ وہ اپنی بدمعاشی اوباشی کے لحاظ سے ان بستیوں میں بدنام تھے۔ جو شخص سب سے پہلے مارا گیا تھا مسلمان تھا اس کے متعلق بھی لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ اس کا خاتمہ بھی حسن کی روح ہی نے کیا ہوگا اب باقی قاتلوں میں سے صرف سکھ رہ گیا تھا۔

سکھ گھڑسواری کا بڑا شوقین تھا اس نے دو گھوڑے پال رکھے تھے بڑے توانا اور اچھی نسل کے تھے۔ ان گھوڑوں کو وہ کھلا چھوڑ دیتا تھا جہاں چاہیں گھاس چرتے تھے لوگوں کے کھیت میں بھی چرتے تھے لیکن اس کی بدمعاشی اور اوباشی کی وجہ سے کسی کو اسے منع کرنے تکرار کرنے کی یا لڑائی جھگڑا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ایک تو اس سکھ کا خاندان کافی بڑا تھا۔ دوسرے خود بھی یہ قاتل سکھ مانا اور چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔

پہلے دو واقعات کے چند ہی روز بعد اس سکھ کو بھی حسن کی روح نے آپکڑا وہ اس طرح کہ سکھ ہر روز صبح ہی صبح گھڑسواری کے لئے نکلتا تھا گھڑسواری کرنے کے بعد وہ لوٹتا اس کے بعد بیلوں کو جوت کر ہل چلانے کیلئے چلا جایا کرتا تھا ایک روز جب یہ گھڑ دوڑ کے لئے نکلا تو تھوڑی دیر بعد اس کا گھوڑا واپس آیا اور وہ اس طرح کہ سکھ اپنے گلے میں جو بھی بڑی چادر رکھتا تھا اس کا ایک سرا سکھ کی گردن کے ساتھ دوسرا سرا گھوڑے کی گردن کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور وہ گھوڑا اسکھ کی لاش کو گھسیٹتا ہوا بستی

میں لے آیا تھا یوں چاروں قاتلوں کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد گورکن رمضان لمحہ بھر کے لئے رکا پھر دوبارہ اس نے احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"احمد بیٹے اب بھی حسن کی روح اس قبرستان سے نکل کر کبھی اسکول کی عمارت کبھی اپنی پرانی کھنڈر حویلی اور کبھی برساتی نالے کے اس پار جنگل کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد گورکن خاموش ہوگیا تھا۔ احمد بھی تھوڑی دیر چپ رہا اس کی گردن بھی جھک گئی تھی جیسے وہ گہری سوچوں میں کھو گیا ہو۔ باہر رات اب گہری ہوگئی تھی سردی کی وجہ سے فضاؤں کے اندر گہری دھند بھی پھیلی ہوئی تھی اس کٹیا کے باہر جھانکتے ہوئے احمد اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اور گورکن کو مخاطب کیا۔

"رمضان چچا آپ کی باتیں سنتے سنتے مجھے وقت کا احساس بھی نہیں ہوا۔ رات کافی گہری ہوگئی ہے اب مجھے چلنا چاہئے میں آپ کا بہت ممنون اور شکر گزار ہوں کہ آپ نے حسن کی روح اور اس کی زندگی کے حالات میری خاطر تفصیل کے ساتھ سنائے اس کے بعد احمد باہر نکلا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جس وقت وہ بستی کی طرف بڑھ رہا تھا اچانک اسکے قدم رک گئے اس لئے کہ بستی کے اندر اور بستی کے باہر اسے اچانک کتوں کے رونے اور بلیوں کے عجیب سے انداز میں اپنے خوف اپنے ڈر کا اظہار کرنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

اس وقت فضا میں گہری دھند پھیلی ہوئی تھی تاریکی اپنے زوروں پر تھی سخت سردی ہر شے کو لپیٹے ہوئے تھی جس وقت کتوں اور بلیوں کے رونے کی آوازیں احمد نے سنیں تو اس کے قدم رک گئے تھے۔ پھر اس کی نگاہیں مڑتے ہوئے جب قبرستان کی طرف اٹھیں تو اس نے دیکھا حسن کی روح قبرستان سے نکل کر کھنڈر اور ویران حویلی کی طرف جارہی تھی۔ جس کے اندر حسن کبھی اپنے اہل خانہ اور رمضان کے ساتھ رہا کرتا تھا اس موقع پر احمد نے کچھ سوچا پھر چپکے سے وہ مڑا اور وہ بھی آہستگی سے چلتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا تھا۔

اس نے دیکھا اندھیرے میں وہ روح ایسی لگ رہی تھی جیسے کہ وہ کوئی برق کا مجسمہ ہو اس مجسمے نے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین اور دوسرے کندھے پر سیاہ رنگ کا کشکول لٹکا رکھا تھا۔ رات کافی گہری کہر آلود تھی اور اندھیرے میں وہ برق نما مجسمہ ہلکی ہلکی روشنی دیتا ہوا ویران حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا احمد بھی بڑی تیزی سے اس کے پیچھے تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے اور اس برق نما مجسمے کے درمیان فاصلے کو کم کرتا جارہا تھا۔

حویلی کے قریب جاکر احمد کے قدم ایک دم رک گئے اس لئے کہ روح نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ احمد پر وحشت طاری ہوگئی تھی سردی اور کہر کے باوجود وہ پسینہ پسینہ ہوکر رہ گیا تھا پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ روح مڑی حویلی میں داخل ہوئی اور غائب ہوگئی، احمد پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ بستی کی طرف سرپٹ بھاگ گیا۔

☆......☆......☆

رولوکا سے حکیم وقار مخاطب ہوئے۔ "حکیم صاحب اوپر والی" کہانیاں میں نے پڑھیں اور تیسری کہانی آپ نے سنائی، تینوں کہانیوں میں روحوں کا تذکرہ واضح طور پر کیا گیا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں روحوں کی موجود ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا...... اب آپ بتائیں کہ کیا یہ واقعی حقیقت ہے کہ روحیں دنیا میں موجود ہوتی ہیں اور اپنی مرضی سے جہاں چاہیں جاتی ہیں اور وقت ضرورت کوئی اور روپ بہروپ بھر لیتی ہیں...... آپ کے ساتھ رہتے ہوئے اب میں بھی روح، آسیب، چڑیل، بھوت، پریت، جنات اور یہی نہیں بلکہ جادو ٹونے کا بھی قائل ہوگیا ہوں کہ یہ ساری باتیں حقیقت پر مبنی ہیں، اب آپ ذرا واضح کردیں تاکہ میں اور بھی حقیقت سے آشنا ہوجاؤں۔"

حکیم وقار کی باتیں سن کر رولوکا مسکرایا اور پھر گویا ہوا۔

(جاری ہے)



خونی شکار

اقراء قریشی ـ راولاکوٹ

پنجرے کا دروازہ کھلتے ہی پنجرے میں موجود عفریت نے چشم زدن میں چھلانگ لگا کر نوجوان کی گردن دبوچ لی اور اپنے نوکیلے خونی دانت نوجوان کی گردن میں پیوست کردیئے تو......

آہستہ آہستہ...... پورے جسم میں خوف کی لہر سرایت کرتی...... ہولناک اور خونی کہانی

رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ قصبے کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں جاچکے۔ آرتھر نے کافی کا مگ خالی کرکے کچن میں رکھا ٹیبل پر پڑی چابیاں اٹھائیں اور گھر سے باہر نکل آیا۔ دروازہ لاک کرکے پہلے وہ گھر کے عقبی سمت بنے ایک لکڑی کے چھوٹے سے کمرے کی جانب بڑھا لکڑی کے اس چھوٹے کمرے میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو کہ روشن دان سے صاف دکھائی دے رہی تھی آرتھر نے ہاتھ میں پکڑے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

کمرے میں ایک جانب ہڈیوں کا ڈھیر جمع تھا۔ کمرے میں ایک عجیب سی بو پھیلی تھی لیکن آرتھر وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے اس بدبو سے اسے کوئی فرق نہ پڑ رہا ہو۔ سامنے ہی ایک پنجرہ پڑا تھا۔ جس میں ایک بڑی سی

چگادڑ بند تھی آرتھر کے آنے پر چگادڑ کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ آرتھر سے مانوس ہوا۔

آرتھر پنجرے کے قریب آیا اور پیار سے چگادڑ کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تمہارے لئے شکار لینے جارہا ہوں۔ پریشان مت ہونا میری پیاری والڈا۔"

چگادڑ جس کا نام آرتھر نے "والڈا" رکھا تھا آرتھر کی بات سن کر وہ سر ہلانے لگی جیسے کہ آرتھر کی بات سمجھ گئی ہو۔ آرتھر نے پیار سے والڈا کی جانب دیکھا اور "گڈ بائے" کہنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا اب اس کا رخ سامنے سڑک کی جانب تھا۔

آرتھر کو اس قصبے میں رہتے ہوئے ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ آرتھر کی واقفیت ابھی لوگوں سے نہیں ہوئی تھی آرتھر خود بھی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا تھا۔ آرتھر کا گھر جو کہ اس نے کرایہ پر لیا ہوا تھا قصبے میں سب سے آخر میں تھا۔ اس گھر کے قریب کوئی گھر نہیں تھا بس ایک یہی گھر تھا جس کے چاروں جانب جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کبھی کوئی یہاں رہا ہی نہ ہو۔ چھ مہینے سے آرتھر یہاں رہ رہا تھا لیکن اس نے بھی جھاڑیاں کاٹنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ آرتھر تو ان جھاڑیوں کے باعث خوش تھا کیونکہ ایک طرح سے انہوں نے گھر کے جانب چاردیواری کررکھی تھی، کوئی بھی آرتھر کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔

آرتھر روزانہ صبح نکل جاتا اور دو ڈھائی بجے واپس گھر آجاتا تھا دراصل آرتھر ایک چھوٹے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کرتا تھا وہ صبح سے دوپہر دو بجے تک وہاں رہتا تھا دو بجے کے بعد اس کی جگہ چارلس آجاتا تھا۔ آرتھر اور چارلس کی آپس میں بڑی دوستی تھی لیکن یہ دوستی صرف ہوٹل تک محدود تھی۔ چارلس کبھی آرتھر کے گھر نہیں آیا تھا اور نہ ہی آرتھر کبھی اس کے گھر گیا تھا۔ آرتھر آتے ہوئے اپنے لئے رات کا کھانا وہاں سے ہی لے آتا تھا۔ جبکہ صبح ناشتہ بھی وہاں ہی کرتا تھا۔ آرتھر نے اپنے پاس ایک چگادڑ بھی رکھی تھی جسے وہ پورا دن کمرے میں رکھتا۔

دوپہر کو گھر آکر وہ اسی لکڑی کے کمرے میں بیٹھا والڈا سے باتیں کرتا تھا۔ والڈا بھی اس کی باتوں پر بھی آنکھیں جھپکائیں اور کبھی پر پھڑپھڑانے لگتی۔ آرتھر ہر شام والڈا کے کھانے کے لئے شکار لے آتا تھا۔ آج بھی وہ والڈا کے لئے روز کی طرح شکار تلاش کرنے نکلا تھا۔ وہ سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔

آرتھر نے ایک چھوٹے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ جس کے دونوں جانب درخت تھے جو کہ اندھیرے میں ماحول کو اور خوفناک بنا رہے تھے آرتھر اس ماحول سے بے نیاز چلا جارہا تھا۔

اب وہ سڑک پر پہنچ چکا تھا سڑک پر گاڑیاں آجارہی تھیں آرتھر سڑک کے اطراف بنے فٹ پاتھ پر چلنے لگا کچھ دور چل کر رک گیا۔ دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی۔ گاڑی نزدیک آتی جارہی تھی۔ آرتھر نے ہاتھ اٹھا کر گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا گاڑی آرتھر کے قریب آکر رک گئی۔ آرتھر گاڑی کے قریب آیا ڈرائیور نے آرتھر کی جانب والا شیشہ نیچے کیا۔ آرتھر تھوڑا سا جھکا اور چہرے پر پریشانی کے تاثرات لاتے ہوئے ڈرائیور سے کہنے لگا۔ "میری ماں بیمار ہے، مجھے انہیں اسپتال لے کر جانا ہے پلیز میری مدد کرو۔"

ڈرائیور آرتھر کی بات سن کر کہنے لگا۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

آرتھر گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے راستہ سمجھانے لگا۔ آرتھر کو توقع نہیں تھی کہ آج اسے اتنی جلدی شکار مل جائے گا۔ آرتھر نے اپنی اداکاری پر دل ہی دل میں خود کو داد دی۔ آرتھر نے اسے سنسان سڑک سے جانے والا راستہ بتایا۔ ڈرائیور کی عمر تیس، پینتیس سال تھی۔ وہ جلد ہی آرتھر کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے آرتھر کو کسی نے بھی ڈرائیور کے ساتھ آتے نہیں دیکھا تھا۔ آرتھر ڈرائیور کو وہیں رکنے کا اشارہ کرکے جھاڑیوں کے درمیان چلنے لگا۔ آرتھر نے جلدی سے لاک کھولا اور دروازہ کے پیچھے پڑا لوہے کا راڈ اٹھایا اور جھاڑیوں

میں ایسے چھپایا کہ نظر نہ آئے۔

پھر وہ واپس ڈرائیور کی جانب چلا آیا اور اس سے کہنے لگا۔ "میری ماں کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ وہ یہاں تک چل کر نہیں آسکتی ہیں انہیں یہاں تک لانے میں میری مدد کرو۔" ڈرائیور نے آرتھر کی بات سن کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ ڈرائیور آگے آگے چلنے لگا جبکہ آرتھر پیچھے تھا۔

جیسے ہی ڈرائیور جھاڑیوں میں داخل ہوا اور آرتھر نے آواز نکالے بنا جھاڑیوں میں چھپایا ہوا لوہے کا راڈ نکال لیا اور پوری قوت سے ڈرائیور کے سر پر دے مارا۔ ڈرائیور اس حملے سے انجان تھا وہ بغیر آواز نکالے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ آرتھر نے اسے وہیں چھوڑا اور واپس گاڑی کی جانب آیا۔ گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی۔

آرتھر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کے عقبی سمت کے جنگل کی جانب چلنے لگا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی درخت گھنے ہوتے جارہے تھے۔ گاڑی آرتھر نے جنگل میں چھپادی۔ پھر واپس گھر چلا آیا۔ جھاڑیوں میں گرے ڈرائیور کو وہ لکڑی کے بنے کمرے کی جانب گھسیٹنے لگا کمرے کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو گھسیٹ کر اندر لے آیا۔

والڈا اپنے شکار کو دیکھ کر پنجرے میں پھڑ پھڑانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی مخصوص آواز نکالنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے والڈا بہت خوش ہو۔

آرتھر آہستہ آہستہ پنجرے کے پاس آیا اور پنجرہ کھول دیا۔ والڈا فوراً ہی پھڑ پھڑاتے ہوئے اپنے شکار کی جانب بڑھی والڈا اڑ کے شکار کی گردن پر بیٹھی ولڈا کی آنکھیں چمک رہی تھیں والڈا نے منہ کھولا اس کے نوکیلے دانت دکھائی دے رہے تھے اس نے فوراً ڈرائیور کی گردن میں اپنے دانت پیوست کردیئے آرتھر سامنے ہی بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا کچھ دیر والڈا اپنے شکار کا خون پیتی رہی پھر فوراً ہی لاش پر سے گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگی۔

آرتھر خاموشی سے زمین پر بیٹھا سوچنے لگا کہ گاڑی کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ آرتھر کے دماغ میں ایک ترکیب آئی وہ فوراً زمین سے اٹھا اور باہر نکل گیا

اور باہر سے دروازہ لاک کردیا اب آرتھر کا رخ جنگل کی جانب تھا آرتھر تیز تیز قدموں سے جنگل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ رات اپنے آخری پہروں میں داخل ہوچکی تھی آرتھر جلد سے جلد گاڑی کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا کچھ ہی دیر میں وہ گاڑی کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے جیب سے چابی نکالی جو کہ اس نے گاڑی سے نکلتے وقت اپنی جیب میں رکھ لی تھی گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا آرتھر نے گاڑی اسٹارٹ کی اب اس کا رخ جنگل کے آخری حصے کی جانب تھا جہاں ایک دلدل تھی۔

آرتھر تیزی سے گاڑی بھگا رہا تھا آخروہ دلدل کے پاس پہنچ ہی گیا۔ اس جگہ ڈھلوان سی بنی تھی اور نیچے تھی آرتھر گاڑی سے اترا اور گاڑی کو دھکا لگانے لگا۔ آہستہ آہستہ گاڑی ڈھلوان کی جانب بڑھنے گی اور پھر فوراً ہی نیچے جا گری۔ آرتھر اس تمام کارروائی کے دوران خاصا تھک چکا تھا۔

صبح کاذب اجالا آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوچکا تھا آرتھر واپسی کے لئے مڑا اور اپنے گھر کی جانب چل دیا گھر پہنچ کر وہ سوگیا۔ پہلے ہی وہ بہت تھک چکا تھا۔

الارم بجنے سے آرتھر کی آنکھ کھل گئی۔ آرتھر کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں لیکن مرتا کیا نہ کرتا آرتھر کو اٹھنا ہی پڑا کیونکہ اسے ہوٹل جانا تھا آرتھر نے کافی تیاری اور پینے کے بعد تیار ہوکر والڈا کے کمرے کی جانب بڑھا دروازہ کھولا تو فوراً ہی بدبو کے بھبکے اس کی ناک سے ٹکرائے۔ آرتھر اندر کی جانب بڑھا والڈا وہیں نیچے فرش پر پڑی تھی، والڈا کی آنکھیں بند تھیں وہ سو رہی تھی پاس ہی ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ آرتھر نے والڈا کو ہاتھوں میں اٹھایا اور پنجرے کی جانب بڑھا والڈا اٹھ گئی اور اڑتی ہوئی پنجرے کی جانب بڑھی آرتھر نے پنجرہ کھولا والڈا پنجرے میں چلی گئی آرتھر نے اس کو بائے کہا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

ہوٹل پہنچ کر آرتھر نے ناشتہ کیا اور کام میں مصروف ہوگیا وہ ٹرے اٹھائے کچن کی جانب بڑھا کہ اچانک اس کی نظر کاؤنٹر پر رکھے اخبار پر پڑی اس نے فوراً ٹرے وہیں چھوڑی اور خبر پڑھنے لگا جس میں لکھا تھا۔ ”چھ مہینے میں 10 لوگ گمشدہ ہوچکے ہیں جن کا اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ پولیس اپنی کارروائی کررہی ہے عوام کا مطالبہ ہے کہ جلد سے جلد اغوا کار کو تلاش کیا جائے اور اسے سخت سے سخت سزا دی جائے اور گمشدہ لوگوں کا سراغ لگایا جائے۔“

خبر پڑھتے ہی آرتھر پریشان ہوگیا، وہ سوچنے لگا کہ اب اسے کچھ دنوں کے لئے اپنی کارروائی بند کردینی چاہئے ورنہ اگر پولیس کو پتہ چل گیا تو اس کا بچنا ناممکن ہے۔

آرتھر نے اخبار وہیں کاؤنٹر پر رکھا اور کچن میں چلا گیا پورا دن وہ یہی سوچتا رہا کہ اب کیا ہوگا اسی وجہ سے اس سے آج کام کے دوران کئی غلطیاں ہوئیں اور اسے ڈانٹ بھی پڑی۔ دو بجتے ہی چارلس ہوٹل پہنچ گیا۔

آرتھر سے ملنے کے بعد چارلس نے اس سے پوچھا کہ۔ ”آج کا اخبار پڑھا جس میں بتایا گیا کہ کل پھر کوئی ڈرائیور گم ہوگیا ہے۔“ چارلس کی بات سنتے ہی آرتھر کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات چھانے لگے اور اس کے ماتھے پر پسینہ نمودار ہوگیا چارلس آرتھر کی حالت دیکھ کر اس سے پوچھنے لگا۔ ”آرتھر! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”نہیں، بس سر میں ہلکا سا درد ہے۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ آرتھر بولا۔

”ٹھیک ہے! تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔“ چارلس نے آرتھر کا کندھا تھپتھپایا آرتھر، ہوٹل سے باہر آگیا تمام راستے بس وہ یہی سوچتا رہا کہ اب کچھ ہفتوں تک وہ کوئی شکار نہیں کرے گا۔

گھر پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے والڈا کے پاس پہنچا۔ اس کو پنجرے سے باہر نکالا اور اسے گھر کے اندر لے آیا بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اس کو اپنے سامنے بیڈ پر ہی رکھ دیا، وہ پھڑ پھڑانے لگی۔ ایسے لگتا تھا جیسے والڈا کو آرتھر کی پریشانی کے بارے میں معلوم ہوگیا ہو اور وہ آرتھر کے بولنے کے انتظار میں ہو۔ آرتھر کہنے لگا۔ ”والڈا! اب کئی دنوں تک میں تمہارے لئے شکار کا بندوبست نہیں کرسکوں گا۔ اسی لئے تمہیں اب اسی شکار

www.urdusoftbooks.com

پر گزارا کرنا ہوگا۔"

والڈا! نے فوراً آنکھیں جھپکائیں اور آرتھر کے گھٹنے پر جا کر بیٹھ گئی۔ آرتھر اسے پیار کرنے لگا۔ والڈا بار بار آنکھیں جھپکاتی اور آوازیں نکالتی گویا کہہ رہی ہو۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" آرتھر وہیں بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں اور ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

☆......☆......☆

"آرتھر! آرتھر!" میگی آنٹی کی آواز آرتھر کے کانوں سے ٹکرائی آرتھر جو کہ باہر گارڈن میں کھیل رہا تھا بھاگتا ہوا اندر کی جانب بھاگا کچن میں پہنچا تو میگی آنٹی خونخوار نظروں سے آرتھر کو گھور رہی تھیں۔ "تم نے ابھی تک برتن نہیں دھوئے۔" میگی غصے سے بولی آرتھر فوراً ہی کہنے لگا۔ "میں بس دھونے ہی لگا تھا۔"

"تمہیں کھیل کود سے فرصت ملے تو وقت پر کام کرو گے۔" میگی آرتھر کی کمر پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولی اور وہاں سے چل دی۔

آرتھر روتے ہوئے برتن دھونے لگا۔ آرتھر کو اپنے والدین یاد آنے لگے کہ جو کہ اس سے بہت پیار کرتے تھے لیکن ایک حادثے نے انہیں آرتھر سے بہت دور کردیا۔ ایک دن آرتھر اپنے والدین کے ساتھ گھومنے جارہا تھا کہ راستے میں موڑ مڑتے وقت ان کی گاڑی ایک تیز رفتار ٹرک سے جا ٹکرائی آرتھر کے والدین تو موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔ لیکن آرتھر بچ گیا، پانچ دن اسپتال میں رہنے کے بعد اس کے ایک دور کے رشتہ والی آنٹی جن کا نام "میگی" تھا اسے اپنے ساتھ لے آئیں آرتھر سے شروع شروع میں انہوں نے اچھا سلوک رکھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد وہ اس سے گھر کے کام کروانے لگیں۔ آرتھر کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔

آرتھر کے پاس سات سال کی عمر سے ایک پالتو چمگادڑ تھی جس کو وہ ہر وقت اپنے کمرے میں رکھتا تھا۔ اور اس سے تمام باتیں کرتا تھا۔ حادثے کے دن وہ والڈا کو گھر میں ہی چھوڑ گیا تھا جس کی وجہ سے والڈا بچ گئی تھی آرتھر جب میگی آنٹی کے گھر آیا تو والڈا کو بھی ساتھ لے آیا اب بھی وہ والڈا کو اپنے روم میں رکھتا تھا اور اس سے دل کی ہر بات کرتا تھا۔ آرتھر جب سے یہاں آیا تھا میگی آنٹی نے اس کا اسکول جانا بھی بند کردیا تھا آرتھر صبح سے شام تک گھر کے کام کرتا رہتا تھا پھر بھی ہر بات پر میگی اسے ڈانٹتی رہتی تھیں۔

میگی خود ایک اسٹور پر جاب کرتی تھیں دوپہر کو گھر لوٹتی اور آرام کرتی رہتی تھیں کھانا بھی آرتھر تیار کرتا تھا اس کے باوجود آرتھر کو مار بھی پڑتی تھی تین سال تک آرتھر میگی آنٹی کے ظلم برداشت کرتا رہا۔ آرتھر کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ یہاں سے بھاگ جائے لیکن موقع نہیں ملتا تھا آرتھر ہر روز والڈا کو میگی آنٹی کے رویے کے بارے میں بتاتا تھا والڈا سنتی رہتی اور پھر آوازیں نکالنے لگتی۔ جیسے آرتھر کی ہر بات سمجھتی ہو۔

ایک دن آرتھر صفائی کررہا تھا۔ میگی کی اس روز چھٹی تھی آرتھر ڈائننگ ٹیبل صاف کررہا تھا میگی کا فون بھی ٹیبل پر پڑا تھا۔ آرتھر نے اٹھایا تو فون اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جاگرا اور ٹوٹ گیا۔ میگی آواز سن کر باہر نکلیں اور اپنے فون کا یہ حشر دیکھ کر غصے سے آگے بڑھی اور آرتھر پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ آرتھر رو رہا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میگی جب تھک گئی تو کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگی ساتھ ساتھ آرتھر کو برا بھلا کہنے لگی۔

آرتھر کا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا آرتھر وہیں کھڑا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اور برداشت نہیں کرے گا اور رات کو ہی یہاں سے دور چلا جائے گا۔ آرتھر وہیں کھڑا ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

میگی نے چلا کر آرتھر کو کہا۔ "دفع ہوجاؤ میرے سامنے سے۔" آرتھر فوراً ہی اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگا والڈا نے آرتھر کو روتے دیکھا تو پنجرے میں ہی پھڑ پھڑانے لگی جیسے آرتھر کا دکھ جان گئی ہو۔ آرتھر نے پنجرہ کھولا اور والڈا کو باہر نکال لایا اور تمام ماجرا اس کو سنا دیا۔ والڈا کی آنکھوں میں غصہ در آیا۔ والڈا اڑ کر باہر کی جانب جانے لگی لیکن آرتھر نے

اسے فوراً لپک کر پکڑ لیا۔

آرتھر والڈا سے کہنے لگا۔ ”ابھی نہیں رات کو...... رات کو ہم اپنا بدلہ لگیں گے اور ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے جائیں گے۔“ والڈا ایک دم شانت سی ہوگئی جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو۔

رات کا کھانا آرتھر نے تیار کیا اور میگی آنٹی کو دے دیا، آرتھر کو معلوم تھا کہ میگی آنٹی دس بجے سو جاتی ہیں۔ وہ بھی کھانا کھا کر روم میں آ گیا اب اسے صرف دس بجنے کا انتظار تھا جیسے ہی دس بجے آرتھر اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا میگی آنٹی کے روم میں آیا اس نے ہاتھ میں کرکٹ بیٹ بھی اٹھا رکھا تھا آرتھر بنا آواز کئے میگی کے روم میں داخل ہو گیا اور سوئی ہوئی میگی کے سر پر بیٹ سے وار کر دیا۔ والڈا بھی آرتھر کے ساتھ ہی تھی۔ والڈا فوراً اڑتی ہوئی آئی اور میگی کی گردن میں دانت پیوست کر دیئے۔ پھر آرتھر نے میگی کی دراز میں رکھے ہوئے پیسے لئے اور فوراً والڈا کو چلنے کا اشارہ کیا۔

والڈا آرتھر کے ساتھ ساتھ اڑنے لگی میگی کی لاش وہیں بیڈ پر پڑی تھی اور اس کے سر سے خون بہہ بہہ کر فرش پر جمنے لگا تھا۔ آرتھر گھر سے باہر نکلا والڈا بھی ساتھ ساتھ تھی۔ آرتھر ریلوے اسٹیشن پہنچا اس نے نیو جرسی شہر کا ٹکٹ خریدا اور روانہ ہو گیا۔ اب بھی وہ جرسی شہر میں رہ رہا تھا۔

اچانک والڈا کے شور مچانے سے آرتھر ماضی کی دنیا سے باہر نکل آیا، آرتھر اٹھا اور والڈا کو اس کے کمرے میں چھوڑ آیا کیونکہ آرتھر کو پتہ تھا والڈا بھوک لگنے پر ہی شور مچاتی ہے۔

آرتھر اب معمول کے مطابق ہوٹل جاتا اور واپس آ جاتا۔ 2 ہفتوں سے اس نے والڈا کے لئے کوئی شکار نہیں کیا تھا، ولڈا کا پہلے والا شکار اب ختم ہو چکا تھا ایک ہفتہ اور گزر گیا آرتھر نے والڈا کے آگے مختلف پھل وغیرہ رکھے لیکن والڈا نے وہ نہیں کھائے ولڈا چڑ چڑی ہوتی جا رہی تھی اب والڈا آرتھر کے آتے ہی غصے سے پنجرے سے ٹکریں مارنے لگتی۔ آرتھر جانتا تھا وہ خون اور انسانی گوشت کی عادی ہو چکی ہے اسے یہ پھل وغیرہ پسند نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اس نے والڈا کو کھلانے کی کوشش کی لیکن والڈا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

☆......☆......☆

پولیس والے بھی اب جرسی سٹی کے علاقوں میں چھان بین کر رہے تھے جس کے باعث آرتھر اب شکار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، آرتھر نے ہوٹل سے ایک مہینے کی چھٹیاں لے رکھی تھیں، اب وہ زیادہ گھر پر ہی رہتا تھا، والڈا کے پنجرے کے قریب بھی جاتا تو والڈا خونخوار نظروں سے اس کی جانب دیکھتی اور منہ موڑ لیتی۔ آرتھر اب اسے سمجھاتا رہتا لیکن وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔ آرتھر نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اگلے دن وہ والڈا کے کمرے میں گیا، والڈا اوندھے منہ پنجرے میں گری ہوئی تھی وہ دو ہفتوں سے بھوکی تھی آرتھر نے اسے گرے ہوئے دیکھا تو فوراً پنجرے کے پاس آیا اور پنجرہ کھول دیا۔

والڈا پنجرہ کھولنے کی آواز سنتے ہی باہر کی جانب لپکی اور آرتھر پر جھپٹی۔

آرتھر اس اچانک افتاد کے لئے تیار نہیں تھا آرتھر فرش پر گرا۔ والڈا نے فوراً آرتھر کی گردن میں دانت پیوست کر دیئے۔ آرتھر چلا رہا تھا لیکن والڈا پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا، آرتھر نے والڈا کو اپنی گردن سے الگ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن والڈا جو کہ ہفتوں سے بھوکی تھی اس نے آرتھر کو نہ چھوڑا۔ والڈا نے اپنے نوکیلے دانتوں سے گردن سے گوشت نوچ ڈالا آرتھر کی گردن سے خون بھل بھل بہنے لگا۔

آرتھر نے آخری بار والڈا کو دیکھا، آرتھر کی نظروں میں شکوہ تھا لیکن والڈا برابر آرتھر کا گوشت نوچ رہی تھی۔

جس والڈا کے لئے آرتھر نے کتنے ہی معصوم اور بے گناہ لوگوں کا شکار کیا تھا، آج اسی والڈا نے اسے اپنا شکار بنا لیا۔ آرتھر نے آخری ہچکی لی اور اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔



ملک الموت

مدثر بخاری۔شہر سلطان

اچانک ریل کے ڈبے میں ایک بوڑھا نمودار ہوا اور بولا، صاحب آپ کے ذہن میں بہت سے سوالات کنڈلی مارے بیٹھے ہیں، آپ تو اشرف المخلوقات ہو جبکہ آپ لوگ مجھ نا چیز کو ملک الموت کہتے ہو اور پھر……

جسم وجاں پر سکتہ طاری کرتی ایک عجیب وغریب نا قابل یقین……مگر حقیقی کہانی

اس بوڑھے کی عمر 70 سال سے تجاوز تھی۔ بال برف کی مانند سفید، سفید گھنی مونچھیں……سیاہ لمبا کرتا۔ چہرے پر سختی جبکہ اس کی آواز میں مخصوص کھنک تھی۔ نرم انداز گفتگو، چہرہ جتنا سخت آواز اتنی ہی ملائم، البتہ جسم سخت اور ورزشی، جوانی میں جاندار شخص رہا ہوگا۔ باڈی بلڈنگ بھی کی ہوگی۔ تن سازی بھی ہوسکتا تھا اس کے ہاتھ بھی کافی سخت تھے۔ ہلکی ہلکی داڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ رنگ مناسب سا جوانی میں کئی حسیناؤں کے دل دھڑکائے ہوں گے……!

اس کی آنکھوں میں ساحرانہ کشش تھی۔ بلا کی ذہین آنکھیں، جیسے ایکسرے ہوں۔ آر پار محسوس ہوتی نظریں مجھے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس شخص نے ٹرین میں سوار تمام مسافروں کو جیسے کنٹرول میں کرلیا تھا۔ ٹرین حیدرآباد اسٹیشن پر رکی تھی۔ سب اپنی

اپنی زندگی کے رنگوں میں مست تھے۔ایک ہنگامہ برپا تھا۔شوروغل اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ایک فیملی کی چند عورتیں سکھر سے چڑھی۔سارا راستہ ناک میں دم کررکھا تا۔میرے ساتھ میں تین مسافر ایسے تھے جن سے میری خوب بنی ان کا تعارف آگے چل کر بیان کروں گا......!

بوڑھا اپنی تمام ہیبتا کی کے ساتھ ٹرین میں داخل ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں بلیک بریف کیس تھا۔ ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھا......!

معاف کیجئے گا۔ٹکٹ نمبر 27 پر آپ تشریف فرما ہیں۔جبکہ یہ ٹکٹ میرے ہاتھ میں ہے۔وہ بولا۔ واقعی میں غلط سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز سے سیٹ چھوڑ دی۔

تھینک یو ڈیئر......!اس نے اپنا سامان save کیا۔جبکہ میں سائیڈ سیٹ پر براجمان ہوگیا......!

ایک بات واضح تھی کہ اس شخص کے آنے کے بعد شور ختم ہوگیا تھا۔ساحرانہ انداز اور پرسانلٹی کا مالک وہ شخص عجیب وغریب تھا۔مجھ سمیت تمام لوگ اس کی تیز نظروں سے چھپنے کی کوشش کررہے تھے......!

میرے ساتھ ایک وکیل صاحب سفر کررہے تھے۔ملتان سے ہم نے اکٹھے سفر شروع کیا تھا۔مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کی طرح ان صاحب نے بھی اپنی کتاب چھپوائی تھی۔مرزا اب تک بیسیوں کیس لڑے مگر خیر سے کسی میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔لیکن تھے بہت ایماندار،گڑبڑ والا کیس کبھی ہاتھ میں نہیں لیا۔بہت سے کیس فری میں بھی لڑے......!

ان کے ساتھ ڈاکٹر علی مختار سفر کررہے تھے۔ بہت اچھے انسان مخلص اور شفیق......!

ہمارے ساتھ ایک نہایت ایماندار پولیس انسپکٹر خاور علی بھی سفر کررہے تھے۔تینوں نے اپنے اپنے بہت سے کارنامے میرے حوالے کیے تاکہ میں انہیں قلم بند کرکے چھپوا سکوں......!

لیکن اس ہیبت ناک شخص کے آنے کے بعد یہ سلسلہ فی الحال رک گیا تھا۔تینوں نے اپنے اپنے سیل فون نکال لئے تھے۔ میں باری باری سب کو دیکھا۔ آخری نظر میں نے اس شخص پر ڈالی۔وہ سگریٹ کے مرغولے کھڑکی سے باہر اڑا رہا تھا۔کچھ نہ کچھ تو اس شخص کے اندر تھا۔تبھی تو سبھی کو سانپ سونگھ گیا تھا......!

غیر اختیاری طور پر میں نے بھی سیل فون پر میسج پڑھنا شروع کردیئے......!

اچانک ہم چاروں کے سیل فونز پر ایک ہی وقت میسج ریسیو ہوئے۔یاد رہے میسج ٹون ایک ہی وقت بج اٹھی تھی۔

ہیلو ڈیئر......!نمبر Unknown......!

ہائے ڈیئر......میں نے Reply کیا۔

Where are you Going?......

اگلا میسج ریسیو ہوا......

Karachi...... آئی ریپلائیڈ

Good......تم سب کو تنگے ہو؟ اگلا میسج ریسیو ہوا۔

But....no آپ کون؟ اور آپ کو ہم سے مطلب؟......!

آپ کا ہم سفر رائٹر صاحب!......اگلا پیغام ملا۔

آپ سیدھی طرح بتائیں۔ پہیلی مت بجھوائیں۔آئی Send۔یار ایک اجنبی نمبر سے پیغام موصول ہورہے ہیں۔نام بھی نہیں بتاتا اور یہی کہتا ہے کہ آپ کا ہمسفر......!ڈاکٹر مختار بولے۔

same یار......میرے ساتھ بھی یہی سچویشن ہے۔انسپکٹر خاور بولے۔یار اگر سچ پوچھو تو میرے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔وکیل صاحب بولے۔

عجیب بات ہے مجھے بھی کوئی اسی طرح تنگ کررہا ہے۔میں نے کہا۔

ذرا آپ نمبر دہرائیں۔میں نے کہا۔

نمبرز ہم چاروں کے پاس مختلف تھے۔مطلب ایک ہی شخص چار مختلف نمبرز سے تنگ کررہا تھا۔عام روٹین میں اگر ہم سب الگ الگ سفر کررہے ہوتے تو

www.urdusoftbooks.com

بات کا Issue ہی نہ بنتا۔ سیدھا سادہ کیس تھا۔ مگر اس حالت میں سچویشن مختلف تھی۔

ہم چاروں گونگے تھے؟ اس کا مطلب واضح تھا کہ ہم واقعی خاموش تھے۔ اور کوئی ہمیں Observe کر رہا تھا اور واقعی ہم نے حیدر آباد سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

تبھی میری نظر اس شخص پر گئی جو اپنے موبائل کو استعمال کر رہا تھا۔ لیکن اگر ہمیں وہ شخص تنگ کر رہا تھا تو اس کے پاس ہمارے نمبرز کہاں سے آئے تھے؟ ناممکن......؟

ایسا سوچنا بھی بیوقوفی تھی......!

تبھی وہ شخص ہماری جانب گویا ہوا......!

دوستو! کیا تم اپنا فیوچر دیکھنا چاہو گے......؟ وہ اتنی سادگی سے اور پختگی سے کہہ گیا کہ اس کی بات حرف آخر لگی...... ہم سب حیران ذرا برابر نہ ہوئے۔ کیونکہ نام نہاد پیر فقیر عامل کامل ایسے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کام مسافروں سے تھوڑی بہت رقم اینٹھنا، ایک لحاظ سے اپنا کاروبار بنا رکھا ہے۔ خاص طور پر عورتیں اس چکر میں خاصا روپیہ لٹاتی ہیں۔ ہم نے بھی اس شخص کو ایسا ہی سمجھا لیکن حقیقت آگے چل کر واضح ہوئی......!

یقین کرو فرینڈز......! تم واقعی اپنا فیچر اس میجک فیوچر Display میں دیکھ سکتے ہو......!

کیا واقعی؟ لیکن آپ کو ہم سے ایک روپے کی بھی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔

Good......! یہ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگ غربت اور مسائل سے تنگ آکر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے لوگوں کو لوٹ جاتے ہیں لیکن میرا ایسا کوئی پلان نہیں ہے......!

آپ صرف مجھے اپنا نام اور فیورٹ کلر بتائیں۔ وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

جی مختار، فیورٹ رنگ سبز۔ وہ بولے۔

اس نے بریف کیس اوپن کیا۔ بال پوائنٹ پر حساب لگایا، پھر بڑے پراسرار انداز میں بولا۔

آپ کا پورا نام ڈاکٹر علی مختار ہے۔ ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔ مریض ڈالا اور حسین کو آپ بچا سکتے تھے مگر تھوڑی سی لاپروائی اس کی جان لے ڈوبی......!

ڈاکٹر علی مختار کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ان کی سوچ میں بھی ایسا نہ تھا کہ وہ پراسرار شخص یوں اچانک راز افشاں کر دے گا......!

آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اتنے اعتماد سے......

وہ بولے۔ ابھی داستان اور بھی ہے جناب! تشریف رکھئے......وہ تحمل سے بولا۔

ذرا آپ اپنا اسم گرامی بتائیں...... وہ وکیل صاحب سے بولا۔

خالد حسین......!

چند لمحوں بعد حمام میں یہ بھی ننگے تھے۔

خالد حسین ایڈووکیٹ صاحب......! امیر مائی والا کیس دوغلی بنیاد پر لڑے۔ امیر مائی کا بیٹا بے گناہ پھانسی چڑھا۔ آپ کو ذرا برابر بھی رحم نہ آیا۔ سارا کیس اوپن تھا۔ لیکن آپ نے دوٹکوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ ڈالا۔ افسوس خالد صاحب......!

خالد حسین کی بولتی بند ہوگئی۔ وہ شخص سب کی چمڑی ادھیڑ کر الگ کیے جا رہا تھا۔

انسپکٹر خاور حسین جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پیلی پڑ گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ چلتی ٹرین سے کود جاتا......!

خاور علی......وہ بولا۔

انسپکٹر خاور علی...... رشوت کی انتہا...... ملازم حسین کی بددعائیں، اور غریب تاج مائی کے اکلوتے سپوت کرم داد کی دو مہینے تک حوالات میں رکھنے اور عدالتی ریمانڈ نہ ملنے کے باوجود بھی سیٹھ زمان خان کی ایمان پرور دن رات تشدد......!

پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ ایگزامز جناب اشرف علی کو غیر قانونی طور پر نقل کروانے کے جرم میں جیل ڈالنے کا جرم......!

ایک طویل لسٹ ہے......! کس کس کو بیان کرو......!

عالیان......!میں نے بتایا۔

رائٹر ہوں...... پیشہ بنا رکھا ہے۔ سچ سے دور......نام نہاد صحافت۔ بلیک میلنگ کا دھندہ۔ تم سب ہی کرتے ہو......تم سب ہی ایسے ہو۔ قلم کو صحیح راستے پر چلاؤ تو تلوار سے زیادہ طاقتور......!

☆......☆......☆

تم سب کو فیوچر دیکھنا ہو تو بتاؤ۔ یا کوئی ایک بھی اگر دیکھنا چاہے تو بتاؤ۔ وہ بولا۔

ہم واقعی غصہ میں تھے۔ لیکن ایک اندرونی خوف بھی تھا۔ یہ حیرت انگیز حقیقت تھی۔ لیکن ہم واقعی فیوچر دیکھنے کے متمنی تھے......

میں فیوچر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اکیلا......یعنی اس میں کوئی دوسرا ساتھ نہ ہو۔ ڈاکٹر مختار بولے۔

ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ جو بھی ہوگا ہم سب دیکھیں گے۔ وکیل صاحب بولے۔

لیکن یہ ہم سب کی پرسنل لائف ہے۔ اور ہم میں یہ فطرتی چیز ہے کہ بہت سی اہم معاملات پر پبلک سے چھپانے پڑتے ہیں......!

آپس کی بحث فضول ہے۔ جو بھی فیوچر دیکھے گا۔ اس آئینے میں یہ آئینہ آپ کو یعنی آپ چاروں کو فیوچر دکھائے گا۔ اپنی نظریں آئینہ پر گاڑ دیں اور ہم ایک نئی دنیا میں جا پہنچے......!

☆......☆......☆

مسز ایڈور ناتھ ہاؤس وائف تھی۔ کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے پڑھ نہ سکی تھی۔ اپنا نام اور مخصوص سائن وہ کر لیتی تھی۔ لندن کی آزاد فضا میں پرورش میں جوان ہونے والی ایڈور ناتھ ایک شرمیلی عورت تھی۔ جوانی میں بھی وہ محتاط رہی۔ کبھی کسی کی جانب مائل نہ ہوئی۔ حالانکہ یہاں کی آزاد فضا میں جو لڑکی بوائے فرینڈ کے بغیر زندگی گزار رہی ہو۔ اسکول کی باقی لڑکیاں اسے عجیب نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ مگر ایڈور ناتھ نے صرف اسکول میں قدم ہی رکھا تھا جب وہ ننھی منی سی تھی۔ ابا اور اماں ایکسیڈنٹ میں چل بسے۔ ایڈور انتھ فٹ پاتھ پر ہو جاتی۔ پر محنت کرتی رہی۔ تبھی اسے مسٹر مائیکل ملے۔

محبت ہوئی۔ شادی رچالی۔

ایڈور ناتھ پیا کے دیس آئی تو وہی تنہائی، بچے شادی کے تین سال بعد ہوئے......!

ان تین سالوں میں ایڈور ناتھ نے ایک بات محسوس کی کہ مائیکل گھر کے ایک جانب کبھی نہیں گئے۔ بیک جانب پرانی طرز کے دو کمرے تھے۔ مائیکل کہتے تھے کہ یہ ان کے دادا کے زمانے سے بھی پہلے کے تھے۔ وہ جگہ صاف ستھری تھی۔ وہاں مختلف پھول تھے۔ بس اتنا تھا کہ انسان وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔ باقی سب نارمل تھا۔ وہ سنیچر کی شام تھی۔ جب اسے گھر کے پیچھے سے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ تبھی ایسا لگا کوئی مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ وہ چیخ کبھی بند ہو جاتی تو کبھی معدوم......!

ایڈور ناتھ پسینے میں بھیگ گئی تھی۔ تبھی اس نے پچھلے کمپارٹمنٹ میں نظر دوڑائی۔ انہی دو کمروں میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ خوفناک انسانی چیخیں بلند ہوئی جا رہی تھیں۔ شام مزید پھیلتی جا رہی تھی۔ مائیکل کا موبائل بند جا رہا تھا۔ تبھی اس نے پولیس اور فائر بریگیڈ کو کال کی......!

پانچ منٹ کے اندر اندر دونوں ڈپارٹمنٹ کے لوگ وہاں موجود تھے۔ تفتیشی افسر اور فائر بریگیڈ کمپارٹمنٹ کی پچھلی جانب کے لئے......!

لیکن منظر الگ تھا۔ وہاں خاموشی کا راج تھا۔ آگ کا نام و نشان تک نہ تھا۔

میڈم...... یہاں تو آگ ہے نہ انسانی آوازیں...... آپ پلیز کسی ماہر سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کیجئے......! تیر کی طرح چبھتے الفاظ اسے مزید پریشان کر گئے۔

دونوں افسران گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ گاڑیاں اوجھل مگر آوازیں دوبارہ بلند ہونے لگیں۔ آگ کے شعلے دوبارہ بلند......

☆......☆......☆

ڈاکٹر علی مختار کا کمپارٹمنٹ کراچی کے گنجان آباد علاقے میں تھا۔ دو میل کے فاصلے پر ان کا پرسنل کلینک واقع تھا۔ جہاں وہاں ہارٹ پیشنٹ کا علاج بھی کرتے تھے۔ بائی پاس کے آپریشن بھی کیا کرتے تھے۔

آج ان کی طبیعت میں ناسازی تھی۔ سر درد اور جسم میں سستی نے انہیں کلینک سے جلد گھر آنے پر مجبور کردیا۔ ویسے بھی آج مریضوں کا رش روٹین سے کم تھا۔

ان کی سیکریٹری نادیہ کا گھر راستے میں پڑتا تھا جنہیں وہ گاڑی میں لفٹ دیتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ واپسی پر ڈاکٹر مختار، نادیہ کو اس کے گھر ڈراپ کردیتے......

آج بھی ایسا ہوا، انہوں نے نادیہ کو اس کے گھر ڈراپ کیا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ سر بھی چکرانے لگا۔ تبھی ان کی منزل بھی آ گئی......

مسرت مختار کی گاڑی بھی گیراج میں موجود تھی۔ ان کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی۔ مطلب واضح تھا کہ وہ بھی گھر پہنچ چکی تھی۔

گاڑی سے نکلتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں گئے۔ ان کی حالت اس وقت نارمل ہوئی...... ہلکی پھلکی نیند مکمل کی۔ Pain Killer نے کافی آرام دیا۔

یہ رات کا وقت رہا ہوگا جب ڈاکٹر مختار علی کی آنکھ کھلی۔ گھڑی پر ایک بج چکا تھا۔ مسرت گہری نیند میں تھی۔ ڈاکٹر مختار کو ماحول سے نفرت ہونے لگی۔ انہیں لگا جیسے کوئی انہیں دیکھ رہا ہو۔ ان دونوں کے علاوہ تیسرا بھی اس کمرہ میں کوئی موجود تھا...... وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتے تھے مگر جسم جیسے جامد ہوگیا۔ جسم حرکت کرنے سے عاری ہو۔ وہ صرف دماغ کا استعمال کرسکتے تھے۔ ایسے جیسے کسی چیز نے جکڑ رکھا ہو......!

انہوں نے بولنے کی کوشش کی مگر ناکام......! کچھ دیر کے لئے انہوں نے اسے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ Relaxe رہنے کے باوجود بھی جسم حرکت میں نہ آیا......

تبھی انہیں اپنے سامنے ایک سایہ محسوس ہوا، ایک مردانہ سایہ......! اس کی تصویر سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے لمبے آئینے پر بنتی گئی...... وہ شکل واضح ہوتی گئی۔

ڈاکٹر مختار کا چہرہ خوف سے زرد پڑتا گیا۔

وہ دلاور تھا۔ جس کا قتل انہوں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔

☆......☆......☆

خالد حسین ایڈووکیٹ اپنی رہائش گاہ پر موجود تھے۔ تبھی ایک گمنام کال ریسیو ہوئی۔

ہیلو خالد حسین ایڈووکیٹ اسپیکنگ......!

سر میں اختر بات کررہا ہوں۔ جی آپ سے ایک کیس کے سلسلے میں ملنا ہے۔ جی آپ سر اعظم غفار کو تو جانتے ہوں گے۔ اعظم انڈسٹری والے...... مجھے انہوں نے آپ کا نمبر دیا ہے......دوسری طرف سے آواز آئی۔

جی بولیں...... اگر آپ میری رہائش گاہ آجائیں تو مناسب اور واضح بات ہوجائیگی۔ وہ بولے۔

اوکے جی...... آپ ایڈریس بتائیں میں آجاتا ہوں۔

ڈیفنس ایریا، مکان نمبر 4، گلی نمبر 2......!

☆......☆......☆

معاملہ گھناؤنا تھا۔ اختر ایک مکینک تھا۔ چار بھائی تھے۔ ماں باپ کافی عرصہ پہلے چل بسے تھے۔ چاروں کا الگ کاروبار تھا۔ الگ گھر تھے۔ سارے شادی شدہ تھے۔ اختر کا کراچی میں پھیلا ہوا بزنس تا۔ اچھا خاصا کماؤ تھا۔

اب آپ مجھے کیس بتائیں......!

جی میرا بھائی پچھلے کئی دنوں سے گھر سے غائب ہے۔ اس کے بیوی بچے بڑے پریشان ہیں جی......! وہ بولا۔

تم نے پولیس میں ایف آئی آر درج کروائی......!

جی بالکل...... مگر کچھ پتہ نہیں...... معاملہ انوکھا ہے......! وہ پراسرار انداز میں بولا۔

کھل کر بتاؤ...... تاکہ تمہارے کیس کے بارے

میں سوچا جا سکے......!وہ بولا۔

اس کا نام واجد ہے۔ طارق روڈ پر گارمنٹس کی دکان ہے...... اس کی بیوی کو جناتی دورے پڑتے ہیں......اس حالت میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی......

چار دن پہلے اسے شدید دورہ پڑا......!

واجد اسے کسی پیر صاحب کے پاس لے گیا۔ لیکن کوئی اثر نہ پڑا......! واجد رات کو حاجت کے بہانے اٹھا تھا مگر واپس نہیں آیا......! یہ بات اس کی بیوی نے بتائی......!

واجد کے گھر دو کمروں، ایک کچن، باتھ روم پر مشتمل تھا۔ اس کی بیوی اچھی خاصی پڑھی لکھی عورت تھی۔ دو بچے، احمد اور مائرہ اسکول پڑھتے تھے۔ اس کی بیوی درخشندہ ایک انوکھی بیماری میں مبتلا تھی۔ کبھی کبھی ہوش کھو بیٹھتی۔ ہفتہ میں دو بار ایسا لازمی ہوتا تھا۔ جس کا دورانیہ 15 منٹ ہوتا تھا......!

آپ کو یہ سب کچھ کب سے شروع ہوا؟ خالد حسین نے پچھا۔

دو سالوں سے...... ایک انوکھا واقعہ ہوا تھا۔

وہ بولی......

واقعہ؟ بتائیں گی......اس نے پوچھا۔

ہمارے گھر کے پیچھے ایک بہت پرانا گھر ہے۔

بہت پرانا، ہمارے دادا سے پہلے کا......!

پچھلے دو سالوں سے یہ آباد لگتا ہے۔ حالانکہ یہ بند ہے۔ کوئی نہیں آتا۔ اس طرف لوگ کہتے ہیں سرکاری تحویل میں چلا گیا ہے۔ ایک دن میں واشنگ مشین پر کپڑے دھو رہی تھی کہ گھر کی پچھلی طرف سے کسی کی چہل پہل محسوس ہوئی...... پھر آواز بڑھتی گئی...... میں راہداری کی جانب بھاگی...... راہداری پچھلی طرف کھلتی ہے...... میں نے اس گھر میں آگ کے شعلے دیکھے......اندر کوئی مدد کو پکار رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ......فوراً اس گھر کی باؤنڈری کراس کر گئی۔ لیکن اگلے لمحے مجھے کوئی ہوش نہ رہا...... مجھے ایسا لگا جیسے جہنم میں آ گئی ہوں......سر پر ہتھوڑے جیسی ضربیں لگیں......!

اب بھی جب مجھے اپنے سر پر بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ جب بوجھ میں زیادتی ہونا شروع ہو جاتی ہے تو میں اس کو کھو بیٹھتی ہوں......!

وہ بولتی چلی گئی......!

اس کے بعد دوبارہ کبھی ایسے ہوا......؟ اس نے پوچھا۔

کافی دفع......ہم نے کافی لوگوں سے بات کی مگر یہ سب کچھ رات کو وقوع پذیر ہوتا ہے یا دوپہر...... وہ بھی اچانک......!وہ بولی۔

واجد کو اس بارے میں علم ہوگا......!

جی......! لیکن وہ اس کوشش میں تھے کہ جلد از جلد یہاں سے شفٹ ہو جائے......!

واجد کی گمشدگی کی اطلاع پر پولیس نے کیا قدم اٹھایا؟

ایف آئی آر درج کرائی۔ لیکن پولیس کا ایک کانسٹیبل بے چارہ جان سے گیا۔ وہ بولی۔

"وہ کیسے......؟"

میں نے پولیس کو تمام واقع سنایا...... ہر جگہ چیک کیا۔ ہر شہر پتہ کرایا گیا۔ مگر واجد نہ ملا...... پھر پولیس انسپکٹر کو اس مکان پر شک پڑا۔ ایک کانسٹیبل اس مکان کے اندر داخل ہوا۔ لیکن دوسرے دن اسے زبردست بخار چڑھا۔ اسی بخار نے اس کی جان لے لی۔

کانسٹیبل کی زبان بند ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں خوف تھا......وہ ایک ہی اشارہ کرتا تھا کہ اس مکان میں مت جانا......!

اس مکان کو قریب سے دیکھنے کا شوق خالد حسین کو لے ڈوبا تھا لیکن وہ بال بال بچا تھا۔ البتہ مکان کے سینٹر میں ایک مردانہ جوتا نظر آیا...... درخشندہ نے بتایا کہ یہ اس کے خاوند کا ہے......!

اوہ یہ مردانہ جوتا......! خالد بولا۔

ہاں یہ میرے خاوند کا ہے۔ لیکن پہلے تو اس جگہ میری نظر نہ پڑی تھی۔ مطلب جب پولیس کے لوگ آئے تھے تب یہ جوتا مجھے یا پولیس کو نظر کیوں نہ آیا؟ وہ بولی۔

بات تو واقعی ٹھیک ہی تھی۔ خیر کچھ بھی ممکن تھا......!

آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ واجد اسی مکان میں گیا اور پھر واپسی نہ ہوئی۔ وکیل نے پوچھا۔

شک ہے۔ یقین تو تب ہی ہوگا جب ہمیں کوئی ثبوت ملے گا۔ وہ بولی۔

تبھی خالد حسین کو سید علی شاہ کا خیال آیا۔ وہ فقیر درویش تھے۔ خلوت میں رہتے تھے۔ لوگوں کو شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے...... یہ معاملہ آسیبی تھا۔ اور وہ اس مکان میں تنہا بغیر کسی مدد کے گھسنے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ اسی مد میں ایک کانسٹیبل پہلے ہی جان سے گیا تھا۔ خالد حسین کو جھرجھری سی آگئی...... بغیر کسی مشورے کے وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانا نہ چاہیے۔ خالد حسین کو ایک حیرت اور تھی کہ واجد اگر اس آسیبی مکان میں داخل ہو کر کہاں کھو گیا۔ اگر اندر کوئی موجود ہوتا تو پولیس کانسٹیبل لکھ کر کچھ بیان کر دیتا۔ یا اگر اس واجد کی Death ہوگئی ہوتی تو لاش کی سرانڈ کی بدبو تو محسوس ہوتی۔ معاملہ صرف آسیبی مکان تک محدود نہ تھا۔

☆......☆......☆

مس ایڈورناتھ کی ہتھیلی پر کالا بچھو اپنی تمام تر ہیبتناکیوں کے ساتھ موجود تھا۔ بچھو جنگلی اور افریقہ کی سب سے مشہور آدم خور نسل کا تھا۔ جیوگرافک کی حالیہ ریسرچ کے مطابق یہ کالا بچھو ایک ہفتہ میں ہزار سے زائد افراد کو لقمہ اجل بنا چکا تھا۔ اس کا زہر چند سیکنڈز میں انسانی خون میں موجود وائٹ بلڈ سیلز کو توڑ پھوڑ کر دل اور دماغ کی شریانوں کو پگھلا دیتا تھا۔ بچھو کے ڈنک مارنے کے 5 سیکنڈ بعد بچھو اپنی براؤن آنکھوں سے خون کی پچکاری شکار کی آنکھوں میں ڈالتا۔ آنکھیں چندھیا جاتی...... شکار کو ایسے محسوس ہوتا جیسے تیزاب پھینکا گیا ہو۔ جب کہ تیزاب اور انتہائی زہریلا ڈنک شکار کو تڑپا کے رکھ دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شکار موت کی نیند سو جاتا۔

ایڈور کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں...... بچھو آرام سے بیٹھا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ بچھو نے کوئی حرکت نہ کی...... وہ صبح ناشتہ کے لئے اٹھی تھی کہ اسے اپنی ہتھیلی پر یہ خطرناک موذی نظر آیا تھا...... ایڈورناتھ نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ ٹی وی پر مخصوص چینل اس بارے میں جانکاری فراہم کرتے رہتے تھے......! اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ موت واقع نظر آرہی تھی۔ تبھی اس کے خیال میں اس خطرناک بچھو سے بچنے کا انوکھا طریقہ آیا......!

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں...... تبھی اس نے مسٹر یوچاچاپوپ کی کتاب کا آخری لفظ دہرانا شروع کر دیا...... مسٹر یوچاچاپوپ عیسائی برادری کا اسکالر تھا۔ اس کے مطابق اگر کوئی موذی جانور آپ کی موت کی وجہ بن رہا تو ایک محبت بھرا لفظ زور زور سے پڑھا جائے۔

اس کا عقیدہ تھا کہ پادری کی بات کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔ تبھی وہ زور زور سے اس لفظ کو دہرانے لگی۔ یہ اس کا ایمان تھا یا الفاظ کا اثر کہ بچھو بغیر کوئی نقصان پہنچائے دروازے کے راستے باہر نکل گیا۔

چالاک بیوی

ایک ماہر ازدواجیات شہریوں کو لیکچر دے رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے کہا اگر کوئی صاحب جس کی بیوی سیدھی سادی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ چالاک ہوجائے تو وہ اپنا ہاتھ کھڑا کرے۔ ایک آدمی جو کہ مجمع کے آخر میں بیٹھا تھا اس نے اپنا ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ماہر ازدواجیات نے مسکراتے ہوئے کہا اچھا تو آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی چالاک ہوجائے۔

اس آدمی نے اپنا ہاتھ مایوسی سے نیچے کر لیا اور بولا۔ اوہ...... میں یہ سمجھا تھا کہ شاید آپ نے ہلاک بولا تھا۔

(محمد احمد راجپوت۔بورے والا)

تب کہیں ایڈورناتھ کے جسم میں جان آئی۔

☆......☆......☆

ایڈورناتھ کے کمپارٹمنٹ میں دوبارہ آگ جلتی تھی...... خوفناک قسم کی آوازوں کے ساتھ...... دل دہلا دینے والی آوازوں نے ایڈورناتھ کے اوسان خطا کردیئے۔ وہ کانپ رہی تھی...... حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ معاملہ اس وقت ہوتا جب وہ گھر میں اکیلی ہوتی۔ مسٹر سائیکل جاب پر اور تمام بچے اسکول......!

آج بھی دوپہر کا وقت تھا۔ لندن میں سردی آج بھی عروج پر تھی۔ برف باری بھی رہی مگر جلد ہی موسم معتدل ہوگیا......!

آج مٹن تیار کررہی تھی۔ یہ اس کے بچوں کی مرغوب غذا تھی۔ تبھی ڈوربیل کی آواز سنائی دی......

چولہا ہلکا کرکے وہ ڈور کی جانب لپکی......!

باہر کوئی موجود نہ تھا۔ البتہ اسی وقت (باہر) پچھلی جانب کمپارٹمنٹ میں آگ بھڑک اٹھی۔ خوفناک آوازوں نے اس کے حواس خطا کردیئے۔

تبھی وہ ہمت کرکے پچھلی جانب گھومی۔ وہاں واقعی آگ کے شعلے بلند تھے۔ تبھی اس کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا۔ ایک انسانی آگ کا گولہ برآمد ہوا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ اس کی زبان انگریزی نہیں تھی۔ وہ چیخ رہا تھا۔ وہ واقعی انسان تھا۔ ایک زندہ انسان۔ ایک اندرونی ہمدردی نے ایڈورناتھ کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

وہ اپنے روم سے کمبل لے آئی اور پھر کمبل کو اس اجنبی پر اچھال دیا۔

☆......☆......☆

مسٹر مائیکل انتہائی اہم میٹنگ میں مصروف تھے۔ جب انہیں مسز کی فون کال موصول ہوئی۔

جی آپ پلیز ہیلتھ ہیئر یونٹ آجایئے۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

میٹنگ برخاست کرنے کے بعد وہ ہیلتھ کیئر یونٹ جا پہنچے۔

ان کی بیوی پریشانی کے عالم میں ویٹنگ روم میں ٹہل رہی تھی۔

خیریت تو ہے ڈارلنگ...... کیوں اتنا پریشان ہو؟ وہ بولے۔

جونی اور کیٹ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا...... وہ بولی۔

کب اور کیسے؟ کہاں ہیں اب وہ......! وہ دھاڑے۔

خیریت سے ہیں۔ اور گھر میں......؟

لیکن تم یہاں کیسے......؟

کمپارٹمنٹ کی پچھلی جانب آسیبی گھر سے ایک اجنبی آگ میں جھلسا ہوا باہر نکلا ہے۔ شکل سے ایشیائی لگتا ہے...... میں اکیلی پریشان ہورہی تھی...... سوچا آپ کو زحمت دوں!

ایشیائی بھلا...... اس کمپارٹمنٹ سے باہر کیسے آسکتا ہے۔ اس میں تو کوئی جاتا ہی نہیں......! وہ بولے۔

لیکن یہ حقیقت ہے۔ ابھی اسے ہوش آجائے گا۔ آپ پلیز اسے خود دیکھ لیجیے۔

☆......☆......☆

میرا نام واجد ہے پاکستان سے ہوں۔ لیکن میں کس جگہ ہوں۔ میں تو سائے کے پیچھے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلا تھا۔ جلا ہوا آدمی اپنے بارے میں بتا رہا تھا......!

مسٹر مائیکل کے Office میں ایک پاکستانی جاب کرتا تھا۔ مسٹر مائیکل سمجھ گئے تھے کہ یہ اجنبی پاکستانی ہے۔ تبھی انہوں نے زبان کا مسئلہ حل کرتے ہوئے مسٹر خاور کو زحمت دی۔

یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے خود کو بھی پتہ نہیں کہ میں کہاں ہوں؟

تم اس وقت لندن میں ہو...... خاور نے بتایا۔

لندن......؟ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں تو پاکستان کے شہر کراچی کا باشندہ ہوں...... کلینکل ایکسپرٹ ہوں۔ کل رات میں سویا ہوا تھا کہ مجھے سرگوشی محسوس ہوئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ تبھی میری گناہ میری بیوی پر پڑی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میری بیوی نے مکمل

میک اپ کر رکھا تھا۔ وہ میرے آگے تھی۔ وہ صحن میں چل گئی۔ تبھی میں بھی صحن میں چلا آیا......! وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی جاتی۔ میں دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگتا جاتا۔ تبھی وہ گھر کی پچھلی جانب روانہ ہوگئی۔ میں بھی اس کے پیچھے۔

تبھی وہ آسیبی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔ یہ ہمارے گھر کے پچھلے جانب آسیبی کمپارٹمنٹ ہے جہاں کبھی کبھی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ یا کبھی خوفناک آوازیں داخل ہوتی ہیں......!

دروازہ کھل گیا۔ میری خوب صورت بیوی اندر داخل ہوگئی تھی۔ تبھی میں بھی اندر داخل ہوگیا۔ اندر ایک حسین وجمیل منظر تھا۔ جنت بے نظیر...... خوب صورت حسین عورتیں ہاتھوں میں شراب لئے میرا انتظار کررہی تھیں۔ خوشبو پھیل گئی تھی۔

میری بیوی اچانک کہیں گم ہوگئی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر حسین وجمیل حسیناؤں کے تھرکتے وجود میں کھو گیا۔ میری باچھیں کھل گئیں......

ایک حسینہ میری جانب لپکی...... شراب کا مگ میرے لبوں سے مس ہوا۔ وہ سرور چڑھا کے مست ہوگیا۔ تبھی میں بہک سا گیا۔

میں نے اس حسینہ پر نگاہ غلط ڈالی...... شیطان حاوی ہونے لگا کہ منظر بدل گیا۔

حسینائیں خوفناک شکل اختیار کرگئیں...... بدبو دار تعفن پھیل گیا...... اندھیرا اور گھپ اندھیرا پھیل گیا...... میں جیسے ہوش میں آگیا...... تبھی میں پیچھے کی جانب بھاگا۔ لیکن دروازہ بند ہوگیا۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب جگنو چمکا تو گھپ اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوا تو دروازے کی جانب لپکا۔ تبھی خوفناک آوازیں آنا شروع ہوگئیں...... پھر اچانک آگ بھڑک اٹھی۔

میں آگ سے بچتا رہا۔ لیکن آگ نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تبھی میں دروازے کے ذریعے باہر نکلا......! اور اب آپ کے پاس ہوں......

کہانی حیرت انگیز تھی۔ ایک شخص کراچی سے لندن کس طرح آپہنچا...... معاملہ عجیب تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر مختار دلاور کا سایہ دیکھ کر حیران ہوگئے......!

آئینہ میں مکمل طور پر دلاور کا عکس چھا گیا۔

اس کی آنکھیں سرخ اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔

ایک خوفناک چہرہ انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

ڈاکٹر مختار سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس پینے لگے۔ ان کا وجود خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا......!

آئینہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر فرش پر بکھر گیا۔

اسی لمحے ڈاکٹر مختار کانپ اٹھا۔

ان کا چھوٹا بیٹا احسن رونے لگا تھا۔ ان کی بیوی اسے چپ کرانے میں لگی تھی...... وہ جیسے ہوش میں آگیا تھا...... وہ بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیڈروم میں موجود تھا...... اس نے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ حقیقت میں ٹکڑے ٹکڑے دیکھا۔ انہیں پسینہ چھوٹ گیا تھا۔

آپ اتنا پریشان کیوں ہیں؟

کچھ نہیں...... بس برا خواب دیکھ لیا تھا......!

ننھا احسن قلقاریاں مار رہا تھا...... تبھی احسن روتے ہوئے بے ہوش ہوگیا...... اس کا چہرہ سرخ سے پیلا ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مرئی طاقت اس کے ننھے وجود سے خون چوس رہی ہو...... ڈاکٹر مختار کے پسینے چھوٹ گئے۔ ان کی بیوی کی حالت اپنے بچوں کو دیکھ کر غیر ہونے لگی۔

اسے کیا ہورہا ہے؟ پلیز میرے بچے کو بچالیں......! وہ خود بھی ڈاکٹر تھی۔ لیکن اس وقت دونوں میاں بیوی کی حالت قابل ہمدردی تھی۔

لیکن پھر جیسے بچہ زندہ ہونے لگا ہو۔ پہلے زرد چہرے میں دوبارہ سے خون بھرنے لگا ہو...... پھر رونے لگا...... دونوں نے حیرت انگیز انداز سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ خدا کا معجزہ ہی تھا۔

☆......☆......☆

خالد حسین ایڈووکیٹ نے درویش بابا علی شاہ کو اس گھناؤنے معاملہ میں انٹر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ درخشندہ اور اس کا دیور بھی اس فیصلے پر متفق تھے۔

کمپارٹمنٹ میں آگ لگنا، پھر چیخ و پکار اور واجد کی پراسرار گمشدگی، کانسٹیبل کی اس مکان میں جانے کے بعد پراسرار موت ایک انوکھا اور پراسرار معاملہ تھا......

درویش علی شاہ، عمرے اور مقدس مقامات کی زیارت پر گئے تھے۔ یہ بات ان کے آستانے پر جا کے معلوم ہوئی تبھی ان کے مرید دین محمد سے خالد حسین کی ملاقات ہوئی۔ یہ مولوی تھے۔ مسجد میں امامت کے ساتھ ساتھ درس قرآن کا فریضہ بھی سر انجام دیتے تھے۔

جی میرا نام خالد حسین ایڈووکیٹ ہے۔ ہم نے ملنا ہے علی شاہ سے......!

جی وہ تو عمرے پر گئے ہوئے ہیں۔ مگر کام کیا ہے؟ وہ بولے۔

خالد حسین نے سارا معاملہ گوش گزار کیا......!

پھر دین محمد نے یہ معاملہ سلجھانے کا فیصلہ کرلیا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر مختار کو بھاری خمیازہ ادا کرنا پڑا تھا......! ان کا بیٹا ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا تھا۔ انہیں دلاور کیس اچھی طرح یاد تھا۔

جب دلاور سرجری کی غرض سے ان کے کلینک پر آیا تھا۔ متوسط طبقے کے اس خاندان کی ہارٹ ڈیزیز موروثی بیماری تھی۔ جب اس نے دس لاکھ کا مطالبہ کردیا......

جی میں دس لاکھ سے ایک روپیہ بھی کم نہ لوں گا۔ اور اگر آپریشن کے بعد مریض کو کچھ ہوگیا تو ہم ذمہ دار نہ بھی ہوں گے۔

آپریشن ہوگا تب بھی آپ ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ہم بہت غریب انسان ہیں جی۔ آپ کا کیا ہے۔ آپ کی آخرت بھلی ہوجائے گی جی......؟

میں کچھ نہیں جانتا...... مکمل پیسے ہیں تو ٹھیک ورنہ خیراتی اسپتال لے جاؤ۔ فری میں ہوجائے گا۔ وہ بڑی بے رحمی سے بولا تھا۔

جبکہ وہ غریب گڑگڑاتے رہے۔ مریض F.S میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا۔ انتہائی ذہین اور با اعتماد......! بدقسمتی سے دل کی موروثی بیماری کے آخری اسٹیج پر جا پہنچا تھا۔

☆......☆......☆

ہمیں واجد کی واپسی کا انتظام کرنا چاہئے۔ اس کے گھر والے پریشان ہونگے۔ ایڈورناتھ نے کہا۔

ہاں۔ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ مگر کچھ قانونی پیچیدگیاں حائل ہیں۔ برٹش اصول کے تحت ہمیں واجد کو اس کے ملک بہت جلد بھیجنا ہوگا۔ میں ہائی کمیشن سے رابطہ کرتا ہوں کہ واجد کو جلد از جلد اس کے ملک بھیجا جائے۔ تب تک اس کی مکمل نگہداشت ہوگی...... اس کا جسم اچھا خاصا جھلس چکا ہے۔ زخم بھرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تب تک میں اس کے پاسپورٹ اور دوسرے انتظامات کرتا ہوں۔ مائیکل بولے۔

گڈ...... واجد کا کہنا ہے کہ اس کے گھر کے پیچھے بھی ہمارے گھر کی طرح ایک مکان ہے۔ جس میں آگ لگنے اور شور و غل جیسی حرکات ہوتی رہتی ہیں۔ جبکہ وہ اس کے اندر داخل ہوا تو مختلف لوگوں سے ملتا لندن آ پہنچا......؟ یہ کیسے ممکن ہے؟

میرا دماغ اس معاملے میں ماؤف ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے...... مائیکل بولے۔

تو بس پھر ٹھیک ہے۔ ہمیں بہت جلد یہاں سے شفٹ ہوجانا چاہئے۔ آپ کسی مکان کی بات کررہے تھے۔

ہاں۔ بس واجد کو اس کے ملک روانہ کرکے ہم اس گھر کو Sale کرکے دوسرے مکان میں شفٹ ہوجائیں گے۔

واجد کی حالت دن بدن بہتر ہورہی تھی۔ اس کے زخم بڑی تیزی سے مندمل ہونے لگے تھے۔ ایڈورناتھ اور مائیکل بہت اچھے انسان تھے۔ دونوں نے اس

کی نگہداشت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

یہ ٹیوزڈے تھا۔ واجد کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ واجد کے لئے لندن ایک نئی اور خوب صورت جگہ تھی وہ یہاں کی آزاد اور خودمختار زندگی سے متاثر تھا......

ٹریفک کے اصول اور انسانی ہمدردی کے بہت سے واقعات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے...... ہر طرف خوشی اور مصروف زندگی...... سب اپنی اپنی مصروفیات میں گم نظر آئے تھے۔

لوگ ناشتہ میں، ڈنر میں فاسٹ فوڈ کا استعمال بے دریغ کرتے تھے۔ چلتے پھرتے کھانا بھی کھالیا اور Office بھی ٹائم سے پہلے جا پہنچے......!

تبھی اسے خیال آیا کہ انگریزوں نے فاسٹ فوڈ کیوں ایجاد کیا تاکہ چلتے پھرتے کھا بھی لیا۔ وقت کی بچت اور بہت سا کام بھی سمیٹ لیا جبکہ ہم لوگوں نے فاسٹ فوڈ کو بطور فیشن یا وقت کے بے ضیاع کے طور پر لے لیا۔ لوگوں کی لمبی لمبی لائنیں شام ہوتے ہی باربی کیو پر لگ جاتی ہیں۔

ٹریفک کے بہترین اصول، صفائی ستھرائی اور ذات پات سے الگ، ایک بات جو غور طلب رہی کہ انگریز ہر کام کو مخلص ہو کر کرتے تھے اور جس دن اس کے پاس کوئی کام نہیں، اس دن وہ اپنے آپ کو دنیا کا فضول ترین شخص قرار دیتے تھے۔

بہرحال اس دن ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ واجد مکمل صحت یاب تھا۔ وہ شام کو کمپارٹمنٹ کے پچھلی جانب آنکلا......!

جونہی وہ اس طرف آیا۔ اسے چکر آنے لگے۔ اسے ایسا لگا جیسے ایک غیر مرئی طاقت اسے کمپارٹمنٹ میں بلا رہی ہو۔ تبھی اسے Feel ہوا جیسے اس کمپارٹمنٹ سے روشنی کا ہالہ برآمد ہوا ہو، تبھی وہ ہالہ اس کے اردگرد گھومنے لگا۔ وہ ہالہ دائرے میں گھومتا ہوا دوبارہ کمپارٹمنٹ کی جانب جانے لگا۔ واجد اس ہالے کے اندر قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ہوش ہی نہ رہا تھا کہ کب وہ بے ہوش ہوا۔ جبکہ مائیکل اور ایڈورنا تھ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

بابا دین محمد کمپارٹمنٹ کے اندر داخل ہوئے۔ خالد حسین ایڈووکیٹ کی حالت دیدنی تھی۔ بابا نے اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ جبکہ واجد کا بھائی اور درخشندہ اپنے ہی گھر کی حدود میں مقیم رہے جبکہ خالد حسین کی شامت آگئی تھی۔ اس نے کمپارٹمنٹ کے اندر جانے کی کوشش کی تھی۔ اسے گرم پھوارے نے جلا دیا تھا۔ یہ خالد حسین کی عین دل کی جگہ تھی۔

یہ دین محمد کے آنے سے ایک دن پہلے کا عمل رہا ہوگا۔ جب خالد حسین نے ذہنی تجسس کے تحت کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس نے جونہی دروازہ کھولا۔ آگ کا گرم شعلہ اس کی جانب لپکا تھا۔ جبکہ بابا دین محمد نے اسے منع کیا تھا۔ اس کے خیال میں کمپارٹمنٹ ذہنی خیال کا ایک ایسا پراندہ تھا جس میں خواہ مخواہ ہی بھوت پریت کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ سب ڈرامہ رچایا گیا تھا۔

لیکن جب آگ کا شعلہ عین دل کی جگہ پڑا تو پھر آگ اعضائے دل کو جلا کر بھسم کر گئی۔

☆......☆......☆

واجد بھاگتا ہوا اس جناتی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا۔ دروازہ خود بخود اوپن ہو گیا تھا...... اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہ رہا تھا۔

جب جگنو چمکا تو اس نے اپنے سامنے ایک بابا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ واجد کو اپنے جسم میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن بابا نے اچانک آنکھ کھول دی۔

"بیٹا...... لیٹے رہو...... تمہارے زخم ہرے ہیں......

آپ کون ہیں؟ اور میں کہاں ہوں؟

میرا نام دین محمد ہے۔ تم اپنے گھر ہو...... دیکھو...... پہچانو۔ ارے بھئی تم سب اندر آجاؤ......! بابا نے دروازہ کی جانب دیکھ کر زور سے کہا۔

سارے لوگ اندر آ گئے۔

واجد اپنی بیوی، اور بھائی دونوں کو پہچان گیا تھا...... ! اور ناقابل یقین...... ! میں دوبارہ پاکستان آ گیا ہوں...... اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں...... درخشندہ کی حیرت اور خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ واجد بھی اپنے بھائی سے مل کر خاصا خوش تھا۔

آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ واجد میاں لندن سے ہو کر آئے ہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ اس کی تفصیل تو میں نہیں بتا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ اس مکان کا دوسرا حصہ لندن میں ہے۔ جنات ہوائی مخلوق ہے۔ فاصلہ اس مخلوق کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ پلک جھپکتے میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔ آپ کے اس کمپارٹمنٹ میں جنات کا بسیرا تھا۔ اب میں نے تمام شیطانی جنات کو فنا کر دیا ہے۔ اس کام کے لئے مجھے پیرو مرشد علی شاہ صاحب سے اجازت لینی پڑی تھی...... !

بہت بہت مہربانی...... کیا فنا ہونے والے جنات دوبارہ تو اس مکان میں نہیں آئیں گے؟

زیادہ تر جنات ویران اور کم آبادی جگہوں پر رہتے ہیں۔ ان کی آبادی دوانچوں پر بھی رہ سکتی ہے۔

بظاہر تو دوانچ ہوتے ہیں مگر اگر اندر داخل ہوئے تو بہت بڑا شہر نظر آتا ہے۔ خیر یہ دوبارہ واپس نہ آئیں گے کیونکہ جو جن ایک بار فنا ہو گیا۔ سمجھو اس کی موت ہو گئی۔ اور موت کے بعد کوئی دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ وہ بولے۔

☆......☆......☆

اسی لمحے جیسے آئینہ خاموش ہو گیا...... ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہم لوگوں میں دو لوگوں نے اپنا فیوچر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جن کی Movie اس جادوئی آئینہ میں چلی تھی۔

خالد حسین اور ڈاکٹر مختار علی کی حالت قابل رحم تھی۔ آئینہ نے سب کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا......

اسی لمحے ڈاکٹر مختار کا سیل فون بج اٹھا...... اسے پسینہ سا آ گیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا وہ آنکھیں چرا رہا تھا۔ اس نے فون اٹینڈ کیا۔

ہیلو...... !

کیا...... کیا مطلب...... میرا بیٹا فوت ہو گیا...... !

یہ دردناک خبر تھی...... ڈاکٹر مختار کا بیٹا حقیقت میں Expire ہو گیا۔

اسی لمحے وہ گرا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ تبھی میں آگے بڑھا۔ ڈاکٹر کی سانسیں زندگی کی قید سے آزاد ہو گئی تھیں۔

اسی لمحے خالد حسین کے سینے میں شدید درد اٹھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ جیسے اس کے دل کو جلایا جا رہا ہو۔ چند ہی لمحوں میں اس کی ڈیتھ ہو گئی۔

☆......☆......☆

میں نے اس بوڑھے کو پکڑنا چاہا لیکن بوڑھا اپنی جگہ سے غائب تھا۔ ٹرین میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک صاحب نے زنجیر کھینچ لی۔ ریلوے ماسٹر کو انفارم کیا گیا۔

اگلی صبح اخبار میں یہ خبر اس طرح شائع ہوئی۔

دو مسافر اچانک دل کا دورہ پڑتے ہی دم توڑ گئے۔ عینی شاہدین کے مطابق ایک نامعلوم مسافر جس کی عمر 70 سال سے زیادہ ہوگی کو مسافروں نے ان دونوں سے گپ شپ کرتے دیکھا۔ تفصیل میں وہ تمام باتیں درج تھیں جو ہمارے ساتھ وقوع پذیر ہوئیں...... !

مجھے ان دونوں کا دلی افسوس ہوا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ کہ بوڑھا اچانک کہاں سے آ ٹپکا؟ آخر وہ تھا کون؟ اور وہ ان کو کیسے جانتا تھا؟ ان سوالوں کے جواب صرف ایک لفظ دے گئے جب کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور میں اپنا بریف کیس لے کر نیچے اترا۔ ایک بوڑھا قلی میری جانب لپکا۔ صاحب سامان اٹھوالوں؟“ میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ میں اس کی آواز پہچان گیا۔ یہ رات والا پراسرار بوڑھا ہی تھا۔ وہ بولا۔ ”صاحب! آپ کے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں۔ آپ تو اشرف المخلوقات ہو۔ جبکہ آپ لوگ مجھ ناچیز کو ’ملک الموت‘ کہتے ہو۔“



طوفانی رات

محمد شعیب۔فیصل آباد

حویلی کے بند کمرے میں ایک کھرکھراتی ہوئی لرزہ براندام کرتی اور نسوں میں خون منجمد کرتی خوف کے گرداب میں غوطہ زن ناقابل فراموش ڈرائونی کہانی

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہئے، ان الفاظ سے انحراف لوگوں کے لئے سبق آموز کہانی

وہ اندھیری رات تھی۔ابرِ کرم زور و شور سے برس رہا تھا۔بادلوں کی گرج دل دہلا دینے والی تھی۔بجلی کی چمک کسی بھی لمحے آنکھوں کی روشنی زائل کر دینے کو تیار تھی۔ایسے میں اپنے گھر سے نکلنا، بے وقوفی تھا اور یہ بے وقوفی ساجد اور اس کے تین دوست کر چکے تھے۔ساجد، واجد، ثانیہ اور سحر ویک اینڈ منانے اپنے گھر سے نکلے تھے۔

شام بہت سہانی تھی۔آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔سرد ہوا سردی کی شدت میں اضافہ کر رہی تھی۔وہ چاروں اپنے گھر کے قریب والے گارڈن میں اکٹھے ہوئے تھے۔

''یار واجد۔۔۔کیا سہانا موسم ہے۔کیوں نا لانگ ڈرائیو پر چلا جائے۔۔'' ساجد نے اپنے چہرے کی خراش کو مٹاتے ہوئے کہا جو کہ درخت کے جھڑے

ہوئے پتے نے اس کے دائیں رخسار پر لگائی تھی۔

"پاگل ہو تم۔۔۔ موسم دیکھا ہے تم نے، کبھی بھی بارش ہوسکتی ہے۔" سحر نے لہراتی زلفوں کو سمیٹتے ہوئے ساجد کی بات کا جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے، تم بارش سے ڈرتی ہو۔۔" ساجد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں ڈرتی ورتی نہیں ہوں۔۔۔ میں تو بس تمہیں یہ کہہ رہی تھی کہ ایسے موسم میں لانگ ڈرائیو پر جانا دانشمندی کی بات نہیں۔" سحر نے وضاحت کی۔

"اچھا جی۔۔۔ پھر تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔۔۔ اور تم اکیلی رہ کر کیا کرو گی تانیہ؟ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" واجد نے کہا۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟" تانیہ نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔

"وہ میرے پاپا کا فارم ہاؤس ہے نا!" ساجد نے کہا۔

"کیا؟؟؟؟؟؟؟؟؟ اتنی دور۔۔۔۔؟" چونکتے ہوئے سحر نے کہا۔

"ڈر گئی؟؟" ساجد نے تمسخرانہ کہا۔

"جی نہیں۔۔۔ چلو۔۔۔" اس کی آواز میں جوش ختم ہوچکا تھا۔

☆......☆......☆

ایک گھنٹے بعد سحر، تانیہ اور واجد نیو ایڈن گراؤنڈ میں جمع ہوگئے۔ اب بس ساجد کا انتظار تھا۔ دو منٹ بعد وہ بھی کار لے کر آگیا۔ واجد، ساجد کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ سحر اور تانیہ پیچھے بیٹھ گئیں۔ موسم مزید خراب ہوگیا۔ ہلکی ہوائیں، تیز ہوگئیں۔ ہوا میں نمی بڑھ گئی۔ درختوں سے پتے تیزی سے جھڑنے لگے۔ ساجد نے ایف۔ ایم آن کیا۔ سب میوزک سے حظ اٹھانے لگے۔ جوں جوں کار منزل کی طرف جارہی تھی۔ موسم کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ بادلوں نے گرجنا شروع کردیا۔ ساجد اور واجد دونوں اس موسم کو انجوائے کررہے تھے جبکہ سحر اور تانیہ پر ایک وحشت طاری تھی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا، موسم کافی خراب ہے۔ اب بھی وقت ہے، واپس گھر چلتے ہیں۔" سحر نے موسم کی سختی دیکھتے ہوئے کہا۔

ساجد اور واجد نے اس کا ڈر سمجھنے کی بجائے اس کا مذاق اڑانا شروع کردیا۔ دو منٹ کے بعد ساجد نے ایف۔ ایم۔ پر چینل چینج کیا۔ سلو میوزک آن ائیر تھا۔ ایک بھیانک آواز ایف۔ ایم سے آنے لگی۔ موسم کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ بارش نے برسنا شروع کردیا۔ بجلی کی چمک نے کار کی فلیش لائٹ کو ماند کردیا۔

"سنسان، بیابان جنگل سے گزرتے ہوئے ایک الگ سا احساس آپ پر طاری ہوجاتا ہے اور یہ احساس اس وقت وحشت بن کر آپ کو ڈسنے لگتا ہے جب دل کو دہلا دینے والی آوازیں آپ کا پیچھا کرنے لگیں۔ آپ کا نام پکاریں۔ آپ ان آوازوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں مگر وہ آوازیں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آپ کے قریب سے قریب تر آتی جارہی ہوں اور یہ وحشت اس وقت آپ کی جان نکال دیتی ہے جب ایک ہاتھ، آپ کے شانے کو چھوئے۔۔۔" ایف ایم پر آر جے کی پراسرار باتیں سحر اور تانیہ کو اپنے سحر میں لے چکی تھیں۔

"شاپ اِٹ یار۔۔۔ بند کرو ایف ایم کو۔۔۔" تانیہ نے جھلا کر کہا۔

اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ ساجد نے بریک لگائی۔

"کیا ہوا؟ بریک کیوں لگائی؟؟" سحر نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔۔۔ خود بخود بریک لگی ہے۔" ساجد نے کار سٹارٹ کرنے کی پوری کوشش کی مگر کار سٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"یار جلدی کرو۔۔۔" سحر کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ وہ کسی بھی طرح اس سنسان سڑک سے اوجھل ہونا چاہتی تھی۔ بارش کی گرتی بوندیں، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج سحر کو خوف کے اندھیروں میں دھکیل رہی تھیں۔ اس

کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ثانیہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسے حوصلہ دے رہی تھی مگر خود بھی اسی خوف میں مبتلا تھی۔ ساجد نے کار کا دروازہ کھولا اور طوفانی بارش میں قدم رکھا۔ قدم رکھنے کی دیر تھی کہ اس کا پورا جسم تر ہوگیا۔ سرخ شرٹ کے نیچے پہنی بنیان واضح طور پر دیکھائی دینے لگی۔ وہ انجن کی طرف بڑھا مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ جانوروں کی آوازیں مزید واضح ہوگئیں۔ تیس سیکنڈ میں وہ واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ اس کا وجود بھیگ چکا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہوگئے۔ تند خو ہوائیں، طوفانی بارش سے زیادہ خطرناک تھیں۔

''کیا ہوا؟'' واجد نے پوچھا۔

''لگتا ہے انجن میں پانی چلا گیا۔۔۔'' ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

''اب کیا ساری رات اسی جگہ پر گزارنی پڑے گی؟'' سحر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''جب تک بارش نہیں رکتی تب تک تو کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔۔۔''

''اچانک بارش میں اگر آپ کی کار بیابان جنگل میں خراب ہوجائے اور اچانک ایک سایہ آپ کو ونڈو سے نظر آئے۔۔'' آر جے کی باتیں جاری تھیں کہ اچانک کوئی باہر سے ونڈو کھٹکھٹانے لگا۔

''ک ک ک کون؟'' موسلا دھار بارش کی وجہ سے باہر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ واجد کی آواز میں بھی کپکپاہٹ آگئی۔

''یار دروازہ مت کھولنا۔۔'' واجد نے سمجھایا مگر ساجد نہ مانا اس نے دروازہ کھولا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اچانک تند خو ہواؤں نے کار کا رخ لیا۔ بارش کی بوندیں کار میں داخل ہونے لگیں۔ ساجد کے پینٹ بھی بارش سے گیلی ہوگئی۔

''یار جلدی اندر آ۔۔'' سحر اور ثانیہ کے ساتھ ساتھ اب واجد بھی موسم کے حصار میں آگیا۔ اس کا وجود بھی خوف کے زیر اثر ہوگیا

ایک بار پھر ونڈو پر دستک ہوئی مگر اس بار ایک سایہ بھی نمودار ہوا۔ ساجد نے غصے میں دروازہ کھولا۔

''کیا ہے؟ کیوں بار بار تنگ کررہے ہو؟'' ساجد نے باہر نکلتے ہی اس پر جملے کسنا شروع کردیئے مگر وہ بوڑھا شخص خاموشی سے عصا کے سہارے کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کا چہرہ لمبے بالوں سے آدھا ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں خم تھا۔

''بیٹا۔۔ یہاں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ یہ جنگل روحوں کا مسکن ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے، چلے جاؤ یہاں سے۔۔ ورنہ جانی نقصان بھی ہوسکتا ہے۔۔۔'' اس بوڑھے کی آواز موسلا دھار بارش میں بھی کار تک پہنچ رہی تھی۔ سحر اور ثانیہ مزید گھبرا گئیں۔ واجد بھی اب باہر آچکا تھا۔

''ہماری کار خراب ہوگئی ہے اور یہاں کوئی مکینک ہے؟'' واجد نے اس بوڑھے شخص سے پوچھا۔

''اس جنگل میں کوئی مکینک نہیں ملے گا تمہیں۔۔۔ ہاں، اگر چاہو تو میرے ساتھ آسکتے ہو، پاس ہی ایک حویلی ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ چاہو تو آج رات وہاں ٹھہر سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر بوڑھا شخص وہاں سے چل دیا۔ ایک بار پھر بجلی چمکی۔ بادلوں نے ڈر کو ہوا دی۔ ثانیہ فوراً کار سے باہر آئی۔

''یار۔۔ اس طوفانی رات میں باہر رکنے سے بہتر ہے، اس بوڑھے شخص کے ساتھ اس کی حویلی ہی چلے جائیں۔ اس جنگل میں رات گزارنے سے تو بہتر ہے نا!'' اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

''ٹھیک ہے۔۔'' ساجد نے شانے اچکائے اور بوڑھے شخص کو روکا۔ اس کی ہنسی پہلی بار نظر آئی۔ سب اس بوڑھے شخص کے پیچھے چل دیئے۔ سنسان سڑک پر بارش کی بوندوں کے ساتھ ان سب کے قدموں کی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔ ایک میٹر کے فاصلے پر ایک حویلی نظر آئی۔ لوہے کا جالی دار گیٹ طوفانی ہوا میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا کررہا تھا۔ ایک بار پھر بجلی چمکی۔ سب نے پہلی بار اس حویلی کی حولناکی کو دیکھا۔ پوری حویلی پر سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سی آہٹ اس حویلی

کے باہر سے ہی سنی جاسکتی تھی۔ بوڑھے شخص نے آگے بڑھ کر مین دروازہ کھولا۔ دس فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا دروازہ جاذب نظر تو نہ دیکھا مگر ایک وحشت ضرور رکھتا تھا۔ سب اندر چلے گئے۔ وہ سب بارش میں مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ سب کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ حویلی میں اندھیرا تھا۔ بجلی کی چمک نے ہر چیز کو روشن کیا۔ سامنے ایک صوفہ تھا۔ جسے پھٹے پرانے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ دائیں طرف ساٹھ کی دہائی کا ڈائننگ ٹیبل جس نے مٹی کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا، پڑا تھا۔ بائیں طرف ایک کمرہ تھا۔ جس کو دیکھ کر کچن کا گمان ہو رہا تھا۔ ایک آہٹ وہاں سے مسلسل آرہی تھی۔ گرج کی آواز نے اس آہٹ کو مدھم کر دیا۔

"کتنی سنسان ہے یہ حویلی۔۔" آگے بڑھتے ہوئے تانیہ نے کہا۔ اچانک دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ سب نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"ی ی ی یہ دروازہ۔۔؟؟" سحر نے کہا، اس کا چہرہ اس کے ڈر کو ظاہر کر رہا تھا۔

"یہ حویلی سو سال پرانی ہے، سب دروازے جام ہو چکے ہیں۔ کب کھلتے ہیں، کب بند ہوتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا۔۔۔ خیر تم اوپر چلے جاؤ۔۔۔ آرام کرو۔۔" بوڑھا شخص کچن میں چلا گیا اور پھر چار کینڈلز ہاتھ میں لئے واپس آیا۔

"یہ لو۔۔ یہاں روشنی صرف انہی سے ہوتی ہیں۔ اور یاد رہے چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنا۔۔ ورنہ۔۔۔" کھسیانی ہنسی کے ساتھ وہ واپس کچن میں چلا گیا۔ کچن میں جاتے ہی وہ ہنسی غائب ہوگئی بجلی کی چمک نے ایک بار پھر اندھیر حویلی کو نیلی روشنی سے جگمگا دیا۔ سب دھیمے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ہاتھوں میں کینڈلز روشن تھیں مگر ہوا کے جھونکے اس روشنی کو بھی اچک لے جانے کو تیار تھے۔ اوپر والی منزل پر چار دروازے تھے۔ سب ایک ایک کمرے میں چلے گئے۔

☆......☆......☆

تانیہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ کینڈل کی روشنی نے اندھیرے کمرے کو نیم روشن کر دیا۔ صرف ایک ٹوٹا ہوا بیڈ تھا جس کو سیاہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی الماری تھی۔ دیوار پر موذی اور خونی جانوروں کے خاکے بنے ہوئے تھے۔ بجلی کی چمک ان خاکوں میں جان ڈال دیتی۔ وہ سہمتے ہوئے بیڈ پر جا بیٹھی۔ اس کا جسم بھیگا ہوا تھا۔ اس کی نظر الماری پر پڑی۔ اس نے کینڈل کو بیڈ پر رکھا اور الماری کی طرف بڑھی۔ برسات نے اس الماری کو جام کر دیا۔ وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک زوردار جھٹکے سے دروازہ کھلا۔

"آ۔۔۔۔" الماری کھلتے ہی اس پر ایک کھوٹا گرا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل آئی۔ اس کا سانس پھول گیا۔ الماری میں جالے ایسے بنے ہوئے تھے جیسے سالوں سے اس کو نہ کھولا گیا ہو۔ ایک چادر الماری میں تھی۔ اس نے اسے اٹھایا اور اوڑھ کر بیڈ پر جا لیٹی۔ ایک کپکپی اس پر طاری تھی۔ بجلی کی چمک، اور تند خو ہواؤں کی آوازیں نہایت بھیانک لگ رہی تھیں۔ کھڑ کھڑ کی آوازیں، اس کی نیند کو اچک لے گئیں۔ ایک چیخ کی آواز آئی۔ وہ ڈر گئی۔ اٹھ بیٹھی۔ قدموں کی آہٹ اسے سنائی دینے لگی۔ وہ ڈرتے ہوئے دروازے کے قریب گئی۔

"کون ہے؟ کون ہے؟" لرزتے لبوں سے پوچھا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ لمبے سانس لیتے ہوئے وہ آگے بڑھی مگر اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ بجلی چمکی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہاں کوئی دروازہ نہ تھا۔ وہ دروازے جن کے ذریعے سحر، واجد اور ساجد اپنے اپنے کمروں میں داخل ہوئے تھے۔ سب غائب ہوگئے۔

"ساجد۔۔۔ واجد۔۔۔ سحر۔۔۔" وہ چلانے لگی۔ گرج چمک میں اضافہ ہوگیا۔ وہ واپس مڑی تو ایک اور جھٹکا لگا۔ اس کے کمرے کا بھی دروازہ وہاں نہیں تھا۔ صرف دیوار تھی۔ وہ گھبرا گئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا مگر پھر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ ہر طرف اندھیرا چھا

گیا۔ وہ چلانے لگی مگر وہاں کوئی نہ آیا۔

☆......☆......☆

کروٹیں بدل بدل کر ساجد کا جسم ہلکان ہوگیا۔ وہ نئی جگہ پر اور گیلے کپڑوں میں وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ اس نے دیوار کی طرف کروٹ لی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کے ساتھ لیٹا ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی مٹھی خوف سے بھینچ لی۔ بجلی کی چمک نے دیوار پر ایک سایہ بنایا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ خوف اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا۔ قدموں کی آواز کمرے کے باہر سے سنائی دینے لگی۔ اس نے ہاتھ میں کینڈل لی اور ننگے پاؤں دروازہ کھولا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ صرف اندھیرا اور وحشت تھی۔ وہ آگے بڑھا اور واجد کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس نے دروازہ نہ کھولا۔

اچانک سحر کے کمرے سے ایک چیخ کی آواز آئی۔ وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"سحر۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔" وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ چیخ بھی غائب ہوگئی۔ پر اسرار خاموشی نے آگھیرا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ہاتھ میں موجود کینڈل ہوا کے جھونکوں سے بجھنے کو تیار تھی۔ تانیہ کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ وہ آگے بڑھا کمرے میں داخل ہوا مگر وہاں تانیہ موجود نہ تھی۔

"تانیہ؟؟" اس نے پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وہ چلتے چلتے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ کچن سے آہٹ سنائی دی۔

"تانیہ۔۔۔ یہ تم ہو؟" اس نے نیچے جھانکتے ہوئے پوچھا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ آہٹ مذید واضح ہوگئی۔ وہ لرزیدہ قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ ننگے پاؤں تھا مگر جب بھی وہ نچلے سٹیپ پر قدم رکھتا۔ ایک آہٹ سنائی دیتی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ نیچے اتر رہا ہو۔ وہ قدموں کی آواز تھی۔ اس نے اپنے آگے پیچھے دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ ایک تند خو ہوا کا جھونکا آیا اور کینڈل بجھ گئی۔ اندھیرے نے آگھیرا۔ حویلی کے مین دروازے پر دستک ہونے لگی۔ مگر جب وہ اس کے پاس گیا تو دستک کی آواز گل ہوگئی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ پلٹا تو ایک سایہ کچن میں جاتا دکھائی دیا۔ وہ دھیمے قدموں کے ساتھ بڑھنے لگا۔ وہ برسات کے موسم میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ یہ پسینہ خوف کا تھا۔ وحشت کا تھا۔ وہ کچن کے دروازے کے قریب تھا۔ اس سے پہلے کے وہ آگے بڑھتا۔ اس کے شانوں پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

ایک چیخ کی آواز گونجی۔ اس کا سانس پھول گیا۔ آہستہ سے پلٹا وہاں تانیہ تھی۔ جو خود بھی خوف کے پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تم۔۔۔" اسکی آواز ہکلانے لگی۔ سانس کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

غم اور مسکراہٹ

غم اس لئے نہیں ہوتے کہ انہیں آنسوؤں کی صورت میں سجا کر دوسروں کے سامنے پیش کر دیا جائے، یہ دل کے لئے ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں پھلتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں، جب غم اشکوں کی مالا بن کر بکھرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت انہیں زمانے میں سمیٹنے والا کوئی نہیں ملتا کیونکہ یہ دنیا تو خوشیوں کی ساتھی ہے۔ اس نے کب روتے ہوئے چہروں کو ہنسایا ہے بلکہ ہمیشہ ہنستے ہوئے چہروں کو رلایا ہے اس لئے بہتر ہے انسان اپنے دکھوں کو چھپا کر ہر دم مسکراہٹ سجائے رکھے اور زندگی کے دن پورے کرے۔

(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

''ساجد۔۔اس حویلی میں کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔'' ثانیہ نے گھبرا کر کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔ہمیں باقی دونوں کو بھی آگاہ کر دینا چاہئے۔'' تیز قدموں کے ساتھ وہ واپس اوپر گئے۔

☆......☆......☆

''اف کتنی گرمی ہے۔۔۔'' واجد نے اپنی شرٹ اتار کر زمین پر پھینک دی اور دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا۔چند سیکنڈ بعد وہی شرٹ کسی نے زمین سے اس کے منہ پر اچھال دی۔وہ چونک گیا۔ادھر ادھر دیکھا۔کھڑکی کھلی تھی۔

''لگتا ہے ہوا۔۔کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی ہے۔۔'' وہ اٹھا اور کھڑکی کو بند کرنے لگا۔مگر تند خو ہوائیں مزاحمت کر رہی تھیں۔اس نے اپنا ہاتھ باہر کی طرف کھڑکی کو بند کرنے کی غرض سے بڑھایا تو ایک سرخ رنگ کی بوند اس کے دودھیا بازو پر نمودار ہوئی۔اس نے بغور دیکھا۔وہ خون کی بوند تھی۔اس نے باہر جھانکا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔دوبارہ اپنے بازو کی طرف نگاہ دوڑائی،وہ خون اب غائب ہو چکا تھا۔

''یار واجد۔۔۔لگتا ہے سحر کا اثر تجھ پر بھی ہونے لگا ہے۔۔'' اپنے آپ سے کہا۔چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر یہ مسکراہٹ اس وقت غائب ہوگئی جب اس نے اپنے زیب تن کئے بنیان پر خون کے چھینٹے دیکھے۔اس نے انہیں بھی معمولی جانا اور کھڑکی بند کرنے لگا۔اور پھر واپس جا کر لیٹ گیا۔جیسے ہی وہ لیٹا ایک تیز دھار خنجر کا سایہ اس کو دیوار پر نظر آیا۔

☆......☆......☆

ثانیہ اور ساجد اپارٹمنٹس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سحر ان کی طرف دوڑتے ہوئے آئی۔اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''کیا ہوا سحر۔تمہاری یہ حالت؟ کیا ہوا؟'' ثانیہ نے اس کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''وہاں۔۔وہاں۔۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

''کیا ہوا،تمہارے کمرے میں؟ بتاؤ۔۔'' ساجد نے پوچھا۔

''ادھر کوئی ہے۔۔بار بار ایک آہٹ سنائی دے رہی ہے۔۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔تینوں مزید سہم گئے۔

''اب بس۔۔۔اب یہاں پر مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔جلدی سے واجد کو اپنے ساتھ لیتے ہیں اور نکلنے کی کرتے ہیں۔'' ساجد کی بات پر دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔بجلی کی چمک میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔گرج کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے بادل ان کے سر پر ہوں۔وہ چل رہے تھے۔اچانک ساجد کو اپنے پاؤں گیلے محسوس ہوئے۔ہر طرف اندھیرا تھا۔کینڈل بھی بار بار بجھ رہی تھی۔واضح طور سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہاں کچھ ہے۔۔۔میرے پاؤں گیلے ہو رہے ہیں۔۔'' سب کی نظر زمین پر تھیں۔بجلی دوبارہ چمکی۔سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ساجد کے پاؤں خون میں سرخ ہو چکے تھے۔خوف کے سبب اس کے ہاتھ سے کینڈل نیچے گر گئی۔ثانیہ اور سحر نے ایک دوسرے کو دبوچ لیا۔ان دونوں کی سسکیاں حویلی میں گونجنے لگیں۔ان کی نظر خون کے ماخذ کی طرف گئی۔آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔خون واجد کی لاش سے نکل رہا تھا۔اس کا سر کٹا ہوا تھا۔آنکھیں کھلی تھیں۔

''آ ہ ہ ہ ہ ہ'' سحر کی چیخ نے بادلوں کو خاموش کروا دیا۔ساجد کو بھی ایک جھٹکا لگا۔اس سے پہلے کے بجلی کی چمک بڑھتی ۔اس نے دونوں کا ہاتھ پکڑا!

''چلو ۔۔ یہاں سے۔۔۔'' وہ بھاگتے ہوئے نیچے آئے مگر ایک آہٹ ان کا پیچھا کر رہی تھی۔مین دروازے کی طرف بڑھے تو ایک آواز نے سب کو پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''کہاں جا رہے ہو تم سب؟'' یہ واجد کی آواز

تھی۔۔تینوں اسے وہاں دیکھ کر ڈر گئے۔وہ بنیان اور پینٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔اس کی بنیان پر ابھی بھی خون کے نشانات تھے۔

"ت ت تم۔۔مگر تم تو۔۔۔" ساجد نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں۔۔میں کیا؟" وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"دور ہٹو۔۔۔ ہمارے قریب مت آنا۔۔۔ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم واجد نہیں ہو۔۔۔" ساجد نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا مگر وہ مسلسل قریب آرہا تھا۔

"یار۔۔تم کیسی بات کر رہے ہو۔۔میں واجد ہی ہوں۔۔" وہ ان کی باتوں پر حیران تھا۔اور ان کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

"میں نے کہا وہیں رک جاؤ۔۔ورنہ۔۔۔۔" ساجد نے دیوار کے ساتھ لگے ایک گلدان کو اس پر پھینکا۔

"آہ۔۔۔پاگل ہو گئے ہو کیا۔۔" اس کے بازو سے خون بہنے لگا۔

"تمہارے بازو سے خون۔۔۔" سحر آگے بڑھنے لگی۔

"جب اتنی زور سے مارو گے تو خون تو بہے گا نا۔۔۔اف۔۔" سب اس کی طرف بڑھنے لگے۔

"اگر تم زندہ ہو تو وہ لاش کس کی تھی؟" تانیہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"کون سی لاش؟ کیسی لاش۔۔۔" واجد جھلا کر بولا۔

"یار۔۔۔ہمیں جتنا جلد ہو سکے اس حویلی سے نکل جانا چاہئے۔اس حویلی میں ضرور کچھ نہ کچھ ہے۔۔ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہئے۔" ساجد نے واضح طور پر کہہ دیا۔

"مگر۔۔ اس بارش میں کہاں جائیں گے ہم۔۔۔؟" واجد نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔۔۔مگر اس حویلی میں اب نہیں رک سکتے۔۔" تانیہ نے کہا۔

سحر دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھی مگر دروازہ کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"یار۔۔۔دروازہ نہیں کھل رہا۔۔۔۔" ساجد اور واجد نے بھی مدد کی مگر بے سود۔

"اس حویلی سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔۔" ایک گھرگھراتی ہنسی گونجی۔سب ادھر ادھر دیکھنے لگے مگر وہاں کوئی نہ تھا۔بجلی کی چمک بھی اس آواز کے مجسم کو سامنے لانے میں ناکام تھی۔

"کون ہے؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟" ساجد نے للکارا۔

"تمہاری موت۔۔" ایک سایہ نمودار ہوا۔بجلی چمکنے لگی۔بادل گرجنے لگے۔وہ سایہ ہر گزرتے لمحے میں اپنی شکل تبدیل کر رہا تھا۔پہلے وہ ساجد کی شکل میں ظاہر ہوا۔پھر سحر کی شکل میں نظر آیا اور اگلے ہی لمحے وہ غائب ہو گیا۔سب پر وحشت طاری ہو گئی۔دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔مگر وہ بند رہا۔سب نے باہر کے راستے کی تلاش شروع کر دی۔مگر راستہ نہ ملا۔چیخوں کی آواز تیز سے تیز تر ہو گئی۔بجلی کی چمک نے سب کو جدا کر دیا۔اگلے ہی لمحے سب ایک دوسرے کی آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔سب ایک دوسرے کی آواز سننے سے قاصر تھے۔

☆......☆......☆

رات کا طوفان اب تھم چکا تھا۔اندھیرے کی جگہ روشنی نے لے لی تھی۔ایمبولنس کی آوازیں حویلی کے پاس رسنائی دے رہی تھیں۔چار لاشیں ان میں رکھی جا چکی تھیں۔سب ان لاشوں کی حالت کو دیکھ کر حیران تھے۔تین کی موت ایک ہی طریقے سے ہوئی تھی۔تینوں نے اپنی نبض کاٹ ڈالی تھی۔جسم پر کسی بھی قسم کے خراشوں کے نشانات نہ تھے۔سوائے ایک لاش کے۔اس کا سر دھڑ سے جدا تھا۔ایک تیز دھار خنجر سے اس کا سر کاٹا گیا تھا۔خنجر بھی لاش کے پاس سے ملا مگر اس پر چاروں کے انگلیوں کے نشانات تھے۔اسی خنجر سے سب کی نبض کاٹی گئی تھی یا پھر خود انہوں نے اپنی نبض کاٹی تھی۔

اس کیس کو سلجھانے میں پولیس ناکام رہی۔

حویلی کا آسیب

ضرغام محمود۔ کراچی

رات کی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک دلدوز چیخ سنائی دی اور فوراً ھی دودھیا روشنی ھر طرف پھیل گئی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک روح کے ھاتھ میں خون ٹپکتا خنجر تھا اور پھر……

ظلم وزیادتی پر مبنی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش دل دہلاتی…… حقیقی کہانی

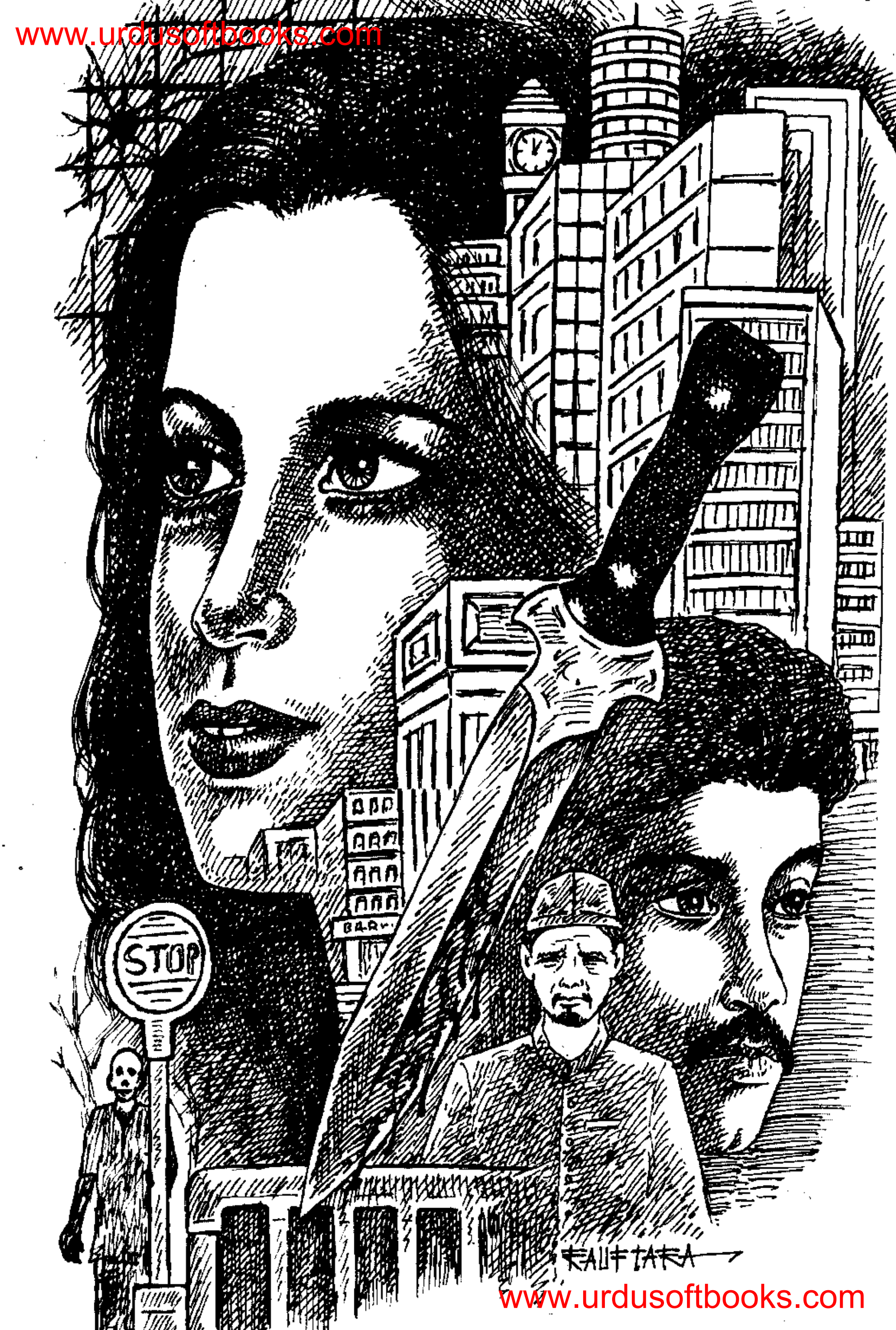
جیپ تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کررہی تھی میں جیپ کی اگلی سیٹ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا جیپ تھر کے صحرا پر ریتیلی مٹی کو روندی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی یہ میرے والدین کا علاقہ تھا میں پہلی بار اس سرزمین پر آیا تھا مگر میرے دل میں کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں ہورہا تھا شائد یہ فطری بات تھی حالانکہ میری پیدائش بھی اسی علاقے کی ہے مگر میں چند ماہ کا تھا جب میرے والدین مجھے لیکر انگلینڈ چلے گئے تھے میں نے اپنی ساری زندگی انگلینڈ ہی میں گذاری بے شک میرے والدین نے میری پرورش مشرقی ماحول میں کی مگر میں انگلینڈ ہی کو اپنا وطن سمجھتا ہوں اور میں پہلی بار اس علاقے میں آیا ہوں لہٰذا میرے دل میں اس جگہ کے لئے کوئی خاص جذبہ نہیں ابھرا تھا۔

میں نے آرام کی غرض سے اپنا سر سیٹ پر ٹکایا اور آنکھیں بند کرلیں آنکھیں بند کرتے ہی میرے ذہن کے پردے پر ماضی کی فلم چلنے لگی۔

میرے والد شاہ زمان جوانی میں ہی انگلینڈ چلے گئے تھے انہوں نے پاکستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی لہذا انہیں انگلینڈ میں اچھی نوکری ملی میری والدہ زبیدہ خاتون کی شادی میرے والد کے ساتھ پاکستان ہی میں ہوئی تھی پھر میری پیدائش بھی پاکستان کی ہی ہے پھر میرے والدین مجھے لیکر انگلینڈ شفٹ ہوگئے میری والدہ مکمل طور پر گھریلو خاتون تھی مگر افسوس وہ ہمارے ساتھ زیادہ عرصہ نہ رہ سکی جب میں صرف سات سال کا تھا تو مما کو کینسر ہوگیا پپا کی انتہائی توجہ اور ڈاکٹروں کی محنت کے باوجود مما زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی اور میری آٹھویں سالگرہ سے دو دن قبل مما نے دنیا سے موڑلیا۔

اس تکلیف دہ صورتحال میں پپا کے واحد دوست مرزا انکل نے ہم باپ بیٹے کو سہارا دیا مرزا انکل کی بیوی جنہیں میں خدیجہ خالہ کہتا تھا انہوں نے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا اور میری پرورش اپنے ذمے لی۔ مرزا انکل کا تعلق انڈیا کے شہر لکھنو سے ہے لہذا آج میری زبان میں جو فراست وبلاغت ہے وہ سب خدیجہ خالہ کی تربیت کا اثر ہے۔ میں پورا دن خدیجہ خالہ کے پاس رہتا تھا اور رات میں پپا آفس سے آتے ہوئے مجھے گھر لے آتے تھے۔ اور رات کو میں اور پپا باتیں کرتے ہوئے سو جاتے تھے۔

مجھے یاد ہے جب میرا یونیورسٹی کا آخری سمسٹر چل رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ دنوں سے پپا پریشان اور فکرمند نظر آرہے ہیں وہ میرے ساتھ زیادہ


STOP

باتیں نہیں کررہے اکثر وہ خیالوں میں کھوئے کھوئے رہنے لگے ہیں ٹی وی وغیرہ دیکھتے ہوئے بھی ایسا لگتا جیسے ان کی آنکھیں تو ٹی وی پر جمی ہیں۔۔۔مگر ان کا دھیان کہیں اور ہے۔۔۔

"پپا۔۔۔" ایک دن میں نے ہمت کرکے پپا کو پکارا۔

"آں۔۔ہاں۔۔۔۔" ایسا لگا جیسے پپا گہری نیند سے جاگے ہوں۔

"پپا۔۔کیا بات ہے آپ پریشان کیوں ہیں؟۔۔" میں نے پوچھا۔

"نن۔۔۔نہیں۔۔۔میں کیوں پریشان ہونگا۔۔" پپا نے جواب دیا۔

"پپا آفس میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟۔۔" میں نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔آفس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔"

"پپا۔۔۔پھر کیا بات ہے آپ کچھ دنوں سے پریشان ہیں۔۔؟" میں نے پھر پوچھا۔

"مم۔۔میں کیوں پریشان ہونگا۔۔۔۔میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔۔" پپا نے فکرمندی سے اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

"پپا۔۔۔میں بچہ نہیں ہوں۔۔۔چوبیس سال کا ہوچکا ہوں۔۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے پپا کو جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔مجھے معلوم ہے کہ میرا بیٹا جوان ہوگیا ہے۔۔۔اب مجھے بہو تلاش کرنی چاہیے۔۔" پپا مزاحیہ انداز میں بولے۔

"پپا۔۔۔ٹوپک مت بدلئے۔۔۔۔" میں نے انگلی اٹھا کر پپا کو تنبیہ کی۔" اگر آپ نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی تو۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

"تو۔۔۔؟" پپا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"تو آج سے بلکہ ابھی سے میں بھوک ہڑتال کر دونگا۔۔" میں نے منہ پھلا کر جواب دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے ہونے والی ذرا سی تکلیف بھی پپا برداشت نہیں کرسکتے۔

"اس کا مطلب ہے کہ واقعی تم جوان ہوگئے ہو۔۔۔اپنے باپ کو بلیک میل کررہے ہو۔۔" پپا میری بات سن کر بولے۔

"میل بلیک ہو یا وائٹ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔۔۔مجھے آپ کی پریشانی کی وجہ معلوم کرنی ہے۔۔" میں نے بدستور منہ پھلا کر جواب دیا۔

میری بات سن کر پپا چند منٹ تک خاموش میرے چہرے کی جانب دیکھتے رہے پپا کے ماتھے پر فکر کی گہری شکنیں پڑی ہوئیں تھیں۔ کچھ دیر پپا سوچتے رہے پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور سامنے رکھی میز کی دراز کھول کر اس میں سے ایک لفافہ نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ لے لیا لفافہ لیکر میں نے دیکھا کہ وہ ایک خط تھا جو پاکستان سے آیا تھا اور لفافے پر پپا کا نام لکھا تھا۔ میں نے خط لیکر سوالیہ نظروں سے پپا کی جانب دیکھا تو پپا نے کہا۔

"میری پریشانی کی وجہ یہ خط ہے۔۔"

"کیسا خط ہے یہ اور کس نے بھیجا ہے۔۔؟" میں نے خط کے لفافے کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ خط میرے نام پاکستان سے آیا ہے اور یہی میری پریشانی کی وجہ ہے۔۔تم خط پڑھ لو۔۔" پپا نے مجھ سے کہا تو میں نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

پپا اور مما کا تعلق پاکستان سے ہے بس مجھے اتنا ہی معلوم تھا اس کے علاوہ مما یا پپا نے کبھی کچھ نہیں بتایا نہ ہی میں نے ان دونوں کو کبھی پاکستان کا تذکرہ کرتے سنا نہ ہی مجھے یہ پتا ہے کہ مما اور پپا کا تعلق پاکستان کے کس علاقے سے ہے اور ان کے خاندان میں کتنے لوگ ہیں اور وہ لوگ کہاں رہتے ہیں میں نے کبھی مما اور پپا کی زبان پر پاکستان کا نام نہیں سنا اور اب یہ اچانک ایک خط جو پاکستان سے پپا کے نام آیا۔ میں بہت حیران تھا۔

میں نے خط لفافے میں سے نکالا خط اردو میں لکھا ہوا تھا خدیجہ آنٹی کی مہربانی سے مجھے بہت اچھی اردو آتی

تھی لہٰذا میں خط پڑھنے لگا۔

شاہ زمان بیٹا!!!!!!

برسوں بعد آپ کو مخاطب کر رہا ہوں اور اس کی وجہ شاہ سائیں ہیں۔۔۔شاہ سائیں کی طبیعت بہت خراب ہے وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ من ہی من آپ کو یاد کرتے ہیں وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں شائد یہ ان کی آخری خواہش ہو اگر آپ پاکستان آ سکتے ہو تو ایک بار صرف ایک بار شاہ سائیں کے لئے پاکستان آ جاؤ۔

آپ کا وفادار۔۔۔لال بخش۔

''یہ شاہ سائیں کون ہے؟'' خط پڑھنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''تمہارے دادا۔'' پپا نے بتایا۔

''دادا ابا۔یعنی آپ کے والد۔۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں''۔

''اور آپ کے دیگر بہن بھائی۔۔؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''بہن کوئی نہیں تھی دو بھائی تھے۔'' مجھے جواب ملا۔

''تھے۔۔'' میں نے پھر پوچھا۔

''ہاں تھے۔۔اب وہ زندہ نہیں ہیں۔۔'' پپا نے بتایا۔

''آپ کا رابطہ تھا ان لوگوں سے۔۔'' میں حیرت کے سمندر میں غرق تھا اتنے برسوں بعد مجھے اپنے خاندان کے بارے میں معلوم ہو رہا تھا۔

''تھا مگر زیادہ نہیں۔۔'' پپا نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''پپا آپ دادا حضور سے ناراض ہو کر انگلینڈ آئے تھے۔۔'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔۔میں ان کی اجازت سے انگلینڈ آیا تھا۔۔'' پپا نے بتایا۔

''پھر۔۔پھر کیا بات تھی کہ ہم لوگ آج تک ان سب سے ملنے پاکستان نہیں گئے۔۔'' میں حیرت سے پوچھا کیونکہ میرے کئی دوستوں کا تعلق پاکستان، بھارت بنگلہ دیش اور دیگر ممالک سے ہیں جو ہر دوسرے سال اپنے وطن جاتے ہیں اور اپنے رشتے داروں سے ملتے ہیں صرف ایک میں ہی تھا جو کبھی اپنے وطن نہیں گیا تھا لہٰذا پپا کی بات سن کر مجھے بے چینی سی ہونے لگی میں پپا سے یہ بات جاننا چاہتا تھا کہ ہم لوگ پاکستان کیوں نہیں جاتے تھے۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔۔'' پپا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔

''میرے پاس بہت فرصت ہے۔۔'' میں صوفے پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

''لیکن میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تمہیں پوری بات بتاؤں۔۔'' پپا بولے۔

''کیوں۔۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''ہمارے خاندان شاہ فیملی پر آسیب کا سایہ ہے اس لئے میں تمہیں اور تمہاری مما کو لیکر انگلینڈ آ گیا۔۔'' پپا نے گول مول بات بتائی۔

''یعنی میری پیدائش بھی پاکستان کی ہے۔۔'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں۔۔تم چند ماہ کے تھے جب میں اور تمہاری مما تمہیں لیکر انگلینڈ آئے تھے۔''

''پھر تو میں اپنی جنم بھومی دیکھنے ضرور جاؤں گا۔۔'' میں نے پرجوش انداز میں کہا۔

''نہیں۔۔۔صرف میں اکیلا پاکستان جا رہا ہوں۔۔'' پپا نے مجھے بتایا۔

''کیوں۔۔'' میں روہانسا ہو گیا۔

''یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتا تم بس اپنی تعلیم پر توجہ دو۔۔'' پپا نے سرد لہجے میں جواب دیا تو مجھ میں مزید بات کرنے کی ہمت نہ رہی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ پپا سے مزید بات کروں مگر پپا نے پاکستان جانے میں اتنی جلدی مچائی کہ میں سوچتا ہی رہ گیا اور پپا نے ٹکٹ خرید کر اپنی سیٹ بھی کنفرم کروالی۔

پھر ایک صبح جب پپا پاکستان جانے کے لئے

ائیرپورٹ نکل رہے تھے تو مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے
"آہ۔۔جب وطن سے نکلا تھا تو جوان تھا اب۔۔بوڑھا ہوگیا ہوں اور تمہاری ماں بھی ساتھ نہیں ہے۔۔"
پپا اپنے آنسو صاف کرنے لگے۔
"کوئی بات نہیں پپا۔۔آپ چند ہی دنوں میں واپس آجائیں گے۔" میں نے پپا کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کئے۔
"شاہ ویز بیٹا۔۔۔میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔۔" پپا گھر سے نکلتے ہوئے رک گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔
"جی حکم پپا۔۔"
"شاہ ویز۔۔۔میری یہ بات تمہیں ہر حالت میں ماننی پڑے گی۔۔" پپا گھمبیر لہجے میں بولے تو میں چونک اٹھا۔
"خیر تو ہے نا۔۔۔پپا۔۔" میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔
"شاہ ویز۔۔۔اگر۔۔اگر مجھے پاکستان میں کچھ ہوجائے تو۔۔تو تم یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرو گے کہ مجھے کیا ہوا ہے۔۔؟" پپا نے گول مول بات کی تو میں مزید پریشان ہوگیا۔
"میں سمجھا نہیں پپا۔۔"
"اگر۔۔۔اگر میں پاکستان میں مرجاؤں تو تم صورتحال کا جائزہ لینے کبھی پاکستان نہیں آؤ گے۔۔" پپا نے اٹکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔
"پپا۔۔" میں چیخ اٹھا۔
"ہاں بیٹا۔۔۔ہماری شاہ فیملی پر ایک آسیب کا سایہ ہے۔۔ایک۔۔۔ایک کرکے سب اس آسیب کا شکار ہوگئے۔۔۔اب صرف ہم دونوں باقی بچیں ہیں۔۔اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر مجھے پاکستان میں کچھ ہوجائے تو تم پاکستان نہیں آؤ گے۔۔" پپا بولے۔
"پپا آپ۔۔آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔اگر۔۔اگر آپ کو کوئی خطرہ ہے تو آپ۔۔۔آپ پاکستان نہ جائیں۔۔" میں نے پپا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔
"نہیں بیٹا۔۔۔میرا جانا بہت ضروری ہے۔۔ شائد۔۔شائد میری موت بھی میرے بھائیوں کی طرح ہی لکھی ہے۔۔" پپا بولے۔
"پپا۔۔" بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے۔
"شاہ ویز بیٹا۔۔تم جوان آدمی ہو۔۔۔تمہیں حالات کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہئے۔۔" میرے آنسو دیکھ کر پپا بے چین ہوگئے۔
"پپا۔۔۔آپ مجھے پوری بات بتائیے۔۔" میں آنسو پونچھتا ہوا بولا۔
"شاہ ویز یہ ہمارا خاندانی راز ہے۔۔۔شاہ فیملی پر ایک آسیب کا سایہ ہے۔۔تمہارے تایا اور میرے بڑے بھائی شاہنواز سے ایک بھیانک غلطی سرزد ہوگئی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ شاہ خاندان بھگت رہا ہے۔۔" پپا بولے۔
"غلطی کیسی غلطی۔۔۔"
"کاش۔۔کاش بھائی جان وہ غلطی نہ کرتے۔۔تو آج ہم تمہارے دادا کے ساتھ حویلی میں رہ رہے ہوتے۔۔" پپا خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔
"پپا۔۔بتائیے نا۔۔تایا جان سے کونسی غلطی سرزد ہوگئی تھی جس کا خمیازہ سارے خاندان کو بھگتنا پڑ رہا ہیں۔۔" میں نے پپا سے پھر پوچھا۔
"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا بس تم یہ بات یاد رکھو کہ تمہیں کسی بھی حال میں پاکستان نہیں جانا ہے۔۔" پپا بولے۔
"ٹھیک ہے پپا۔۔۔میں کبھی پاکستان نہیں جاؤنگا مگر آپ جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کیجئے گا۔۔" میں نے پپا کو جواب دیا تو وہ مجھے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ الوداع کہہ کر ائیرپورٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔
پپا پاکستان سے روزانہ مجھے فون کرتے اور اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ایک رات پپا کا فون آیا۔
"کیسے ہو شاہ ویز بیٹا؟"

"میں ٹھیک ہوں پپا۔۔آپ بتایئے دادا حضور کی طبیعت کیسی ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"ان کی طبیعت کافی خراب ہے ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔۔" پپا کی آواز بھرا گئی۔

"اوہ۔۔۔دادا حضور کو ہوا کیا ہے۔۔" میں نے پوچھا۔

"بڑھاپا ہی سب سے بڑی بیماری ہے۔۔پھر ان کے دائیں حصے پر فالج ہو گیا ہے وہ بستر سے لگ گئے ہے ان سے بولا بھی نہیں جا رہا۔" پپا رونے لگے۔

"پپا حوصلہ کریں۔۔" میں نے پپا کو دلاسا دیا۔

"پپا آپ کب واپس آ رہے ہیں۔۔" کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے موضوع بدلا۔

"پتا نہیں بیٹا قسمت میں ملنا لکھا بھی ہے یا نہیں۔۔؟" پپا کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"پپا" میں چیخ پڑا۔

"شاہ ویز بیٹا۔تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔تمہیں یاد ہے نا۔" کچھ توقف کے بعد پپا بولے۔

"ہاں پپا مجھے یاد ہے میں کبھی پاکستان نہیں آؤں گا۔۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں بیٹا تم کبھی پاکستان نہیں آنا اگر میں نہیں رہا تو تم وہیں کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لینا تا کہ شاہ فیملی کی نسل آگے بڑھ سکے۔" پپا بولے۔

"پپا۔۔" میں ایک بار پھر چیخ اٹھا۔" پپا ۔۔آپ بتایئے وہاں کیا حالات ہیں۔۔مجھ سچ سچ بتایئے۔۔"

"شاہ ویز بیٹا۔۔تم نئے دور کے آدمی ہو میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔۔" پپا نے کہا۔

"پپا مجھے پتا ہے آپ کسی بھی حالت میں جھوٹ نہیں بولتے مجھے آپ کی ہر بات پر یقین ہے۔۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"شاہ ویز۔۔کیا تم بھوت پریت پر یقین رکھتے ہو۔۔" کچھ توقف کے بعد ریسور سے پپا کی آواز ابھری۔

"بھوت۔۔۔یہ کیا بات ہوئی پپا۔۔" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں شاہ ویز بیٹا۔۔اس حویلی میں ایک آسیب ہے جو ہمارے خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر مار رہا ہے وہ شاہ خاندان کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتا ہے۔۔پتا نہیں کب وہ میری زندگی سے بھی کھیل جائے۔۔لہذا میری نصیحت یاد رکھنا تم کبھی پاکستان نہیں آنا تم ہی شاہ خاندان کے آخری چشم و چراغ ہو۔۔۔شاہ خاندان کا نام تمہاری ہی اولاد سے چلے گا۔۔" پپا کی لہجے میں یاسیت بھری ہوئی تھی ان کی باتیں سن کر مجھے رونا آنے لگا۔

"پپا۔۔پپا آپ فوراً واپس ۔۔۔۔۔" میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر لائن ڈس کنکٹ ہو گئی اور میں ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔

میں بے حد پریشان تھا۔۔۔آخر معاملہ کیا ہے پپا کھل کر مجھے کیوں نہیں بتا رہے اور پھر ان کی آواز میں کتنی پریشانی تھی اور آسیب۔۔۔یہ آسیب کا کیا معاملہ ہے پپا مجھ سے کیا چھپانا چاہ رہے ہیں۔میں مسلسل سوچ رہا تھا میں نے کئی بار پاکستان کال کرنا چاہی مگر لائن ہی نہ ملی میں مسلسل کوششوں میں لگا رہا مگر میرا رابطہ پپا سے نہیں ہوا۔

پھر ایک رات جب میں سکون سے سو رہا تھا تو مجھے ایک خواب نظر آیا میں نے دیکھا کہ

ایک اجاڑ بیابان میدان ہے جہاں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں ان خودرو جھاڑیوں نے پورے میدان کو ڈھانپ لیا ہے اس میدان کے وسط میں خالی جگہ ہے جہاں پپا کھڑے ہیں اور خوفزدہ انداز میں چیخ رہے ہیں خودرو جھاڑیوں کی ہر شاخ پر ایک سانپ بیٹھا تھا اور تمام سانپ پھن پھیلائے پپا کو ڈرا رہے تھے پپا بہت ڈرے ہوئے تھے وہ خوفزدہ انداز میں چیخ رہے تھے ان سانپوں سے بچ کر پپا بھاگنا چاہتے تھے مگر۔۔مگر انہیں راستہ نہیں مل رہا تھا وہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کسی جھاڑی کے قریب جاتے تو اس جھاڑی پر بیٹھے ہوئے سانپ انہیں ڈسنے کی کوشش

کرتے اور پپا ڈر کے مارے پیچھے ہٹ جاتے میں میدان کے باہر کھڑا ہوا پپا کو دیکھ رہا تھا میں پپا کو بچانا چاہتا تھا مگر وہ لاکھوں سانپ مجھے ایسا کرنے سے روک رہے تھے بلکہ بہت سے سانپ میری جانب بھی بڑھے چلے آرہے تھے پپا مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا کہہ رہے تھے مگر میں پپا کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

اسی وقت ایک بہت بڑا سا کالا سانپ میری جانب بڑھا اور اس سانپ نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی یہ دیکھ کر پپا نے میری جانب دوڑ لگا دی اور جیسے ہی سانپ نے مجھے ڈسنا چاہا پپا میرے اور سانپ کے درمیان آگئے اور سانپ نے پپا کو ڈس لیا پپا زمین پر گر پڑے میں گھبرا کر پپا کے پاس جانا چاہتا تھا مگر پپا نے چیخ کر مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا کہا اور خود میری جانب بڑھتے ہوئے سانپ سے لپٹ گئے اور زور زور سے چیخ کر مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا کہنے لگے میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا مگر۔۔

اچانک میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میں ایک گڑھے میں گر پڑا گڑھے میں ایک سیاہ سانپ پہلے ہی سے کنڈلی مارے بیٹھا تھا جیسے ہی میرے گڑھے میں گرا وہ سانپ اچھل کر میرے سینے پر بیٹھ گیا اور مجھے ڈسنے والا تھا کہ ٹھیک اسی وقت میری آنکھ کھل گئی میں پسینے سے بری طرح بھیگا ہوا تھا حالانکہ کمرے میں اے سی چل رہا تھا مگر میں نے اتنا بھیانک خواب دیکھا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے میں بری طرح گھبرا گیا مجھے رہ رہ کر پپا کا خیال آرہا تھا مگر میں مجبور تھا میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر پاکستان کال کرنی چاہی مگر فون کی گھنٹی بجتی رہی اور کسی نے فون نہیں اٹھایا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا صبح ہوئی ہی جاتی تھی لہذا میں بستر سے اٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر اپنے لئے ناشتہ بنانے لگا ابھی میں ناشتے سے فارغ ہو کر یونیورسٹی جانے کی تیاری کررہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو۔'' میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہیلو۔۔میں پاکستان سے بیرسٹر انور علی ہاشمانی بات کررہا ہوں۔۔کیا میں مسٹر شاہ ویز سے بات کرسکتا ہوں۔'' دوسری جانب سے ایک سخت اور ٹھنڈی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''جی میں شاہ ویز بات کررہا ہوں۔۔فرمایئے۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''مسٹر شاہ ویز میرے پاس آپ کے لئے ایک بری خبر ہے۔۔'' دوسری جانب سے بیرسٹر انور علی ہاشمانی کی آواز آئی۔

''کیا۔۔کیا خبر ہے۔۔پپا تو خیریت سے ہے نا۔۔'' میں بوکھلا گیا۔

''مسٹر شاہ ویز آپ کے والد مسٹر شاہ زمان کل رات حویلی میں اپنے کمرے کی بالکونی سے نیچے گر پڑے جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوگئی۔۔'' دوسری جانب سے بیرسٹر انور علی نے مجھے اطلاع دی۔

''پپا۔۔'' میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور میں بلند آواز سے رونے لگا۔

''مسٹر شاہ ویز سنبھالئے اپنے آپ کو۔۔آپ ایک بہادر آدمی ہے۔۔'' کچھ دیر توقف کے بعد مجھے بیرسٹر انور علی کی آواز سنائی دی۔

''پپا کی لاش کہاں ہے۔۔؟'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''مسٹر شاہ زمان کو ان کی وصیت کے مطابق آج صبح شاہ خاندان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کردیا گیا۔'' بیرسٹر انور علی نے مجھے مطلع کیا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں بھڑک اٹھا۔''میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔۔میرے بغیر ان کی تدفین کس طرح کردی گئی؟'' میں نے تیز آواز میں بیرسٹر انور علی سے کہا۔

''یہ آپ کے والد کی وصیت تھی جو انھوں نے حویلی میں آتے ہی کی تھی اس کے علاوہ انھوں نے ایک ڈیو پیغام بھی آپ کے لئے ریکارڈ کروایا تھا۔اس پیغام کی سی

ڈی میں آپ کو کوریئر کر رہا ہوں وہ پیغام سن کر آپ کو آپ کے سارے سوالات کا جواب مل جائے گا۔" بیرسٹر انور علی ہاشمانی نے مجھے جواب دیا اور فون ڈس کنکٹ کر دیا۔

میں کتنی ہی دیر تک ریسیور پکڑے روتا رہا پھر میں نے مرزا انکل کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں پپا کی موت سے آگاہ کیا کچھ دیر میں مرزا انکل اور خدیجہ آنٹی گھر پہنچ گئے میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی مجھے رہ رہ کر پپا کا خیال آ رہا تھا کہ آخر ان کا خدشہ درست ثابت ہوا اور پپا کی موت بھی ان کے بھائیوں کی طرح ہوئی۔ مرزا انکل اور خدیجہ آنٹی نے میرے ڈھارس بندھائی اور مجھے دلاسے دیئے۔

اگلے دن شام کو مجھے کوریئر سے ایک پارسل ملا جس میں ایک سی ڈی تھی میں نے سی ڈی فوراً اپنے کمپیوٹر میں لگائی تو پپا کا چہرہ کمپیوٹر کی اسکرین پر نمودار ہو گیا۔ پپا کو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے ڈبڈبائی نظروں سے اسکرین پر پپا کو دیکھا پپا کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا اور وہ بہت کمزور نظر آ رہے تھے ۔میں نے ہیڈفون کانوں سے لگایا تھا میرے کانوں میں پپا کی آواز گونجنے لگی۔

"شاہ ویز بیٹا۔۔جب تم یہ سی ڈی دیکھ رہے ہو گے۔۔تو میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا۔۔تم حیران ہو گے کہ میں نے تمہیں اپنی آخری رسومات میں شرکت سے بھی محروم رکھا۔تم یقیناً مجھ سے ناراض ہو گے۔۔مگر بیٹا میں مجبور ہوں۔۔تم شاہ خاندان کے آخری چشم و چراغ ہو مجھے تمہاری زندگی بہت عزیز ہے اگر تمہیں اپنے پپا سے محبت ہے۔۔تو تم کبھی پاکستان نہیں آنا۔۔یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ برسوں پہلے تمہارے تایا یعنی میرے بڑے بھائی شاہ نواز سے ایک بھیانک غلطی سرزد ہو گئی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ ہمارا خاندان بھگت رہا ہے تمہارے بڑے تایا اور تائی ان کے معصوم بچے اور تمہارے چھوٹے تایا سب اس آسیب کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اب میرے بعد صرف شاہ خاندان میں تم باقی بچے ہو لہٰذا شاہ ویز بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم وہیں پر کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لینا تاکہ شاہ خاندان کی نسل آگے بڑھ سکے۔۔میری نصیحت یاد رکھنا شاہ ویز بیٹا کبھی پاکستان نہ آنا۔۔اللہ تمہیں بہت ساری خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔سدا خوش رہو شاہ ویز بیٹا۔۔"

اس کے بعد سی ڈی خالی تھی میں نے بار بار سی ڈی ری وائنڈ کر کے دیکھی۔

"آخر تایا شاہ نواز سے کیا غلطی ہو گئی تھی جس کا نتیجہ پورے شاہ خاندان کو بھگتنا پڑا اور تمام لوگ بے موت مارے گئے۔" میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا میں پاکستان میں جاگیرداری نظام میں ہونے والی دشمنیاں اور خونریزیوں کی داستانوں سے واقف تھا میرا یہی خیال تھا کہ کسی دشمنی کی وجہ سے سارے خاندان پر موت کا سایہ منڈلاتا رہا اور ایک ایک کر کے سارے مارے گئے شائد اسی لئے پپا مجھے پاکستان سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔

کچھ دنوں میں، میں سنبھل گیا اور تعلیم پر توجہ دینے لگا اور یونیورسٹی جانے لگا میرا آخری سمسٹر تھا جو میں نے شاندار نمبروں سے پاس کر لیا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے برٹش فارن سروس جوائن کر لی چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد مجھے جاب کی آفر ہوئی جو میں نے فوراً قبول کر لی کیونکہ فارن سروس میں جانا میرا خواب تھا مگر حسنِ اتفاق دیکھیں میری پہلی تعیناتی پاکستان میں کی گئی میں نے بہت کوشش کی کہ کسی اور ملک میں تعیناتی مل جائے مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا اور مجھے پاکستان ہی میں نوکری جوائن کرنی پڑی جسے میں نے قسمت میں لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔

جب میں اسلام آباد ائیرپورٹ پر اتر رہا تھا تو میرے کانوں میں پپا کے الفاظ گونج رہے تھے انھوں نے مجھے پاکستان آنے سے منع کیا تھا مگر قسمت کے سامنے سب بے بس ہے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ قسمت ایسا چکر چلائے گی کہ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی پاکستان آنا پڑے گا اور پپا سے کیا ہوا وعدہ توڑنا پڑے گا میں نے کئی بار خیالوں ہی خیالوں میں پپا سے معافی مانگی۔

چھ مہینے اسلام آباد میں کام کرنے کے بعد مجھے کراچی کے قونصل خانے میں بھیج دیا گیا میں غیر محسوس طور پر اپنے آبائی علاقے سے قریب تر ہوتا جارہا تھا۔

کراچی آنے کے بعد مجھے پپا کی یاد بہت ستانے لگی مجھے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ نہ جانے پپا کی موت کن حالات میں ہوئی آخر جب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو میں نے قونصل خانے سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور حویلی فون کیا۔

''ہیلو۔۔'' دوسری جانب سے آواز ابھری۔

''کون بول رہا ہے۔۔؟'' میں پوچھا۔

''میں لال بخش بات کررہا ہوں۔۔۔''

''آپ کون ہیں؟'' دوسری جانب سے لال بخش نے اپنا نام بتانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''میں شاہ ویز ہوں۔۔شاہ زمان کا بیٹا۔۔'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''جی کہئے کیا بات ہے۔۔'' میرا نام سنتے ہی لال بخش کا لہجہ بدل گیا اور وہ سرد آواز میں بات کرنے لگا۔

''میں اس وقت کراچی میں برٹش قونصل خانے میں ہوں اور حویلی آنا چاہتا ہوں'' میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیوں۔۔'' لال بخش کی سرد آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''حویلی آنا میرا حق ہے اور میں اپنا یہ حق استعمال کرنا چاہتا ہوں'' لال بخش کی کیوں سن کر مجھے غصہ آ گیا۔

''آپ حویلی آسکتے ہیں یا نہیں۔۔اس کا فیصلہ شاہ سائیں کرینگے اور وہ ابھی سو رہے ہیں'' دوسری جانب سے لال بخش نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں شام کو فون کرتا ہوں آپ دادا حضور سے پوچھ لیجئے گا۔۔'' میں اپنا لہجہ دھیما کرتے ہوئے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

شام کو میں نے پھر حویلی فون کیا اس مرتبہ بھی فون لال بخش ہی نے اٹھایا۔

''آپ نے معلوم کیا دادا حضور سے۔۔'' سلام دعا کے بعد میں نے لال بخش سے پوچھا۔

''شاہ سائیں نے منع کردیا ہے آپ حویلی نہیں آسکتے۔۔'' لال بخش نے مجھے جواب دیا۔

''میری بات کرایئے دادا حضور سے۔۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''شاہ سائیں کی طبیعت ایسی نہیں ہے کہ وہ فون پر بات کرسکیں'' لال بخش نے مجھے جواب دیا۔

''تو پھر ان سے کہئے کہ اگر وہ مجھے حویلی نہیں آنے دیں گے تو پھر میں کل پولیس کے ساتھ حویلی آؤنگا میرے والد ایک سال پہلے اس حویلی میں ناگہانی موت کا شکار ہوگئے تھے مجھے خدشہ ہے کہ انہیں قتل کیا گیا تھا لہٰذا میں اپنے والد کی موت کے حقائق جاننا چاہتا ہوں میں ان کی قبر کشائی کروا کر ان کا پوسٹمارٹم کراونگا تاکہ حقائق سامنے آسکے اور میرے اس بات کو خالی دھمکی مت سمجھنا میں ایک برٹش ایمبیسیڈر ہوں اور ایک برٹش ایمبیسیڈر کی طاقت اور پہنچ کتنی ہوتی ہے اس کا آپ لوگوں کو باخوبی اندازہ ہوگا۔۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے لال بخش کو چپ لگ گئی۔شائد حویلی کے مکینوں کو میری طاقت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

''آپ دو منٹ ہولڈ کیجئے میں شاہ سائیں سے بات کرتا ہوں'' لال بخش اب نہایت ادب سے مخاطب ہوا پھر ایسا لگا جیسے وہ کسی سے بات کررہا ہے دو منٹ بعد ریسیور سے لال بخش کی آواز ابھری۔

''شاہ سائیں نے آپ کو حویلی آنے کی اجازت دے دی ہے۔۔۔کل صبح ڈرائیور آپ کو آپ کی رہائش گاہ سے لینے آجائے گا۔'' لال بخش کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی پھر میں نے اپنی رہائش گاہ کا ایڈریس لکھوایا اور ریسیور رکھ دیا۔

اگلی صبح ایک شخص جس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے کاندھے پر اجرک (سندھی چادر) تھی اور اس نے مخصوص سندھی ٹوپی پہنی ہوئی تھی ایک پرانے ماڈل کی جیپ لیکر میرے گھر پر آیا اور مجھے ادب سے سلام کرنے کے بعد بولا۔

"مجھے شاہ سائیں نے بھیجا ہے آپ چھوٹے سائیں ہیں۔۔" اس شخص نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ میں نے ساری تیاری رات ہی میں کر لی تھی اپنے کپڑے اور ضرورت کی چند چیزیں ایک اٹیچی کیس میں رکھ لی تھی لہذا میں نے اٹیچی کیس اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تو وہ شخص جلدی سے آگے بڑھا اور مجھ سے اٹیچی کیس لینے لگا۔

"چھوٹے سائیں یہ مجھے دے دیجئے۔۔"

"کیا نام ہے تمہارا۔۔" میں نے اس کا ہاتھ اٹیچی کیس سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"سائیں۔۔ میرا نام تاج علی ہے ویسے سب مجھے تاجو کہتے ہیں۔۔۔ آپ یہ اٹیچی مجھے دے دیجئے میں اسے اٹھا لیتا ہوں۔۔" تاج علی نے پہلے اپنا نام بتایا اور پھر میرے ہاتھ سے اٹیچی کیس لینے لگا۔

"تاج علی میں جس جگہ سے آیا ہوں وہاں کے لوگ اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔۔۔ لہذا یہ اٹیچی کیس مجھے ہی اٹھانے دو۔۔" میں نے اسے اٹیچی کیس اٹھانے سے روکتے ہوئے کہا۔

"سائیں ہم آپ کے غلام ہیں غلاموں کے ہوتے ہوئے مالک کیوں کام کرے۔۔" تاج علی نے کہا۔

"تم غلام ہو؟۔۔۔ تاج علی۔۔۔ اپنے آپ کو غلام سمجھنا بند کرو تم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہو اور گاڑی چلانے کی ملازمت کرتے ہو بس۔۔" میں نے تاج علی عرف تاجو کو جواب دیا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر جیپ کی جانب بڑھ گیا تاجو میرے پیچھے حیرت سے چل رہا تھا شائد اس طرح کا رویہ اس کے ساتھ آج تک پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ حیران تھا۔

جیپ کے پاس پہنچ کر میں نے اٹیچی کیس جیپ میں رکھا اور جیپ کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا تو تاجو بول اٹھا۔

"سائیں۔۔۔ آپ آرام سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائے۔۔ میں آگے بیٹھ کر جیپ چلاؤں گا۔۔"

"میں آگے بیٹھ کر ہی سفر کرونگا اور تم زیادہ فکر مند مت ہو تم میرے برابر بیٹھ کر جیپ چلاؤ۔۔" میں نے تاجو کو جواب دیا۔

"سائیں آپ کے برابر۔۔۔" تاجو کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تاج علی تم بھی انسان ہو۔۔۔ اپنے آپ کو اتنا مت گراؤ۔۔" میں نے تاجو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں جاگیرداری نظام میں ملازموں کو غلام سمجھا جاتا ہے۔

میرے حوصلہ دلانے پر تاجو میرے ساتھ بیٹھ گیا اور اس نے جیپ اسٹارٹ کی جیپ پرانے ماڈل کی ضرور تھی مگر نہایت آرام دہ اور عمدہ حالت میں تھی تاجو نے جیپ اسٹارٹ کر کے گیئر ڈالا اور جیپ آگے بڑھا دی۔

"کہاں جانا ہے؟" جیپ جب مین روڈ پر پہنچی تو میں نے تاجو سے پوچھا۔

"مٹھی سے تھوڑا آگے تین چار گھنٹوں کا راستہ ہے۔۔" تاجو نے جواب دیا تو میں نے اپنا موبائل نکال کر قونصل خانے فون کیا اور اپنے اسسٹنٹ کو اپنے سفر اور منزل کے متعلق بتایا۔ جیپ جلد ہی کراچی کی حدود سے نکل گئی تاجو خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا وہ ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر بڑی مہارت سے جیپ چلا رہا تھا شائد وہ ان راستوں پر سفر کا عادی تھا میں نے اپنی سیٹ کی پشت سے اپنی کمر لگائی اور اپنا سر سیٹ پر لگا دیا اور آنکھیں بند کر لی۔

دو ڈھائی گھنٹوں کی مسافت کے بعد جیپ پکی سڑک سے اتر کر ریتیلی پگڈنڈی پر دوڑنے لگی چاروں طرف ریت ہی ریت تھی دور دور تک سبزے کا نام و نشان تک نہ تھا کہیں کہیں چند جھونپڑیاں نظر آرہی تھی جہاں بچے پھٹے پرانے کپڑے پہنے کھیلتے نظر آرہے تھے جب جیپ ان کے پاس سے گزرتی تو وہ اپنی آنکھوں میں دنیا جہاں کے حیرت سمیٹے جیپ کو دیکھتے مجھے ان بچوں کو دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا ان کے پاس بنیادی سہولتیں بھی نہیں تھی ایک چھوٹی سی بچی کو دیکھ کر تو میری آنکھیں

بھر آئی وہ معصوم بچی اپنے وزن سے زیادہ بھاری پانی سے بھرا برتن سر پر رکھے ننگے پیر جلتی ریت پر چل رہی تھی۔ مجھے یہ سب دیکھ کر افسوس ہونے لگا کہ میرے اپنے ہم وطن کیسی کسمپرسی میں زندگی گزار رہے ہیں۔

ریگستان میں چلتے چلتے ایک نخلستان آیا یہاں پانی تھا اور ایک گاؤں کے آثار بھی نمایاں ہوئے کھجور کے باغات بھی نظر آئے مگر کچھ اجڑے اجڑے یہاں لوگ کھیتی باڑی بھی کررہے تھے۔

''یہ ساری زمین آپ کے خاندان کی ملکیت ہے۔'' تاجو نے جیپ چلاتے ہوئے مجھے بتایا۔

''اور یہ کام کرنے والے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ ملازم ہیں'' تاجو نے بتایا تو میں بغور علاقے کو دیکھنے لگا۔

''یہ باغات اجڑے اجڑے سے کیوں ہیں'' میں باغات کو دیکھتا ہوا بولا مجھے حیرت ہورہی تھی کہ پپا کا تعلق اتنے بڑے جاگیردار گھرانے سے تھا۔

''جب کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو تو باغ اجڑ ہی جاتے ہیں'' تاجو بولا۔

''پڑھے لکھے لگتے ہو۔'' تاجو کی فلسفیانہ باتیں سن کر میں مسکرایا۔

''جی۔۔میں نے گریجویشن کیا ہے۔'' تاجو نے جواب دیا۔

''ویری گڈ۔۔۔مگر پھر تم ڈرائیوری کیوں کررہے ہو۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سائیں۔۔میرے پاس قابلیت ہے رشوت دینے کے لئے پیسے یا کوئی بڑی سفارش نہیں جو مجھے نوکری مل جائے۔۔پیٹ بھرنے کے لئے ڈرائیوری کر رہا ہوں۔'' تاجو کا لہجہ تلخ ہوگا تو میں اثبات میں سر ہلانے لگا چھ ماہ پاکستان رہ کر مجھے یہاں کے حالات سے کافی آگاہی ہوگئی تھی میں جانتا تھا یہاں کس طرح رشوت اور سفارش سے میرٹ کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔

''ہاں تم کیا کہہ رہے تھے ان باغات کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں'' میں نے بات کا رخ تبدیل کردیا۔

''جی سائیں۔۔باغات کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے اسی لئے یہ باغات اجڑتے جارہے ہیں۔''

''کیوں لال بخش ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''لال بخش سائیں بھی اب بوڑھے ہوگئے ہیں جتنا ان کے بس میں ہوتا ہے وہ کرلیتے ہیں۔۔۔اصل توجہ تو مالک کو ہی دینی ہوتی ہے اور شاہ سائیں کی طبیعت اجازت نہیں دیتی کہ وہ زمینداری کے کام کرسکیں۔۔'' تاجو نے جواب دیا۔

''کیوں کوئی اور نہیں ہے۔'' میں نے پھر پوچھا۔

''آپ کے علاوہ سب لوگ۔۔۔۔۔۔'' تاجو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اب تو اس ساری جائیداد کے وارث آپ ہی ہے۔'' تھوڑی دیر توقف کے بعد تاجو پھر بولا۔

''ارے نہیں بھئی میں کوئی وارث وغیرہ نہیں ہوں۔۔۔میں تو یہاں صرف اپنے والد کی موت کی وجہ معلوم کرنے آیا ہوں'' میں نے جواب دیا تو تاجو حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد جیپ ایک عظیم الشان حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گئی میں نے سر اٹھا کر آسمانوں کو چھوتی حویلی کو دیکھا تو حیران رہ گیا گیروے رنگ کی حویلی سر اٹھائے شان سے کھڑی تھی حویلی کی بیرونی دیواروں پر شیشے کے ٹکڑوں سے خاص جے پوری نقاشی کی گئی تھی حویلی کے محرابوں پر خوبصورت پچکاری کا کام کیا ہوا تھا جبکہ حویلی کا دیدہ زیب منقش گیٹ اتنا بڑا تھا کہ ایک چھوٹا بحری جہاز بھی اس گیٹ سے گزر سکتا تھا حویلی کی اٹھان ہی بتارہی تھی کہ حویلی کے مکین کتنے شان والے ہیں اور کتنے مالدار ہیں میں حیرت سے حویلی کو دیکھ رہا تھا کہ پپا کا خاندان کتنا مالدار ہے حالانکہ انگلینڈ میں ہم لوگ عام سے متوسط طبقے کی طرح رہتے تھے مما گھر کا سارا کام خود کرتی تھی اور پپا ایک دفتر میں نوکری کرتے تھے میں حیرت میں حویلی کو دیکھ رہا تھا۔

تاجو نے جیپ کا ہارن بجایا تو بڑا سا خوبصورت منقش آبنوسی سیاہ دروازہ کھل گیا دروازے کے ساتھ ہی

دو افراد ہاتھوں میں ہتھیار پکڑے کھڑے تھے تاجو نے جیپ گیٹ سے اندر کی تو وہاں کھڑے دونوں افراد نے مجھے جھک کر سلام کیا میں نے بھی سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا گیٹ سے اندر آنے کے بعد میں نے دیکھا اندر طویل لان ہے جس میں خوبصورت گھاس لگی ہوئی ہے ساتھ ہی کھجور کے بڑے بڑے درخت سر اٹھائے کھڑے ہے جن پر کھجوریں لدی ہوئی ہیں لان کے ایک جانب جدید سوئمنگ پول بنا ہوا ہے اور لان کے دوسری جانب لاتعداد سفید رنگ کی کرسیاں رکھی ہوئی ہے شائد گاؤں کے پنچائیت کی میٹنگ وغیرہ یہیں پر ہوتی ہیں لان میں کئی خوبصورت مور پھر رہے تھے خاص طور پر سفید مور پر تو میری نظر ہی جم گئی جو اپنے پر پھیلائے دنیا و مافیہا سے بے خبر رقص کر رہا تھا۔

''مور تھر کا حسن ہے۔۔'' تاجو نے مجھے مور کو رقص کرتے دیکھا تو بولا میں نے اس کے بات سن کر اقرار میں سر ہلا دیا۔

تاجو نے جیپ حویلی کے اندرونی دروازے کے سامنے روکی تو میں جیپ سے اتر گیا اور میں نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنا بیگ اٹھا اور کندھے سے لٹکا لیا یہ دیکھ کر تاجو تیزی سے میری جانب بڑھا اور اس نے مجھ سے بیگ لینے کی کوشش کی میں اسے منع کرنا چاہتا تھا مگر تاجو کی آنکھوں میں التجا دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور بیگ اسے دے دیا۔ حویلی کے اندرونی دروازے پر ایک بڑی عمر کا آدمی کھڑا تھا اس کے دائیں بائیں کئی افراد نہایت ادب سے کھڑے تھے اس بڑی عمر کے آدمی کے چہرے پر کرختگی تھی اس کے رخساروں کی ہڈیاں اس طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی جیسے وہ دانت بھینچ کر کھڑا ہو اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ میرا استقبال اپنے دل پر جبر کرکے کر رہا ہو میں آگے بڑھا تو وہ شخص تیزی کے ساتھ میری جانب بڑھا اور اپنا تعارف کروایا۔

''میں لال بخش ہوں'' لال بخش نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے میری جانب بڑھایا۔

''مجھے شاویز کہتے ہیں۔۔'' میں نے لال بخش کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواباً کہا۔

''شاہ ویز سائیں کا سامان کمرے میں پہنچا دو۔۔'' لال بخش نے اپنے ساتھ کھڑے نوکر سے کہا تو تاجو نے میرا بیگ لے لیا۔

''آپ سفر سے تھک گئے ہونگے نہا دھو کر تھوڑا آرام کر لیجئے دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔۔'' لال بخش نے مجھ سے کہا اور واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

''مجھے وہ ہی کمرہ دیجئے گا جہاں میرے والد ٹھہرے تھے۔۔'' میں نے پلٹ کر جاتے ہوئے لال بخش سے کہا تو وہ رک گیا اور میری جانب مڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ کے لئے وہ ہی کمرہ صاف کیا گیا ہے جہاں شاہ زمان سائیں ٹھہرے تھے۔۔'' لال بخش نے مجھے جواب دیا اور پھر مڑ کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

نوکر بھی میرا سامان اٹھا کر حویلی کے اندر بڑھا تو میں بھی نوکر کے پیچھے پیچھے چل دیا چلتے ہوئے میں بغور حویلی کو دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی لال بخش کے سرد رویے پر غور کر رہا تھا کہ اس نے کتنے روٹھے لہجے میں مجھ سے بات کی اور اکھڑے رویے کے ساتھ میرا استقبال کیا حالانکہ میں اس حویلی کا اکلوتا وارث ہوں۔

میں یہ سب سوچتا ہوا نوکر کے پیچھے چل رہا تھا نوکر سیڑھیوں کے ذریعے مجھے اوپری منزل پر لے کر گیا اوپر پہنچ کر میں نے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ یہ ایک لمبی راہداری ہے جس کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے ہیں وہ نوکر مجھے ایک کمرے کے سامنے لیکر گیا پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے ایک تنقیدی نظر کمرے پر ڈالی کمرے کافی بڑا اور ہوادار تھا کمرے میں اے سی اور روم فریج بھی رکھا ہوا تھا کمرے کے دائیں جانب بالکونی تھی اور سامنے بڑی سے ایل سی ڈی لگی ہوئی تھی کمرے میں اٹیچ باتھ بھی تھا میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو حیران رہ گیا باتھ روم اٹالین

ٹائلز سے مرصع تھا اور اس میں جدید باتھ اور شاور لگے ہوئے تھے میں ایک پسماندہ گاؤں میں اتنا جدید اور پر آسائش کمرہ اور باتھ روم دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔۔۔'' میں نے نوکر سے پوچھا۔

''چھوٹے سائیں مجھے نورا کہتے ہیں۔۔'' نوکر نے مجھے اپنا نام بتایا۔

''نورا اس کمرے میں کون رہتا تھا۔۔؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''یہ آپ کے والد کا کمرہ ہے۔۔''

''نہیں میرا مطلب ہے میرے والد تو برسوں بعد پچھلے سال آئے تھے ان سے پہلے کون رہتا تھا۔؟'' میں پھر پوچھا

''یہ آپ کے والد کا ہی کمرہ ہے شادی کے بعد آپ کی والدہ بھی یہیں آئی تھیں جب آپ لوگ یہاں سے چلے گئے تھے تو یہ کمرہ بند کر دیا تھا۔۔ برسوں بعد آپ کے والد کے آنے پر ہی یہ کمرہ کھولا گیا۔۔'' نورا نے مجھے تفصیل بتائی تو میں سر ہلانے لگا۔

''دیگر کمروں میں کون رہتا ہیں'' کچھ دیر بعد میں نے نورا سے پھر پوچھا۔

''پہلا کمرہ شاہ سائیں کا ہے دیگر کمرے اب خالی ہیں۔۔'' نورا بولا۔

''اب خالی ہیں کیا مطلب؟''

''پہلے آپ کے تایا اور ان کے فیملی رہتی تھی مگر اب۔۔۔'' نورا نے جملہ ادھورا چھوڑا اور اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگا شائد اسے سب کی یاد آنے لگی تھی۔

''سائیں کوئی کپڑے وغیرہ استری کے ہو تو دے دیجئے۔۔'' تھوڑی دیر بعد نورا گویا ہوا تو میں نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے ایک شلوار قمیص نکال کر نورا کے دی میں نے خاص طور پر یہاں کے لئے کئی شلوار قمیص خریدی تھیں۔ نورا میرے کپڑے لے کر کمرے سے گیا تو میں بھی نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا نہا دھو کر فریش ہوا تو تھکن محسوس ہونے لگی میں آرام کی نیت سے بستر پر لیٹ گیا بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

میں کافی دیر تک سوتا رہا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی کچھ دیر میں خالی الذہن لیٹا رہا دروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا گیا۔

''کون ہے۔۔آجاؤ۔۔'' میں نے بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے آواز لگائی تو نورا کمرے میں داخل ہوا اور نہایت ادب سے مجھ سے مخاطب ہوا'' چھوٹے سائیں کھانا تیار ہے بخش بابا آپ کو بلا رہے ہیں۔۔''

''ٹھیک ہے میں آتا ہوں'' میں نے نورا سے کہا تو وہ مجھے ادب سے سلام کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا نورا کے جانے کے بعد میں بستر سے اٹھا اور باتھ روم کی جانب بڑھا اچانک میری نظر بالکونی پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ بالکونی میں ایک عورت سفید لباس میں کھڑی ہے اس کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے ہے وہ بالکونی میں کھڑی باہر کی جانب دیکھ رہی ہے۔

''کون ہو تم کمرے میں کیسے آئی؟'' میں نے ڈپٹ کر اس عورت سے پوچھا اس عورت نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا بس مسلسل بالکونی سے باہر جھانک رہی تھی۔

''اے کون ہو تم؟۔۔'' میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھا اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں لڑکھڑا گیا گرنے سے بچنے کے لئے میں نے مسہری کا سہارا لیا اور نیچے فرش پر دیکھا کہ میں کس چیز سے ٹکرایا ہوں مگر فرش صاف تھا وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے میں ٹکرا کر لڑکھڑاتا میں نے حیران نظروں سے فرش کو دیکھا پھر اپنے پیروں کو دیکھا۔

''نہ جانے میں کس چیز سے ٹکرایا تھا۔۔'' میں بڑبڑایا پھر میں نے نظر اٹھا کر بالکونی کی جانب دیکھا تو مجھے شدید حیرت کا جھٹکا لگا بالکونی خالی تھی اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا میں جلدی سے بالکونی میں آیا اور میں بالکونی میں چاروں جانب دیکھا مگر بالکونی خالی تھی۔

''آخر وہ عورت کہاں گئی؟'' میں سوچنے لگا کیونکہ بالکونی آنے اور جانے کا واحد راستہ کمرے سے

ہو کر گزرتا تھا اور وہ عورت کمرے میں داخل نہیں ہوئی تھی تو۔۔۔تو پھر وہ عورت کہاں غائب ہوگئی۔ میں حیرت کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے بالکونی سے نیچے جھانکا تو نیچے کافی گہرائی تھی اور وہاں نیچے بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔

''وہ عورت غائب کہاں ہوگئی۔۔کہیں میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا۔'' میں مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر میں نے سر کو جھٹک کر پریشان کن خیالات سے چھٹکارا پانا چاہا اور بالکونی سے باہر کی جانب دیکھنے لگا۔

''پپا اسی بالکونی سے باہر گرے تھے۔'' مجھے خیال آیا پپا کی یاد آتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے آنسو بھری آنکھوں سے بالکونی سے باہر جھانکا۔

کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد میں نے اپنی آنکھیں پونچھی اور واپس کمرے میں آیا اور باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے باہر نکلا باہر نورا میرے انتظار میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا میں نورا کے ساتھ لمبی راہداری عبور کرکے سیڑھیوں کے ذریعے نیچے پہنچا نورا مجھے ایک بڑے سے ہال میں لیکر آیا اس بڑے سے ہال میں ایک بڑی سی ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی اس ڈائننگ ٹیبل کے گرد انتہائی دیدہ زیب کرسیاں رکھی ہوئی تھی اور ڈائننگ ٹیبل پر انواع اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے اس ہال کی دائیں جانب والی بڑی سی دیوار پر کئی تصاویر لگی ہوئی تھیں میں ان تصاویر کو دیکھنے لگا ان تصاویر میں کئی بزرگ لمبی لمبی پگڑیاں پہنے بڑے کروفر کے ساتھ کھڑے تھے۔ان سب کے چہروں پر رعب ودبدبہ تھا صاف لگتا تھا وہ سب اپنے زمانے کے حکمران رہے ہوں گے۔

''یہ سب آپ کے پرکھوں (بزرگوں) کی تصویریں ہیں'' مجھے اپنے پیچھے لال بخش کی آواز آئی تو میں نے گھوم کر اپنے پیچھے لال بخش کو دیکھا۔

''یہ سب۔۔؟'' میں نے لال بخش سے پوچھا۔

''جی۔۔چھوٹے سائیں۔۔یہ سب۔۔'' لال بخش نے جواب دیا ''یہ سب آپ کے بزرگ ہیں یہ آپ کے پردادا اور یہ ان کے والد اور یہ ان کے والد۔۔۔'' لال بخش ایک ایک تصویر کے بارے میں بتانے لگا۔

''یہ آپ کے بڑے تایا شاہ رحمان اور ان کی بیوی کی تصویریں ہیں'' لال بخش نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کے شکل بہت حد تک پپا سے ملتی جلتی تھی وہ سفید پگڑی پہنے کھڑا تھا اس کی تصویر کے ساتھ ایک خاتون کی تصویر تھی جو میری بڑی تائی تھی ان تصویریں کے نیچے ایک تصویر میں دو بچے پانچ یا چھ سال کے کھڑے تھے۔

''یہ دونوں بچے تایا شاہ رحمان کے ہیں؟'' میں نے بچوں کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لال بخش سے پوچھا۔

''جی ہاں۔۔۔یہ شاہ حسن اور شاہ حسین ہے سائیں رحمان کے جڑواں بچے۔۔؟'' لال بخش نے مجھے بتایا۔

''اب تو یہ بچے جوان ہو گئے ہوں گے۔۔؟'' میں نے دوبارہ دریافت کیا۔

''یہ معصوم ہی تو سب سے پہلے حویلی کے آسیب کا شکار ہوئے تھے۔۔'' لال بخش کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی۔

''لاحول ولاقوۃ۔۔'' میں زیرِ لب بڑبڑایا کیونکہ میں بھوت پریت آسیب وغیرہ جیسی چیزیں کا قطعی قائل نہیں تھا۔

''اور یہ تصویر کس کی ہے۔۔؟'' میں ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اس تصویر میں ایک خوبصورت نوجوان شخص بڑے اسٹائل سے کھڑا تھا اس کے سنہری گھنگھریالے بال اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اس شخص کے گورے چٹے چہرے پر بڑی طرحدار قسم کی مونچھیں تھی جنھیں تاؤ دے رہا تھا بلاشبہ وہ شخص کافی خوبصورت تھا مگر اس کے باوجود مجھے وہ شخص اچھا نہیں لگا کیونکہ اس شخص کے خوبصورت چہرے پر عجیب سی سفاکیت چھائی ہوئی تھی۔وہ شخص چہرے سے ظالم معلوم پڑتا تھا۔

'' یہ آپ کے چھوٹے تایا شاہنواز سائیں ہیں۔۔'' لال نے بتایا۔

''اوہ'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میرے ذہن میں پیا کے الفاظ گونجنے لگے'' تمہارے چھوٹے تایا شاہنواز سے ایک غلطی ہوگئی تھی جس کی سزا شاہ خاندان بھگت رہا ہے۔۔''

شاہنواز تایا کے آگے پیا اور مما کے تصاویر ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھی پیا اور مما کی تصویریں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے سر جھکا کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کی لال بخش نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی دی۔

''یہاں دادا حضور کی تصویر نہیں لگی۔۔'' تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے لال بخش سے پوچھا

'' توبہ۔۔توبہ۔۔۔شبھ شبھ (اچھا اچھا) بولئے چھوٹے سائیں'' لال بخش اپنے گالوں پر توبہ کے انداز میں ہاتھ مارتا ہوا بولا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اس دیوار پر صرف ان لوگوں کی تصویریں لگی ہیں جواب اس دنیا میں نہیں رہے۔۔'' تھوڑی دیر اپنے گال پیٹنے کے بعد لال بخش نے مجھے بتایا۔

''اوہ سوری۔۔مجھے معلوم نہیں تھا۔۔'' میں نے فوراً معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں شاہ سائیں کی تصویر اس دیوار پر لگی ہے۔'' لال بخش نے میری توجہ دوسری دیوار کی جانب دلائی تو میں نے گھوم کر اس جانب دیکھا اس دیورا پر ایک قدآدم تصویر لگی ہوئی تھی جس میں ایک بارعب شخص نہایت رعب کے ساتھ ایک خوبصورت کرسی پر بیٹھا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں ایک عصا (لاٹھی) پکڑا ہوا تھا جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے ذہانت اس شخص کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک دادا حضور کی تصویر کو دیکھتا رہا۔

''دادا حضور تو بہت رعب والے لگتے ہیں۔'' میں نے تصویر دیکھتے ہوئے لال بخش سے کہا۔

'' جی ہاں چھوٹے سائیں ۔۔۔شاہ سائیں کا رعب بہت ہے۔۔'' لال بخش بولا۔

'' آیئے چھوٹے سائیں کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے۔۔'' کچھ دیر بعد لال بخش نے میری توجہ کھانے کے جانب دلائی تو میں ڈائننگ ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔

'' کیا دادا حضور نہیں آئیں گے؟'' میں نے ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

'' یہاں آپ کے دادا حضور کو سب شاہ سائیں کہتے ہیں لہذا آپ بھی انہیں شاہ سائیں کہا کریں'' لال بخش ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''میرا تعلق یہاں سے بہت واجبی سا ہے میں انہیں اسی رشتے سے پکاروں گا جوان کا اور میرا ہے یعنی دادا پوتے کا۔لہذا میں انہیں دادا حضور ہی پکاروں گا۔۔'' میں لال بخش کو تفصیلی جواب دیا۔

'' آپ اردو بہت اچھی ہے۔۔''

'' جی ۔۔ماما کے مرنے کے بعد میری تربیت خالہ خدیجہ نے کی تھی اور خالہ خدیجہ کا تعلق لکھنؤ سے ہے لہذا میری زبان میں جو شائستگی اور فراست ہے یہ خالہ خدیجہ کی تربیت کا نتیجہ ہے'' میں نے جواب دیا تو لال بخش سر ہلانے لگا۔

''میں نے دادا حضور کا پوچھا تھا۔۔'' تھوڑی دیر بعد میں نے لال بخش کو اپنی بات یاد دلائی۔

'' شاہ سائیں کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ کھانا وغیرہ اپنے کمرے ہی میں کھاتے ہیں'' لال بخش نے بتایا تو میں خاموشی سے کھانا کھانے لگا کھانے بہت لذیذ تھا لہذا میں چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

'' کیا دادا حضور سے ملاقات نہیں ہوگی۔۔؟''

کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے لال بخش سے پوچھا۔

'' ابھی تو شاہ سائیں دوائی کھا کر سورہے ہیں شام تک اٹھ جائیں گے تو ملاقات ہوجائے گی۔۔'' لال بخش نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کم از کم مجھے دادا حضور کا دیدار ہی کروا دیجئے۔۔" میں کہا۔

"آیئے۔۔" لال بخش نے اپنی چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا تو میں نے بھی چائے کی پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا اور لال بخش کی رہنمائی میں دادا حضور کے کمرے کی جانب چل دیا۔

دادا حضور کے کمرے کے سامنے پہنچ کر لال بخش نے دروازہ کا لاک گھما کر دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا میں بھی لال بخش کے پیچھے دادا حضور کے کمرے میں داخل ہوا کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک شاہانہ قسم کے کمرے میں جہازی سائز کے بیڈ پر دادا حضور آنکھیں موندے سو رہے ہیں ان کا دایاں حصہ فالج کی وجہ سے ایک جانب کو ڈھلکا ہوا محسوس ہو رہا تھا فالج کی وجہ سے ان کا منہ بھی ایک جانب کو جھکا ہوا تھا اس کے باوجود دادا حضور کے چہرے پر رعب تھا دادا حضور کافی لمبے چوڑے تھے جہازی سائز کے بیڈ کو انھوں نے پورا گھیرا ہوا تھا دادا حضور سے نظر ہٹا کر میں نے کمرے پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی کمرہ میں ہر چیز شاہانہ انداز لئے ہوئے تھی ایسا لگتا تھا جیسے کسی بادشاہ کا کمرہ ہو۔ میں نے دادا حضور کو ایک بار پھر بھرپور نظروں سے دیکھا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے دادا حضور کے چہرے میں مجھے پپا کا چہرہ نظر آنے لگا لال بخش نے بھی میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور تسلی دی۔ پھر ہم دونوں دادا حضور کے کمرے سے باہر آ گئے۔

"آپ آرام کر لیجئے ابھی سفر کی تھکان نہیں اتری ہو گی۔ رات کو شاہ سائیں جاگ جائیں گے تو آپ کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔۔" لال بخش نے مجھ سے کہا تو میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا میں جب کمرے میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ نورا کمرے میں موجود ہے اور میرے بستر کی چادر تبدیل کر رہا ہے بستر کے چادر بدلنے کے بعد نورا ادب سے ایک جانب کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"چھوٹے سائیں آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔۔"

"ہاں۔۔ فریج میں پانی ختم ہو گیا ہے تم ایسا کرو ایک دو پانی کی بوتلیں بھر کر رکھ دو۔۔" میں نورا سے کہا تو نورا نے فرج کا دروازہ کھولا اور پانی کی خالی بوتلیں نکالی اور بوتلیں لیکر کمرے سے باہر چلا گیا نورا کے جانے کے بعد میں ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آیا اور ڈریسنگ ٹیبل میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے آئینے میں اپنے پیچھے ایک عورت کا چہرہ نظر آیا میں جھٹکے سے پیچھے کی جانب مڑا کہ دیکھ سکو ل کہ میرے پیچھے کون ہے۔۔ مگر میں حیران رہ گیا میرے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا میں نے گھوم کر آئینے میں دیکھا آئینے میں وہ عورت صاف نظر آ رہی تھی اس عورت نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اس کے گھنے سیاہ بال اس کے چہرے پر پڑے ہوئے تھے اس کا سر نیچے کے جانب جھکا ہوا تھا میں نے ایک بار پھر مڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا مگر میرے پیچھے کوئی نہیں تھا میں نے ایک بار پھر آئینے پر نظر ڈالی آئینے میں اس عورت کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔

"کک۔۔۔کون ہو تم۔۔؟" میں گھبرا کر پوچھا تو اس عورت نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔۔۔تو میری سانسیں میرے حلق میں گھوٹنے لگیں۔

اف۔۔۔اس عورت کا چہرہ۔۔۔اس عورت کے چہرے پر زخموں کے ان گنت نشانات تھے اس کے چہرہ اتنا زخمی تھا کہ اس عورت کے خدوخال پہچانے نہیں جا رہے تھے اس کی آنکھیں۔۔۔اف۔۔۔اس کی آنکھوں سے لہو بہہ رہا تھا اور وہ لہو بہتی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی مجھے اپنی سانسیں بند ہوتی محسوس ہونے لگی خوف سے میرا برا حال تھا میں لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور نورا پانی کی بوتلیں لیکر اندر داخل ہوا مجھے گرتا دیکھ کر نورا نے پانی کے بوتلیں میز پر رکھی اور جلدی سے مجھے سنبھالا دے کر بستر پر بیٹھا دیا۔

"کیا ہوا۔۔چھوٹے سائیں؟" نورا مجھے بستر پر بیٹھانے کے بعد پوچھنے لگا۔

''وہ۔۔وہ دیکھو آئینے میں۔۔'' میں نے آئینے کی جانب اشارہ کر کے کہا تو نورا آئینے میں دیکھنے لگا۔

''سائیں یہاں تو کوئی نہیں ہے۔۔'' نورا آئینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تو میں ہمت کر کے اٹھا اور آئینے کے سامنے پہنچا اور آئینے میں دیکھنے لگا مگر اب آئینے میں اس عورت کا عکس نہیں تھا میرے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اور میں تھکے تھکے انداز میں بستر پر بیٹھ گیا۔

''سائیں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔۔۔ ڈاکٹر کو بلاؤں؟'' نورا نے مجھے اس طرح بستر پر بیٹھتا دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

''نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔'' میں نے نورا کو جواب دیا نورا فکر مند نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''نورا۔۔۔ تم نے حویلی میں پھرنے والے آسیب کو دیکھا ہے۔۔'' کچھ دیر بعد میں نے نورا کو مخاطب کیا۔

''جی سائیں کئی بار۔۔۔ وہ ایک عورت ہے۔۔''
نورا ہکلایا۔

''عورت۔۔۔ وہ عورت کیسی نظر آتی ہے۔۔ میرا مطلب ہے وہ آسیب۔۔ جو حویلی میں گھومتا ہے وہ کس طرح کا نظر آتا ہے۔۔'' میں نے نورا سے پھر پوچھا۔

''سائیں اسی آسیب کی وجہ سے تو یہ حویلی ویران ہوگئی ورنہ اس حویلی میں اتنی رونق ہوتی تھی کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔۔'' نورا ماضی میں کھو گیا۔

''میں نے اس آسیب کا حلیہ پوچھا ہے نورا۔۔'' میں نے دوبارہ اپنا مدعا بیان کیا۔

''سائیں وہ ایک عورت ہے سفید لباس میں اور اس کا چہرہ۔۔۔۔'' نورا جیسے جیسے بتاتا جا رہا تھا مجھ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ جس عورت کو میں نے پہلے بالکونی اور پھر آئینے میں دیکھا تھا وہ۔۔۔ وہ حویلی کا آسیب ہی تھا وہ۔۔۔ وہ وہی آسیب تھا جس نے شاہ خاندان کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا جس نے پپا کو بالکونی سے نیچے گرایا تھا میں حیرانگی کے عالم میں بستر پر بیٹھا نورا کا بیان سن رہا تھا۔

''اچھا نورا تم برسوں سے یہاں نوکر ہو۔۔؟'' میں نے نورا سے پوچھا۔

''سائیں چھوٹا سا بچہ تھا جب سے شاہ سائیں کی خدمت میں ہوں۔۔'' نورا نے بتایا۔

''اوکے۔۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ تایا شاہنواز سے کیا غلطی ہوئی تھی۔۔'' میں نورا سے پوچھا۔

''سائیں چھوٹا منہ بڑی بات۔۔ آپ یہ بات مجھ سے نہ پوچھئے۔۔۔'' نورا نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''اچھا۔۔ اچھا نہیں پوچھتا۔۔ میرے سامنے اس طرح ہاتھ مت جوڑو۔۔'' میں جلدی سے نورا سے کہا تو وہ تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اچھا اس حویلی کے آسیب نے یا اس حویلی کی بھوتنی نے کبھی کسی نوکر وغیرہ کو نقصان پہنچایا ہے۔'' کچھ دیر بعد میں نے نورا سے پھر پوچھا۔

''نہیں سائیں۔۔۔ وہ بھوتنی صرف شاہ خاندان کے لوگوں کی دشمن ہے اور۔۔۔'' نورا کہتے کہتے رک گیا اس کے نہ کہے الفاظ بھی میں سمجھ گیا۔

''ٹھیک ہے نورا تم جاؤ میں آرام کرونگا۔۔'' میں نے کہا تو نورا مجھے سلام کرتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

نورا کے جانے کے بعد میں بستر سے اٹھا اور میں نے اپنا بیگ کھول کر Peter Straub کا مشہور ناول Ghost Story نکالا اور اپنے بستر پر لیٹ کر ناول کا مطالعہ کرنے لگا ابھی مجھے ناول پڑھتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے کسی عورت کی اذیت بھری چیخ سنائی دی آواز بہت ہلکی تھی مگر صاف آرہی تھی میں نے ناول بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور غور سے سننے لگا ایک بار پھر چیخ کی آواز بلند ہوئی کوئی عورت نہایت اذیت میں چیخ رہی تھی میں بستر سے اٹھ گیا اور آواز کی سمت کا اندازہ لگانے لگا آواز باہر سے آرہی تھی میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر راہداری میں جھانکا راہداری خالی پڑی تھی چیخوں کی آواز راہداری کے کونے کے کمرے

سے آرہی تھی عورت کی اذیت ناک چیخوں کے ساتھ کسی مرد کی غصے بھری آواز بھی ابھر رہی تھی میں نے آواز کی درست سمت کا اندازہ کیا اور آواز کی جانب بڑھا آگے ہی آگے بڑھتے ہوئے میں راہداری کے آخری کمرے کے سامنے پہنچ گیا آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں۔

"یہ۔۔۔یہ کمرہ تو شاہنواز تایا کا تھا۔" مجھے فوراً کی بات یاد آئی اس نے مجھے ایک ایک کمرے اور اس میں رہنے والے مکینوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچا آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں میں کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے لگا اندر کمرے میں کوئی مرد کسی مظلوم عورت پر ظلم کر رہا تھا عورت اذیت ناک انداز میں چیخ رہی تھی اور مرد غصے سے اسے گالیاں دینے کے ساتھ مار رہا تھا۔

" ذلیل عورت۔۔۔ تو منحوس ہے۔۔۔بے غیرت۔۔" کمرے کے اندر سے ایک مرد کی آواز ابھری اور ساتھ ہی زوردار تھپڑ کی آواز بھی کمرے سے باہر تک آئی۔

"مم۔۔۔میں آپ کی بیوی ہوں۔۔۔آپ نے مجھ سے نکاح کیا ہے۔۔" کمرے سے کسی عورت کی کمزور سی آواز ابھری۔

"ذلیل عورت تو نے اپنی ادائیں دکھا کر مجھے پھنسا لیا تو نے اپنی خوبصورتی کا جادو مجھ پر چلایا مگر۔۔ اب میں تیرے جال میں نہیں پھنسوں گا میں تیرا یہ خوبصورت چہرہ بگاڑ دوں گا۔۔" اندر کمرے سے مرد کی آواز ابھری ساتھ ہی عورت کے چلانے کی آواز آئی وہ بچاؤ بچاؤ چلا رہی تھی۔

مجھ سے ضبط نہیں ہوا اور میں نے کمرے کے ہنڈل پر ہاتھ رکھا اور ہنڈل گھما کر دروازہ کھولا۔۔۔تو میں دھک سے رہ گیا اندر کمرے میں شاہنواز تایا تھے جو ایک عورت کو سر کے بالوں سے پکڑ کر مار رہے تھے شاہنواز تایا کے دوسرے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس سے وہ اس عورت کے چہرے پر زخم لگا رہے تھے میں ششدر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ شاہنواز تایا تو مر چکے ہیں پھر یہ کون شخص ہے۔۔۔اور اس عورت کو کیوں اتنی بے دردی سے مار رہا ہے؟

اچانک وہ عورت شاہنواز تایا کو دھکا دے کر کمرے سے باہر کی جانب بھاگی کمرے کے دروازے پر میں کھڑا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس عورت نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور وہ عورت میرے پاس آئی اور میرے اندر سے ایسے گزر گئی جیسے میرا وجود ہی نہ ہو یا میں کسی دھوئیں کا بنا ہوا ہوں وہ عورت میرے اندر سے نکل کر باہر راہداری میں آگئی اور ایک ایک دروازہ کھٹکھٹا کر مدد طلب کرنے لگی

مگر۔۔۔مگر حویلی کا کوئی دروازہ اس کے لئے نہ کھلا کوئی شخص اس مظلوم عورت کی مدد کو نہ آیا۔

شاہنواز تایا بھی اس عورت کے پیچھے خنجر لئے کمرے سے باہر نکلے اور انہوں نے دروازہ کھٹکھٹا کا مدد طلب کرتی اس عورت کو پیچھے سے پکڑا اور خنجر کے ایک ہی وار سے اس عورت کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا ۔یہ دیکھ کر میں بری طرح گھبرا گیا میں آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے فرش نے میرے پیر جکڑ لئے ہو ۔اس عورت کا سر تن سے جدا کرنے کے بعد شاہنواز تایا نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اس عورت کا سر کٹنے کے بعد لڑھکتا ہوا میرے قدموں میں آگیا اور اس کا دھڑ بھی چلتا ہوا میرے سامنے آگیا پھر اس عورت کے دھڑ نے انگلی اٹھا کر میری جانب اشارہ کیا اور اس عورت کا کٹا ہوا سر ہوا میں بلند ہوا اور میرے چہرے کے سامنے آکر رک گیا اور اس کٹے ہوئے سر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا یہ سب دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے اور میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور میں بے ہوش کر گر پڑا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا ناول میرے سینے پر دھرا ہوا تھا میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"میں۔۔۔میں یہاں کیسے آیا۔۔۔مم۔۔۔میں وہاں راہداری میں بے ہوش ہو کر گرا تھا۔۔" میں نے گھبرا کر سوچا پھر میں نے کمرے پر نظر دوڑائی مگر کمرے میں کوئی

www.urdusoftbooks.com

نہیں تھا۔

"کہیں میں پڑھتے پڑھتے سو تو نہیں گیا۔۔؟"
میں نے پھر سوچا۔

"لیکن وہ عورت اور تایا شاہنواز۔۔" میں الجھن کا شکار تھا "کہیں میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔"

"ہاں شائد میں نے خواب ہی دیکھا تھا۔۔۔ میں ناول بھی Ghost Story پڑھ رہا تھا لہٰذا میں نے خواب میں بھی بھوت ہی دیکھ لیا۔۔" میں مسلسل سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔۔" میں نے آواز لگائی تو نورا کمرے میں داخل ہوا اور مجھے سلام کر ادب سے کھڑا ہو گیا میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔

"سائیں لال بخش نے آپ کو یاد کیا ہے۔۔"

"اچھا تم چلو میں آتا ہوں۔۔" میں نے جواب دیا تو نورا واپس چلا گیا میں بستر سے اترا اور باتھ روم میں گھس گیا تھوڑی دیر میں، میں فریش ہو کر کپڑے وغیرہ بدل کر نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ڈائننگ ٹیبل پر چائے کے لوازمات رکھے ہیں مگر ڈائننگ ہال میں کوئی نہیں ہے میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ڈائننگ ٹیبل تک پہنچا۔

"تو آپ ہیں۔۔۔اس حویلی کے اکلوتے وارث۔۔۔انگلینڈ پلٹ۔۔۔مسٹر شاویز۔۔" مجھے اپنے پیچھے ایک شوخ نسوانی آواز آئی تو میں بے اختیار پیچھے کی جانب گھوم گیا پیچھے پلٹ کر میں نے دیکھا کہ ڈائننگ روم کے دروازے پر ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کھڑی ہے میں اس لڑکی کو دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا سانولی سلونی سی گھنگرو دار بال والی تیکھے نقوش کی وہ حسینہ سیدھی میرے دل میں اترتی چلی گئی میں پہلی نظر کی محبت کا قائل نہیں ہوں۔ مگر۔۔مگر وہ حسینہ مجھے اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

"جی میرا نام شاہ ویز ہے۔۔۔اور آپ۔۔"
میں نے اس حسینہ پر سے نظر ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا نام ماہا ملک ہے ویسے حویلی میں سب مجھے ماہی کہتے ہیں" اس لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔

"تشریف رکھیئے۔۔" میں نے ماہی کے لئے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی نکالتے ہوئے کہا تو وہ نہایت بے تکلفی سے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ماہی بیٹا۔۔یہ شاہ ویز ہے اور شاہ ویز سائیں یہ ماہی ہے۔۔" ڈائننگ روم کے دروازے سے لال بخش داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"بخش بابا میں تعارف کروا چکی ہوں۔۔" ماہی نے جواب دیا۔

"شاہ ویز سائیں۔۔۔یہ آپ کے بڑے تایا شاہ رحمان کے عزیز دوست کی بیٹی ہے۔۔۔ماہی کے ماں باپ کے انتقال کے بعد شاہ سائیں نے اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا یہ حیدر آباد شہر میں پڑھتی ہے چھٹیوں میں حویلی آتی ہے۔۔" لال بخش نے تفصیل سے مجھے بتایا تو میں نے سر ہلا دیا۔

"مجھے آپ کے والدین کا سن کر بہت افسوس ہوا۔۔" میں نے رسماً کہا۔

"تھینکس۔۔" ماہی بولی "مجھے تو مما پپا کی صورت بھی یاد نہیں جب میں دو ماہ کی تھی تو ایکسڈنٹ میں مما پپا کی ڈیتھ ہو گئی تھی جب سے میں بابا سائیں کے پاس ہوں۔۔۔بابا سائیں ہی میرے سب کچھ ہیں۔۔"

"بابا سائیں؟۔۔" میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

"شاہ سائیں۔۔۔میں انہیں بابا سائیں کہتی ہوں۔۔" ماہی نے مجھے بتایا۔

"یعنی آپ دادا حضور کی بیٹی ہو۔۔" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" ماہی نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

"پھر تو آپ اس حویلی کی مالکن ہوئیں۔۔"

میں نے مسکرا کر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بے شک مالکن میں ہوں مگر۔۔۔وارث تو آپ ہیں۔۔" ماہی نے جواب دیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی ہنسنے سے اس کے گالوں میں ڈمپل پڑ گئے میں بھی اس کی بات پر مسکرا کر اسے دیکھنے لگا اور ساتھ ہی دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ حویلی میں کوئی تو ہے جس سے میں بات چیت کر سکتا ہوں۔

"ماہی بیٹا۔۔اب شاہ ویز سائیں کی ذمہ داری تمہاری ہے بے چارے صبح سے آئے ہوئے ہیں جب سے کمرے میں بند بور ہو رہے ہیں اب تم انہیں بور نہیں ہونے دینا۔۔" لال بخش نے ماہی سے کہا تو ماہی سر ہلانے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں بابا۔۔۔اب شاہ ویز سائیں بالکل بور نہیں ہوں گے۔۔" ماہی نے جواب دیا تو لال بخش سر ہلاتے ہوئے ہال سے باہر چلا گیا۔

"ہاں تو مسٹر شاہ ویز۔۔۔فرمایئے آپ کی بوریت کیسے دور کی جائے۔۔" چائے پینے کے بعد ماہی بولی۔

"ماہی۔۔" میں سنجیدہ لہجے میں ماہی کو مخاطب کیا تو ماہی نے چونک کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ماہی کیا تم مجھے پپا کی قبر تک لے جا سکتی ہو۔۔" تھوڑی دیر توقف کے بعد میں نے کہا۔

"ہاں ضرور۔۔چائے پی کر انکل شاہ زمان کی قبر پر چلتے ہیں" ماہی نے مجھے جواب دیا تو میں سر جھکا کر چائے پینے لگا پپا کے ذکر پر میری آنکھیں بھر آئی تھی لہٰذا میں آنسو چھپانے کے خاطر سر جھکا کر بیٹھ گیا ماہی کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے ٹیبل پر رکھے ٹشو بکس سے ایک ٹشو نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔

☆......☆......☆

"ماہی۔۔حویلی کے متعلق مجھے کچھ بتاؤ۔۔" پپا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر واپس آتے ہوئے میں نے ماہی سے کہا۔

"چھوڑو حویلی کے قصے کو۔۔۔کیا کرو گے سن کر۔۔" ماہی بے زاری سے بولی۔

"تم نے حویلی میں گھومتے اس آسیب یا بھوت کو دیکھا ہے۔۔" میں نے پھر پوچھا۔

"ہاں کئی بار۔۔" ماہی نے جواب دیا۔

"کیسا دیکھتا ہے وہ آسیب۔۔؟" میں نے پھر پوچھا۔

"وہ ایک عورت ہے جس نے سفید لباس پہنا ہوا ہے اور اس کے چہرے پر زخم کے نشان ہے۔" ماہی بولی اور تفصیل کے ساتھ اس آسیب کا حلیہ بتانے لگی ماہی حلیہ بتاتی جا رہی تھی اور میں حیران ہو رہا تھا کیونکہ ماہی اسی عورت کا حلیہ بتا رہی تھی جسے میں کئی بار حویلی میں دیکھ چکا ہوں۔۔"

"ماہی اس بھوت کی کیا دشمنی ہے شاہ فیملی سے جو وہ شاہ فیملی کے پیچھے پڑ گئی ہے؟۔۔" ماہی کے خاموش ہونے کے بعد میں نے پوچھا تو ماہی مجھے گھورنے لگی۔

"شاہ ویز۔۔وہ سب جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے۔۔بس تم جلد از جلد حویلی سے چلے جاؤ۔۔"

"قطعی نہیں۔۔میں سب کچھ جانے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔۔تم مجھے بتاؤ کہ وہ آسیب کون ہے اور شاہ فیملی سے اس آسیب کی کیا دشمنی ہے اور۔۔۔تایا شاہنواز سے کیا غلطی ہوئی تھی۔۔" میں ماہی کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا تو ماہی حیران نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ شاہنواز سائیں سے کوئی غلطی ہوگئی تھی۔" ماہی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک مرتبہ پپا کے منہ سے میں نے یہ بات سنی تھی کہ ان کے بڑے بھائی شاہنواز سے ایک غلطی ہوگئی تھی جس کا خمیازہ شاہ فیملی کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔۔" میں نے ماہی کو بتایا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"پلیز ماہی مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔۔؟" میں نے التجائی لہجے میں ماہی سے کہا۔

میری بات سن کر ماہی چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی پھر تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں

سب بتاتی ہوں مگر تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ سب کچھ جان لینے کے بعد تم حویلی سے چلے جاؤ گے اور حویلی سے چلے جانے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔"

"میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن میں حویلی میں رہنے نہیں آیا جلد یا بدیر مجھے حویلی سے جانا ہی ہے۔" میں نے ماہی کو جواب دیا تو ماہی مجھے دیکھنے لگی پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔

"بھوت پریت روح بدروح کو میں بھی نہیں مانتی تھی مگر۔۔۔مگر جب میں نے خود اس عورت کا بھوت دیکھا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ بھوتوں کا وجود بھی ہوتا ہیں۔۔" ماہی نے کہنا شروع کیا۔

"وہ عورت کون ہے جس کا بھوت حویلی میں پھرتا ہے۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"صبر رکھو میں تمہیں ترتیب سے سب بتاتی ہوں۔۔" ماہی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور سوچنے لگی شائد وہ واقعات کو اپنے ذہن میں تازہ کر رہی تھی میں ماہی کے سامنے کھڑا اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"بابا سائیں کے تین بیٹے تھے بیٹی کوئی نہیں تھی۔" ماہی نے کہنا شروع کیا "سب سے بڑے بیٹے شاہ رحمان سائیں پھر شاہنواز سائیں اور سب سے چھوٹے تمہارے والد شاہ زمان سائیں۔۔۔" ماہی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔

"بابا سائیں روایتی جاگیرداروں کے برعکس بہت رحمدل اور مہربان ہے وہ اپنے مزارعین کو بڑی عزت دیتے ہیں بابا سائیں ایک مذہبی ذہن کے آدمی ہے اسی لئے انہیں جدید دور کی خرافات سے بڑی نفرت ہے جس میں سرفہرست گانا بجانا فلم و ڈرامہ ہے۔

بابا سائیں کے بڑے بیٹے شاہ رحمان اور تمہارے پیا شاہ زمان بابا سائیں کی طرح ملنسار اور مذہبی ذہن کے آدمی تھے۔۔۔مگر تمہارے چھوٹے تایا شاہنواز سائیں بابا سائیں کے برعکس ناچ گانے کے دلدادہ اور لڑائی بھڑائی کے ماہر تھے ان کے ماتھے پر ہر وقت غصے کے مارے بل پڑے ہوتے تھے وہ غریبوں کے ساتھ روایتی جاگیرداروں والا سلوک کرتے تھے اور انہیں اپنا غلام سمجھتے تھے شاہنواز سائیں گانے بجانے کے بھی بے حد شوقین تھے اور وہ اپنا یہ شوق حویلی میں پورا نہیں کر سکتے تھے لہٰذا وہ آئے دن شہر جا کر اپنا یہ شوق پورا کرتے تھے بابا سائیں نے بہت کوشش کی کہ شاہنواز سائیں راہ راست پر آجائے انہیں پیار سے ڈانٹ کر سختی کر کے ہر طرح سے سمجھایا مگر شاہنواز سائیں باز نہیں آئے۔" ماہی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی میں بھی خاموش کھڑا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کہیں بیٹھ جانا چاہئے اس طرح کھڑے کھڑے ہم تھک جائیں گے۔۔" ماہی نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"چلو اس کنویں کی منڈیر پر بیٹھ جاتے ہیں" ماہی نے کچھ ہٹے کنویں کی جانب اشارہ کیا تو میں اور وہ چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ کنویں تک پہنچے اور منڈیر پر بیٹھ گئے۔

" شاہنواز تایا سے کیا غلطی ہوئی تھی؟۔۔" کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھنے کے بعد میں نے پوچھا۔

" شاہ رحمان سائیں کی شادی بابا سائیں نے اپنی مرضی سے کی تھی اور شاہنواز سائیں کا رشتہ بھی انہوں نے اپنے ایک دوست کے گھر طے کر دیا تھا یہ اس وقت کی بات ہے جب حویلی میں شاہنواز سائیں کے شادی کی تیاریاں جاری تھی کہ گاؤں میں ایک فلمی یونٹ آیا جو گاؤں میں فلم کی شوٹنگ کرنا چاہتا تھا بابا سائیں تو اس فلمی یونٹ کو کبھی بھی اپنے گاؤں میں شوٹنگ کی اجازت نہیں دیتے۔۔مگر اس فلم کا ڈائریکٹر بھی کوئی اونچی پہنچ والا تھا لہٰذا جب اوپر سے حکومتی دباؤ پڑا تو بابا سائیں نے مجبوری میں فلم کی شوٹنگ کی اجازت دے دی۔" اتنا کہہ کر ماہی خاموش ہوگئی پھر کچھ دیر بعد گویا ہوئی۔

"گاؤں میں فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو شاہنواز

سائیں کی موجیں ہی ہوگئیں۔ شاہنواز سائیں ہر وقت فلمی یونٹ کے ساتھ رہتے تھے اس فلمی یونٹ کے ساتھ فلم کی ہیروئین رخسار بھی تھی نہ جانے کب شاہنواز سائیں اور رخسار کے درمیان پیار کا پودا کھلا اور تناور درخت بن گیا فلمی یونٹ تو چند دن شوٹنگ کر کے واپس شہر چلا گیا اور اس یونٹ کے ساتھ رخسار بھی چلی گئی مگر ساتھ ہی وہ شاہنواز سائیں کا سکھ چین بھی لوٹ لے گئی۔

ادھر حویلی میں شاہنواز سائیں کی شادی کی تیاری عروج پر تھی عین شادی والے دن شاہنواز سائیں حویلی سے بھاگ گئے اور شاہنواز سائیں کی بارات نہ جاسکی گاؤں کی روایات کے مطابق جرگہ بیٹھا جرگے میں بابا سائیں کی بہت بے عزتی ہوئی اور انہیں بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ بابا سائیں کو جرمانے کا افسوس نہیں تھا مگر جرگے میں جو شرمندگی بابا سائیں کو اٹھانی پڑی اسے بابا سائیں نے دل سے لگالیا اور وہ بیمار پڑ گئے۔

ایک مہینے بعد شاہنواز سائیں حویلی لوٹ آئے ۔۔۔ مگر وہ اکیلے نہیں تھے انھوں نے شہر میں رخسار سے شادی کر لی تھی اور وہ رخسار کو اپنی دلہن بنا کر حویلی میں لے آئے تھے شاہنواز سائیں کی اس حرکت پر بابا سائیں بہت گرجے برسے مگر اب کیا ہوسکتا تھا شاہنواز سائیں نے رخسار سے نکاح کر لیا تھا اور رخسار شاہنواز سائیں کی دلہن کی حیثیت سے حویلی آئی تھی۔

بڑی اماں یعنی تمہاری دادی جان کے کہنے پر بابا سائیں نے شاہنواز سائیں اور رخسار کو حویلی میں رہنے کی اجازت تو دے دی مگر ساتھ ہی یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ کوئی بھی ان دونوں سے بات چیت نہیں کرے گا اور نہ ان دونوں سے کوئی میل ملاپ رکھے گا لہذا حویلی کے دیگر لوگوں نے شاہنواز سائیں اور رخسار کا مکمل بائیکاٹ کر دیا وہ دونوں اپنے کمرے تک محدود رہتے تھے انہیں کھانا پینا ان کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔'' ماہی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ میں چپ چاپ بیٹھا ماہی کو سن رہا تھا جب ماہی خاموش ہوئی تو میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا ماہی نے چند گہری سانسیں لیں اور پھر گویا ہوئی۔

''چند دن تو شاہنواز سائیں رخسار کی محبت میں گرفتار رہے مگر کب تک ۔۔۔ آخر ان کی رنگیلی طبیعت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا اور وہ دوبارہ اپنی پرانی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے اس بات پر رخسار اور شاہنواز سائیں کے درمیان تو تو میں میں ہونے لگیں ایک رات ان دونوں کے درمیان زبردست جھڑپ ہوئی اور شاہنواز سائیں نے رخسار پر ہاتھ اٹھا دیا بس پھر تو شاہنواز سائیں کا ہاتھ کھل گیا اور وہ روزانہ رخسار کو مارنے لگے۔

پھر۔۔۔ پھر۔۔۔'' ماہی اچانک خاموش ہوگئی۔

''پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے چینی سے ماہی سے پوچھا۔

''پھر وہ بھیانک رات آئی۔۔'' ماہی نے کہنا شروع کیا ''اس رات شاہنواز سائیں اور رخسار کے درمیان زبردست جھڑپ ہوئی اور شاہنواز سائیں نے اس رات رخسار کو بہت مارا رخسار کی دردناک چیخیں سب نے سنیں۔۔ شاہنواز سائیں بھیانک قہقہے لگاتے ہوئے رخسار کو زدوکوب کر رہے تھے ۔۔۔ اس رات شاہنواز سائیں نے رخسار پر ظلم کی انتہا کر دی رخسار چیختی رہی ہر کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر مدد کی بھیک مانگتی رہی مگر کسی نے اس کی مدد نہیں کی سب بابا سائیں کے حکم کی وجہ سے مجبور تھے کسی نے رخسار کے لئے اپنے کمرے کا دروازہ نہ کھولا اور آخرکار ۔۔۔۔'' ماہی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی اس کی آنکھیں بھر آئی تو اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

'' پھر کیا ہوا۔۔'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''اس رات شاہنواز سائیں انسان نہیں رہے حیوان بن گئے انھوں نے خنجر کے وار کر کے رخسار کا چہرہ مسخ کر دیا اور پھر خنجر کے ایک ہی وار سے رخسار کی گردن اس کے تن سے جدا کر دی۔'' ماہی پھر خاموش ہوگئی۔

''اوہ۔۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ساتھ ہی میں حیرت میں ڈوب گیا کیونکہ یہ واقعہ میں خواب

میں من وعن دیکھ چکا تھا۔

"جب صبح سب کو صورتحال کا پتا چلا تو سب فکرمند ہو گئے مگر بابا سائیں کے حکم پر رخسار کی لاش چپ چاپ دفنا دی گئی اور سب لوگ ایسے بن گئے جیسے رخسار کا کوئی وجود ہی نہیں تھا کسی کی زبان پر کبھی رخسار کا نام نہیں آیا حویلی سے باہر کے لوگوں کو یہ کہہ دیا گیا کہ رخسار شہر چلی گئی پھر اس واقعے کے ٹھیک ایک سال بعد۔

رات کے وقت اچانک شاہنواز سائیں کی چیخیں پوری حویلی میں گونجنے لگیں سب لوگ گھبرا گئے اور شاہنواز سائیں کے کمرے کی جانب دوڑے شاہنواز سائیں کا کمرہ اندر سے بند تھا اور کمرے کے اندر سے شاہنواز سائیں کی آواز آرہی تھی۔

"کمینی تو پھر آگئی میں نے تجھے مار دیا تھا مگر۔۔تو پھر زندہ ہوگئی۔۔"

"میں انتقام بن کر آئی ہو شاہنواز۔۔۔اب دیکھنا اس حویلی میں موت کا رقص کس طرح ہوتا ہے ۔۔۔سب لوگ مریں گے۔۔" کمرے کے اندر سے رخسار کی آواز آئی تو سب لوگ حیران رہ گئے اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔

"کون ہے شاہنواز تمہارے ساتھ۔۔۔" باہر سے شاہ رحمان سائیں نے پوچھا۔

"یہ سالی دوبارہ زندہ ہو کر آگئی اور مجھے۔۔۔ دھمکی دے رہی ہے۔۔۔" اندر سے شاہنواز سائیں کی آواز آئی۔

"کون زندہ ہو کر واپس آگئی۔۔"

"رخسار۔۔۔۔اور کون۔۔۔آج میں اسے دوبارہ مار دونگا۔۔" اندر سے شاہنواز سائیں کی آواز آئی تو سب حیران رہ گئے پھر کمرے کے اندر سے شاہنواز سائیں کی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں تو باہر کھڑے سب لوگ گھبرا گئے اور دروازہ توڑنے لگے اور جب دروازہ ٹوٹ کر گرا تو سب کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

کمرے کے وسط میں شاہنواز سائیں کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی شاہنواز سائیں کو انتہائی بے دردی سے مارا گیا تھا ان کی لاش کے بڑی بے دردی سے ٹکڑے کئے گئے تھے سب لوگ یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے کہ شاہنواز سائیں کی لاش کے پاس رخسار ایک تیز دھار خنجر لئے کھڑی ہے اس نے سفید لباس پہنا ہوا ہے اور اس کا چہرہ۔۔۔اف۔۔۔اس کا چہرہ زخموں سے بھرا ہوا تھا حویلی کے دیگر لوگوں کو دیکھ کر رخسار نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

سب مریں گے۔۔کوئی نہیں بچے گا۔۔شاہ فیملی کا نام ونشان تک مٹا دونگی۔۔" رخسار نے بھیانک لہجے میں کہا اور پھر دھواں بن کر سب کے نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔

شاہنواز سائیں کی لاش کو بھی خاموشی کے ساتھ آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا حویلی کے دیگر مکین کئی مہینوں تک رخسار کی دھمکی کی وجہ سے سہمے ہوئے رہے مگر ایک سال تک کچھ نہیں ہوا تو سب مطمئن ہو گئے۔

پھر تمہاری پیدائش ہوئی تو حویلی میں دوبارہ خوشیاں منائی جانے لگیں سب رخسار اور اس کی دھمکی کو بھول گئے تمہارا عقیقہ اور شاہ رحمان سائیں کے جڑواں بچوں شاہ حسن اور شاہ حسین کی سالگرہ کی تقریب ایک ہی دن رکھی گئی تقریب حویلی کے لان میں تھی لہذا شہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے حویلی کے کمروں کی صفائی شروع کی گئی مگر جب شاہنواز سائیں کا کمرہ جو ایک سال سے بند تھا جب اس کمرے کو کھولا گیا ۔۔۔تو سب حیران رہ گئے کیونکہ کمرہ مکمل طور پر صاف ستھرا تھا ایسا لگتا تھا جیسے یہ کمرہ کسی کے زیر استعمال ہے سب حیران رہ گئے پھر جب حویلی کے ملازم کچھ چیزوں کو ادھر ادھر کرنے لگے تو وہاں رخسار کی روح آگئی سارے نوکر ڈر کے بھاگ گئے بابا سائیں کے حکم پر وہ کمرہ بند کر دیا گیا اور اس پر بڑا سا تالا ڈال دیا گیا اس دن کے بعد سے وہ کمرہ کبھی نہیں کھولا گیا۔

پھر جب تقریب عروج پر تھی تو اچانک ننھے شاہ حسن اور شاہ حسین غائب ہو گئے ہر طرف ان کی ڈھونڈ

پڑی مگر وہ دونوں نہ ملے پھر ایک نوکر کی چیخ نے سب کو اپنی جانب متوجہ کیا سب اس نوکر کے پاس پہنچے ۔۔۔۔تو۔۔۔'' ماہی یہاں تک کہہ کر پھر خاموش ہوگئی میں بھی خاموشی سے ماہی کے ایک بار پھر بولنے کا انتظار کرنے لگا میں حیران ہو رہا تھا کہ مرنے کے بعد ایک انسان انتقام لے رہا ہے اور حویلی کے مکینوں کو دردناک موت سے ہمکنار کر رہا ہے۔

''نوکر کے توجہ دلانے پر سب نے باغ کے سب سے بلند درخت کی جانب دیکھا تو۔۔۔'' ماہی نے دوبارہ کہنا شروع کیا ''تو سب نے صدمے کے مارے دل پکڑ لئے کیونکہ درخت کی سب سے اونچی مضبوط شاخ پر شاہ حسن اور شاہ حسین کی لاشیں لٹک رہی تھیں اور ان لاشوں کے پاس کھڑی رخسار کی روح قہقہے لگا رہی تھی۔

یہ بھیانک منظر دیکھ کر شاہ رحمان سائیں اور آنٹی شمسہ بے ہوش ہوگئیں بڑی مشکلوں سے معصوم بچوں کی لاشوں کو درخت سے اتارا گیا خوشی کی تقریب غم میں تبدیل ہوگئی اس واقعے کے بعد تمہارے والد شاہ زمان سائیں نے فیصلہ کیا کہ وہ حویلی چھوڑ کر چلے جائیں گے اور بابا سائیں کی اجازت سے شاہ زمان سائیں اور زبیدہ آنٹی تمہیں لیکر انگلینڈ چلیں گئے۔۔'' ماہی پھر خاموش ہوگئی۔

''تایا شاہ رحمان اور تائی شمسہ کی موت کیسے ہوئی۔۔''

میں نے ماہی کے خاموش ہو جانے کے بعد پوچھا۔

''وہ دونوں بھی رخسار کے انتقام کا نشانہ بنے اپنے بچوں کی موت کے بعد شمسہ آنٹی کی کیفیت دیوانوں کی سی ہوگئی اور اسی دیوانگی میں انھوں نے اپنی شہ رگ کاٹ لی مگر دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ حرکت شمسہ آنٹی نے خود نہیں کی بلکہ رخسار نے یہ کام کیا ہے کیونکہ شمسہ آنٹی بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی تھیں اور جب انھوں نے شہ رگ کاٹی تو چھری ان کے دائیں ہاتھ میں تھی۔''

''اور تایا شاہ رحمان کا انتقال کیسے ہوا؟''

''آنٹی شمسہ کے انتقال کے چھ ماہ بعد ایک دن شاہ رحمان سائیں حویلی کے باغ میں مالی سے پودوں کی صفائی کروا رہے تھے کہ ایک بلند و بالا درخت جو زمین میں مضبوطی سے کھڑا تھا اچانک زمین سے اکھڑ کر شاہ رحمان سائیں پر گر پڑا شاہ رحمان سائیں کو چیخنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ درخت کا گرنا اتفاقی بات نہ تھی کیونکہ وہاں موجود مالی نے بیان میں یہی کہا کہ اس نے درخت کے گرنے سے پہلے درخت کے اوپر سفید لباس میں کسی عورت کو دیکھا تھا۔۔'' ماہی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی تو میں سوچ میں پڑ گیا۔

آج تک میں بھوت پریت کا قائل نہیں تھا مگر آج ماہی کی باتیں سن کر اور جو واقعات صبح سے ابھی تک میرے ساتھ گزرے ہیں ان سب کے متعلق سوچ کر میری سوچ کا زاویہ بدل رہا تھا۔

''یہ سب واقعات تمہاری پیدائش سے پہلے کے ہیں۔۔؟'' میں نے ماہی سے پوچھا۔

''ہاں جب شاہ رحمان سائیں کا انتقال ہوا تو میں دو ماہ کی تھی شاہ رحمان سائیں کے جنازے میں شرکت کر کے میرے والدین واپس جا رہے تھے تو ان کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا اس وقت میں صرف دو ماہ کی تھی جب سے میں بابا سائیں کی سرپرستی میں ہوں۔۔'' ماہی نے مجھے بتایا۔

''کہیں تمہارے والدین کے ایکسیڈنٹ میں بھی رخسار کا ہاتھ نہ ہو۔۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں۔۔ آج تک رخسار کبھی حویلی سے باہر کسی کو نظر نہیں آئی اور نہ ہی اس نے شاہ فیملی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔۔'' ماہی بولی۔

''تم نے اپنی آنکھوں سے رخسار کی روح کو دیکھا ہے۔۔؟'' میں نے ایک بار پھر ماہی سے پوچھا۔

''کئی بار۔۔۔ کئی بار وہ مجھے حویلی میں گھومتی نظر آئی مگر اس نے مجھے کبھی کچھ نہیں کہا۔۔۔ نہ صرف مجھے بلکہ اس نے کبھی کسی نوکر کو بھی تنگ نہیں کیا بس اس کی دشمنی شاہ فیملی سے ہے۔۔'' ماہی نے جواب دیا۔

"دادی جان کا انتقال کیسے ہوا۔" مجھے دادی جان کا خیال آیا تو میں نے ماہی سے پوچھا۔

"ان کا انتقال طبعی ہوا وہ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔" ماہی بولی۔

"ہوں۔۔" میں سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

"جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے رخسار دراصل بابا سائیں کو دکھ دینا چاہتی ہے کیونکہ ان کے فیصلے کی وجہ سے رخسار کی کسی نے مدد نہیں کی۔۔" ماہی کچھ دیر بعد بولی تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"اب یہ بتاؤ میں کیا کروں۔۔؟" میں نے ماہی سے پوچھا۔

"میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم جتنی جلدی ہو سکے حویلی چھوڑ کر چلے جاؤ کیونکہ رخسار کی روح کی ساری طاقت حویلی کے اندر ہی کام کرتی ہے وہ حویلی کے باہر کچھ نہیں کر سکتی۔۔" ماہی نے جواب دیا تو میں نے فکرمندانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

"کافی ٹائم ہو گیا ہمیں حویلی چلنا چاہئے۔۔" تھوڑی دیر بعد ماہی بولی تو میں سوچ کے سمندر سے باہر آیا۔

"آں ہاں۔۔"

"تمہارے سنگ وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔۔" میں نے حویلی کے جانب قدم بڑھاتے ہوئے ماہی سے کہا تو اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا میں شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا ماہی نے شرما کر اپنی نظریں نیچے کر لی اور تیز قدم اٹھانے لگی میں بھی اس کی سنگت میں تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

ہم دونوں جیسے ہی حویلی میں داخل ہوئے تو ہمیں لال بخش مل گیا۔

"آپ لوگ کہاں چلے گئے تھے۔۔۔ حویلی میں سب پریشان ہو رہے تھے۔۔" ہمیں دیکھتے ہی لال بخش بول اٹھا۔

"وہ۔۔ ہم لوگ تھوڑا آگے چلے گئے تھے۔۔" ماہی نے جلدی سے جواب دیا۔

"شاہ سائیں جاگ گئے ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔۔" لال بخش نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بابا سائیں جاگ گئے۔۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی ماہی بول پڑی اور تیز تیز قدموں کے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

"چھوٹے سائیں وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔۔" لال بخش نے ایک بار پھر مجھ سے کہا تو میں سر ہلاتے ہوئے ماہی کے پیچھے چل دیا۔

ماہی تیز قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی دادا حضور کے کمرے کے دروازے تک پہنچی اور دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور پیچھے مڑ کر مجھے دیکھنے لگی جب میں ماہی کے ساتھ دروازے کے سامنے پہنچا تو ماہی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گئی اس کے پیچھے میں بھی دادا حضور کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے دیکھا دادا حضور گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مسہری پر تھوڑا اوپر ہو کر لیٹے ہیں۔ ماہی تیزی کے ساتھ ان کے پاس پہنچی اور انہیں سلام کیا دادا حضور نے ماہی کے سر پر ہاتھ رکھا میں نے بھی آگے بڑھ کر دادا حضور کو سلام کیا مجھے دیکھتے ہی دادا حضور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے میری بھی آنکھیں بھر آئیں وہ میرے والد کے والد تھے میرے دادا حضور تھے ان کے چہرہ پر محبت و شفقت برس رہی تھی انھوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا جب میں ان کے قریب گیا تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور میرا ماتھا چوم لیا ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے انھوں نے مجھ سے کچھ کہا مگر میں ان کے الفاظ ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا کیونکہ ان کے دائیں حصے پر فالج کی وجہ سے ان کے منہ سے الفاظ ٹھیک طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے میں نے مدد کے لئے ماہی کی جانب دیکھا۔

"بابا سائیں پوچھ رہے ہیں کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔۔" ماہی نے دادا حضور کی ترجمانی کی۔

"نہیں نہیں دادا حضور میں یہاں بالکل آرام سے

ہوں۔۔" میں نے جواب دیا میری بات سن کر دادا حضور بہت خوش ہوئے اور پھر کچھ کہنے لگے میں نے ایک بار پھر ماہی کی جانب دیکھا۔

" بابا سائیں کو تمہارا دادا حضور کہنا بہت اچھا لگا۔" ماہی نے ایک بار پھر دادا حضور کی ترجمانی کی" بابا سائیں کہہ رہے ہیں کہ تم ہمیشہ انہیں دادا حضور ہی کہنا۔"

" دادا حضور۔۔" میں نے ایک بار پھر کہا تو دادا حضور نے مجھے اپنے گلے سے لگالیا۔

پھر میں دادا حضور اور ماہی وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے دادا حضور مجھ سے میری ماں اور باپ کی باتیں کر رہے تھے اور میں پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

ہمیں باتیں کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئیں میں اس وقت چونکا جب وال کلاک نے رات کے بارہ بجے کا گھنٹہ بجایا میں نے چونک کر وال کلاک کی جانب دیکھا قدیم طرز کا قد آدم وال کلاک کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ رکھا تھا جس میں سنہری رنگ کا گھنٹہ ٹن ٹن بج رہا تھا جیسے ہی وال کلاک کی ٹن ٹن ختم ہوئی۔

حویلی میں کسی عورت کے رونے کی آواز گونجنے لگی رفتہ رفتہ رونے کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی پھر ایسا لگا جیسے لاکھوں چڑیلیں بین کر رہی ہو فضا ان چڑیلوں کے رونے کی آوازوں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ان آوازوں کے ساتھ ہی ماہی اور دادا حضور کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ دونوں شدید خوفزدہ نظر آنے لگے میں نے سوالیہ نظروں سے ماہی کی جانب دیکھا تو وہ دھیرے سے بولی۔

" رخسار۔۔۔رخسار آگئی۔۔" ماہی کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اس کے منہ سے ٹھیک طرح سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے دادا حضور نے بھی اپنے بائیں ہاتھ سے میرے کلائی زور سے پکڑ لی تھی اور ساتھ ہی وہ منہ ہی منہ میں قرآنی آیات پڑھ رہے تھے۔

رونے کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی رونے کی آوازوں کے ساتھ ہزاروں بھیڑیوں کے غرانے کی آوازیں بھی آنے لگیں پھر ساری آوازیں یک دم بند ہوگئی ہر طرف سناٹا چھا گیا خاموشی اتنی تھی کہ ہم تینوں کی سانسوں کی آوازیں باآسانی سنائی دے رہی تھی اچانک ایک زور کی چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی شاہنواز تایا کی آواز گونجی۔

" آج۔۔آج تجھے میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچاسکتا۔۔۔آج میں تجھے جان سے ماردونگا۔۔" ساتھ ہی شاہنواز تایا کے قہقہے بھی گونجنے لگے شاہنواز تایا کے قہقہوں کے ساتھ رخسار کی دردناک چیخیں بھی گونج رہی تھیں رخسار فریاد کررہی تھی شاہنواز تایا سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی مگر شاہنواز تایا شیطان بنے ہوئے تھے رخسار فریاد کرتے کرتے حویلی کے کمروں کے دروازے کھٹکھٹانے لگی اور ہر دروازے کو کھٹکھٹا کر رحم کی بھیک مانگ رہی تھی مگر حویلی کا کوئی دروازہ نہ کھلا پھر دادا حضور کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ساتھ ہی رخسار کی دل چیر دینے والی فریاد کی آواز میرے کانوں میں پڑی میں نے ایک نظر دادا حضور اور ماہی پر ڈالی دونوں انتہائی خوفزدہ سے بیٹھے تھے دونوں کا چہرہ خوف کے مارے سفید پڑ گیا تھا میں نے صرف ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر دادا حضور سے اپنی کلائی چھڑائی اور تیزی کے ساتھ بستر سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

میرے اس طرح دروازہ کھولنے پر ماہی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔دروازہ کھول کر میں نے دیکھا دروازے پر سفید لباس میں ایک عورت کھڑی ہے اور اس عورت کا چہرہ۔۔۔اوہ۔۔۔اس عورت کے چہرے پر اتنے زخم تھے کہ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا یہ وہی عورت تھی جو مجھے اکثر حویلی میں نظر آتی رہی تھی اس عورت کے پیچھے شاہنواز تایا کھڑے تھے ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خنجر تھا شاہنواز تایا نے خنجر والا ہاتھ اٹھایا تاکہ وہ رخسار پر وار کرسکیں۔

جیسے ہی شاہنواز تایا نے رخسار پر وار کیا میں نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

" شرم نہیں آتی عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بس بہت ظلم کرلیا آپ نے اس مظلوم عورت پر۔۔۔اب

میں آپ کو اس پر کوئی ظلم نہیں کرنے دوں گا۔۔" میں نے شاہنواز تایا کا خنجر والا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور انہیں زور سے دھکا دیا وہ شاہنواز تایا پیچھے دیوار سے جا ٹکرائے اور دیوار سے ٹکراتے ہی دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

میں رخسار کی جانب مڑا۔۔۔رخسار کا کٹا پھٹا چہرہ تیزی کے ساتھ صحیح ہونے لگا اور پھر بھیانک چہرے کی جگہ ایک خوبصورت چہرے نے لے لی۔

"بزدلوں کے شہر میں یہ کون جواں مرد آ گیا جو مظلوم کے حق کے لئے آواز اٹھا رہا ہے۔۔" رخسار کی روح مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں شاہ زمان کا بیٹا شاہ ویز ہوں ۔۔رخسار تائی۔۔" میں نے رخسار کی روح کو مخاطب کیا۔

"تائی۔۔۔۔تم نے مجھے تائی کہا۔۔" رخسار کی روح بے چین نظر آنے لگی۔

"آپ میرے تایا شاہنواز کی بیوی ہو۔۔اس لحاظ سے میری تائی جان ہوئیں۔۔" میں نے جواب دیا۔

"تائی جان۔۔" رخسار کی روح کی آواز میں ایک حسرت تھی "اس حویلی کے مکین تو مجھے ایک گری ہوئی بازاری عورت سمجھتے ہیں ۔۔اس حویلی میں مجھے کلنکنی، آوارہ، فاحشہ اور بے غیرت کہا گیا۔۔۔اور تم ہو جو کہ مجھے رشتوں کا مان دے رہے ہو۔۔" رخسار کی روح کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"حویلی میں جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا وہ انتہائی غلط تھا۔

آپ۔۔آپ اس حویلی کی عزت تھیں۔۔حویلی والوں کو آپ کو عزت دینی چاہیے تھی میں ان سب کی جانب سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔۔" میں نے رخسار کی روح سے معافی مانگی۔

"بہو۔۔" اسی وقت کمرے کے کھلے دروازے سے آواز آئی میں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا میرے ساتھ رخسار کی روح بھی چونک گئی اور اس نے بھی نظریں اٹھا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا کمرے کے دروازے پر دادا حضور ماہی کا سہارا لئے کھڑے تھے۔

"بہو غلطی میری ہے۔۔۔میں فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے والوں کو برا سمجھتا تھا حالانکہ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں اور تم تو اس حویلی کی بہو تھی اس حویلی کی عزت تھی۔۔۔مجھے تمہیں عزت اور مان دینا چاہیے تھا جو میں نے نہیں دیا۔۔یہ میری غلطی تھی۔۔۔مجھے معاف کر دو۔۔بہو۔۔" دادا حضور نے رخسار کی روح کے سامنے ہاتھ جوڑے میں لپک کر دادا حضور کے پاس پہنچا اور انہیں سہارا دیا۔

"آپ۔۔آپ مجھ سے معافی نہ مانگے۔

آپ۔۔۔آپ میرے بڑے ہیں میں انتقام کی آگ میں اندھی ہو گئی تھی۔۔

آپ۔۔آپ مجھے معاف کر دیں۔۔" رخسار کی روح رو پڑی اور دادا حضور کے قدموں میں بیٹھ گئی دادا حضور نے اپنا ہاتھ بڑھا کر رخسار کے سر پر رکھا۔

"بہو۔۔" دادا حضور نے ایک بار پھر رخسار کو بہو کہہ کر مخاطب کیا تو رخسار کی آنکھیں بھر آئیں رخسار نے دادا حضور کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور پھر دھواں بن کر فضا میں غائب ہو گئی۔

رخسار کی روح کے جانے کے بعد میں نے اور ماہی نے دادا حضور کو سہارا دے کر ان کے بستر تک پہنچایا اور انہیں بستر پر لیٹا دیا دادا حضور ایک دم نڈھال ہو گئے تھے ماہی نے جلدی سے انہیں دوائی کھلائی اور ان کا سر دبانے لگی میں بھی دادا حضور کے پیر دبانے لگا تھوڑی دیر میں دادا حضور گہری نیند سو گئے تو میں اور ماہی ان کے کمرے سے نکل آئے پھر میں نے ماہی کو شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا ہوا گزشتہ واقعات پر غور کر رہا تھا میں بھوت پریت روح بدروح کا قائل نہیں تھا۔

مگر۔۔مگر ابھی میں نے رخسار تائی کی روح کو دیکھا ان سے بات چیت کی مجھے یہ سب ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا شائد کوئی شخص تشنہ طلب یا نا امید اس دنیا

www.urdusoftbooks.com

سے چلا جاتا ہے تو اس کی روح بے چین رہتی ہے رخسار تائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا وہ اس حویلی کی بہو تھیں مگر انہیں بہو کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا انہیں عزت مان سمان نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے ان کی روح بے چین پھر رہی تھی شائدان کی روح کو اب سکون آ گیا ہو۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی، میں فریش ہو کر رات کے واقعات پر غور کرتے ہوئے نیچے ہال میں پہنچا ہال میں پہنچ کر میری نظر اس دیوار پر پڑی جہاں شاہ فیملی کے خاندان کی تصاویر لگی ہوئی تھیں تو مجھے خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا شاہنواز تایا کی ساتھ رخسار تائی کی تصویر لگی ہوئی تھی میں بغور رخسار تائی کی تصویر دیکھنے لگا واقعی رخسار تائی بے حد خوبصورت تھیں رخسار تائی تصویر میں مسکرا رہی تھیں یقیناً انہیں خوشی ہو رہی ہو گی کہ آخر کا شاہ فیملی نے انہیں خاندان کی بہو تسلیم کر لیا اور وہ شاہ فیملی کا حصہ بن گئیں۔ میں نے مسکرا کر رخسار تائی کی تصویر کو دیکھ رہا تھا کہ لال بخش میرے پاس آیا۔

"یہ تصویر۔۔" میں نے لال بخش سے پوچھا۔

"منجھلی بہو کی تصویر شاہ سائیں کے حکم پر یہاں لگائی گئی ہے۔۔" لال بخش نے مجھے بتایا تو میرے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ دوڑ گئی آخر کار رخسار تائی کو مرنے کے بعد ہی سہی انہیں ان کا حق مل گیا۔

"چھوٹے سائیں۔۔ آپ کو شاہ سائیں یاد کر رہے ہیں۔۔" ایک نوکر نے جو ابھی ہال میں داخل ہوا تھا مجھے سلام کرنے کے بعد کہا

"دادا حضور جاگ گئے۔۔" میں بڑبڑایا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ دادا حضور کے کمرے کی جانب بڑھا کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دروازے کو اپنی انگلیوں سے بجایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر کمرے میں دادا حضور مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ماہی ایک پیالے میں سوپ لئے چمچے سے انہیں سوپ پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دادا حضور نے ماہی کو سوپ پلانے سے منع کیا اور مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا، میں نے دادا حضور کے پاس مسہری پر بیٹھ گیا میرے بیٹھتے ہی دادا حضور نے اپنا بایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور کہنے لگے

"شاہ ویز بیٹا۔۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" دادا حضور کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں وہ دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔

ماہی نے دادا حضور کا جملہ مکمل ہونے کے بعد مجھے دادا حضور کی بات سمجھانا چاہی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے ماہی کو منع کیا۔

"مجھے دادا حضور کی بات سمجھ آ گئی ہے۔۔" میں نے ماہی کو جواب دیا پھر دادا حضور کی جانب متوجہ ہوا۔

"نہیں دادا حضور میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔۔ میں آج ہی سفارت خانے کو اپنا استعفیٰ بھجوا دونگا۔۔" میں نے دادا حضور سے کہا تو دادا حضور بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگے اور پھر انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

"ہاں دادا حضور میں یہاں حویلی میں رہونگا آپ کے پاس۔۔ آپ کے ساتھ۔۔ آپ کے قدموں کے سوا میری جائے پناہ کہاں ہے۔۔ اور۔۔۔ اور میری منزل بھی تو آپ کے پاس ہی ہے۔۔" میں نے دادا حضور سے کہا او رجملے کے آخر میں، میں نے ماہی کو شوخ نظروں سے دیکھا تو ماہی نے گھبرا کر اپنی نظریں نیچے کر لیں۔ میں نے دادا حضور کے گلے لگے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر ماہی کا ہاتھ پکڑ لیا، ماہی نے حیران نظروں سے میری جانب دیکھا اور میری آنکھوں میں اپنے لئے محبت کا سمندر دیکھ کر ماہی نے حیا سے اپنی گھنیری پلکیں جھکا لیں۔

مگر میں نے اتنی سی دیر میں اس کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی دیکھ لی تھی میری گرفت ماہی کے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔

دشمن روحیں

ایم اے راحت

قسط نمبر: 11

ظلم و جبر کی داستان حیرت جو کہ خراماں خراماں اپنے پڑھنے والوں کے رؤیں رؤیں میں خوف کی لہر سرایت کرتی رات کے گھٹا ٹوپ پرہیبت اندھیرے میں روحوں کی دنیا میں لے جائے گی، جہاں کہ اذیت سے دو چار روحیں سبک رفتاری سے پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردیں گی۔

ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی رائٹر کے زور قلم سے لکھی شاہکار کہانی

کوئی باقاعدہ کیمپنگ تھی۔ خیمے نظر آرہے تھے اور ان خیموں کے درمیان دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گویا مہم جوؤں کی ٹولی تھی، جو ہمالیہ کے پراسرار حالات میں کسی مہم جوئی کے لئے نکلی تھی۔

غور سے دیکھا تو عمدہ قسم کی گاڑیاں بھی نظر آئیں، اور یہ پختہ یقین ہوگیا کہ صورتحال ایسی ہی ہے۔ ایک لمحے تک میں سوچتا رہا اور پھر فیصلہ یہ ہی کیا کہ آگے بڑھ کر ان لوگوں سے ملاقات کروں۔ دیکھوں تو سہی یہ لوگ کہاں جارہے ہیں۔ میں اُس منحوس سے مل چکا تھا۔ وہ بہت مطمئن تھی۔ اس کے اس اطمینان سے میرا بڑا دل دکھا تھا۔

کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ میں ان کے چنگل سے نکل آیا ہوں، لیکن اندازہ یہ ہورہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ غرض یہ کہ آخری فیصلہ کیا، اور ان لوگوں کی طرف چل پڑا، لمبا فاصلہ تھا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان لوگوں نے مجھے دور سے دیکھ لیا ہے، اور ایک جگہ آکر کھڑے ہوگئے ہیں۔ میں نے جب اُن لوگوں کے سربراہ کو دیکھا تو میرا دل خون ہوگیا۔ یہ اُسی گاؤں کا کھیا تھا جس کے کہنے پر میں نے اُس شیر کو مارا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ میں اُن لوگوں سے بہت دور نکل آیا ہوں مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

آہ! سب کچھ وہی تھا۔ اب تک جھک ماری ہے میں نے، بلا وجہ وقت ضائع کرتا رہا ہوں۔ یہ پراسرار کھیل تو بڑی کامیابی سے جاری ہے۔ آہستہ آہستہ میں ان کے قریب پہنچتا جارہا تھا۔ پھر جب بالکل قریب پہنچ گیا تو اندازہ ہوگیا کہ یہ اُسی کھیاجی کی ٹولی ہے، لیکن اس قدر شان وشوکت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک گاؤں کا کھیا اگر شکار پر نکلے گا تو اس قدر شان وشوکت کے ساتھ نکلے گا۔ اُن کی ٹولی میں بہت سی لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ عجیب وغریب نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ سب کی سب لڑکیاں ہندوستانی تھیں، لیکن سب کی سب ایک سے بڑھ کر خوب صورت تھیں۔ اس کے علاوہ جو افراد نظر آرہے تھے۔ ان میں بھی کئی شاندار شخصیتیں تھیں۔

پھر ان کے ساتھ ساز وسامان لینڈ کروزر اور ٹریلر اور وین وغیرہ۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکار پر نکلنے والی ٹولی اس طرح کے ساز وسامان سے آراستہ ہوگی۔ کھیاجی ان سب کو میرے بارے میں بتا رہے تھے۔ اور وہ سب میری طرف دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر کھیاجی میری طرف بڑھے اور بولے۔

''میں ان سب کو تمہارے بارے میں ہی بتا رہا تھا۔ میں نے ان سب کو بتایا کہ تم نے کس طرح سے شیر



کو ختم کیا۔ خیر اب تم تھک گئے ہو گے۔ نجانے کہاں سے پیدل چلتے ہوئے آئے ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے آرام کرو۔ ہمارا یہ کیمپ عارضی ہے، لیکن اب ہم آرام سے ہی آگے بڑھیں گے۔ تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے جب تک تم اپنے طور پر مطمئن نہیں ہو جاتے، ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔"

"یو آن!"

مجھ سے بات کرتے کرتے وہ دوسری سمت مڑا، اور پھر اک طرف منہ کرتے ہوئے بولا۔

"جی آیا!"

اُس کی آواز کے جواب میں سنائی دیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک لڑکا سامنے نظر آیا۔

یہ ایک نیپالی لڑکا تھا۔ لمبا چوڑا جوان تھا۔ جس کی شخصیت میں کوئی ایک چیز ایسی ضرور تھی کہ جو دیکھنے والے کو ایک دم متاثر کرتی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچا، اور پھر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے گردن جھکا دی۔

"میرا نام یو آن ہے۔"

"یو آن اس وقت تعارف کے بجائے ان کے آرام کا بندوبست کرو۔ ان کا تعارف یا تمہارا تعارف تو بعد میں تفصیل سے بھی کروایا جا سکتا ہے۔"

کھیا جی کی یہ بات سن کر یو آن مجھ سے بولا۔

"آیئے سر......!"

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے میری رہنمائی کی، تو میں اُس کے آگے آگے چلنے لگا۔

"وہ رہی خیمہ نما چھولداری...... جس کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا جبکہ یہ والی خاص کر آپ کے لئے......!"

میں اپنی آرام گاہ میں داخل ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل خوش ہو گیا۔ یہ تو اچھا خاصا گیسٹ روم بنایا گیا تھا۔ بہت ہی اعلیٰ قسم کا فولڈنگ بستر...... اور مزید بہت سی آرام کی چیزیں تھیں۔

"اب آپ یہ بتائیں سر...... کہ اگر آپ بھوکے ہیں تو پہلے آپ کے کھانے کا بندوبست کر لیا جائے۔"

"یو آن مائی فرینڈ! بہتر ہے کہ مجھے کھانے کے لئے مل جائے۔"

میں نے بے تکلفی سے کہا۔

پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا، اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مائی فرینڈ...... آپ نے مجھے اپنا دوست کہا؟"

"ہاں...... اور تم بھی مجھے اپنا دوست کہو۔"

"میں جو کہتا ہوں مجھے کہنے دو۔ میں تمہیں سچ بتاؤں۔ بعض لوگ کسی کو ایک نگاہ میں پسند آتے ہیں۔ میں نے تو تمہارے بارے میں سن کر ہی تمہیں پسند کر لیا تھا اور اب جب میں نے تمہیں دیکھا ہے تو مجھے اپنے آپ پر فخر ہو رہا ہے، اب کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگر میں نے کسی کو دیکھے بغیر اس کے بارے میں اندازہ لگایا تو میرا اندازہ کبھی بھی غلط نہیں ہو گا۔ معافی چاہتا ہوں۔ زیادہ بول گیا۔ دراصل مجھے زیادہ بولنے کی عادت ہے، لیکن اب سب کچھ بعد میں...... پہلے آپ کچھ کھا لیں۔ میں ابھی آپ کے لئے کچھ لاتا ہوں۔"

یو آن نے جو کچھ میرے سامنے پیش کیا۔ وہ بھی بہت اعلیٰ قسم کا تھا لیکن زیادہ اعلیٰ درجے کا تھا، زیادہ دیر نہیں لگی تھی لیکن بہت ہی اعلیٰ قسم کے سینڈوچ کافی اور کچھ پھل میرے سامنے لا کر رکھے گئے تھے۔

"یار تم سچ میں بہت اچھے دوست ہو۔"

"شکریہ سر جی......!"

"تھینک یو سر، آپ کو پسند آئے، میری خواہش اسی میں ہے۔ جو بھی ضرورت ہو آپ یو آن کو آواز دے دینا۔ یہاں سے ہی آواز لگائیں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اُس کی بات کو سن کر میں مسکرا اُٹھا۔ اب میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ جیسے ہی کافی کا آخری گھونٹ لیا۔ میری پلکیں جڑنے لگیں۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ اور پھر میں شام پانچ بجے اُٹھا۔ اُس وقت جھٹپٹا اترتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن کھانے کے لئے جو چیزیں ملی تھیں، اس کے بعد جس پر مشقت سفر سے چھٹکارا ملا

تھا اس نے ساری تھکن دور کر دی تھی۔

پھر یوآن نے ہی چھولداری کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا تھا اور ایک دم پردہ اٹھا کر اندر آ گیا تھا۔

"آپ نے مجھے دوست کہا ہے، سر اس لئے آپ کو تھوڑی سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"مثلاً"

"اب آپ نے دیکھا نہیں کہ میں کس طرح پردہ اٹھا کر اندر آ گیا ہوں۔"

"اوہ...... چلو ٹھیک ہے۔ اتنی دوستی مجھے پسند ہے۔"

"سر چائے کا ٹائم ہو گیا ہے، اور سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی آپ باہر نکلیں، چائے کے برتن لگ جائیں گے۔"

"ارے ارے مجھے اتنی اہمیت نہ دو۔"

"بڑی ٹھیک اہمیت دی گئی ہے، آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے، لباس وغیرہ تو آپ کا کوئی دوسرا نہیں ہوگا لیکن مکھیا جی نے کہا ہے کہ آپ کے سائز کے کپڑوں کا بندوبست کر دیا جائے گا، یہ ذمہ داری بھی خود میرے اوپر ہی لگا دی گئی ہے۔" یوآن نے کہا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں جس جگہ پہنچا، وہ بے مثال تھی، خیموں کے درمیان کی جگہ بنائی گئی اور یہاں بڑی آرام دہ فولڈنگ میزیں لگی ہوئی تھیں وہ ویسے بھی میں نے جو یہاں ساز و سامان دیکھا تھا۔ وہ اس قدر بے مثال تھا کہ میں تو خوابوں میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا، بہرحال مختلف آوازوں میں میرا استقبال کیا گیا، اور اس وقت سب سے بڑی بات یہ بھی کہ بہت سی لڑکیاں اس محفل میں شامل تھیں۔ وہ اگر نہ ہوتیں تو مجھے بڑا تعجب ہوتا، لیکن بہرحال میں نے سب کچھ قبول کر لیا تھا۔

چائے کے برتن لگائے جانے لگے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس طرح ہم لوگ کہیں باہر نکلے ہوں گے۔ دولت کے کھیل نرالے ہی ہوتے ہیں۔ مکھیا جی نے زبردست انتظامات کئے تھے اور یہ اجنبی لوگ یقینی طور پر ان مہم جوؤں میں شامل تھے۔ جو مکھیا جی کے ساتھ شکار پر نکلتے ہوں گے، مکھیا جی نے میرا ایک شاندار شخصیت سے تعارف کروایا۔ جو لمبی چوڑی اور بہترین شخصیتوں کی مالک تھی۔

"یہ نواب صاحب ہیں۔ میرے بہترین ساتھی۔ سیر و سیاحت کے رسیا، لمبی چوڑی زمینوں کے مالک اور یہ رائے پردیب سنگھ ہیں۔ ریاست دکن کے سب سے بڑے جاگیردار، یہ ان کی بیٹیاں ہیں۔ یہ بیتا ہے اور یہ اپنے آپ کو فرنچ کہتی ہے۔ کیونکہ ان کی ماں فرنچ تھی۔ یہ دوسری ملانکہ ہے۔ یہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہنے میں زیادہ فخر محسوس کرتی ہے۔"

"جی۔"

میں نے گردن خم کر کے کہا اور پھر دوسرے لوگوں کا بھی تعارف کروایا جانے لگا۔ میں نے سب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ کیونکہ مجھے یہ بات یاد تھی کہ ان سب کی نظر میں، میں ہندو ہی ہوں۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا، اور پھر ہم سب بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، رات کا کھانا بھی اسی طرح شاندار طریقے سے کھایا گیا، بہت سے ملازم ساتھ تھے، جن کا زیادہ تر تعلق نیپال سے تھا۔ یہ نیپالی نوجوان بڑے مستعد اور ہر طرح سے چاک و چوبند تھے۔ اور بھاگ بھاگ کر سارے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے شاندار حصار بنا لیا تھا۔ علاقے کے بارے میں مجھے زیادہ اندازہ تو نہیں تھا لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ ان علاقوں میں اچھے خاصے درندے موجود ہیں۔ یقینی طور پر مکھیا جی نے جس طرح کے انتظامات کئے ہوں گے۔ رات کو مکھیا جی نے مجھے اپنے خیمے میں بلوایا۔ پھر مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اب تم مکمل طور سے میرے ساتھیوں میں سے ہو اور کسی بھی طرح سے الگ انسان نہیں ہو۔ میں تمہیں یہ بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ شکار میری بہترین دلچسپی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم دفینے بھی تلاش کرتے ہیں۔ تبت اور اس کے بے شمار علاقوں میں بدھ مت کے آثار ہیں۔ اور یہاں ایسی ایسی عظیم الشان خانقاہیں موجود ہیں جہاں بدھوں

کے اعلیٰ پائے کے مجسمے جو ہیرے جواہرات سے سجے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی سونے کے بت پر اس میں اکثر مہم جوؤں کو دستیاب ہو جاتے ہیں۔

اور ہم تنہا ہی نہیں کبھی کبھی بے شمار ٹولیاں ان کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ ہمیں ہو سکتا ہے اپنے سفر کے دوران ایسی بہت سی ٹولیاں ملتی ہیں۔ تم ہمیں معاف کرنا، تم ایک ماہر شکاری کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ہو، تم نے اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ تم ان کے لئے ملازموں جیسی حیثیت رکھتے ہو۔ لیکن تم ہمارے ہاں ملازم نہیں ہو، بلکہ ہمارے ایک ساتھی ہو۔ اگر اس سفر میں ہمیں کوئی خزانہ دستیاب ہوا تو اس میں سے تمہیں تمہارا بہترین حصہ دیا جائے گا۔ یہ پورا گروپ جس میں نواب صاحب وغیرہ موجود ہیں۔ سب کے سب خزانے کے خواہش مند ہیں۔ اب مجھے ایک بات کا جواب دو کہ کیا تم خوشی کے ساتھ ہماری قربت پسند کرو گے۔"

"جی کھیا جی! میں تو اس علاقے میں جب سے آیا ہوں، بے شمار مشکلات کا شکار رہا ہوں۔"

"اتفاق ہی ہے۔"

"جی......!"

"اب سوؤ گے نہیں......کیا؟"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے تو بے تحاشا نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں......ہاں......بالکل......!"

جو خیمہ میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ میں اسی میں آ کر لیٹ گیا۔ دن میں چونکہ کافی وقت سو چکا تھا۔ اس لئے رات کو دیر تک جاگتا رہا، دماغ میں سوچیں ہی سوچیں تھیں۔ بس کھیا جی سے جھوٹ بول کر اپنے خیمے میں آ گیا تھا۔ کہانی نیا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ پہلے یہ کہانی یوں تھی کہ وہ منحوس میرے پیچھے تھی۔ اس نے مجھے اپنے راستے پر لگا رکھا تھا اور مجھ سے میرا ایمان چھین لیا، پتہ نہیں کیا کیا غلاظتیں کھلا کر اور اس کے بعد اس نے مجھے استعمال کرتے ہوئے اپنے ایک دشمن کے پاس بھیجا۔ جس کا نجانے زندگی کا کیا مقصد تھا۔ پھر کھیا جی مل گئے۔ اب ان کی مہم جوئی اور ان کی یہ تیاریاں...... وہ مجھے ایک شکاری کا درجہ دے رہے تھے۔ میں تو یہی سمجھا تھا۔ مگر اب پتہ چلا کہ انہیں کسی خزانے کی تلاش ہے۔

بہرحال میری اپنی کوششیں تو ناکام رہی تھیں، میرے اندر جو غلاظتوں کا زہر اتر چکا تھا۔ وہ مجھے ان لوگوں کے چنگل میں پھنسے رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ اسی کا شکار تھے۔ اب اگر میری تقدیر میں یہ ہی سب کچھ لکھا گیا ہے، تو ٹھیک ہے، یہ ہی سہی۔ پھر رات کے کسی حصے میں نیند آ گئی تھی۔

دوسری صبح وہی شاندار ناشتہ اور اس کے بعد روانگی کی تیاریاں نیپالی ملازموں نے اس طرح خیمے اترے اور ان کو فولڈ کیا کہ انسان حیران رہ جائے۔ وہ اپنے کام میں بڑے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ ساری چیزیں ٹریلر اور ویگنوں میں لاد دی گئی تھیں۔ نیپالی جوان ہی گاڑیاں ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے بارے میں ہی کھیا جی نے بتایا تھا کہ وہ بہترین ٹرینڈ ہیں، اور راستوں سے بخوبی واقف ہیں، ابھی تک میرا کسی لڑکی سے باقاعدہ تعارف نہیں ہوا تھا یا کوئی اور جگہ ہمارا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا، خیر جب سفر شروع ہوا تو مجھے بھی ایک بڑی لینڈ کروزر میں ہی سوار کرایا گیا تھا اور میں آرام سے سفر کر رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کون سا علاقہ تھا، اور جگہ کون سی تھی۔ بس سفر آرام سے جاری تھا اور ہم اس عظیم الشان علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ دور دور تک ایک ویران اور بنجر پہاڑی علاقہ نظر آ رہا تھا۔ تاحد نگاہ پتھریلی زمین بہت دور تک چلی گئی تھی۔

اور تقریباً دوپہر تک سفر کرنے کے بعد ہمیں درختوں کی سیاہی نظر آئی تھی اور وہ بھی ایک بلند جگہ سے، ہماری اس لینڈ کروزر میں نواب صاحب اور ان کی لڑکیاں موجود تھیں، باقی لوگ دوسری گاڑیوں میں تھے۔ یہ سفر بالکل باقاعدہ کیا جاتا رہا۔ کھانے پینے کے لئے بھی بس ہلکی پھلکی چیزیں دے دی گئی تھیں، شام کو چھ بجے سورج چھپ گیا اور اندھیرا کسی سیلاب کی طرح

بڑھتا نظر آیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ماحول کو نگل لیا اور ہر چیز تاریک ہوگئی۔ تب ڈرائیوروں نے گاڑیوں کی روشنیاں جلالیں، تارچ جلالیں۔ مزید کچھ دیر تک سفر جاری رہا۔ اس کے بعد سیٹیوں کی آوازیں ابھرنے لگیں، جس کا مطلب تھا کہ رک جایا جائے، گاڑیاں رک گئیں، اور نواب صاحب نے کھیا جی سے پوچھا۔

''کیا خیال ہے، ابھی اور آگے چلنا ہے۔''

اس نے سوال کیا۔

''نہیں یار تھک گئے۔''

کھیا جی نے جواب دیا۔

''علاقہ بھی بہت اچھا ہے۔''

''میں نے جان بوجھ کر یہ جگہ پسند کی ہے۔''

''بالکل...... بالکل......!''

کھیا جی نے کہا۔

بڑی صاف ستھری جگہ تھی، پرسکون اور درختوں سے خاصی دور، اس کے علاوہ جورات ہوگئی تھی، اس میں زیادہ آگے بڑھنا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ کھیا جی نے منظوری دے دی۔ تمام لوگ اس پلان پر متفق تھے۔ پھر نیپالی ملازموں کو ہدایت دی گئی۔ اور وہ نیچے اتر گئے۔ سارے کام بڑے سسٹم سے کئے جارہے تھے۔ پھر نیپالی ملازموں نے صرف تین خیمے لگائے تھے یہ تینوں خیمے بڑے احتیاط سے لگائے گئے تھے، ورنہ ٹرالر ہی اتنے بڑے تھے کہ سب لوگ ان میں آرام کرسکتے تھے، ضروری سامان اتارا گیا، اس میں دوسرے ملازموں نے بھی نیپالی نوجوانوں کی مدد کی تھی۔ سب سے پہلے تمام لوگوں کے لئے کافی تیار کرائی گئی۔ پھر کھانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب مجھے واقعی لطف آرہا تھا، اس طرح کے سفر ویسے بھی لطف دیتے تھے۔ پھر بھی بات یہ ہے کہ نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔''

میرا تھا کون، جس کے لئے میں تڑپتا اور ترستا، یہ تو اچھی خاصی کمپنی مل گئی تھی، ذراسی غلطی ہوگئی تھی، اگر اس وفادار نوکر کو ساتھ لے لیتا، جس نے اپنے مالک کا بدلہ لینے کے لئے سب کچھ تیاگ دیا تھا، تو میری اتنی حیثیت ضرور تھی کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کرتا، وہ میرا بہترین ساتھی اور دوست تھا۔ بے شک یوآن اب وہ جگہ لینے کی کوشش کررہا تھا۔ لیکن وہ صلاحیتیں شاید یوآن میں نہیں تھیں۔ جو اُس میں تھیں۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو اب ہو ہی چکا۔

کھانے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ سناٹا میں انتظامات معمولی نہیں تھے۔ سرچ لائٹیں روشن کی گئیں، جو ٹرالروں اور دوسری جگہوں پر نصب تھیں اور اس کے بعد بٹن آن کیا گیا، تو ہر طرف دودھیا روشنی پھیل گئی۔

میں ششدر رہ گیا تھا۔ میں نے بے اختیار کہہ ڈالا۔

''کیا اتنی تیز روشنی سے ہمارے ساتھ لایا ہوا روشنی کا سسٹم ختم نہیں ہوجائے گا۔''

''نہیں میری جان ٹرالروں میں جنریٹر نصب ہے۔ روشنی ان جنریٹروں سے ہی ہورہی ہے اور ہر طرح کے انتظامات موجود ہیں۔''

''ویری گڈ...... ویری گڈ......'' نواب صاحب شاید میرے اور کھیا جی کے درمیان ہونے والی بات سن رہے تھے۔

عقب سے بول پڑا۔

''نوجوان کیا مزہ نہیں آرہا۔ اس سفر میں ہمارے پاس ہر طرح کا آرام موجود ہے اور اس کی ہر طرح کی ذمہ یہاں کے قابل لوگوں نے لے رکھی ہے۔''

ابھی نواب صاحب یہ ہی الفاظ کہہ رہے تھے کہ اچانک ایک طرف سے موسیقی کی لہریں ابھریں اور میں پھر اچھل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''یہ موسیقی کی آواز کہاں سے آئی؟''

میں نے حیرت سے کہا۔

''ٹرالروں سے آرہی ہے۔''

''زبردست۔''

''ٹھیک......!''

میں مسکرا دیا۔

واقعی جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ لڑکیاں اور نوجوان ایک جگہ پر جمع ہو گئے اور آپس میں خوب اچھی طرح ہنس بول رہے تھے۔ خوب تالیاں پیٹی جانے لگیں۔ فرمائشیں ہوئیں، ریکارڈ بجتے رہے، کافی تقسیم ہوئی، ایک لڑکی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ خیر پھر کھانا تیار ہوا۔ کھایا گیا۔ اس کے بعد آرام کی باتیں ہونے لگیں، تمام کے تمام لوگ یہاں بھی باز نہ آئے، روشنی کافی تھی۔ جگہ جگہ بساطیں بچھائی جانے لگیں۔ اس کے بعد شطرنج کھلی جانے لگی۔ موسیقی بند کر دی گئی۔ میں نے ایک گاڑی میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔

اور اس پر کسی نے اعتراض بھی نہ کیا۔ چنانچہ میں آرام کی جگہ پہنچ گیا، اور نجانے کب خیالات میں الجھا الجھا سو گیا۔ کافی رات گزر چکی تھی۔ اور میں کافی نیند لے چکا تھا۔ کہ کسی نے مجھے جھنجوڑا، میں نے دیکھا کہ وہ نواب صاحب تھے اور ان کے ساتھ وہی لڑکی کھڑی تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

''خیریت ہے نواب صاحب؟''

''ہاں...... ہاں سب ٹھیک ہے، لیکن یہ بتاؤ، کہ یہاں سونے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کہاں......؟''

''میرا مطلب ہے...... یہاں...... یہاں تو تمہیں آرام بھی نہیں مل رہا......!''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔

''یہ کوئی سونے کی جگہ ہے۔''

نواب صاحب نے کہا۔

''بس کوئی نہ کوئی جگہ تلاش کرنا ہی تھی، کیونکہ خیموں میں آپ لوگ تھے، پھر بہر حال سب کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔''

''بلاوجہ کی باتیں نہ کرو، تم نے کیا کچھ محسوس کیا، کہ ہم نے تمہیں خود سے کم سمجھا ہو، یا پھر خود سے الگ سمجھا ہو۔''

''نہیں......!''

''تو پھر......؟''

''میری بھی تو کچھ ذمہ داریاں ہیں اور آپ سوئی نہیں؟''

میں نواب صاحب سے بات کرتا کرتا اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا، تو وہ بولی۔

''سو گئی تھی بے چاری نے تمہارے بارے میں سنا، تو پریشان ہو گئی۔''

''بھیا جی اتنی شاندار شخصیت کا مالک ہے۔ اتنا بڑا شکاری ہے۔ اسے دوسروں کے ساتھ سلا دیا جائے۔''

''ارے...... ارے...... مہربانی ہے آپ کی......!''

''اچھا...... آ جاؤ...... آ جاؤ...... ویسے بھی تم ان علاقوں سے ناواقف ہو۔ ایسی تفریحات نہ کیا کرو، سمجھے؟''

ہمیں پتہ بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح یہاں اس گاڑی میں سو رہے ہو۔ پھر اس نے ہی کہا، کہ کسی گاڑی میں دیکھو۔ کہیں سو تو نہیں گیا۔ اگر تم نہ ملتے تو میں ساری رات سو نا پاتا۔''

نواب صاحب نے غصیلے انداز میں کہا۔

میں مسکرا دیا اور وہ لڑکی اور نواب صاحب باہر نکل گئے۔ میرے انداز میں عجیب سی کسل مندی تھی۔ مگر میں بھی ان کے پیچھے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سرچ لائٹیں بجھا دی گئی تھیں۔ چند معمولی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ ٹرالروں کی چھت پر میں نے ان نیپالیوں کو دیکھا، وہ باقاعدہ اسلحہ لئے وہاں ڈیوٹی دے رہے تھے۔

''یہ لوگ......!''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ان کی ڈیوٹی ہے، آدھی رات کو دوسرے جاگ جائیں گے۔''

بھیا جی نے بتایا اور میں نے گردن ہلا دی۔



تہی دست

اقصیٰ فاطمہ۔ گجرات

رات کے اندھیرے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے کئی سال بعد دہلا کر رکھ دیا، کیونکہ حقیقت سے ناآشنا شخص شرمندہ ہی نہیں بلکہ نادم بھی تھا اس کی زندگی......

کیا یہ حقیقت ہے کہ صرف اور صرف خیالات کو تقویت پہنچانے والے گھاٹے میں رہتے ہیں

ہمارے پھوپھا کی آدمی سے زیادہ زندگی غیرممالک میں خصوصاً سعودی عرب میں گزری، بھانت بھانت کی بولیاں اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اب اپنی آخری عمر میں انہوں نے اپنے دیس میں رہنے کو ترجیح دی، ایک دفعہ عید پر ہم ان سے ملنے گئے، مجھے شوق چرایا کہ ان کے غیرممالک میں گزرے لمحات میں کچھ ایڈونچرز یا مافوق الفطرت واقعات گزرے ہوں گے ان کو جاننے کا پہلے تو وہ مانے نہیں کیونکہ ان کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ رات کو جب لائٹ چلی گئی تو سب لوگ صحن میں چارپائیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ ایسے میں، میں نے ایک بار پھر اُن کو گھیر لیا اور ضد کرنے لگی تو انہوں نے اپنے دوست سعید کا واقعہ سنایا۔ سعید صاحب اور پھوپھا جان اُن دنوں جدہ میں مقیم تھے اور ایک مشہور کنسٹرکشن کمپنی میں ملازم تھے۔ پھوپھا جان کو انہوں نے یہ پراسرار واقعہ

سنایا پھر اس کے سچ ہونے کا ثبوت بھی فراہم کردیا۔

☆......☆......☆

تیس سال پہلے جب سعید صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تو وہ بہت خوش تھے اُن کی رہائش دریا کے کنارے بسے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی ان کی شادی مہرو نام کی جس لڑکی سے ہوئی وہ اپنے حسن و جمال میں بے مثال تھی، دور دور تک اس کی خوب صورتی کے چرچے تھے۔ بیشتر نوجوان مہرو کو اپنا جیون ساتھی بنانے کے خواب بنتے۔ جب یہ قرعہ فال سعید صاحب کے نام نکل آیا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔

شب عروسی میں وہ جھوم رہے تھے۔ ان کی خوشی دیدنی تھی بن مانگے قدرت کا ایک حسین شاہکار جو اُن کی زندگی کی زینت بن گیا تھا۔ وہ جب مہمانوں اور لڑکیوں سے فارغ ہو کر حجلہ عروسی میں آئے تو مہرو گٹھری سی بنی سکڑی سمٹی گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ ان کے سلام کا جواب بھی اس نے سر کے اشارے سے دیا۔ وہ اس کے روبرو بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ روایتی باتیں آنے والے کل کی باتیں خوبصورت گھر کی بنیاد رکھنے کی باتیں، کچھ ہی دیر بعد اُن کو یوں لگا جیسے وہ دیواروں سے ہمکلام ہیں، کیونکہ ان کی دلہن کی طرف سے تردید یا تائید کچھ بھی موصول نہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے خجل سا ہو کر گھونگھٹ الٹ دیا۔ گھونگٹ اٹھتے ہی ان کی آنکھیں جیسے چکا چوند ہو گئیں، اتنی خوبصورت دلہن ساری زندگی انہوں نے نہیں دیکھی تھی بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا۔

"ماشاءاللہ۔"

مہرو ساکت و جامد رہی وہ اسے شرم و جھجک میں رہی، جوں جوں رات بھیگتی گئی اور سعید صاحب مہرو کی زلف گرہ گیر کے دیوانے ہوتے گئے۔

مہرو نے ان پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ اُن کو مہرو کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا وہ ہر وقت اس کے آگے پیچھے صدقے واری ہوتے رہتے مگر وہ بلا کی سنجیدہ تھی سرد مہری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس میں وہ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دیکھنے کے لئے سو جتن کرتے، اگر کبھی وہ بھولے سے مسکرا بھی دیتی تو فوراً ہی اس کی مسکراہٹ کو بریک لگ جاتا جیسے اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ سعید صاحب صبح کے گئے شام کو گھر لوٹتے مگر بیوی کا سرد رویہ اُن کو دلبرداشتہ کر دیتا وہ اس کی سرد مہری کی وجہ نہ جان پاتے اس لئے جلتے کڑھتے پڑ کر سو رہتے۔

مہرو ویسے تو ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی مگر اس کی سرد مہری اور بے حسی سعید صاحب کو پریشان کر دیتی۔

ایک دن وہ بہت سوچنے کے بعد دل کی بات زبان پر لے آئے۔ "تمہیں ہم سے کوئی شکایت ہے مہرو؟"

مہرو بولی۔ "نہیں تو آپ کو ایسا کیونکر محسوس ہوا؟"

"تمہارا رویہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے اگر اس کی کوئی خاص وجہ ہے تو بتادو ہم تمہاری شکایت دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

وہ لکڑیوں سے جلائے جانے والے چولہے کے پاس بیٹھی پانی گرم کر رہی تھی خود بھی جیسے سلگ اور چٹک رہی تھی اس کے چہرے پر واضح کرب کو انہوں نے محسوس کر لیا۔

اس نے بس ایک نظر ان کو دیکھا مگر لب سے کچھ نہ بولی۔

اُس کی اُس ایک نظر میں نجانے کیا کچھ تھا کہ سعید صاحب بے چین ہو اُٹھے وہ اندر ہی اندر گھلتے رہتے، مہرو اُن کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی جس کو سمجھنا ان کے لئے جان جوکھوں کا کام تھا۔

وہ اس کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے مگر وہ جیسے کسی پتھر کی بنی تھی اس پر ان کی بے پناہ چاہت اور وارفتگی کا کچھ اثر نہ ہوتا۔

زندگی کے خوب صورت دن سرد مہری کی نذر ہو رہے تھے، سعید صاحب اب مہرو کے اس انداز کے عادی ہو گئے۔ انہوں نے پرواہ کرنا چھوڑ دیا۔ یہ سوچ کر شاید وہ فطرتاً ہی ایسی ہے۔

ایک شام جب وہ تھکے ماندے گھر لوٹے تو مہرو نے کھانا ان کے آگے رکھ دیا۔ چپاتیوں کی پوری چنگیری ان کے آگے رکھ دی جب وہ کھانا کھا چکے تو آخری چپاتی کے نیچے ان کو گھی کا ایک پراٹھا نظر آیا۔ ابھی وہ اس کی

طرف ہاتھ بڑھانے ہی والے تھے کہ مہرو نے جلدی سے چنگیری اٹھالی۔

اور چپاتی کے نیچے سے پراٹھا نکال کر دستر خوان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا اور خود پیڑھی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔

وہ بہت حیران ہوئے مگر نظر انداز کر دیا۔

پھر تو روزانہ ان کو گھر میں رات کے کھانے میں پراٹھا نظر آتا مگر اس پراٹھے کو نہ تو وہ کھاتے نہ ہی مہرو کھاتی، وہ بس اس کو لپیٹ کر طاق پر رکھ دیتی، عجیب سی پراسرار صورتحال ہو گئی تھی وہ کچھ پوچھتے تو مہرو ٹال جاتی۔

ایک روز آدھی رات کے وقت ان کو شدید پیاس لگ گئی ان کو حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے۔

انہوں نے مہرو کو آواز دے کر پانی کا تقاضا کیا۔ وہ شاید گہری نیند میں تھی، ایک آواز پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ خود اُٹھے، جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے ان کی نظر مہرو کی چارپائی پر پڑی تو یک لخت ان کا دماغ کھول اُٹھا مہرو کی چارپائی خالی تھی۔

انہوں نے اس کو بہت آوازیں دیں، سارا گھر چھان مارا مگر بے سود، وہ گھر پر تھی ہی نہیں وہ غصے سے کھولتے گھر کے دروازے میں آ کر کھڑے ہو گئے اسی وقت ان کو دائیں طرف سے کوئی سایہ اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ انہوں نے اس پر نظریں جما دیں۔

پریشانی سے ان کا برا حشر ہو گیا۔

وہ سایہ نزدیک آنے پر انہوں نے اسے پہچان لیا وہ مہرو تھی۔

مہرو نے جب اُن کو دروازے پر کھڑے پایا تو تیز قدموں سے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''آپ کب سے کھڑے ہیں یہاں؟''

''میں کافی دیر سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔'' اُن کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرا رہے تھے۔ مہرو کے سر پر جوں تک نہ رینگی اس کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ شوہر اس پر شک کر رہا ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ضروری تھا۔

شاہ فاروق......!!

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شاہ فاروق کو جیب تراشی میں بڑا ملکہ حاصل تھا ایک مرتبہ ڈنر پارٹی میں چرچل کی گھڑی چوری ہو گئی، چرچل نے شاہ فاروق کا شہرہ سن رکھا تھا۔ اس نے کہا وہ گھڑی میرے بزرگوں کی ایک پرانی یادگار ہے، لہٰذا مجھے واپس کر دی جائے، شاہ فاروق نے جواب دیا، گھڑی میں نے تو نہیں اڑائی ویسے آپ یہاں کس کس سے ملے تھے؟

چرچل نے کہا آپ کی کابینہ کے لوگوں سے ملا تھا۔ فاروق نے بے ساختہ کہا۔ یقیناً یہ پاشا کی حرکت ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر گئے اور کچھ دیر بعد واپس آئے اور گھڑی چرچل کو واپس کر دی لطف کی یہ بات ہے کہ خود پاشا کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شاہ فاروق نے کب وہ گھڑی اس کی جیب سے پار کر لی تھی۔

(ایس امتیاز احمد، کراچی)

''میں کھیتوں میں گئی تھی رفع حاجت کے لئے۔''

وہ غصہ بھول بھال کر اس کو سرزنش کرتے ہوئے گھر میں آ گئے۔

''اگر ایسی ہی ضرورت تھی تو مجھے جگا لیتی میں ساتھ جاتا۔''

''میں نے آپ کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

یہ کہہ کر مہرو اپنے بستر پر لیٹ کر سو گئی۔

سعید صاحب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ اکیلی اور کمزور سی لڑکی آدھی رات کے وقت کھیتوں میں کیسے جا سکتی ہے، مختلف اچھے برے خیالات دل و دماغ میں کلبلا رہے تھے مگر وہ مہرو کو ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ اس کو بے انتہا چاہتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہلے دن ہی سعید صاحب پر رعب حسن ہی کچھ ایسا

پڑ گیا کہ ان کو مہرو کی کوئی بھی بات غلط یا بری نہ لگتی۔

☆......☆......☆

چلتے چلتے وہ کھیت پار کرکے بیلے کی طرف نکل آئے دریا کے کنارے کھڑے وہ اردگرد ہر چیز کو غور سے دیکھتے اور عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہے، شام کے سائے پھیلنے شروع ہوئے تو انہوں نے واپسی کی راہ لی، وہ یہ سوچ کر مہرو کو سیر کے لئے لے گئے کہ شاید اس طرح وہ اکیلے گھر سے نکلنا چھوڑ دے مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی مہرو کی روٹین میں کوئی فرق نہ آیا۔

اب تو اُن کی برداشت جواب دینے لگی۔ شکوک و شبہات کے ناگ اُن کے وہم وگمان میں سر اُٹھانے لگے وہ ایک ان دیکھی آگ میں جلنے لگے مگر مہرو سے کچھ نہ کہا۔

ایک اور تدبیر ان کے ذہن میں آ گئی تو انہوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا، وہ اب ہر حال میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردینا چاہتے تھے۔

وہ سر شام ہی بستر پر پڑ کر خراٹے لینے لگے۔ درحقیقت وہ سونے کے بجائے مہرو کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے لگے۔

جب اندھیرا کچھ گہرا ہوا تو مہرو اُٹھی اس نے چپل اڑسی چادر ٹھیک سے اوڑھی اور طاق پر رکھا دسترخوان میں لپٹا پراٹھا لے کر اس میں گھی اور شکر ملا کر چوری بنائی۔ پھر اس چوری کو بغل میں دبا کر وہ دبے پاؤں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

سعید صاحب کا غصے کے مارے دماغ جھنجھلا اٹھا۔

وہ بھی جلدی سے بستر چھوڑ کر اُٹھے اور دبے پاؤں مہرو کا پیچھا کرنے لگے۔ مہرو نے کھیتوں کا راستہ پکڑا۔ ہر طرف ہو کا عالم سارا گاؤں خواب وخرگوش کے مزے لے رہا تھا یہاں تک کہ آوارہ کتے بھی جابجا سوئے ہوئے تھے مگر یہ حقیقی سکون سے نا آشنا دو افراد اپنی اپنی دھن اور آگ میں جلتے مگن سے چلے جارہے تھے۔ مہرو دریا کے پاس آ کر رک گئی۔

اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا دیکھ لیتی تو سعید صاحب ضرور اس کی نظروں میں آ جاتے۔

وہ کچھ دیر رکی اور پھر دریا کے پانی میں قدم رکھ دیئے۔

یہاں دریا کا پاٹ کم چوڑا تھا اور پانی بھی زیادہ گہرا نہیں بلکہ گھٹنوں گھٹنوں تھا۔

وہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سعید صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور دل پر چھریاں چلنے لگیں وہ سمجھ گئے ان کی بیوی ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آدھی رات کو اپنے کسی آشنا سے ملنے جارہی ہے۔

اس خیال نے اُن کو اتنا مشتعل کردیا کہ ان کا دل چاہنے لگا وہ مہرو کو پکڑ کر یہیں دریا میں دھکا دے دیں یا اس کو زندہ ہی زمین میں گاڑ دیں مگر وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے کیونکہ وہ دل وجان سے اس پر فدا تھے۔ ان کا دل مہرو کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کرنے پر بھی تیار تھا سو انہوں نے خود پر جبر کیا اور دریا پار کرلیا۔

دریا کے پار ایک بہت بڑا قبرستان تھا۔ مہرو کا رخ اسی کی جانب تھا وہ بھی اُس کے پیچھے ہولئے ان کا خیال تھا کہ وہ قبرستان میں جائے گی۔ مگر ایک بار پھر اس نے اُن کو غلط ثابت کردیا وہ قبرستان میں داخل ہونے کے بجائے اس کے باہر ایک بہت بڑے درخت کے نیچے جا کر کھڑی ہوگئی چاند کی دھیمی روشنی میں سعید صاحب نے دیکھا کہ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے کوئی بیٹھا ہے۔

مہرو کو دیکھ کر وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا وہ بھی اس کے برابر بیٹھ گئی اور چوری کا برتن کھول کر سامنے رکھ لیا۔

سعید صاحب سے یہ منظر برداشت نہ ہو پا رہا تھا ا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس شخص کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے دریا میں بہادیں، وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی لاڈلی بیوی کا کسی غیر مرد کے ساتھ تعلق ہوسکتا ہے۔

مہرو اس آدمی کو اپنے ہاتھوں سے چوری کھلا رہی تھی۔ حلیہ سے وہ آدمی فقیر لگتا تھا۔ ''فقیر کا بھیس لے کر یہ ایسے گل کھلا رہا ہے۔'' انہوں نے سوچا۔

سعید صاحب کو اپنی سوچوں پر کوئی اختیار نہ رہا۔

اُسے اتنی محبت سے چوری کھلاتے دیکھ کر اُن کا جذبہ رقابت ایسا بیدار ہوا کہ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ

کر چند قدم آگے بڑھے پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔ کچھ دیر یہ منظر دیکھتے رہے پھر پیچ و تاب کھاتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے، گھر آ کر بھی ان کو کسی کل چین نہ ملا وہ سونے کی اداکاری کرتے رہے حقیقتاً سو نہ پائے۔

صبح ہوئی مہرو اپنی روٹین کے مطابق مطمئن سی گھر کے کام کاج کرتی رہی، سعید صاحب کے دل میں اسے دیکھ دیکھ کر طرح طرح کے خیالات آتے رہے آج وہ کام پر بھی نہ جاسکے، خرابی طبیعت کا بہانہ کر دیا۔ وہ سارا دن وسوسے پالتے رہے سوچتے رہے، کڑھتے رہے، جب بھی وہ مہرو کی طرف دیکھتے انہیں یوں لگتا جیسے اس کے لبوں پر نامعلوم سی طنزیہ مسکراہٹ ثبت ہے۔ جسے محسوس کرتے ہی وہ بے چین ہو کر پہلو بدلتے مہرو نے جب اُن کی یہ حالت دیکھی تو جی جان سے اُن کی خدمت کرنے لگی۔ شادی کے بعد وہ آج پہلی دفعہ بیمار ہوئے تو مہرو نے اُن کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا۔

مہرو دراصل لے پالک تھی اس کے گھر والوں نے اسے کسی سے لے کر پالا تھا کبھی اس کو اس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ وہ کوئی غیر ہے ان کا خون نہیں ہے۔

جب یہ بات اُن کے ذہن میں آئی تو اُن کی بے لگام سوچیں کہاں سے کہاں نکل گئیں، وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

”ہو سکتا ہے مہرو کسی کے گناہ کا پھل ہو جو قسمت نے میری جھولی میں ڈال دیا ہے، ضرور یہ مہرو کے خون کا اثر ہے جو وہ میرے ساتھ دھوکہ کر رہی ہے راتوں کو بلا ناغہ اپنے آشنا سے ملنے جاتی ہے، جو کچھ بھی ہے میں اسے اپنے ساتھ یہ سب نہیں کرنے دے سکتا۔“

انہوں نے سوچ لیا کہ وہ مہرو کو قتل کر دیں کیونکہ وہ بے پناہ محبت کے باوجود ان کے جذبات اور مقدس رشتے کے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی ان کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو پر پہلو بدلنے لگے، سوچوں نے اُن کو ادھ موا کر دیا تو انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اُن کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

”اُف میرے خدایا تو مجھے کس گناہ کی سزا دے رہا ہے۔“ کئی بار انہوں نے ہاتھ نیفے میں اڑسے خنجر کی طرف بڑھایا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے خنجر پر ہاتھ رکھ کر جیسے ہی وہ مہرو کی طرف دیکھتے اُن کی محبت عود کر آتی سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا وہ پگھل کر پانی ہو جاتے، بے بسی سی بے بسی محسوس کر رہے تھے۔

بالآخر شام کے وقت وہ اٹھے اور مہرو سے کہا۔

”میں شہر جا رہا ہوں ڈاکٹر کو دکھانے، ہو سکتا لیٹ ہو جاؤں واپس نہ آسکوں تم دروازہ بند رکھنا ٹائم پر کھانا کھا کر سو جانا، مہرو نے اُن کو بہت روکا آج نہ جائیں رات کو وہ اکیلی رہ جائے گی۔ مگر اب اُن سے اِک پل بھی گھر میں رکا نہ جا رہا تھا۔ وہ مہرو کے لاکھ روکنے پر بھی نہ رکے اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

رات ہوتے ہی مہرو نے چوری بنا کر برتن میں ڈالی اور بڑی سی چادر اوڑھ کر گھر سے باہر نکلی۔ اس نے کھیتوں کی طرف قدم بڑھائے اور تیز تیز چلنے لگی۔ آج وہ جلدی جا کر لوٹ آنا چاہتی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی کھیتوں کو پار کر کے دریا کے کنارے پہنچی پھر دریا بھی پار کر کے قبرستان کے باہر بڑے پیڑ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

وہ آدمی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ مہرو اس کے پاس بیٹھ گئی اور چوری کا برتن کھول لیا۔ پہلا نوالہ مہرو نے اسے کھلایا۔ دوسرا اپنے منہ میں ڈال لیا۔ دفعتاً اس آدمی کو کھانسی کا دورہ سا پڑا، شاید کھانا حلق میں اٹک گیا تھا۔ مہرو جلدی سے پاس پڑا پیالہ اُٹھا کر دریا کی طرف پانی لینے کے لئے بھاگی۔

ایسے میں کوئی سایہ سا درخت سے کودا، رات کافی اندھیری تھی چاند اپنی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔

اس سائے کو دیکھ کر بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، اس سائے نے آناً فاناً تیز دھار آلے سے وار کیا اور اس کی گردن دھڑ سے جدا کر کے بھاگ کھڑا ہوا جیسے ہی مہرو واپس لوٹی سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

”اوہ۔“ مہرو کے منہ سے ایک زوردار آہ نما چیخ نکلی اور وہ بلند آواز میں رونے لگی۔ ساتھ ہی وہ اِدھر

اُدھر چکرانے لگی کہ شاید قاتل اس کو دکھ جائے وہ چیختی دھاڑتی رہی، قاتل کو تلاش کرتی رہی، مگر کوئی نہ ملا تھک ہار کر اس نے فریادی لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو خدا کے واسطے ایک بار میرے سامنے آؤ۔"

کوئی بھی سامنے نہ آیا۔

اس نے ایک بار پھر آواز بلند کی۔

"تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ ہے ایک بار میرے سامنے آؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی بس میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کون ہو، کوئی انسان جن ہو یا چڑیل ہو۔"

"خدا کے لئے ایک بار میرے سامنے آجاؤ۔"

وہ سسکتے ہوئے بین کرتی رہی ان دیکھے قاتل سے فریاد کرتی رہی۔ مہرو کی آہ و بکا اور فریادیں قبرستان اور آس پاس کے علاقے میں گونج کر ایسے خوف و ہراس پیدا کررہی تھیں جیسے کہ چڑیل یا بدروح چیخ رہی ہو۔

سعید صاحب مہرو کی یہ حالت دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر ڈر کر وہاں سے ایسے بھاگے کہ گھر آکر ہی دم لیا۔

مہرو کے رونے چلانے سے ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ تیز بخار نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ تصور کررہے تھے کہ مہرو کوئی انسان نہیں بلکہ غیر مرئی مخلوق ہے جو ایسی سنسان جگہ پر دہشت ناک انداز میں چیخ چیخ کر ان دیکھے دشمن کو للکار رہی تھی۔

نجانے کتنی دیر گزر جانے کے بعد مہرو ٹوٹی بکھری سی گھر پہنچی تو سعید صاحب بخار اور خوف سے لرز رہے تھے۔

☆......☆......☆

پھر زندگی نے ایک نئی کروٹ بدلی پندرہ سال گزر گئے کبھی مہرو نے گھر سے ایک قدم بھی باہر نہ نکالا، بچے بھی بڑے ہوگئے، سب کچھ ٹھیک ہوگیا، سعید صاحب بہت خوش اور مطمئن تھے۔

ایک روز سعید صاحب کو کسی چیز کی ضرورت پڑی تو انہوں نے بیٹھے بیٹھے مہرو کو آواز دی۔

"بھئی مہرو پچھلے اسٹور سے فلاں چیز تو لا دو۔"

مہرو نے جواباً دور سے ہانک لگائی۔

"نا بابا نا، اس وقت وہاں اندھیرا ہے مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

یہ سن کر سعید صاحب کے تن بدن میں غصے سے آگ بھڑک اٹھی۔ اتنے سالوں میں پہلی دفعہ وہ خود پر قابو نہ رکھ پائے اور طنز کرتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تمہیں ڈر نہیں لگتا تھا جب تم آدھی آدھی رت کو دریا پار کرکے قبرستان جاتی تھی۔"

یہ سننا تھا کہ مہرو کسی عفریت کی طرح ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی، غصے اور جذبات سے لال بھبوکا چہرہ لئے اس سے جیسے تیسے بن بڑا ہاتھ بلند کرکے پورے جسم کا زور لگا کر ایک ایسا تھپڑ سعید صاحب کے گال پر رسید کیا کہ وہ درد سے بلبلا اٹھے اور اپنی جگہ سے زمین پر لڑھک گئے۔

"یہ بات آج آپ کہہ رہے ہیں، جب ان باتوں کا وقت گزر گیا اس وقت آپ بات کرتے تو میں آپ کو بتاتی۔" مہرو نے غرا کر کہا پھر سعید صاحب کے چہرے پر بغور نظریں جما کر بولی۔

"وہ میرا باپ تھا۔"

یہ سننا تھا کہ سعید صاحب کو یوں لگا جیسے آسمان ان کے سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔

وہ اتنے شرمندہ ہوئے کہ شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ ان کے ذہن میں معافی کا خیال آرہا تھا مگر شرمندگی اتنی تھی کہ کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکل رہا تھا۔

مہرو نے ایک جملہ کہا۔

"میں نے آپ کو معاف کیا لیکن آپ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔"

پھر مہرو بھی کچھ ہی عرصے بعد خالق حقیقی سے جا ملی۔ مگر سعید صاحب کبھی اس تھپڑ کو بھلا نہ پائے کیونکہ مہرو کے اس تھپڑ کا نشان ہمیشہ ان کے گال پر ایسے ثبت رہا جیسے انہوں نے خود اس نشان کو اپنے گال پر کندہ کروایا ہو۔



قتل عمد

احسان الحق

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جرم کی جو فائلیں پولیس کے ریکارڈ میں دفن ہوجاتی ہیں انہیں دوبارہ کھلوانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں مگر جب دوبارہ فائل کھلی تو لوگ انگشت بدنداں رہ گئے اور پھر......

جرم وسزا کے موضوع پر......تہلکہ مچاتی اور حیرت کے زیر اثر......دلکش کہانی

وہ دونوں ایک ایسے کمرے میں موجود تھے جس کی دیواروں پر سفید رنگ کی ٹائلیں لگائی گئی تھیں۔ ان سفید رنگ کی ٹائلوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے یہ واحد کمرہ کوئی غسل خانہ ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ یہ کمرا غسل خانہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک تفتیشی کمرا تھا۔ اس سفید ٹائلوں والے کمرے میں صرف ایک دروازہ تھا۔ اس کی چھت دس فٹ اونچائی پر تھی۔ کوئی روشن دان نہ تھا جس سے ہوا کا گزر ہو سکے۔ ہاں البتہ کمرے کی چھت پر ایک چھوٹا سا ایگزاسٹ فین موجود تھا جس سے اندرونی فضا کی تلخ کردینے والی بدبو کو باہر خارج کرنے میں مدد مل رہی تھی۔ اسی کمرے کی دوسری دیوار کے نکڑ پر دوسرا چھوٹا سا پنکھا تھا جس کا کام یہ تھا کہ بیرونی ہوا کو کمرے تک متواتر پہنچاتا رہے۔ یوں کمرے میں حبس دم کی کیفیت نہ تھی۔

کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی میز دھری

تھی۔ اس میز کے آمنے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر ایک باوردی خاتون بیٹھی تھی جبکہ دوسری کرسی پر ایک بارہ سالہ لڑکا بیٹھا تھا۔ خاتون اپنے لباس سے پولیس والی دکھتی تھی جبکہ اُس کی میز کی دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھا لڑکا ٹی شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھا۔

"دیکھو لارسن!" اُس خاتون نے لڑکے کو مخاطب کیا۔ وہ یہ سن کر کپکپایا۔ اور پھر ایک جھٹکا لیتے ہوئے کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ یوں جیسے کسی نے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا دیا ہو۔

"جی۔ میں سن رہا ہوں، مسز کیلی۔" لڑکے لارسن نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔

"تم نے میرے سوال کا ہنوز کوئی جواب نہیں دیا لارسن!" کیلی نے بغور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ یوں کہتے ہوئے کیلی کے لہجے میں سختی عیاں تھی۔

"کون سا سوال...... کون سا جواب؟ مسز کیلی۔ میں بھول گیا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ مجھے بھولنے کی عادت ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے لارسن نے ایک جمائی لی اور اپنے سامنے رکھے لکڑی کے میز پر اپنے دونوں بازوؤں کے اوپر سر رکھ لیا۔ یوں جیسے وہ غنودگی کے عالم میں ہو۔

"لارسن! ہوش کرو۔" کیلی نے اس مرتبہ قدرے اونچی آواز میں چلا کر کہا تھا۔ اُس کے یوں چلانے پر لارسن دوبارہ جھٹکا کھاتے ہوئے کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ یوں تن کر کرسی پر بیٹھا تھا جیسے خوفزدہ بھی ہو۔

"کیا تم کافی پینا پسند کرو گے؟"

"جی! پلیز...... مجھے سردی لگ رہی ہے؟"

"یہ میری جیکٹ پہن لو۔ بلکہ ٹھہرو۔" یہ کہتے ہوئے کیلی قدرے دائیں جانب جھکی جہاں اُس کا آفس بیگ رکھا تھا۔ اُس نے بیگ سے ایک جیکٹ نکال کر لارسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے قد کاٹھ کے مطابق ہے۔ ہاں...... میرا خیال ہے کہ تمہیں یہی جیکٹ پہننی چاہیے۔"

جیکٹ دیکھتے ہی لارسن کی آنکھوں میں خوف اُتر آیا۔ اُس کی نظریں وحشت کے عالم میں اُس جیکٹ پر ثبت ہو چکی تھیں۔

"لیکن...... مسز کیلی......!!!" لارسن کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"لیکن کیا؟ لارسن!"

"یہ...... یہ...... یہ جیکٹ!" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں...... بولو!"

"یہ جیکٹ تو آپ کے بیٹے جیک کی ہے!"

لارسن نے بمشکل اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

"ہاں...... یہ جیکٹ میرے بیٹے...... میرے دل کے ٹکڑے...... میرے اکلوتے لاڈلے جیک کی جیکٹ ہے۔ اور جیک تمہارا کلاس فیلو اور بیسٹ فرینڈ تھا۔"

"لیکن...... مسز کیلی...... یہ جیکٹ میں کیسے پہن سکتا ہوں۔"

"ہاں...... یہ تم نے ٹھیک سوال کیا۔" کیلی نے اپنی کرسی پر اطمینان سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے دونوں بازوؤں کو باہم سمیٹ لیا۔ وہ اب یوں لارسن کو گھور رہی تھی جیسے اُس کے ردعمل پر غور کر رہی ہو۔ لارسن دوبارہ سے کپکپانے لگا تھا۔

"یہ جیکٹ فوری پہن لو، نہیں تو تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی اور ویسے بھی یہ جنوری کا مہینہ ہے۔ سردی معمول سے زیادہ ہے۔"

"جی میڈم!......" لارسن نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ جیکٹ کو چھوا لیکن دوبارہ جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے اندر اتنی قوت نہیں ہے۔ لاؤ! میں یہ جیکٹ تمہیں پہنا دیتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے کیلی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن لارسن نے اُس کے اُٹھتے ہی فوری وہ جیکٹ اپنے جسم پر پہن لی تھی۔

"بٹن بند کر لو۔ اور زپ چڑھا لو۔"

''ہاں...... یہی واحد طریقہ ہے سردی روکنے کا...... مجھے کافی کا ایک کپ ملے گا؟'' لارسن نے ملتجایانہ نگاہوں سے کیلی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو کیلی نے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی دروازہ دوبارہ مقفل کردیا۔

لارسن کو دروازہ کھلتے ہی بیرونی سرد برفانی ہوا کے تھپیڑے نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باہر بہت زیادہ ٹھنڈ تھی اور موسم بھی سردی کا تھا۔ باہر یقیناً برف پڑی تھی۔

تھوڑی توقف کے بعد کیلی واپس آچکی تھی اور اس کے ہاتھوں میں دو کپ تھے جن سے دھواں دار کافی کی مہک پورے ٹائلوں والے اس کمرے کو مہکا کر رکھ گئی۔''

لارسن نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کپ کو یوں تھاما جیسے اُسے کافی اپنے حلق میں انڈیلنے سے زیادہ اُس کپ کی گرمی کی حدت سے غرض ہو۔

''پیو اب...... پیتے کیوں نہیں۔'' کیلی نے نفرت انگیز نگاہیں اس مرتبہ لارسن پر گاڑھ دیں۔

''کافی کا کپ گرم ہے۔ میرے ہاتھوں کو سکون محسوس ہورہا ہے مسز کیلی۔''

''کافی پیو اور پرسکون رہو۔ اسے پینے پر تمہارے پورے وجود کو سکون حاصل ہوگا۔''

''کیا باہر برف پڑی ہے؟''

''ہاں!...... کیوں؟''

''جب آپ نے دروازہ کھولا تھا تو بہت سخت سردی کمرے میں آئی تھی۔''

''ہاں۔ برف کل پڑی تھی۔ لیکن آج صرف جمی ہوئی برف ہے۔ البتہ سخت ٹھنڈ ہے باہر کیونکہ ہوا کا زور ہے اور تمہیں تو معلوم ہے کہ جب جمی ہوئی برف کے اوپر تیز ہوائیں چلتی ہیں تو انسانی جسم کو چیر کر رکھ دیتی ہیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' لارسن نے یہ کہتے ہوئے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ کافی کا گھونٹ بھرتے ہی اُسے زوردار کھانسی کا دورہ پڑا۔ کھانستے ہوئے وہ نڈھال سا ہوگیا۔ جبکہ کیلی اُسے بغور دیکھتی رہی۔ جب لارسن کو کھانستے کھانستے قدرے اضافہ محسوس ہوا تو کیلی نے اُس سے نرمی سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا کافی تیز ہے؟''

''نہیں تو......'' وہ اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر اپنے منہ کے آگے رکھتے ہوئے بولا تھا۔ ''میرا گلا خشک تھا۔ شاید اس لئے کافی پیتے ہی کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔'' اُس نے اپنی سی توجیح پیش کی۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ اب تو تم بات کرنے کے قابل ہوگئے ہو۔ مجھے بتاؤ کیا تم نے کوئی نشہ تو نہیں کر رکھا؟'' کیلی نے روایتی پولیس آفیسر کی طرح تفتیشی انداز میں سوال کیا۔

''نہیں مسز کیلی! میں نشہ نہیں کرتا۔''

''لیکن جیک نے مجھے بتایا تھا کہ تم اسکول کی عقبی دیوار سے ٹیک لگا کر سگریٹ پی رہے تھے۔''

یہ سن کر لارسن کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو یک دم دھواں بن کر اُڑ گئی۔

''دراصل ایک بار میں نے ڈیڈی کے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال لیا تھا۔ شاید یہ اُسی دن کی بات ہے جب میں اسکول کی عقبی دیوار سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور اچانک مجھے تلاش کرتا ہوا آپ کا بیٹا جیک وہاں آن پہنچا۔ اُس دن کے بعد سے آج تک میں نے دوبارہ کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا مسز کیلی۔''

''اونہو...... تم کہتے ہو تو میں مان لیتی ہوں لارسن!''

''سچ میں مسز کیلی! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس دن کے بعد سے میں نے کبھی سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'' پھر وہ یہ کہہ کر خوفزدہ انداز میں کپکپایا اور تیزی سے کیلی سے مخاطب ہوا۔

''برائے کرم! یہ سگریٹ والی بات میرے ڈیڈی کو مت بتایئے گا۔ ورنہ وہ میرے اوپر پابندیاں عائد کردیں

گے۔ پلیز، مسز کیلی!" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا تھا۔

کیلی نے اُسے یک ٹک دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اور نہایت سنجیدگی کے عالم میں ایک سوال اُس پر مزید داغ دیا۔

"اُس دن کیا ہوا تھا؟ لارسن۔" کیلی کی جانب سے یہ سوال عین متوقع تھا۔ لارسن کو معلوم تھا کہ وہ زیر تفتیش ہے اور اس وقت پولیس کی حراست میں ہے۔ لیکن اُس کا دماغ اتنا بھی ماؤف نہیں تھا کہ اُسے چند ہفتوں قبل کے واقعات یاد نہ رہے ہوں۔

لارسن کو بخوبی یاد تھا کہ اُس دن اسکول میں کیا ہوا تھا۔ جیک اور وہ دونوں بہترین دوست تھے۔ دوست ہی نہیں، بلکہ جب سے جیک اور لارسن نے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے گھروں میں رہتے تھے۔ گویا وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمسایہ بھی تھے۔ دونوں ہم عمر تھے۔ ایک ہی اسکول میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ جیک مسز کیلی کا بیٹا تھا جو مقامی پولیس کی معروف انسپکٹر تھی۔ تفتیشی ٹیم کا حصہ تھی۔ لیکن جب وہ واقعہ پیش آیا جس میں جیک کی جان چلی گئی تھی تب مسز کیلی ذہنی طور پر غیر حاضر دماغ ہونے کی وجہ سے پولیس سروس سے ریٹائرمنٹ لے چکی تھی۔ شاید عارضی طور پر چھٹیوں پر رہی ہو۔ اس کا قطعی علم تو کسی کو نہ تھا لیکن وہ گھر پر ہی ہوا کرتی تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے جیک کے جنازے پر اُسے آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ غم وسوگ کی وجہ سے وہ اپنے گھر میں گویا بند ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک حساس ماں تھی۔ جیک کا باپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ وہ بدقسمتی سے فیکٹری میں بھڑکی آگ کی نذر ہو گیا تھا۔ سب تقدیر کا کھیل تھا۔ اُس وقت جیک صرف چار سال کا بچہ تھا۔ کیلی پڑھی لکھی جوان اور چست عورت تھی۔ اُس نے اپنے بیٹے کو اپنی منزل مقصود سمجھ لیا اور از سرِ نو شادی کرنے کے بجائے پولیس کی ملازمت قبول کر لی تھی۔ وہ جیک کے مستقبل کے لئے ہر سو فکر مند تھی۔ اُس کے لئے اب دو ہی منزلیں تھیں۔ زندگی کے دو مقاصد۔ پولیس کی نوکری اور جیک کا روشن مستقبل، لیکن بدنصیبی کے عفریت نے گویا اس مختصر چھوٹے سے خاندان کا دروازہ دیکھ لیا تھا۔ بدنصیبی کا عفریت چند ہفتے قبل دوبارہ سے اس گھر کے دروازے پر اپنا بھرپور زہر اُگل گیا تھا۔ یہ زہر جیک کی موت کی صورت میں تھا۔ جو کیلی جیسی بہادر لیکن حساس عورت کو اپنی زندگی میں دوبارہ سے پینا پڑا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لئے قطعی تیار نہ تھی۔

حادثے رونما ہوتے ہیں۔ کون اُن کے لئے تیار ہوتا ہے؟...... کوئی بھی تو نہیں۔ ورنہ حادثہ، حادثہ کیوں کہلوائے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کب، کیا ہو جائے۔ بس یہی کیلی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ چند ہفتوں قبل!

جیک کی موت نے کیلی کی زندگی میں گویا ایک سکوت پیدا کر دیا تھا۔ ایک تاریکی! ایک خاموشی! ایک کلی تنہائی کا احساس! وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اپنے ہی قلب کے حصار میں کہیں گم سم اُسے اب سامنے کوئی منزل دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایک گھپ اندھیرا۔ ایک تاریکی۔

پولیس محکمے والوں نے اُسے سروس سے علیحدہ اپنے آپ میں واپس آنے تک گھر بھجوا دیا تھا۔ لوگوں کی رائے تھی کہ اب شاید کیلی زندگی بھر کوئی کام نہ کر سکے گی۔

یہ کیس بھی اب مسٹر ڈیوڈ کے پاس منتقل ہو چکا تھا۔ ڈیوڈ پولیس کا منجھا ہوا سراغ رساں بھی تھا اور ایسے کیسز میں بیسیوں مرتبہ اُسے تفتیشی آفیسر کے فرائض سونپے گئے تھے۔ بہت سے کیسز کو اُس نے خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ لیکن یہ کیس اُلجھا ہوا تھا۔ یہاں معاملہ اسکول کے بچوں کا تھا۔ اور سارا کیس ایک حادثہ دکھائی دیتا تھا۔ اور کب، کس کے ساتھ، کیا حادثہ پیش آ جائے؟ کون کیا کہہ سکتا ہے؟ حادثے تو زندگی میں رونما ہوتے ہی رہتے ہیں، ان حادثات پر کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کسی کو قاتل نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قتل تو قتل عمد ہوتا ہے۔ حادثے اور قتل میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حادثہ، قتل نہیں ہوتا۔ اسی طرح قتل، حادثہ نہیں ہوتا۔

بہرحال! حادثہ قرار دے کر ڈیوڈ نے اس کیس کو

کلوز کر دیا تھا۔ کیس کی فائل بند ہوگئی تھی۔ کوئی مجرم قرار نہ پاسکا۔ حادثے میں جیک کو مرنا تھا سو وہ مر گیا۔ اُس کی ایسے ہی لکھی تھی۔ ڈیوڈ کے پاس تمام ثبوت و شواہد کی روشنی میں اسی طرح سے اس کیس کا اختتام ممکن تھا۔ کیس ختم ہو چکا تھا۔ اسکول کے چند لڑکوں، کلاس ٹیچر، پرنسپل اور سیکورٹی گارڈز کو شامل تفتیش کرنے کے بعد اور حتمی نتیجے پر پہنچ کر فائل کو ہمیشہ کے لئے پولیس ریکارڈز کے قبرستان میں سپرد ریکارڈ کر دیا گیا تھا۔ اور اب بات آئی گئی ہوگئی تھی۔

لیکن کیلی کے لئے یہ بات آئی گئی بات نہ تھی۔ وہ اپنے کھنڈر جیسے ویران دل میں گویا گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ محض ایک حادثاتی موت تھی۔ وہ اس فائل کو دوبارہ سے کھلوانا چاہتی تھی۔ لیکن ایسی فائلیں ایک مرتبہ بند ہو جانے کے بعد دوبارہ سے کھلوالینا کوئی بچوں کا کام نہ تھا۔ عموماً جو فائلیں پولیس کے ریکارڈ روم میں دفن ہو جایا کرتی ہیں، اُن کیسز کو یا تو Solved سمجھا جاتا تھا اور یا پھر X-files یعنی ایسے کیسز جن کا معمہ ابھی تک حل طلب تھا یا پھر مافوق الفطرت وجوہات کی بنا پر Unsolved کیسز۔ شاید اب کیلی نے ہوش میں آتے ہی اپنے بیٹے کی موت کے اس معمے کو حل کرنے کی ٹھان لی تھی اور شاید اسی لئے کیلی کے سامنے لارنس کو دوبارہ تفتیش کے لئے بیٹھنا پڑ گیا تھا۔

"اس دن کیا ہوا تھا، لارنس؟"

کیلی نے لارنس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوبارہ سوال کیا۔

"میں اسکول میں تھا۔" لارنس نے اپنے سر پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے بات کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن پر بھرپور دباؤ ڈالنا پڑ رہا ہو۔ وہ بوجھل آواز میں بات کر رہا تھا۔

"میں اور جانسن دونوں اکٹھے تھے۔"

"جانسن کون ہے؟" کیلی نے دریافت کیا۔

"یہ ہماری کلاس میں نیا لڑکا آیا تھا۔ کوئی دس دن قبل ہی آیا تھا، میڈم کیلی۔" لارنس نے وضاحت کی۔

"وہ پچھلے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ کیون والوں نے اسے اسکول میں ساتویں کلاس میں داخلہ دے دیا۔ وہ لڑکا بہت شریر مزاج کا لڑکا تھا۔ اپنی عمر سے زیادہ بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔"

"پچھلے اسکول سے کیوں نکالا گیا تھا وہ؟" کیلی نے اپنی آنکھوں کے زاویے کو تنگ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس نے پچھلے اسکول میں اپنی ٹیچر کے پیٹ میں مکا دے مارا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ کلاس میں سگریٹ پی رہا تھا۔ میڈم جولیا جو اس کی کلاس ٹیچر تھیں، انہوں نے جانسن کو ایسا کرنے سے روکا تو جانسن نے طیش میں آ کر انہیں مکا رسید کر دیا۔"

"اور یہ سب تمہیں جانسن نے خود بتایا تھا؟"

"جی میڈم کیلی۔"

"اور اُس نے تمہیں اپنے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ اُسے انسانوں کو تنگ کرنے میں خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ صرف دسویں تک تعلیم حاصل کرے گا اور پھر وہ جب اپنے قدموں پر جم جائے گا تو زندگی میں......" یہ کہہ کر لارنس خاموش ہو گیا۔

"ہاں، ہاں...... بولو......" کیلی نے پر تجسس انداز میں سوال کیا۔

"لیکن یہ راز ہے۔ اس نے منع کیا تھا کہ یہ راز وہ صرف مجھے بتا رہا ہے۔ کسی اور کو میں نہ بتاؤں ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"دیکھو لارنس، تم اس وقت بالکل محفوظ ہو۔ اور یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی فرد موجود نہیں ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بولو...... اُس نے کیا کہا تھا؟"

کیلی کے یوں تسلی دلانے پر لارنس نے کافی سے بھرے کپ میں سے ایک بھرپور گھونٹ منہ میں انڈیلا۔

کافی کا بھرپور گھونٹ انڈیلنے پر اُسے دوبارہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ کافی دیر تک یونہی کھانستا رہا جبکہ کیلی اُسے بغور گھورتی رہی۔ پھر لارسن نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''اُس نے کہا تھا کہ میں دسویں جماعت سے فارغ ہو کر کرائے کا قاتل بنوں گا اور سب سے پہلے اپنے اسکول کے ٹیچر کو قتل کروں گا۔''

''بہت سائیکو کیس ہے یہ جانسن!''

''نہیں کیلی میڈم۔ وہ بہت ذہین لڑکا ہے! اُس کی سوچ باقیوں سے مختلف ہے۔''

''ہر مجرم ذہین ہی ہوتا ہے۔'' کیلی نے اپنے پیشے سے متعلق یہ گھسا پٹا سا جملہ ادا کیا۔ لارسن نے اُس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔

''اُس دن تم اور جانسن ملے تھے۔ اس سے آگے کیا ہوا تھا۔'' کیلی نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے دوبارہ سوال کیا۔ ہم دونوں نے آدھی چھٹی کا پلان بنایا تھا۔''

''کیسا پلان؟''

''ہم نے یہ منصوبہ بنایا کہ میں اور لارسن سیکورٹی گارڈ کی گن چوری کریں گے۔''

''اچھا؟ پھر؟'' اب کیلی لارسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سنجیدگی سے اُسے بغور سن رہی تھی۔ وہ بولتا رہا۔

''آدھی چھٹی ہوگئی۔ میں نے آپ کے بیٹے جیک سے یہ منصوبہ بیان کیا تو وہ کہنے لگا۔''

''دیکھو لارسن۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا۔ یہ جانسن خطرناک لڑکا ہے اور پچھلے اسکول سے ہی اس لڑکے کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس کے متعلق کسی کی رائے مثبت نہیں ہے۔ اس کی ماں بھی کوئی اچھی عورت نہیں۔ سنا ہے اُس نے اپنے یار سے شادی کر لی ہے اور اس کے باپ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔''

''تم دونوں کس کی ماں کے متعلق باتیں کر رہے ہو؟'' اچانک پیچھے سے جانسن ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ یقیناً اُس نے جیک کے الفاظ سن لئے تھے۔

''کسی کی ماں کی بات نہیں ہو رہی، ہم تو یوں ہی یوم ماں کے متعلق بات کر رہے تھے۔

''یوم ماں! یعنی مدرز ڈے۔''

''ہاں! مدرز ڈے۔'' میں نے جانسن کو جواب دیا اور اشارے سے جیک کو خاموش رہنے کو کہا۔ جیک ناک منہ چڑھا کر خاموش رہا۔ اُسے جانسن بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ جانسن نے فوری کہا۔

''تم لوگ قبل از مسیح کی دنیا میں رہتے ہو۔'' یہ کہہ کر اُس نے شیطانی قہقہہ لگایا۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی ابلیسی ہنسی ہنستا رہا۔ ہم دونوں اُس کے ان دیوانہ وار قہقہوں کو سنتے رہے۔ ''ابے سالو! کیا بچوں کی طرح ماں ماں اور یوم ماں منانے کے پلان بناتے ہو۔ جو تمہاری عمر ہے۔ اُس عمر کے مطابق منصوبے بنایا کرو۔ اب دیکھو! آج میں اپنی ماں کے زیرنگیں ہوں۔ وہ اپنے یار کے ساتھ گل چھرے اُڑا رہی ہے۔ اور جب میں جوان ہو جاؤں گا تو میں اپنی ماں کے سامنے گل چھرے اُڑا کر اُسے اُسی طرح دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دوں گا جیسا کہ اُس نے میرے سگے باپ کو لاتیں گھونسے مار کر گھر سے نکالا تھا۔ میں ایک رکھیل لاؤں گا جس طرح وہ اپنا یار لائی ہے آج۔'' یہ کہہ کر وہ ہم دونوں کی جانب ابلیسی نگاہوں سے دیکھنے لگ گیا تھا۔ جیک کو اُس کی ان باتوں پر تاب نہ رہی تھی۔ وہ باقاعدہ لال سرخ ہو چکا تھا اور غصے کے عالم میں جانسن کو دشنام طرازی کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

''تم ہو ہی ابلیس کے چیلے۔ غنڈے۔ بدمعاش......'' جانسن یہ سب سن کر آگ بگولا ہو گیا اور جیک کی طرف غصے سے لپکا۔ لیکن میں نے جانسن کو فوری بغل گیر ہو کر جیک کو چیختے ہوئے کہا تھا۔ ''خدا کے واسطے جیک۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' جیک جاتے ہوئے مجھے کوستا ہوا چلا گیا تھا۔ اُس کے آخری جملے ابھی بھی مجھے یاد ہیں۔ اُس نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

''ہاں......ہاں......میں جاتا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا

لارنس! تمہیں یہ لڑکا بالکل اپنے جیسا بنا ڈالے گا۔ تم بھی اسی جیسے شیطان بن جاؤ گے اور ایک دن بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔"

"ابے جا منہ گول کر اپنا۔ مہاتما گوتم بدھ کی اولاد......" جانسن نے جیک کو بھاری سی گالی دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہوا جاتا تھا۔

"ہونہہ! پھر کیا ہوا۔" کیلی نے لارنس سے دریافت کیا۔ لارنس یہ سب واقعات بتاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیلی کے یوں بیچ میں مداخلت کرنے پر گویا وہ چونک سا گیا تھا۔

"میڈم! جیک ایک بہترین دوست تھا میرا۔ آپ کا بیٹا بہت شریف النفس لڑکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں۔ میرے دل میں جانسن کی محبت میں رہ رہ کر شیطان نے جگہ بنالی تھی۔ جانسن مجھے بھا گیا تھا اور جیک سے میرے فاصلے بڑھ گئے تھے۔ یہ کہہ کر لارنس نے ایک بلغمی کھانسی کی۔ اس مرتبہ اُس کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سے اپنا گلا تھام لیا تھا۔ شاید اُس کے حلق میں کھانسی کی بدولت شدید تکلیف کا سا احساس ہوا تھا۔ ساتھ میں کھانستے ہوئے اُس نے اس نشست میں پہلی مرتبہ خون بھی تھوکا تھا۔

"کیا تم بیمار ہو، لارنس؟" کیلی نے لارنس کے منہ سے خون برآمد ہوتے دیکھ کر سوال کیا۔ لارنس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ پر لگے خون کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں خوف کی وجہ سے پھیلنے لگیں۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "نہیں تو میڈم کیلی۔ میں تو ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی مرض لاحق نہیں۔"

"تو پھر یہ خون کیسا ہے؟" کیلی نے ہنوز خون کی طرف گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں نہیں جانتا، میم!" لارنس نے بے چارگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ وہ سہما ہوا تھا۔

"کیا تم نے کوئی نشہ آور اشیاء کا استعمال کیا ہے، لارنس؟"

"نہیں میم! میں بتا چکا ہوں کہ زندگی میں، میں نے کبھی نشہ نہیں کیا۔"

"پھر ہوسکتا ہے کہ یہ اس خشک سردی کی وجہ سے ہو رہا ہو، کافی پیو!" کیلی نے میز پر رکھے لارنس کے سامنے کافی مگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! میم! ہوسکتا ہے کہ اس خشک ٹھنڈک کی بدولت انفیکشن ہو گیا ہو۔" لارنس کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا تھا۔ وہ اپنے منہ سے نکلتے خون کی وجہ سے اب کافی فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔

"آگے بولو...... آگے کیا ہوا تھا۔" کیلی نے دوبارہ سے مطلب کی بات پر آتے ہوئے دریافت کیا۔

تب لارنس دوبارہ اُس ماضی کی طرف لوٹ گیا جس کے خیالوں میں چند ساعتیں قبل وہ واقعات کی لڑیاں جوڑتے ہوئے جیک کی موت کے متعلق بیان دے رہا تھا۔

"پھر جانسن اور میں، ہم دونوں نے سیکورٹی گارڈ کی گن ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔ جانسن نے مجھے ایک بات بتائی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ انسانی جسم خون کی کتاب ہوتا ہے۔"

"خون کی کتاب!" میں نے حیرت کے عالم میں جانسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! خون کی کتاب!...... جہاں سے بھی انسانی جسم کھول دو۔ وہیں سے خون بہنے لگتا ہے۔"

"واہ! تم تو فلسفی ہو۔"

"فلسفی نہیں ہوں۔ مستقبل کا قاتل ہوں۔" اُس نے اپنی ایک آنکھ جھپکتے ہوئے کہا۔

"تو تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی انسان کو مار ڈالنا مشکل کام نہیں۔۔"

"نہیں...... نہیں...... جانسن۔ یہ غلط ہے۔ کسی بے گناہ کی جان لینا۔ وہ بھی بغیر وجہ کے۔ یہ جرم ہے۔"

"ارے بقراط کے ماموں! میں یہاں تجھ سے قانون کے اوپر درس لینے کے لئے نہیں کھڑا۔" وہ ناراض ہو کر بولا۔

”میں ایسا نہیں کرسکتا۔“ میں نے اُسے صاف انکار کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اتنی آسانی سے اُس کے رنگ میں نہیں رنگوں گا۔ پھر ہم میں دوستی یاری کی باتیں شروع ہوگئی تھیں لیکن ازراہِ تخیل گن مین سے اُس کی گن ہتھیانے کا منصوبہ ابھی بھی دونوں کے مابین برقرار تھا۔ جانسن کی پلاننگ یہ تھی کہ وہ اسکول کے چوکیدار کو باتوں میں لگائے گا۔ باتوں کے فن کا وہ یوں بھی دھنی تھا۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ مسٹر رچرڈ چوکیدار باقی تمام گارڈز سے زیادہ رحم دل اور خوش اخلاق تھا۔ لہٰذا اس شریر منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جانسن نے اُس شریف آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ اور میں اُس کے منصوبے کا ساتھی تھا۔

باتوں ہی باتوں میں جانسن نے رچرڈ سے دریافت کیا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ اگر اس گن میں گولی بھرنی ہو تو کس طرح بھرتے ہیں۔“

رچرڈ نے احتیاط سے گن میں میگزین لوڈ کیا۔ یہ آٹومیٹک گن تھی۔ وزن میں بھی ہلکی اور پھر جانسن نے پوچھا۔ ”تو کیا اب فائر کریں تو گولی چل جائے گی؟“

”نہیں۔ یہ کلپر آن کرنا ہوگا۔“ اُس نے کلپر کی طرف اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”اور پھر گن چل جائے گی؟“

”ہاں۔ اسے آن لاک کرنے پر فائر کیا جاسکتا ہے!“ رچرڈ نے چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجاتے ہوئے اُسے بتایا۔

”رچرڈ! یہ گن مجھے دے دو۔“ اچانک جانسن نے طے شدہ منصوبے کے عین مطابق رچرڈ سے بگڑے تیور بناتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ تم بچے ہو۔“ رچرڈ نے برا سا منہ بنا کر اپنی گن کو کاندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔ میں نہیں بلکہ تم بچے ہو۔“ جانسن ایک دم آگ بگولا ہوگیا۔ رچرڈ ابھی کوئی جواب دیتا کہ منصوبے کے مطابق میں نے ایک اینٹ ہاتھ میں تھام کر ایک زوردار ضرب رچرڈ کی کمر پر لگا ڈالی۔

درد کی ٹیس کی بدولت وہ لڑکھڑایا تھا کہ اسی آن میں جانسن نے اُس کے دونوں ٹانگوں کے بیچ میں زوردار لات دے ماری۔ رچرڈ کراہتے ہوئے دوہرا چوہرا ہوتا زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ لیکن جانسن نے اگلے ہی لمحے بلا تاخیر اُس کے منہ پر پے در پے تین گھونسے رسید کردیئے اور یوں رچرڈ اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔ میرا وجود جانسن کی اِن بے ساختگیوں کو دیکھ کر کانپ رہا تھا۔ وہاں ہم تینوں تھے۔ سامنے اسکول کا کھلا وسیع میدان تھا۔ دوسرے گارڈ کا فاصلہ ہم سے پانچ سو فٹ تھا۔ اُس نے گڑبڑ ہوتے دیکھ لی تھی۔ وہ اِسی جانب بھاگا چلا آرہا تھا۔ اُس کے منہ میں سیٹی دبی ہوئی تھی جس سے وہ اوروں کو خبردار بھی کررہا تھا۔ ساتھ میں اپنے شانے پر دھرے وائرلیس سے مدد بھی مانگ رہا تھا۔ لیکن اب دیر ہوچکی تھی۔ جانسن نے گن اپنے ہاتھ میں لیتے ہی کلپر ان لاک کردیا تھا۔ اُس نے رچرڈ کی بغلی جیب سے مزید گولیوں کے میگزین نکال لئے تھے۔ گن کا رُخ آسمان کی جانب کرکے اُس نے فائر بٹن پر اپنی اُنگلی کا دباؤ بڑھایا تو دھماکوں کی آواز کے ساتھ کئی فائر ہوئے۔

لڑکے جو میدان میں کھیل رہے تھے وہ خوفزدہ ہوگئے۔ اور ایک عجب نوع کی بھگدڑ شروع ہوگئی۔ ہر کوئی خوف وڈر کے مارے ایک دوسرے سے ٹکراتا ہوا گرتا پڑتا، اِدھر اُدھر بھاگنے لگ گیا تھا۔ بہت سے بچے گارڈ سے ٹکرائے تھے جو ہم سے اب تین ساڑھے تین سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اس طرح سے بچوں کے ٹکرانے پر اپنے قدموں پر جما نہ رہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ عجیب قیامت خیز منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ جانسن دیوانہ وار قہقہے مارتا ہوا ایک کے بعد دوسرا میگزین ڈال کر ہوائی فائرنگ کرتا رہا اور ان سب بچوں کی بدحواسی دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا۔

”چل یار! اب تو بھی دیکھ لے کہ گن چلانے کا کیا مزا ہوتا ہے!“ اُس نے گن میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میرا حلق خشک ہوچکا تھا اور تھوک نام کی کوئی شے زبان پر نہ تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ گن

پکڑلی۔ اور آسمان کی طرف رخ کرتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔ یکے بعد دیگرے کئی دھماکوں کی آوازیں اُبھریں اور فضا شور سے بھر گئی۔ دوسری جانب بچوں کی چیخ وپکار میں پھر سے اضافہ ہوگیا۔

پھر نہ جانے اُن بچوں میں سے جیک ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ غصے سے مجھے اور جانسن کو گھورنے میں محو تھا۔ اُس کے غصے میں شدید احتجاج تھا۔ وہ احتجاج صرف میرے لئے تھا۔ میں اُس کے بچپن کا دوست تھا۔ لیکن اب گمراہ ہورہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں جانسن کی بری صحبت میں رہ کر اُس جیسا بنوں۔

"ابے رک کیوں گیا بزدل! مزید فائر کر آسمان کی طرف گن کا رُخ کرکے ابھی تو شو شروع ہوا ہے۔"

یہ جانسن تھا جو مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ شیطانی مسکراہٹ لبوں پر سجائے مجھ سے مخاطب تھا وہ اس سارے بھگدڑ اور شور شرابے سے محظوظ ہورہا تھا۔ میں نے دوبارہ ٹریگر پر اپنی انگلی رکھی ہی تھی کہ عقب سے کسی نے میرے زوردار ٹھوکر رسید کی۔ اُس ٹھوکر کی وجہ سے میرے ہاتھ میں پکڑی گن کا رُخ اب سیدھا ہوگیا۔ چند دھماکوں کی آوازیں اُبھریں اور سامنے کھڑے جیک کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ جانسن نے بھی ایک ہولناک چیخ ماری تھی۔ گولیاں اُس کی بھی ٹانگ پر لگی تھیں۔ اور ایک گولی میری بھی ٹانگ میں گھس گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوگیا کہ ٹھوکر رسید کرنے والا بھی گن کی گولیوں کی وجہ سے ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ رچرڈ تھا۔ وہی گارڈ جس سے زدوکوب کرکے ہم دونوں نے یہ گن ہتھیائی تھی۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں میڈم کیلی! کہ یہ محض حادثہ تھا۔ ہم نے دانستہ قتل نہیں کیا تھا جیک کا۔ اور جانسن زخموں کی تاب نہ لا کر ہلاک ہوا۔ ساتھ میں اسکول کے بچے بھی زخمی ہوگئے تھے۔ رچرڈ بھی خون بہہ جانے کی وجہ سے ہلاک ہوا تھا۔ لیکن یہ قتل وغارت گری ہمارا اصل مقصود نہ تھا۔ ہم تو محض شغل کررہے تھے میم۔

لیکن اُس ایک واقعے نے میری زندگی کے رہے سہے دن غارت کردیئے۔ میڈم کیلی! میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ سے جانسن سے، رچرڈ سے اور جیک سے!"

یہ کہتے ہوئے لارسن کو دوبارہ کھانسی کا دورہ پڑگیا لیکن اس مرتبہ اُس نے خون کی ایک بھرپور قے کی۔

کیلی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس نے بیرونی دروازہ مکمل کھول دیا اور اُس سے باہر نکل آئی۔ ہوا کا چیرتا ہوا جھونکا لارسن کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

کیلی نے باہر نکل کر اس ایک کمرے کے کیبن کے عقب کی طرف جاتے ہوئے چیخ کر کسی کو مخاطب کیا۔ وہ شخص ہاتھوں میں بیلچہ تھامے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ہاں کیلی؟ کچھ معلوم ہوا؟"

یہ پولیس محکمے کا منجھا ہوا سراغ رساں ڈیوڈ تھا۔

"سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔"

"ویری گڈ۔" ڈیوڈ نے پرجوش انداز میں کہا۔

اُس سے پوچھا۔ "کیا تم نے قبر کھود ڈالی ہے۔"

کیلی نے "کہا! میں نے اپنا کام فارغ کردیا ہے۔"

ڈیوڈ نے جواب دیا تو کیلی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بس یہ حرام زادہ بھی چند ساعتوں کا مہمان ہے۔ جب ٹھنڈا ہوجائے تو آگے تمہیں معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے۔" کیلی نے یہ کہا اور قریب کھڑی پولیس کی گاڑی کی طرف روانہ ہوگئی۔

"تمہارے لئے یہ بھی کردوں گا ڈارلنگ بس! اب تم بھی غصہ تھوک دو۔ اور ٹھنڈی پڑجاؤ۔ ہمارا مستقبل روشن ہے۔" ڈیوڈ نے چیخ کر کہا تھا۔

یہ سن کر کیلی نے ایک دلکش مسکراہٹ ڈیوڈ کی جانب سپرد کی جس پر ڈیوڈ بھی مسکراتا ہوا کیبن میں داخل ہوگیا جہاں لارسن کی ٹھنڈی یخ بستہ لاش اپنی آخری رسومات کی منتظر تھی۔

اسرار

محمد خالد شاہان۔صادق آباد

قسط نمبر 6

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کرے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

وہ میری بات سن کر غرایا۔مگر میں ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔وہ پھنکار کر بولا۔"تو میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا دیکھ اب اپنا حشر تجھے میں کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار کراتا ہوں کہ تیرے گھر والوں کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔"

"تیرے منہ میں خاک۔" میں نے دانت بھینچ کر کہا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر اسے کھینچ مارا۔پتھر سیدھا اس کی پشت پر لگا۔اور وہ چیختا چلاتا ہوا جھاڑیوں کی طرف دوڑا۔ اور میں اس کے پیچھے بھاگا اور ایک اور پتھر دے مارا اس بار پتھر اس کے سر پر لگا وہ دوڑتے دوڑتے گرا تو میں نے ایک مضبوط موٹی سی شاخ اٹھالی اور بری طرح اسے پیٹنے لگا میں جانتا تھا کہ وہ مجھے صرف ڈرا اور دھمکا سکتا تھا اور بس۔موٹی ٹہنی کی ضربات نے اسے نڈھال کردیا وہ بری طرح زمین پر لوٹ پوٹ ہوکر تڑپنے لگا اس کے بعد ٹھنڈا ہوگیا۔میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو بھالی کا مکروہ چہرہ غائب ہوچکا تھا اب اس کی جگہ ایک جنگلی بچھو کا چہرہ نظر آرہا تھا میں سمجھ گیا کہ بھالی کی بدروح نے اس جانور کا بہروپ بھرا تھا۔

میں ٹہنی پھینک کر گھر کی طرف چل پڑا۔میرے ذہن میں بار بار بھالی کی دھمکی گونج رہی تھی۔اچانک مجھے عثمان کے دوست فرید کا خیال آیا جو اس کا جوڑی دار تھا۔ مگر مجھے قاسم والا تلخ تجربہ ہوچکا تھا اس لئے میں نے فرید سے ملنے کا ارادہ ترک کیا اور ادھر شام کے سائے تاریکی میں ڈھلنا شروع ہوگئے تھے میں تیز تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چلا جارہا تھا۔

اچانک میں ٹھٹک کر رکا۔سامنے سے مجھے دو انسانی ہیولے نظر آئے وہ بھی تیز تیز قدموں سے اسی طرف آرہے تھے۔میں جلدی سے گھنی جھاڑیوں میں ہوگیا۔وہ ذرا قریب آئے تو میں انہیں دیکھ کر پہچان گیا وہ دونوں عثمان اور فرید تھے۔ یکبار میرا دل زور سے دھڑکا پہلے تو میرے جی میں آئی کہ انہیں ادھر ہی پکڑلوں مگر پھر اپنا ارادہ بدل لیا وہ دونوں جیسے ہی میرے قریب سے گزرے تو میں بری طرح چونکا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ عثمان کے ہاتھ میں کوئی شے ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ کہیں یہ بھالی کے وجود کی راکھ تو نہیں لیکن ایسا نہ تھا راکھ ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی تھی جبکہ یہ شے کچھ اور ہی تھی میں ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا۔چنانچہ وہ جیسے ہی میرے قریب سے گزرے میں بھی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور محتاط طریقے سے ان کے پیچھے ہولیا۔ان دونوں کا رخ اسی غار کی طرف تھا۔میں چھپتے چھپاتے غار کے سرے پر آکر کھڑا ہوگیا کیونکہ وہ دونوں اندر جاچکے تھے۔ مجھے وہ دونوں گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

غار کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے ایک

www.urdusoftbooks.com



چراغ روشن کردیا تھا۔ جو غار کے ایک کونے میں زمین پر رکھا ہوا نظر آرہا تھا میں نے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عثمان کا چہرہ فق تھا اور وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ جبکہ فرید کے چہرے پر عجیب سی جوش کی سرخی تھی۔

اچانک عثمان کے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹی شے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ کپڑا کھل گیا سامنے ایک خون آلود چھرا پڑا تھا۔

میں دہل کر رہ گیا اسی اثناء میں عثمان نے جلدی سے اس خون آلود چھرے کو کپڑے میں لپیٹا اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے غار کی بھربھری مٹی کھودنے لگا پھر جلدی سے اس نے کپڑے سمیت وہ خون آلود چھرا گڑھے میں دبا کر اوپر سے مٹی برابر کردی۔ میں نے تشویش سے سوچا کہ کہیں یہ دونوں کسی کا خون تو نہیں کرکے آرہے ہے۔

ادھر عثمان نے کھڑے ہوکر فرید سے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”فرید تجھے یہ اتنا بڑا قدم بنا سوچے سمجھے نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔“

”ارے واہ یہ تو نے خوب کہی۔“ فرید ہاتھ نچا کر بولا۔

”اس وقت تو بھالی کی بدروح کے سامنے بڑی سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا اور چھرا تھامے اسے وعدہ دے رہا تھا۔ کہ میں یہ کام اپنے ہاتھوں سے کروں گا مگر وہاں جاکر تو تیرے ہاتھ کانپنے لگے وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے تیرے ہاتھ سے چھرا لے کر جلدی سے قاری ندیم کا خاتمہ کرڈالا۔“ فرید نے اتنا کہا۔

اور میں سناٹے میں آگیا میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا میری کنپٹیاں جیسے سائیں سائیں کرنے لگیں اس کا مطلب تھا کہ ان دونوں نے بھالی کے کہنے پر قاری ندیم کو قتل کرڈالا تھا میں نے ذرا تکلیف سے سوچا مگر نہیں میرے بھائی عثمان نے یہ قتل نہیں کیا یہ گناہ فرید نے کیا تھا میں نے خود کو تسلی دی کیونکہ میں بہرحال اپنے چھوٹے بھائی کو قاتل کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بھی قاری ندیم صاحب جیسے اللہ والے نیک اور عبادت گزار شخص کا قاتل۔

اتنے میں عثمان نے کانپتی ہوئی آواز میں اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ ”یار فرید پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا مجھ سے قاری ندیم پروار کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا میرے ہاتھ سے خود ہی چھرا گر پڑا تھا۔ اور عین وقت پر مجھ پر جانے کیسی کپکپی طاری ہوگئی تھی۔“

”ہاں میں تجھے دیکھ رہا تھا جیسے تجھے سردی سی لگ گئی تھی پر دیکھ میں نے یہ کام کرڈالا۔“ پھر فرید یوں فخر سے بولا۔ جیسے کوئی بڑا کام کیا ہو۔

”یار کچھ بھی سہی تجھے کم از کم قاری ندیم جیسے شخص کا قتل نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میرا دل اب بجھ کررہ گیا ہے میں خود کو بھی اب تیرے ساتھ برابر کا شریک سمجھ رہا ہوں۔“ عثمان بولا۔

غمگین لہجے میں فرید بولا۔ ”ارے وہاں بھالی کے سامنے تو بڑا بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ اب تجھے کیا ہوگیا ہے۔ سنبھال خود کو ابھی تو ہم نے اس کی راکھ کو کالی کے مندر لے جاکر پنڈت رام داس کے حوالے کرنا ہے۔“

”نہیں یار اب مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکے گا تو اب ایسا کر اس سارے شیطانی گورکھ دھندے پر لعنت بھیج اور راکھ کی پوٹلی میرے حوالے کردے۔ میں اسے فوراً دریا برد کئے دیتا ہوں۔“ عثمان نے اس کی منت کی اور میرے کان کھڑے ہوگئے۔

اس کا مطلب تھا کہ راکھ کی پوٹلی فرید کے پاس تھی۔ میں نے دانت پیس کر سوچا ساتھ ہی مجھے اپنے بھائی عثمان کی باتیں سن کر خوشی بھی ہورہی تھی۔ کہ وہ راہ راست پر آگیا تھا۔ ضمیر کی خلش نے بالآخر اسے اس ناپاک کام سے روک دیا تھا۔

فرید اس کی بات سن کر حیرت سے بولا۔ ”یار یہ تو کیا کہہ رہا ہے بھالی کی مدد کرکے ہم بہت دولت مند اور طاقتور ہوجائیں گے تو بھول گیا کہ اس نے ہم سے کیا وعدہ کیا تھا کہ اگر ہم اس کا یہ کام کردیں تو ساری دنیا کی دولت اور خوشیاں وہ ہمارے قدموں میں ڈھیر کردے گا۔ اور ہم جو چاہیں گے وہ چٹکی بجا کر کرڈالے گا۔“

"نہیں یار میں نے کہا ناکہ اب میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔" عثمان نے کہا۔ "میں اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔ بھائی ہمارے ضمیر اور حتی کہ ہمارا ایمان بھی خریدنے پر تلا ہوا ہے۔ بس فرید بہت ہوگیا اب چل وہ راکھ کی پوٹلی جو میں نے تجھے دی تھی اسے میرے حوالے کردے۔"

عثمان نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک غار کے اندر سے ایک سرد ہوا کا جھونکا چلا جو باہر کھڑے مجھے بھی محسوس ہوا تھا وہ دونوں بھی غار کے اندر کھڑے کھڑے ٹھٹک گئے تب پھر میں نے دیکھا ان کے سامنے ایک جھکی ہوئی کمر اور خاکستری چہرے والا وہی بوڑھا نظر آیا جس کی آنکھیں زرد تھیں۔ یہ وہی کبڑا تھا جس نے مجھے پہلے بھی بھٹکانے کی کوشش کی تھی جب میں عثمان کی تلاش میں اس جنگل میں داخل ہوا تھا یقیناً یہ ہی بھائی کا اصلی روپ تھا اس نے نمودار ہوتے ہی سب سے پہلے عثمان کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"تیری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ہم تو تجھے اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں اور تو یہ اول فول بک رہا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ عثمان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری سے کہا۔ "ہاں مجھے تو اب عقل آئی ہے اور مجھے قاری ندیم کے قتل پر افسوس ہو رہا ہے۔ میں تیری باتوں میں آ گیا۔ مگر اب مزید تیری باتوں میں نہیں آؤں گا۔"

"فرید جہاں تو نے ایک قتل کیا ہے وہاں اس کو بھی مار ڈال نکال چھرا۔" بوڑھے بھائی نے فرید کو کہا۔

اور میں نے دیکھا کہ فرید فوراً اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے زمین پر بیٹھ کر وہ گڑھا کھودنے لگا۔ جس میں تھوڑی دیر پہلے خون آلود چھرا دبایا تھا اس نے آن واحد میں چھرا نکال لیا بھائی قہقہے لگائے جا رہا تھا اور فرید اپنے ہاتھ میں خون آلود چھرا پکڑے عثمان کی طرف خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے بھائی کی جان خطرے میں تھی۔ میں بھلا اب کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے ایک زوردار آواز بلند کرکے غار میں داخل ہوگیا اور اپنے چھوٹے بھائی عثمان کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہوگیا۔ بھائی مجھے دیکھ کر یکدم دھوئیں میں تحلیل ہوکر غائب ہوگیا جبکہ فرید چھرا ہاتھ میں تھامے مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ پر ساکت کھڑا ہوگیا۔ "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا تو نے اپنا ضمیر شیطان کے پاس گروی رکھ دیا ہے اور اس کے اشارے پر تو نے ایک نیک انسان کا بے دردی سے قتل کیا۔" میں گرجدار آواز میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔

وہ ایک لمحے تو پریشان سا ہوا اسے یہ پریشانی مجھے اچانک وہاں دیکھ کر ہوئی تھی۔ اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی تھی اور پھر بولا۔ "تو تجھے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ میں نے ہی قاری ندیم کو قتل کیا ہے۔"

"ہاں کیونکہ وہ تم جیسے ضمیر کے سوداگروں کے آگے کانٹے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر یاد رکھنا کہ میرا کانٹا تم نہیں نکال سکتے۔" میں نے کہا اور نفرت سے اسے گھورنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس بار فرید کے چہرے پر سرد مہری چھا گئی اور آنکھوں میں خون خوار چمک، وہ دانت پیس کر میری طرف یہ کہتے ہوئے جھپٹا۔ "تیرا کانٹا بھی میں ہی صاف کروں گا۔" وہ جیسے ہی خون آلود چھرا پکڑ کر میری طرف بڑھا میں نے اپنی دائیں لات اس کے چھرے والے ہاتھ پر رسید کردی چھرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا وہ پھرتی سے چھرا اٹھانے لپکا۔

ہم دونوں بھائی اس پر پل پڑے میں نے چھرا اس سے جھپٹ لیا۔ میں اسے دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک باہر شور بلند ہوا۔ ہم تینوں لمحے بھر کو ٹھٹک گئے۔ اسی وقت فرید نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور خود کو عثمان کے بازوؤں کے شکنجے سے چھڑا لیا اور باہر نکل گیا۔ ہم دونوں بھائی غار سے باہر نکلے تو ایک دم ٹھٹک کر رک گئے۔ فرید تو جانے کہاں تاریکی میں غائب ہو چکا تھا لیکن سامنے ہمیں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ یہ گاؤں کے لوگوں کا مشتعل ہجوم تھا جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور لالٹین تھام رکھی تھی۔

میں لرز اٹھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں فرید سے چھینا ہوا خون آلود چھرا دبا ہوا تھا وہ چھرا جس سے قاری ندیم کا قتل ہوا تھا اور دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے وہ خون

آلود چھرا مجھے قاری ندیم کا قاتل ثابت کررہا تھا۔ اس نازک صورت حال پر میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا تھا، بھیا بھاگو ورنہ گاؤں والے ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

اچانک میرے ساتھ کھڑے عثمان نے چلا کر کہا اور ایک طرف بھاگ اٹھا میں نے چھرا پھینکا اور عثمان کے پیچھے دوڑ لگادی لوگوں نے ہم دونوں بھائیوں کو پہچان لیا تھا۔ اس لئے وہ ہمارے نام پکارتے ہوئے پیچھے دوڑ پڑے۔

ہم دونوں بھائی اندھادھند جنگل میں دوڑے چلے جارہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے ہماری سانسیں پھول گئیں۔ ایک جگہ عثمان ٹھوکر کھا کر گرا میں نے رک کر اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اپنے عقب میں مجھے دور روشنی نظر آرہی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم دونوں ہجوم کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

"عثمان تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا" وہ بہت دہشت زدہ نظر آرہا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بمشکل بولا۔

"بھائی جان خدا کے لئے یہاں سے بھاگ چلو ورنہ گاؤں والے ہمارا برا حشر کرکے رکھ دیں گے وہ پہلے ہی ہم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔"

"عثمان دیکھ لیا نا کہ برے کام کا برا انجام ہوتا ہے۔ اور اس کی لپیٹ میں دوسرے بے گناہ بھی آجاتے ہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "ہم اب کہاں جاسکتے ہیں۔ تم نے ہم سب کو بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے اماں اور بہن شہزادی کس کے سہارے جئے گی۔" میرے لہجے میں اچانک تشویش آمیز تاسف در آیا تھا۔ مجھے واقعی اماں اور بہن کی پریشانی ستانے لگی تھی۔

مگر ہم دونوں بھائیوں کا گھر جانا بھی تو خطرے سے خالی نہ تھا۔ گاؤں والے شاید فرید اور عثمان کے پیروں کے نشانات پر چلتے ہوئے غار تک پہنچے تھے۔ اور یہ عثمان اور میری بدقسمتی تھی کہ گاؤں والوں نے ہم دونوں بھائیوں کو قاری ندیم کے قاتل کے روپ میں دیکھ لیا تھا۔ اب ہمارے گاؤں جانے کی راہیں بند ہوچکی تھیں پورے گاؤں میں یقیناً کہرام مچ گیا ہوگا کیونکہ قاری ندیم کوئی معمولی سا انسان نہ تھے وہ ایک اللہ والے اور نیک انسان تھے۔ پورے گاؤں کے لوگوں کو ان سے عقیدت تھی اور وہ دل وجان سے ان کا احترام کرتے تھے۔ "بھیا اب کیا ہوگا گاؤں والے تو ہمیں ہی قاری ندیم کا قاتل سمجھیں گے۔"

خاصی دیر کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد عثمان نے کہا۔

میں اسے کیا تسلی دیتا میری سمجھ میں خود نہیں آرہا تھا کہ ان سنگین ترین حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔

مجھے بدستور اور خاموش پاکر عثمان نے اچانک کہا۔ "بھیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم پنچائیت کے سرپنچ سے خود ملاقات کرکے انہیں قاتل فرید کے بارے میں بتائیں۔"

"نہیں ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا عثمان۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ اب سرپنچ بھی ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہ الٹا ہمیں گاؤں والوں کے حوالے کردے گا۔ اب ویسے بھی اب گاؤں میں داخل ہونا ہمارے لئے ممکن نہیں رہا۔ اب وہ ہمیں دیکھتے ہی ہماری تکہ بوٹی کرڈالیں گے۔"

"بھیا تو پھر کیا ہم اماں اور بہن شہزادی کو تنہا چھوڑ دیں۔" وہ حیرت سے بولا۔ "ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔"

میں نے اچانک کہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"مجھے کچھ سوچنے دو کہ ہمیں آخر کیا کرنا ہے۔"

میں نے فکرمندی سے اپنی پیشانی مسلی ابھی وہاں ہمیں کھڑے ذرا ہی دیر گزری تھی کہ ہماری تھکی ہوئی سماعتوں سے ایک ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ پراسرار ہنسی کی آواز ہمارے عقب سے ابھری تھی ہم دونوں گھومے، سامنے نظر پڑی تو حیرت سے ہمارے منہ کھل گئے وہ ایک سولہ سالہ دوشیزہ تھی۔ وہ مامے کی بیٹی رشیداں تھی میں کیا اسے پورا گاؤں جانتا تھا مگر رات کے اس سمے ایک گھنے اور ویران جنگل میں اسے یوں اچانک اپنے سامنے پاکر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ عثمان کی طرف بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھے جارہی تھی اور عثمان اس سے نظریں چرانے کی کوشش کررہا تھا۔

تاہم وہ دوسرے ہی لمحے پریشان ہوکر بولا۔

"رشیداں تو ادھر کیا کررہی ہے۔ اس جنگل میں تنہا۔"

"تیرا انتظار کررہی تھی۔ تو باولی پر کیوں نہیں آیا تھا۔" وہ ایک ادا سے بولی اس کی کٹارہ سی آنکھوں میں محبت کی سرکشی کی جوار بھاٹے کی طرح اٹھ رہی تھی عثمان خفت محسوس کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

عثمان فوراً بولا۔ "رشیداں تو گھر چلی جا اور سن میرے بارے میں کسی کو کچھ مت بتانا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔"

"کیوں کیا تو نے کسی کا خون کیا ہے؟" وہ ٹھٹک کر بولی اور اپنی کمانی دار بھنوئیں سکیڑ کر اسے گھورنے لگی۔

عثمان کے ساتھ میں بھی اس کی بات سن کر گھبرا گیا تھا۔ نجانے یہ کمبخت منہ پھٹ اور آفت کی پرکالا کہاں سے اچانک ٹپک پڑی۔

"ہاں...... نہیں...... خون میرے دوست فرید نے کیا ہے۔ سوالزام ہم دونوں بھائیوں پر آ گیا۔" عثمان نے آخراسے سچی بات بتا ہی دی۔ لگتا تھا کہ دونوں کے درمیان کافی پرانی محبت تھی وہ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے میں خاموش کھڑا تھا۔ "کس کا خون کر ڈالا فرید نے۔" رشیداں نے پوچھا۔

"قاری ندیم کا۔"

ہائے میں مرگئی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"دیکھ رشیداں تو ہماری مدد کرسکتی ہے ہم بے گناہ ہیں۔" عثمان منت کر کے بولا۔

"میری قسم کھا کر بتا کہ تو نے خون نہیں کیا ہے۔"

"مجھے تیری قسم تیرے سر کی قسم رشیداں میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ خود سوچ رشیداں بھلا میں اتنا بڑا جرم کیسے کرسکتا ہوں۔ اور وہ بھی قاری ندیم جیسے نیک اور اللہ والے کا توبہ توبہ۔" عثمان بولا۔

"ٹھیک ہے عثمان مجھے تسلی ہوگئی میرا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ تو یہ قتل نہیں کرسکتا۔" رشیداں مسکرا کر بولی۔ پھر کچھ لمحے سوچنے کے بعد دوبارہ بولی۔ "تم دونوں کدھر جنگل میں بھٹکتے پھرو گے چلو میرے ساتھ میرے گھر جب تک حالات ٹھیک نہیں ہوجاتے تم وہیں رہنا۔"

عثمان نے اس کی بات پر فوراً اپنا سر ہلا دیا۔

مگر میرے حلق سے یہ بات نہیں اتری چنانچہ میں نے پہلی بار دونوں کے درمیان لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ "رشیداں یہ تو کیا کہہ رہی ہے کیا تیرا ابا ہم پر بھروسہ کرے گا اور پھر نجانے ہمارے حالات کب بہتر ہوں ہم دونوں بھی تم پر کب تک بوجھ بنے رہیں گے۔" میری بات سن کر اس نے پہلے عثمان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا عثمان اس کے سامنے بالکل نروس نظر آرہا تھا جبکہ رشیداں خاصی نڈر اور دلیر محسوس ہوئی تھی۔

وہ مجھ سے مسکراہٹ سے بولی۔ "بھائی بوجھ کیسا۔ اس کی آپ فکر نہ کرو۔ اور نہ ہی میرے ابو کی فکر کرو۔ کیونکہ اس نے آپ تک دو ہی عورتوں کی غلامی کی ہے ایک اپنی بیوی کی اور دوسری اپنی اکلوتی بیٹی رشیداں کی۔ کیا مجال ہے کہ میرے خلاف کچھ بولے۔ میں پورا گھر سر پر اٹھا لیتی ہوں۔" کوئی اور موقع ہوتا تو اس کی چٹ پٹی باتوں پر دل کھول کر ہنستا۔ لیکن اس وقت مجھ پر مصیبت پڑی ہوئی تھی گاؤں ہمارا تھا ہی کتنا بڑا۔

ہم سب ایک دوسرے کے حالات اور افراد خانہ سے بخوبی واقف تھے۔

رشیداں کے حالات بھی ہمیں معلوم تھے۔ رشیداں کی سگی ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہوچکا تھا اس کا باپ جو پورے گاؤں میں ماما کے نام سے مشہور تھا اس نے ایک ادھیڑ عمر کی بیوہ سے دوسری شادی کرلی تھی مگر لگتا یہی تھا کہ سرکش اور طرح دار رشیداں نے نہ صرف خود کو اب تک سوتیلی ماں کے عتاب سے بچا رکھا تھا بلکہ اسے بھی نکیل ڈال رکھی تھی رشیداں کا باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا دوسری شادی اگرچہ اس کی مجبوری تھی وہ دونوں کی سنتا تھا مگر ترجیح اپنی بیٹی کی بات کو دیتا تھا۔

"چلو اب بہت سوچ لیا تم نے۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر رشیداں نے کہا۔

میں بولا۔ "دیکھ رشیداں تو ایسا کر میرے بھائی عثمان کو فی الحال لے جا اپنے ساتھ...... میری خیر ہے۔"

"نہیں بھائی جان ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں آرام سے رہوں اور آپ کو جنگل میں خوار ہونے کے لئے چھوڑ

دوں۔ ہرگز نہیں بھائی جان۔"

"آپ چلیں گے تو میں بھی چلوں گا ورنہ نہیں۔" عثمان نے حتمی لہجے میں کہا۔

میں اسے سمجھاتے ہوئے پیار سے بولا۔ "دیکھو بھائی ہم دونوں بہت نازک صورت حال سے گزر رہے ہیں ہم اکٹھے رہیں گے تو یہ مناسب نہ ہوگا میں بڑا بھائی ہوں تم اپنا ٹھکانہ بناؤ میں تمہاری ذمہ داری سے آزاد ہو کر میں زیادہ بہتر طریقے سے حالات کو سدھارنے کی کوشش کروں گا۔

اور پھر مجھے اماں اور شہزادی کی بھی خیر خبر لینی ہے۔

تاکہ انہیں ہماری طرف سے تسلی ہوجائے گی اس کے بعد میں باآسانی حالات پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔" میرے سمجھانے پر عثمان کے چہرے پر الجھن آمیز سوچوں کا جال پھیل گیا لوہا گرم دیکھ کر میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ "عثمان...... میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسے کرو اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔" یہ کہہ کر میں رشیداں کی طرف بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔ "رشیداں بہن عثمان کا خیال رکھنا اسے باہر بالکل مت نکلنے دینا اسے میں اللہ کے بعد تیرے حوالے کر رہا ہوں۔" میں نے اپنے اندر اٹھنے والی رقت پر قابو پا رکھا تھا ورنہ عثمان کا گھبرانا لازمی تھا۔

"آپ فکر نہ کرو بھائی کسی کی کیا مجال جو عثمان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔"

"پر رشیداں ایک بات تو بتا تیرے اور تیرے باپ پر تو چلو بھروسہ کر لیتے ہیں کہ وہ عثمان کے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے کہ وہ تمہاری پناہ میں ہے مگر سوتیلی ماں نے اگر باہر کسی کو خبر کردی تو میرے بھائی کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔" میں نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"او نہ جی۔ درانتی سے اس کی گردن نہ کاٹ دوں گی۔" وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو درانتی کی طرح خم کرکے اپنی گردن پر پھیر کر بولی۔ اس کی بڑی بڑی کٹارا سی آنکھوں میں جوش کی سرخی عود کر آئی تھی مجھے اب پورا یقین ہوگیا تھا کہ اس نڈر دوشیزہ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ سب سے قابل بھروسہ بات یہ تھی کہ عثمان سے اس کی محبت جارحانہ حد تک تھی اور عشق وہی کامیاب ہوتا ہے جو عورت کی طرف سے ہو۔ چنانچہ میں اب عثمان کی طرف سے بے فکر ہوگیا تھا۔ میں نے عثمان کو اس کی طرف سے رخصت کیا مجھ سے جدا ہوتے وقت عثمان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اسے گلے لگا کر دلاسہ دیا کہ۔ "میں اس کی خبر گیری کرتا رہوں گا۔" اس کے بعد وہ دونوں تاریکی میں گم ہوگئے رشیداں بلاشبہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ کسی طوفان کی طرح سرکش کھری صاف اور سچی تھی اور خاص دبنگ بھی مجھے خاصی حد تک اندازہ ہوگیا تھا کہ عثمان اس کے پاس ہی زیادہ محفوظ رہ سکتا تھا۔ اور یہی ٹھکانہ ہی سردست چھپنے کے لئے بہتر تھا۔ یعنی خوب گزرے گی جو مل بیٹھے گے دیوانے دو۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے وہ دونوں جاچکے تھے میں تاریک اور سنسان جنگل میں دم بخود کھڑا تھا۔ پورا جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اچانک خاموشی چھا گئی تھی مجھے اپنے بے ترتیب دل کی دھڑکنیں بھی کنپٹیوں پر محسوس ہو رہے تھے۔ حالات نے اس قدر غیر متوقع طور پر پلٹا کھایا تھا کہ میرا دماغ ہی جھنجھنا کر رہ گیا تھا عثمان کی طرف سے قدرے بے فکری ہوچکی تھی رہی اماں اور شہزادی تو مجھے یقین تھا عثمان کے کہنے پر آفت کی پرکالہ رشیداں خاموشی سے جا کر اسے ہماری مشکل اور تسلی سے آگاہ کردے گی۔ قاری ندیم کا قتل ہوچکا تھا اور قاتل فرید تھا جبکہ پورے گاؤں والے مجھے اور عثمان کو ان کا قاتل سمجھ رہے تھے۔ کیوں وہ پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے ہم پر ہماری بے گناہی ثابت ہونے میں کافی وقت درکار تھا۔ اور جانے کتنے کٹھن مرحلوں سے گزرنا تھا مگر میں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔"

میرے سر پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کسی طرح فرید سے اس بھالی کی راکھ کی پوٹلی حاصل کرکے اسے دریا برد کردوں۔ ورنہ فرید دولت اور لالچ میں اس بھالی کو زندہ کرنے پر تلا ہوا تھا فرید نے قاری ندیم جیسے نیک اور اللہ والے بندے کا قتل کرکے ثابت کردیا تھا کہ وہ اب سمجھنے اور سمجھانے کی حدود سے نکل چکا ہے۔ چنانچہ اب میں نے اسے آڑے ہاتھوں نمٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میں اسی لالچی شخص کے گھر تک کیسے جاتا۔ کیونکہ وہ قاتل

ہوکر بھی گاؤں والوں کے سامنے بے قصور تھا اور ہم بے گناہ ہوتے ہوئے بھی قاتل تھے۔ اب میں کیا کروں فریدکا کس طرح راستہ روکوں۔ میں ہر طرف سے مخدوش حالات میں گھر چکا تھا ان پریشان کن خیالات کی تپش سے میرا دماغ جلنے لگا۔ میں نے اپنی جلتی سلگتی کیفیات پر قابو پالیا اور سب سے پہلے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے یہاں سے دور نکل جانا چاہئے یہ سوچ کر میں آگے جنگل میں ویرانے کی طرف چل پڑا جنگل زیادہ طویل نہ تھا میں چاروں طرف ٹیلوں کا خشک سلسلہ تھا آسمان پر تارے اور چاند چمک رہے تھے۔ میں ایک ٹیلے کی آڑ لے کر زمین پر بیٹھ گیا سردی زوروں پر تھی مگر شکر تھا کہ میں نے موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے میں نے ہر قیمت پر فرید کا راستہ روکنا تھا مگر مجھے اس کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ وہ کب اور کس وقت اپنی اس ناپاک مہم پر روانہ ہوگا۔ تاہم مجھے اتنی تسلی ضرور تھی کہ وہ چند روز بعد ہی نکلے گا کیونکہ اتنی طویل اور کٹھن سفر کے لئے اسے لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی ضرورت تھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور کو اپنا ہم خیال بنا کر اسے بھی ساتھ لے کر نکلنے کی کوشش کرے۔

صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی میں سکڑا سمٹا بیٹھا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی میں بری طرح ٹھٹھکا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کسی عورت کی گھٹی گھٹی رونے کی آوازیں تھیں وہ اپنی آواز میں کچھ بولے ہی جارہی تھی میرا دل دھک سے رہ گیا میں نے اپنے لرزتے دل پر قابو پایا اور آواز کی سمت سر اٹھا کر دیکھا تو معاً مجھے اپنی دائیں جانب ایک ٹیلے کے پیچھے سے دو انسانی ہیولے آتے ہوئے دکھائی دیئے چاند تاروں کی مدہم روشنی میں مجھے ایک ہیولا عورت اور دوسرا کسی مرد کا نظر آیا مرد کی گود میں کچھ دبا ہوا تھا شاید کوئی سویا ہوا بچہ تھا مرد اسے لئے تیز تیز قدموں سے بڑھا چلا آرہا تھا اور عورت مرد کے عقب میں بے حال سی بھاگی چلی آرہی تھی ساتھ ہی وہ روتے ہوئے منتیں بھی کررہی تھی میں ٹیلے کی آڑ میں سرک گیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے میرے قریب سے گزرنے لگے۔ ''رک جا ظالم میرا بچہ مجھے دے مت کر یہ گناہ۔'' اس عورت کو میں نے کہتے سنا میرے کان کھڑے ہوگئے میں سمجھ گیا کہ یہ شخص ضرور اس الم زدہ عورت کے معصوم بچے کو اغوا کرکے لے جارہا ہے میں اب زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکتا تھا میں فوراً اوٹ سے نکل کر مرد کے سامنے آگیا وہ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا اور یوں پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں خونی بھوت ہوں وہ مصیبت زدہ عورت مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

''کون ہو تم اور اس بچے کو کہاں لے جارہے ہو۔'' میں نے کڑک کر پوچھا۔

مرد کی عمر چالیس کے قریب تھی رنگ سانولا تھا سر کے بال چھوٹے اور کانٹے دار چھچھوندر کی طرح کھڑے تھے یہ مجھے اپنے گاؤں کا نہیں لگ رہا تھا میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ میری جھڑکی سن کر کرخت لہجے میں بولا۔ ''تو کون ہے میرا راستہ روکنے والا۔ چل ہٹ پرے۔'' اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ ''پہلے اس غریب عورت کا بچہ لوٹا دو۔ پھر تجھے آگے جانے دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تیرا ہم میاں بیوی کے بیچ کیا کام ہے۔ یہ میرا بچہ ہے میں کہتا ہوں ہٹ جا راستے سے۔'' وہ خونخوار لہجے میں غرا کر بولا۔ مجھے اس کی بات سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ اور پھر میں نے اس کے عقب میں خاموش کھڑی عورت سے تصدیق چاہی۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے کیا یہ واقعی تیرا شوہر ہے۔''

''ہاں اس عورت نے آنسوؤں بھرے چہرے سے میری طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''پھر تو کیوں رو رہی تھی تو اپنے شوہر کو کس گناہ سے روک رہی تھی۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

عورت کے بجائے اس کا مرد بولا۔ ''بس زیادہ بات نہیں تجھے معلوم ہوگیا اب چھوڑ ہمارا راستہ۔'' دونوں میاں بیوی کا معاملہ تھا میں کیا کہہ سکتا تھا اس لئے خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا حیرت کی بات ہوئی کہ وہ عورت مزید کچھ نہ کہہ سکی تھی راستہ ملتے ہی وہ مرد آگے بڑھ گیا

عورت اسی طرح روتی دھوتی اپنے شوہر کو کوستی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے گرتی پڑتی چلی گئی میرا دل بے چین سا ہوگیا میں نے ان دونوں پراسرار جوڑے کا تعاقب کرنے کی ٹھانی اور ان کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

وہ دونوں کافی دور جاکر ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئے میں انہیں تلاش کرتا ہی رہ گیا تب میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا میں خود پریشان تھا۔ اس لئے ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دی مجھے وہاں بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک ایک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی میں نے چونک کر آوازوں پر دھیان دیا تو اندازہ ہوا کہ یہ کسی لکڑی کے جلنے کی اور چٹخنے کی آواز ہے۔ ساتھ فضا میں بھی ہلکی ہلکی چراند پھیلنے لگی اب میرا ماتھا ٹھنکا میں لکڑیوں کی آواز پر آگے بڑھا اور ایک بلند ٹیلے کی آڑ سے جھانکا تو چونک گیا۔

سامنے ایک دوسرے ٹیلے کی ڈھلانی دیوار کی کھوہ میں مجھے روشنی کے ساتھ چنگاریاں پھوٹتی نظر آئیں۔ میں پریشان سا ہوگیا جانے کیا گورکھ دھندہ تھا لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا اس لئے چھپتا چھپاتا آگے بڑھا روشنی اب ماند پڑنے لگی تھی میں ابھی کھوہ کے قریب پہنچا تھا کہ اچانک اندر سے ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی جو دور تک پھیلے ٹیلوں کے سناٹوں میں خنجر کی طرح اترتی چلی گئی اس خوف ناک چیخ نے مجھے ایک لمحے کو دہلا کر رکھ دیا میں اپنی جگہ ساکت ہوگیا تھا میری نظر کھوہ پر جم گئی پھر اچانک میں نے کھوہ کے اندر سے ایک عورت کو باہر نکلتے دیکھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے میاں کے پیچھے دوڑتے گرتے جاتے دیکھا تھا اس کی گود میں بچہ تھا وہ اس لئے یوں کھوہ میں سے نکلی تھی جیسے اس کے عقب میں کوئی عفریت ہو وہ اپنے بچے کو سنبھالے دیوانہ وار دوڑی چلی آرہی تھی۔

اس عورت کے نکلتے ہی میں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا کھوہ کے اندر سے اس کا میاں برآمد ہوا اس کی حالت دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا اس کی گردن نصف حد تک ادھڑی ہوئی تھی اور ادھ کٹا سر اس کے دائیں کاندھے پر جھول رہا تھا جہاں سے خون بہہ کر اس کے سارے کپڑے رنگین کررہا تھا مگر اس کے باوجود وہ دونوں بازوں پھیلائے اپنی بیوی کو پکڑنے کے لئے دوڑ رہا تھا اس کی بیوی مجھے کھڑا دیکھ کر میرے قریب آ کر وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ "میرے بچے کو اس شیطان سے بچالو تمہیں اللہ کا واسطہ نہیں تو یہ میرے معصوم بچے کی جان لے لے گا۔"

اس کی زبان سے اللہ کا نام سن کر میرے اندر اس عورت کی مدد کرنے کے جذبے نے سر ابھارا اور پھر میں نے اس کے آگے سر ابھا کر کھڑا ہوگیا سامنے اس کا زخمی شوہر بھی لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب آ پہنچا مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا وہ تن کر کھڑا تھا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں اپنے سر کو سیدھا کیا اور انگارہ برساتی آنکھوں سے مجھے گھور کر خرخراتی آواز میں بولا۔ "اوئے تو پھر میرے راستے میں آ گیا میں کہتا ہو ہٹ جا میرے آگے سے ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔"

ایک لمحے کو میں اس خبیث کی دھمکی سے ڈرا مگر پھر اللہ کا نام کا ورد کرتے ہوئے مضبوط درشت لہجے میں بولا۔ "اے بدبخت یہ کیا اسرار ہے اور تو کون ہے؟"

"میں ایک بہت بڑا عامل ہوں ہٹ جا میرے راستے سے۔" وہ غرا کر بولا اور آگے بڑھ کر مجھے ایک طرف کو زور کا دھکا دیا۔ مجھے اس سے اتنی زور آزمائی کی امید نہیں تھی میں ایک طرف کو لڑکھڑا گیا اس نے فوراً اس عورت کو پکڑ لیا اور اس سے بچہ چھیننے کی کوشش کرنے لگا میں نے سنبھلتے ہی اس پر جست لگائی اور اسے رگیدتا ہوا زمین پر آ رہا میں گرتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن وہ نہ اٹھ سکا شاید وہ مر گیا تھا میں پھر عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ "چلو بہن یہ مر گیا ہے میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔"

"نہیں نہیں یہ نہیں مرا ہے پہلے اس کا سر کچل دوں پھر مجھے تسلی ہوگی ورنہ یہ میرے بچے کو بھی مجھ سے چھین لے گا۔" وہ عورت ابھی تک دہشت زدہ تھی بچہ گہری نیند سو رہا تھا اسے شاید بے ہوش کیا گیا تھا۔

میں نے عورت کو تسلی دی کہ یہ مر چکا ہے چلو آؤ میں نے نرمی سے کہا۔ "کیا یہ بچہ بے ہوش ہے؟" میں نے

چلتے چلتے دریافت کیا۔

"ہاں اس نے بچے کو بے ہوش کیا ہے۔" وہ نفرت سے بولی۔

"مگر تم لوگ کون ہو پہلے کبھی تو یہاں نہیں دیکھا اور یہ کیا چکر ہے تمہارا شوہر چاہتا کیا ہے؟" میں نے چلتے چلتے اس سے سوال کیا۔

"بھیا تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اس کا اجر تمہیں اللہ ہی دے سکتا ہے تم مجھے گھر تک پہنچا دو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔" وہ لجاجت سے بولی اور چلتے چلتے بار بار خوف زدہ نظروں سے عقب میں دیکھنے لگی جیسے اسے ابھی تک اپنے مردہ شوہر سے خوف ہو۔

چلتے چلتے ہم ایک ویرانے میں آ گئے سامنے ایک جھونپڑی دکھائی دی جس کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی وہ عورت مجھے لئے اندر جھونپڑی میں آ گئی اندر ایک لالٹین جھول رہی تھی۔ بوسیدہ سے فرش کے وسط میں ایک انگیٹھی پڑی تھی جو سرد تھی۔

اچانک میری نظر فرش پر ایک میلی چیکٹ گدڑی پر سوئے ہوئے ایک اور بچے پر پڑی وہ اس بچے کا ہم عمر ہی نظر آ رہا تھا جو عورت کی گود میں تھا۔ "یہ بھی تمہارا بچہ ہے بہن؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ بھی میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔" اس کے لہجے میں ممتا بھرا غرور تھا۔ "کیا اسے بھی اس کے باپ بے ہوش کیا ہے۔" میں نے بچے کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا ہاں وہ ہولے سے سوئے ہوئے بچے کی طرف دیکھ کر بولی۔

پھر اس نے دوسرے بچے کو بھی پہلے والے کے ساتھ لیٹا دیا۔ اور انگیٹھی میں کوئلے کو سلگانے کے بعد میرے قریب آ بیٹھی میں بغور اس کے سانولے چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے جو کچھ بتانا شروع کیا اسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کرمو اس کا شوہر تھا وہ بلا کا نکھٹو تھا کام کرنے سے اس کی جان جاتی تھی وہ دوسرے گاؤں میں رہتا تھا اس کی بیوی جو میرے سامنے بیٹھی تھی اس کا نام سکینہ تھا وہ ہماری حویلی میں جھاڑوں پوچھا کیا کرتی تھی کرمو نہ کام کا نہ کاج کا لبی تانے گھر پڑا رہتا تھا۔

جوئے کی بھی اسے لت تھی اور اب نشہ بھی کرنے لگا تھا اپنی بیوی کو مار مار کر پیسے چھین لیتا تھا نہ جانے کسی ہندو جوگی سنیاسی اسے پٹی پڑھا دی تھی اور اسے چند روپوں کی خیرات بطور نذرانہ کے طور پر اسے ایک کالے منتر کا جاپ بتا دیا کرمو پہلے ہی نکھٹو تھا محنت کرنے سے اس کی جان جاتی تھی خالی دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے اور ویسے بھی وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتا تھا جس سے بیٹھے بٹھائے ڈھیروں دولت حاصل ہوں اس لئے بھی ہندو جوگی کی باتوں میں آ گیا ان دنوں کرموں کے ہاں جڑواں بچوں کی ولادت ہوئی ہندو جوگی کے کہنے کے مطابق کرمو کو اپنے جاپ کے آغاز سے پہلے کسی تاریک ویرانے میں آگ روشن کر کے اپنے ایک بچے کو ذبح کر کے اس کے خون کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈالنا تھا۔" سکینہ نے جو اپنے نکھٹو شوہر کا یہ حال دیکھا کہ وہ دولت کے نشے میں اندھا ہو کر اپنے بچے کو شیطانی عمل کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر چکا ہے تو اس نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا سکینہ بے چاری شوہر کے خطرناک ارادوں پر اس کی منت سماجت کرنے لگی مگر کرمو کی آنکھوں پر تو لالچ کی پٹی بندھ چکی تھی کرمو اسے ڈراتا دھمکاتا بھی تھا کہ اگر اس نے کسی سے بھی اس بات کا ذکر کیا تو یا آڑے آئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

پھر کرمو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں ویرانے میں سرکنڈوں کی جھونپڑی ہی بنا کر رہنے لگا اور آخری چاند کی راتوں کا منتظر رہنے لگا سکینہ غم سے پاگل ہوئی جا رہی تھی آج رات جب کرمو اپنے ایک بچے کو شیطانی عمل کی خاطر اسی تاریک خلا میں لے گیا اور آگ روشن کر کے جب چھرے سے ننھے بچے کا گلا کاٹنے لگا تو عین وقت پر سکینہ کے اندر کی دلیر ممتا جاگ اٹھی اور اس نے اپنے شوہر کے ہاتھ سے چھرا جھپٹ کر اس کا ہی گلا کاٹ ڈالا اور اپنے بچے کو اس کے قبضے سے چھڑا کر واپس بھاگی یہ تھی اس بے چاری کی داستان۔

یہاں بھی کالے منتروں کی کارستانی سن کر میرا دل و دماغ ان عملیات سے نفرت کرنے لگا میرا جی چاہتا تھا کہ جو بھی مجھے ان چکروں میں مبتلا نظر آئے اسے مار ہی ڈالو۔ یہ

تو شکر تھا کہ میرا بھائی عثمان ان منتروں کے کالے راستوں پر چلنے سے تائب ہوگیا تھا ورنہ میں اس سے بھی آڑے ہاتھوں نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا ساری داستان سننے کے بعد میں نے روتی سسکتی سکینہ کو تسلی دی اور اس سے بولا۔ "بہن تو نے واقعی میں بہت بہادری کا کام کیا ہے اب تو اپنا دل مضبوط کر تجھے اپنے ان دونوں پھول جیسے بچوں کو پالنا ہے۔ چل میں تجھے تیرے گاؤں چھوڑ آؤں۔"

"بھیا تیری بڑی مہربانی تیری موجودگی سے میرے دل کو کافی ڈھارس بندھی ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر ممنونیت سے بولی۔ "پر بھیا اس وقت رات ہو رہی ہے بس کوئی دم کو سویرا ہو جائے گا تو میں خود ہی چلی جاؤں گی اپنے گاؤں۔"

میں اس کی بات سن کر چپ ہو رہا وہ چند ثانیے خاموش مگر سوچتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کو دیکھتی رہی پھر پوچھا۔ "بھیا تو کون ہے تو نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا اتنی رات گئے تم اس ویرانے میں کیا کر رہے تھے۔" میں نے اس کے سوال پر قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

"بہن بس یوں سمجھ لو میں بھی تمہاری طرح ایک کالے منتر کا مارا ہوں۔"

"کک کیا بھیا۔" وہ جیسے سگی بہنوں کی طرح پریشان ہو کر بولی۔

"بھیا کیا اپنی بہن کو نہیں بتاؤ گے کیا خبر میں اپنے بھیا کے کام ہی آجاؤں" اس کے لہجے میں بہنوں جیسی محبت کو محسوس کر کے بے اختیار میرا جی چاہا کہ اسے حقیقت بتا ڈالوں لہٰذا یہ سوچ کر میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا جس طرح میں اس کی داستان سن کر حیران رہ گیا تھا اس طرح اس نے بھی میری داستان سن کر اپنی انگلی دانتوں تلے دبالی۔ چند لمحے جھونپڑی کے مسدود ماحول میں خاموشی طاری رہی اس کے بعد اس نے سکوت توڑتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بھائی یہ فرید تو بڑا ہی تیز نکلا تمہیں اسے ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔"

"ہاں کوشش تو میری یہی ہے پر پورا گاؤں اس وقت میری جان کا دشمن ہوگیا ہے ایسے میں فرید پر نظر کیسے رکھ سکتا ہوں۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

وہ فوراً بولی۔ "تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ اپنا بھیس بدل لے اور فرید کو پکڑنے کی کوشش کر۔"

اس کی بات سن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں حیران رہ گیا کہ اتنی سادہ سی تجویز اس سے پہلے اس کے ذہن میں کیوں نہ آئی۔ "ہاں بہن یہ تم نے ٹھیک کہا مگر اس کے لئے بھی مجھے مستقل ٹھکانے کی ضرورت پڑے گی۔ آخر میرے ٹھکانے کا بھی کوئی نہ کوئی جواز ہونا چاہئے کیونکہ مجھے ایک قاتل کے روپ میں تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ جس کی مجھے پوری توقع ہے کہ گاؤں والوں نے میرے خلاف پولیس کو بھی بتا دیا ہوگا اور میرے خلاف ایف آئی آر بھی کٹوا دی ہوگی۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں بھائی۔" سکینہ اک دم بولی۔ "تم ایسا کرو جب تک حالات ساز گار نہیں ہو جاتے تم میرے بھائی بن کر میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔" میں نے اس کی بات سن کر اس کا چہرہ دیکھا جہاں ایک بہن کا بھائی سے پیار کا جذبہ نگینے کی مانند دمک رہا تھا اس کی یہ بات بری نہیں تھی۔ کیونکہ میرے پاس سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس کے علاوہ مجھے اپنی پیشانی سے ایک مفرور قاتل کا جھوٹا داغ بھی دھونا تھا یہ سب تب ہی ممکن تھا جب مجھے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ میسر نہ آجاتا چونکہ میں پریشان کن حالات کا شکار تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے سکینہ کی بات مان لینی چاہئے۔ چنانچہ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بہن تو نے مجھے بھائی سمجھا ہے تو مجھے بھی اپنا بھائی سمجھے گی بلکہ اپنی بہنا کو اس کا احساس کبھی نہ ہونے دوں گا اور میں تم پر بوجھ بن کر بھی نہیں رہوں گا اور نہ میں تمہیں حویلی میں کام کرنے کی اجازت دوں گا میں خود کماؤں گا اور تم گھر میں میرے ان ننھے پیارے بھانجوں کو سنبھالنا۔" میری بات سن کر وہ بے اختیار مسکرا اٹھی۔

اچانک جھونپڑی کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔

سکینہ کی نظریں سب سے پہلے دروازے کی طرف اٹھی۔ اور دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے دہشت زدہ چیخ خارج

ہوگئی میں نے دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تو وہ بھیانک منظر دیکھ کر میرا دل بھی بری طرح دہل گیا۔ دروازے پر سکینہ کا شوہر کرمو کھڑا تھا اس نے اپنی ادھیڑ ہوئی گردن کو مسلسل ایک ہاتھ سے سنبھالتے سر کو سیدھا رکھا ہوا تھا خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا اس کی آنکھوں سے ابھی تک شعلے دہک رہے تھے اب تو اس کے بائیں ہاتھ میں وہ لمبا سا خون آلود چھرا ابھی دبا ہوا تھا جس سے سکینہ نے اس کی نصف تک گردن کاٹ ڈالی تھی۔

سکینہ چیخ مار کر اپنے سوئے دونوں بچوں کے پاس جا پہنچی۔ تاکہ اس کا شوہر ان کو پھر نقصان نہ پہنچا دے۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر خرخراتی آواز میں بولا۔ ”سکینہ مجھ پر رحم کر میرا جاپ پورا ہو لینے دے۔ یہ بچہ مجھے دے دے۔ ورنہ میں ساری عمر اس ادھیڑ گردن کے ساتھ گھومتا رہوں گا۔“ اس نے جیسے اپنی بیوی کی منت کی۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”اے یہ بدبخت انسان تجھے شرم نہیں آتی کہ تو ایک شیطانی عمل کی خاطر اپنے معصوم بچوں کی جان لینا چاہتا ہے اور وہ بھی اپنے ہی بچوں کی جان۔“

”تو خاموش رہ جانتا نہیں کہ میں کیا بن گیا ہوں میری حالت پر تم کو رحم نہیں آ رہا۔“ وہ مجھے گھور کر بولا۔

”یہ تیرے اپنے کالے کرتوتوں کی سزا ہے۔“ میں نے اسے مرغوب کرنے کے لئے کہا۔ ”تو میرے سامنے سے ہٹ جا مجھے اپنی بیوی سے بات کرنے دے۔“ وہ کرخت لہجے میں بولا۔

پھر سکینہ کی منت سماجت کرنے لگا۔ ”سکینہ دیکھ میں تیرا شوہر ہوں مجھ پر تجھے ترس نہیں آ رہا مجھے اپنا عمل ظورا کرنے دے۔ ورنہ میں ساری عمر اسی طرح تکلیف کے مارے سسکتا رہوں گا کیونکہ اس ادھورے عمل کی وجہ سے مجھے موت بھی نہ آئے گی۔

ورنہ میں اپنے آپ کو مار کر اس اذیت سے چھٹکارا پالیتا۔ دیکھ مجھے ایک بچہ دے دے۔“

سکینہ پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اس کی گفتگو پر وہ جوش میں آ گئی اور کھڑے ہو کر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرا کر بولی۔ ”میں تجھے ہرگز بچہ نہ دوں گی تجھے اب اپنے کئے کی سزا بھگتنا ہوگی۔ جاؤ دفع ہو جا یہاں سے۔“

بیوی کے جواب پر وہ بھنا گیا۔

”میں ہر قیمت پر یہ بچہ لے کر رہوں گا دیکھتا ہوں کہ کون میرا راستہ روکتا ہے۔“ یہ کہتے ہی وہ چھرا لے کر آگے بڑھا۔ میں فوراً ہی اس کے جارحانہ تیور بھانپ کر اس کے آگے آ گیا۔ اس نے وحشت انگیز غراہٹ سے مجھ پر چھرے سے وار کیا۔ سکینہ کے حلق سے چیخ نکل گئی میں نے جھکائی دے کر خود کو اس کے وار سے بچا لیا۔ اور پھرتی سے اس کے چھرے والی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے چھرا چھین لیا۔ وہ اپنی کلائی چھڑا کر سوئے ہوئے بچوں کی طرف لپکا سکینہ کو ایک طرف دھکا دیا اور ایک بچے کو بے دردی سے اٹھا لیا۔ سکینہ چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی وہ اسے ایک طرف دھکا دے کر باہر کی طرف بھاگا میں نے راہ میں اسے دبوچ لیا بچہ جاگ کر رونے لگ پڑا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کرمو کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا اس کے حلق سے غراہٹ آمیز چیخ نکلی وہ فرش پر گر پڑا میں نے اس سے پہلے ہی بچہ کو چھڑا لیا۔

سکینہ اپنے بچے کو لے کر ایک کونے میں دبک کر گھٹی گھٹی چیخیں مارنے لگی میں خون آلود چھرا پکڑے کرمو کو تڑپتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکنے لگی تھی اس کے پیٹ سے خون کا فوارا ابل رہا تھا مجھے پورا یقین تھا کہ اب وہ زندہ نہیں بچے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں حیران رہ گیا وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا اس کی حالت انتہائی خوف ناک لگ رہی تھی میں حیران تھا کہ وہ اب تک زندہ تھا۔ ”تم مجھے نہیں مار سکتے۔“ کرمو غراہٹ بھری آواز میں بولا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا اور اس نے ایک بار پھر سکینہ کی طرف بڑھنا شروع کیا جواب اپنے دونوں روتے ہوئے بچوں کو خود سے لگائے جھونپڑی کے کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا میں نے اس پر فوری عمل کیا میں جان گیا تھا کہ کرمو اپنے ادھورے عمل کی

وجہ سے شیطان بن چکا ہے لہٰذا اس کا سر ہی دھڑ سے جدا کردینا چاہئے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اسے دھکا دیا وہ زمین پر گرا اور میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور چھرے کے ایک ہی وار سے اس کا سر تن سے جدا کردیا۔

سکینہ یہ منظر دیکھ کر خوف کے مارے چیخنے لگی اور دونوں معصوم بچوں کو اپنے پیچھے چھپالیا۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سکینہ اور دونوں بچوں کو لے کر جھونپڑی سے باہر آ گیا میں نے جلدی سے اندر سلگتی ہوئی انگیٹھی سے سرکنڈوں کو آگ دکھائی پھر سکینہ اور اس کے دونوں بچوں کو لے کر ایک طرف چلا عقب میں جھونپڑی دھڑ ادھڑ جل رہی تھی آگ کی وجہ سے کافی دور دور تک کا تاریک ماحول روشن ہو چکا تھا۔

وہ گاؤں جہاں سکینہ رہتی تھی زیادہ دور نہ تھا بقول سکینہ چند ہی کوس کے فاصلے پر تھا ہم دونوں نے آخر یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس کے گاؤں ہی چلنا چاہئے چونکہ میں ہر صورت صبح کی پہلی روشنی سے پہلے کسی محفوظ ٹھکانے میں پناہ لینا چاہتا تھا پو پھوٹنے سے پہلے ہی ہم گاؤں پہنچ گئے پھر کپاس کے کھیتوں کے درمیان تیز تیز چلتے ہوئے آبادی کے قریب پہنچے۔

سامنے ایک گارے مٹی سے بنی ہوئی جھگی سی نظر آ رہی تھی دائیں بائیں کچھ اور جھو جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اس سے ذرا دور کچے مگر قدرے معقول گھروں کے بے ترتیب سلسلے بکھرے ہوئے تھے ہم سامنے والی جھگی میں داخل ہوگئے۔

ایک ہی کمرہ تھا۔ سامنے صحن کے نام پر ایک کھلا بوسیدہ سا حصہ...... اور اندر کوٹھری نما تنگ و تاریک کمرے میں ایک جھلنگا سی چارپائی نظر آ رہی تھی۔

باہر پو پھوٹ چکی تھی پرندوں کی چہچہاہٹ صبح ہونے کی خبر دے رہی تھی دونوں بچوں پر نشے کا اثر ابھی تک طاری تھا ایک تو میری اور سکینہ کی گود میں بچہ تھا۔ دونوں ہی اونگھے اور کسمساتے سوگئے تھے۔ چارپائی پر ایک بوسیدہ سی چادر بچھی ہوئی تھی ہم نے دونوں بچوں کو دھرے سے اس پر لٹادیا۔ صحن سپیدہ سحر سے دھیرے دھیرے منور ہو رہا تھا میرا سر تھکن اور نیند سے بوجھل ہو رہا تھا سکینہ نے میری کیفیت بھانپ لی۔ اور جلدی سے اندر کوٹھری کے کونے میں زمین پر پرانا بستر لگادیا۔ اس وقت بھری نیند میں مجھے یہ بھی غنیمت لگا۔

سکینہ نے بہنوں والی محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''بھائی تم سوجاؤ کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہوجائے۔'' اور میں نے ایسا ہی کیا اور پرانا سا پیوند زدہ کھیس اوڑھ کر گہری نیند میں ڈوب گیا۔ آنکھ کھلی تو دن روشن ہو چکا تھا۔ سکینہ چارپائی پر بیٹھی دونوں بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ ''بھائی بھوک لگی ہے تو روٹی لادوں۔'' اس نے مجھے جاگتے دیکھ کر دھیرے سے کہا۔ مجھے بھوک تو محسوس ہو رہی تھی مگر میں بولا۔ ''پہلے تم آرام سے بچوں کو دودھ پلالو پھر روٹی کھالیں گے۔''

''اچھا بھائی پھر جب تک تم نہا دھولو۔ باہر پانی موجود ہے۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

صحن کے ایک کونے میں ایک انتہائی مختصر سرکنڈوں کی آڑ بنی ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے چلا گیا وہاں پر پانی سے بھری ایک بالٹی موجود تھی اور لوٹا بھی پڑا ہوا تھا۔

میں نصف گھنٹے کے اندر اندر نہانے وغیرہ سے فارغ ہو کر نکلا تو سکینہ ایک کونے میں چولہا جلائے روٹیاں پکا رہی تھی میں وہاں ہی بیٹھ گیا اس نے جو کی روٹی اور ساگ بنایا تھا ایک گڑوی سے مکھن نکال کر اس نے دو روٹیاں چپڑ کر اس پر ساگ رکھا اور میرے آگے رکھ دیا روٹی مزیدار تھی میں تین روٹیاں کھا گیا سکینہ بھی وہیں بیٹھ کر روٹی کھانے لگی۔ روٹی کھانے کے بعد میں نے جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس میں پانی پیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ ''کیا سوچ رہے ہو بھائی۔'' اس نے روٹی کھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

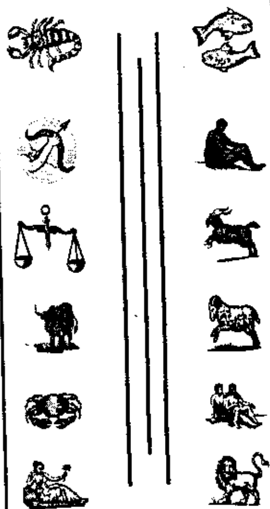
''سوچ رہا تھا کہ اپنے گاؤں کا ایک چکر لگالوں۔ تاکہ حالات کا اندازہ ہوسکے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

وہ بولی۔ ''بھائی ابھی آپ کا گاؤں جانا ٹھیک نہیں ہے آپ کیسے جاؤ گے۔''

روحانی شمع جنتری 2017ء

مؤلف۔ اقبال احمد مدنی

قیمت۔/150 روپے



مسلسل کامیابیوں کے بائیسواں سال

پاکستان کی واحد منفرد اور مستند جنتری جس میں دیئے گئے مستقل اور نئے عنوانات آپ کو ہر وقت چونکا دیتے ہیں اور جسے پڑھ کر آپ پر حیرت طاری ہو جاتی ہیں کہ پاکستان میں چھپنے والی جنتریوں اور تقاویم میں سارے مضامین یکجا نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو بھی اس سے قارئین مکمل استفادہ حاصل نہیں کر سکتے ان کے علم کی پیاس نہیں بجھتی۔ اس سال کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔ جنتری، پاکستان میں سبز انقلاب، مذہبی تقریبات و تعطیلات، خواتین کے مزاج پر چاند کے اثرات، اثرات قمر، تواریخ ماہ، سعد و نحس، شمس در بروج، قمر در بروج، آج کا دن کیسا گزرے گا، ہر کام میں کامیابی یا ناکامی کے لئے سعد اور نحس تاریخیں، قمر در عقرب کے اوقات، داخلہ کی جدول، 2017ء میں یہ کام کریں یا نہ کریں، نقشہ سحر و افطار، تاریخ عیسوی سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، تاریخ ہجری سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، 176 سالہ شمسی ہجری کیلنڈر، فہرست عرس ہائے بزرگان دین، تسویت البیوت مختصر، تسویت البیوت پاکستان، عملیات جسمانی امراض، تعارف رفتار سیارگان، یونانی رفتار سیارگان کو ہندی رفتار سیارگان میں تبدیل کرنا، جدول نظرات سیارگان، انعامی بانڈ یا انعامی اسکیموں سے لکھ پتی یا کروڑ پتی بنے گا کون، 2017ء علم الاعداد کی روشنی میں، عملیات محبت، نوروز عالم افروز (عالمی پیشگوئیاں)، نوروز ہجری کا پھل، نوروز صدی کا پھل، نوراتہ کا پھل، نوروز کا پھل، نوروز چینی کا پھل، چینی سال کیسا رہے گا، سبزیوں سے خطرناک بیماریوں کا علاج، جسم کی نشوونما میں معدنیات کا اہم کردار، شادی شدہ خواتین گھر کو جنت کا نمونہ کیسے بنائیں، رنگ بولتے اور بتاتے ہیں، بھوسے سے شوگر کا علاج، بیل گری کھائیں صحت وتندرستی پائیں، روزانہ رات کو پاؤں کے تلوؤں پر تیل لگائیں اور صحت وتندرستی کے نوراز پائیں، (رجعت سیارگان کے اثرات، نقشہ یا تحویلات کواکب، آپ کامیابی کیسے حاصل کریں، اپنے اسم اعظم اور اسمائے نبوی کے حروف باطن معلوم کیجئے، سات دن میں ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل ہملیات تسخیرات، شرف و ہوط سیارگان، شرف و ہوط قمر، رجعت و استقامت سیارگان، کیا تیسری عالمی جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، کیا اس کائنات میں ہم اکیلے ہیں، زمین سے مشابہ سینکڑوں نئے سیارے دریافت، روم کے اسلامی دارالحکومت بننے کی پیشگوئی سے یورپ پریشان، بارہ برجوں کے حالات 2017ء آخریات، مجھے امید ہے کہ اتنے سارے عنوانات سے آپ کے علم کی پیاس یقینا بجھ جائے اور آپ مزید مفید مشوروں سے مجھے نوازیں گے تاکہ جنتری کو بہتر سے بہتر خطوط پر استوار کیا جائے اور آپ کے استفادوں کا کارروان یونہی رواں دواں رہے۔

دعا گو

اقبال احمد مدنی

شمع بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار **کراچی**

Ph:32773302

www.urdusoftbooks.com

وہ ہی تمہاری ترکیب آزمانی پڑے گی مگر میں اپنا بھیس کیسے بدلوں۔" میں نے الجھ کر کہا۔

وہ بولی۔" آپ ابھی ادھر ہی رکو میں حویلی جاؤں گی تو واپسی میں خیر دین کی دکان سے نقلی داڑھی مونچھ لے کر آؤں گی تو آپ وہ چہرے پر لگالینا۔"

میں اس کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بچے کو لئے باہر نکل گئی۔

شام کے وقت اس کی واپسی ہوئی۔ اس نے ایک بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا اور دوسرا اس کی پشت سے بندھی گٹھڑی نما چادر میں جھول رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کی نقلی داڑھی مونچھیں تھیں اس نے دونوں بچوں کو کوٹھڑی کے فرش پر لیٹا دیا۔ میں اس کے ہاتھ سے نقلی داڑھی اور مونچھیں لے کر اس کا جائزہ لینے لگا اس میں ذرا سی رد و بدل کرنا تھی تا کہ وہ نقلی محسوس نہ ہو سکینہ نے مجھے بتایا تھا کہ خیر دین چاچا اپنی دکان پر بچوں کے لئے مٹی کے کھلونے اور ایسی اشیاء رکھتا تھا مٹی کے کھلونوں میں مجھے اچانک ایک خیال آیا اور میں نے سکینہ سے کہا۔" بہن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو مجھے بہت سے مٹی کے کھلونے لا دے میں انہیں گھر گھر جا کر بچوں کا اسی طرح آمدنی بھی ہوگی اور میں اپنے گاؤں اور گھر بھی آجا سکوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ فرید پر بھی نگاہ رکھ سکوں گا۔"

وہ جھٹ سر ہلا کر بولی۔" یہ کون سی مشکل بات ہے چاچا مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے پہلے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا اگر میرا شوہر کرمو اس سے مٹی کے کھلونوں کا ایک ٹوکرا گھر گھر لے جا کر فروخت کرے تو اچھا خاصا کما سکتا ہے میں وہ ٹوکرا تجھے لادیتی ہوں۔" میں اس کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ بہن میں ذرا یہ داڑھی مونچھیں لگالوں اس کے بعد تیرے ساتھ جا کر چاچا سے کھلونوں کا ٹوکرا لے آتا ہوں۔" اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

چنانچہ میں نے سب سے پہلے سکینہ سے قینچی اور ایک چھوٹا سا آئینہ مانگا۔ وہ دونوں چیزیں اس نے میرے سامنے رکھ دی میں نے سب سے پہلے اپنے بال خود ہی کاٹ کر چھوٹے کیئے۔ پھر نقلی داڑھی مونچھیں لگا کر اس کے اضافی حصوں کو کاٹا۔ پھر سکینہ نے اور میں نے ایک ایک بچہ گود میں لیا اور سیدھے چاچا کی دکان پر پہنچے وہ ایک ساٹھ سالہ بوڑھا تھا مگر صحت کافی اچھی تھی سکینہ نے میرا تعارف بھائی کی حیثیت سے کروایا اور اس سے کھلونوں کا ٹوکرا مانگا۔" پورے چالیس کے قریب کھلونے ہیں۔" کچھ دیر بعد چاچا نے گن کر چالیس مٹی کے کھلونے ایک بڑے ٹوکرے میں ڈال کر بڑے کاروباری لہجے میں کہا اور ساتھ ہی کھلونوں کی قیمت بھی بتائی۔" ہر کھلونے پر دو روپے تیرا منافع اور پر خیال رکھنا۔ کوئی کھلونا ٹوٹا تو وہ تیرے منافع سے کاٹ لوں گا۔" میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر ٹوکرا سر پر رکھ کر کچھ آگے بڑھا تو میں نے کہا۔" بہن اب تو گھر جا۔ میں ذرا پھیرا لگا کر آتا ہوں۔"

وہ حیرت سے بولی۔" بھائی ابھی تو شام ہونے والی ہے صبح تڑکے نکل جانا ابھی تو سارے گاؤں کے لوگ سونے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔"

مجھے اس کی بات مناسب لگی اور پھر ہم واپس جھونپڑی میں آگئے اگلے دن میں ناشتہ کر کے سب سے پہلے سکینہ کے گاؤں کا ایک پھیرا لگایا بیس کے قریب کھلونے تو ہاتھوں ہاتھ بک گئے اب میں نے بقیہ کھلونے اپنے گاؤں جا کر بیچنے کا فیصلہ کیا اور چل پڑا۔

اچانک میری نگاہ سامنے پڑی۔ میں بری طرح ٹھٹکا وہ تین سپاہی تھے جو چند گاؤں والوں کو کھڑا کر کے ان سے پوچھ کچھ کر رہے تھے میرا دل زور سے دھڑکا اور میں نے ان کے قریب سے گزرنا مناسب سمجھا اور اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے ان کے قریب پہنچ کر رک گیا ٹوکرا میرے سر پر تھا میرا خدشہ درست ثابت ہوا تینوں سپاہی میرے بارے میں گاؤں والوں سے پوچھ کچھ کر رہے تھے کہ انہوں نے کسی مشکوک شخص کو اپنے گاؤں میں تو نہیں دیکھا جو ساتھ والے گاؤں کا باسی ہے۔ اور ایک بے گناہ کا قتل کر کے فرار ہو گیا ہے اور انہوں نے پھر میری اور میرے چھوٹے بھائی عثمان کا حلیہ اور نام بتایا مگر وہاں موجود لوگ لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہے

تھے۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا شکر تھا کہ پولیس میری طرف متوجہ نہ ہوئی میں اپنے گاؤں آ گیا۔

گاؤں پر سراسیمگی فضا طاری تھی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا تاہم مجھے تسلی تھی۔ کہ کوئی مجھے پہچان نہ پائے گا۔ کیونکہ میں نے اپنا حلیہ بدل رکھا تھا۔ میں کھلونے والا کھلونے لایا کی صدائے لگاتا ہوا چلا جا رہا تھا پہلے میں نے سوچا کہ میں اپنے گھر جاؤں مگر پھر سب سے پہلے میں نے رشیداں کے گھر آ کر باہر کھلونے والا کھلونے لایا کی صدائیں لگانے لگا تو اندر سے ایک بڑی نسوانی آواز ابھری یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔" بابا آگے جا۔"

میں اس آواز کو پہچان گیا تھا یہ کڑکڑاتی آواز رشیداں کی تھی جب میں بدستور صدا لگاتا رہا تو اچانک دروازہ کھلا اور رشیداں کا جھنجھلایا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔" بابا جاؤ یہاں سے کہا نا...... یہاں کوئی بچہ نہیں ہے جو کھلونے خریدے۔"

میں نے اطراف کا جائزہ لیا پھر رشیداں سے سرگوشی میں بولا۔" رشیداں میں ہوں شریم عثمان کا بڑا بھائی۔" میری بات سن کر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی میں نے پھر اس سے اپنے بھائی کی خیر خیریت دریافت کی اس نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک اور محفوظ ہے مگر ذرا پریشان رہتا ہے۔ کیونکہ رشیداں کے باپ اور سوتیلی ماں کو بھی دیگر گاؤں والوں کی طرح یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عثمان اور شریم قاری ندیم کو قتل کر کے بھاگے ہیں اب اسے ہر وقت مخبری کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور پولیس ہم دونوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔

یہ میرے لئے واقعی پریشان کن بات تھی میں نے رشیداں سے کہا۔" میرے بھائی کو تو پھر یہاں بہت خطرہ ہے تیرے ماں باپ نے پھر اگر اس کی مخبری کر دی تو بڑی مصیبت آ جائے گی۔"

وہ ہمیشہ کی طرح بے نیازی سے بولی۔" وہ دونوں یہ جرأت نہیں کر سکیں گے کیونکہ میرا ابا بھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کے گھر سے قاتل پکڑا جائے اس طرح وہ سب مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔"

" مگر تیری ماں تو کوئی گلا کھلا سکتی ہے ناں۔" میں نے کہا۔

وہ دانت پیس کر اور ہاتھ نچا کر بولی۔" ذرا کر کے تو دکھائے ایسی حرکت میں اس کا گلا نہ دبوچ لوں گی۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک سادہ کپڑوں میں ملبوس پانچ پولیس والوں کا دستہ اچانک نمودار ہوا میں پریشان ہو گیا ساتھ ایک موٹا تھانیدار بھی تھا مگر رشیداں انہیں دیکھ کر ذرا بھی نہ گھبرائی پولیس والے میرے قریب آئے پھر ایک موٹا تھانیدار نے کڑک کر رشیداں سے کہا۔" لڑکی ہم تیرے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا رشیداں بھی سناٹے میں آ گئی تھی موٹا پولیس والا اب بغور ہمارے چہروں پر نظریں گاڑے بری طرح ہمیں گھور رہا تھا میں نے دیکھا کہ رشیداں نے یکدم اپنے تاثرات پر قابو پا لیا اور ناک بھنوں چڑھا کر موٹے تھانیدار سے بولی۔" کیوں میرے گھر کی کیوں تلاشی لینی ہے تم نے۔"

" ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تو نے ان دونوں مفرور قاتلوں میں سے ایک کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔" تھانیدار نے پہلے سے زیادہ کڑک دار آواز میں کہا۔

" گھر میں تیرا ابا ہے تو بلا اسے باہر۔"

" گھر میں میں اور میری ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم نے اپنے گھر کسی قاتل کو پناہ دے رکھی ہے۔" رشیداں نے کمال فنکاری سے اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

" ہم تمہارے گھر کی تلاشی لے کر رہیں گے۔" تھانیدار کڑک کر بولا۔" اے ہے کچھ شرم کرو۔ گھر میں دو عورتوں کے ہوتے ہوئے تم کیسے اندر گھس سکتے ہو پہلے ادھر کھڑے ہو کر میرے ابا کا انتظار کرو۔" رشیداں ہاتھ نچا کر بولی۔ تھانیدار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ادھر میری جی میں آئی کہ خاموشی سے کھسک لو۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

" لڑکی زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر ورنہ تجھے ابھی تھانے لے جا کر سبق سکھا دوں گا۔ میں ذرا وکھری قسم کا تھانیدار ہوں سمجھی تو۔" تھانیدار نے آگ بگولا ہو کر کہا پھر اپنے سپاہیوں سے بولا۔" چلو اوئے تم کیا کھڑے

کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جاؤ گاؤں کے دو چار مردوں کو بلا کر لاؤ۔" دو سپاہی فوراً وہاں سے بھاگے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں قریب کے گھروں سے تین چار مردوں کو لے کر آ گئے تھانیدار زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ رشیداں بھی جیسے منہ دیکھتی رہ گئی پھر وہ سب مکان کے اندر گھس گئے میں بھی ٹوکرا سنبھالے دیگر لوگوں کے ساتھ اندر آ گیا تھا میرا دل بری طرح ڈول رہا تھا عثمان کی گرفتاری اب یقینی ہو گئی تھی۔

اندر صحن میں ہی ایک خراب اندام عورت حیران و پریشان کھڑی تھی میں نے فوراً اندازہ لگایا کہ یہ ہی رشیداں کی سوتیلی ماں ہے۔ رشیداں اس کے لتے دے رہی تھی کہ اس نے یہ جھوٹی اطلاع پولیس کو دی ہو گی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی سوتیلی ماں اس سے بری طرح خائف ہو رہی تھی۔ پولیس کے آدمی گھر کا چپہ چپہ چھان رہے تھے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ عثمان کو برآمد نہ کر سکے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے حیران و پریشان رشیداں کی طرف دیکھا وہ بھی عثمان کے اچانک فرار پر پریشان تھی۔ اسی اثناء میں گاؤں کا ایک آدمی دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور اس نے تھانیدار کو بتایا کہ "ابھی تھوڑی دیر پہلے گاؤں والوں نے عثمان کو دوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ تھانیدار شعلہ فشاں نظروں سے رشیداں کو گھورا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تجھ سے بعد میں اچھی طرح نمٹوں گا اس کے بعد وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ باہر کو لپکا اور پل بھر میں گھر خالی ہو گیا میں بھی کھلونوں کا ٹوکرا لئے باہر آ گیا رشیداں بھی پریشان چہرے کے ساتھ چوکھٹ پر آ گئی۔ میں نے ادھر ادھر نظریں گھمانے کے بعد دھیمی آواز میں کہا۔

"رشیداں یہ..... یہ کیا ہو گیا..... کیا عثمان تیرے گھر میں نہیں تھا۔"

"عثمان میرے پاس ہی تھا۔ پر لگتا ہے کہ اسے پولیس کے آنے کی خبر ہو گئی تھی اور وہ چھت پھلانگ کر بھاگ کھڑا ہوا۔" رشیداں نے پرخیال لہجے میں کہا پھر میں وہاں ایک پل کے لئے نہ رکا اور کھلونے لایا، کی صدائیں لگاتا ہوا سیدھا اپنے گھر کی دہلیز پر پہنچا۔

دروازہ بھڑا ہوا تھا میں اندر گھس گیا سامنے چارپائی پر اماں اور بہن شہزادی آنسوؤں سے لبریز چہرے لئے بیٹھی تھیں ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں میں نے کھلونے کا ٹوکرا فرش پر رکھا پھر لپک کر دروازہ بند کر دیا۔

میری ماں اور بہن شہزادی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے چہرے پر نقلی داڑھی مونچھوں کی وجہ سے نہ پہچان سکے تھیں۔ "اماں یہ میں ہوں شریم۔" میں نے ہولے سے ان کی پریشانی رفع کی۔ "ہائے میرا پتر شریم تو....." ماں نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے خوشی سے بے حال میری طرف بڑھی شریم بھیا شہزادی بھی میرے قریب آ گئی۔ "شریم بیٹے یہ کیا ہو گیا میرا عثمان کہاں ہے۔" ماں نے میرے گلے لگ کر روتے ہوئے کہا میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ساری تفصیل بتا دی۔ اور عثمان کے بارے میں جھوٹ بول دیا کہ وہ بھی خیریت سے ہے۔ "ماں تم لوگ خاموش رہنا انشاء اللہ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے ہم لوگ گھر لوٹ آئیں گے اور ہمارے دامن پر لگے داغ کو بھی مٹائیں گے اماں پر ہمارا ذکر ابھی کسی سے نہ کرنا۔" اماں اور شہزادی کو پہلے سے ہی یقین تھا کہ ہم نے قاری ندیم کا قتل نہیں کیا تھا پھر میں نے ماں اور بہن کی تسلی کی خاطر ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ "میں نے یا عثمان نے یہ قتل نہیں کیا ہے بلکہ یہ فرید نے قتل کیا ہے۔"

انہیں میری بات سن کر تسلی ہو گئی تھی تاہم ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ "پتر پر گاؤں والوں کو تم پر کیسے یقین آئے گا اب تو پولیس بھی تجھے اور عثمان کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"اماں فکر نہ کرو اللہ ہماری مدد کرے گا انشاء اللہ۔"

بہر حال میں وہاں سے باہر نکل آیا۔

گھر سے باہر نکلتے ہی دونوں کے چہرے غمگین ہو گئے میں نے اماں اور بہن کو ایک بار پھر تسلی دی اور اپنے آنسو ضبط کئے کھلونوں کا ٹوکرا اٹھائے باہر آ گیا گاؤں میں شور مچا ہوا تھا عثمان کی گاؤں میں موجودگی اور پھر فرار کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ میں ادھر ادھر

کھلونے بیچنے کے بہانے یہی سن گن لیتا رہا۔ کہ آیا عثمان خدانخواستہ پولیس کے ہتھے چڑھ تو نہیں گیا مگر گھنٹے بھر تک مجھے ایسا کوئی خبر نہ ملی۔ ہر طرف یہی خبر گرم تھی کہ ''عثمان فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے۔'' مجھے عثمان کے رشیداں کے گھر سے فرار ہونے پر دکھ بھی ہو رہا تھا اور میں اس دکھی دل سے یہ سوچ رہا تھا کہ ''یہاں سے فرار ہو کر وہ آخر کہاں جائے گا۔''

مگر میں کیا کر سکتا تھا میں تو اس کے لئے دعائیں ہی مانگ سکتا تھا کہ اللہ میرے چھوٹے بھائی عثمان کو اپنی حفظ وامان میں رکھے میں یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ عثمان ابھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا تو پھر میں فرید کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے پتہ تھا کہ صبح کے وقت اس کا باپ ہی اپنی دکان کھولا کرتا تھا جبکہ فرید دوپہر کا کھانا کھا کر دکان پر جاتا تھا تو پھر اس کا باپ کھانا کھانے آجاتا تھا۔

چنانچہ میرے اندازے کے مطابق کہ اس وقت فرید کو گھر پر ہی ہونا چاہئے تھا میں نے فرید کو چالاکی کے ساتھ پکڑنے کا منصوبہ بنایا تھا اسی لئے مجھے وقت کا انتظار تھا۔ کسی بھی مناسب وقت کا میں نے اس کے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں نے فرید کی ماں کو باہر نکلتے دیکھا اس کے ہاتھ میں کھانے کا ڈبہ تھا میں پریشان ہو گیا کہ فرید گھر پر نہیں تھا میں یہ جاننے کے لئے آگے بڑھا اور فرید کی ماں سے اخلاقاً کہا۔ ''ماں جی فرید آج کدھر ہے جو کھانا آپ لے جا رہی ہیں۔''

''ارے بیٹا آج کل کے بچوں کو جانے کیا ہو گیا ہے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ ''صبح صبح فرید اپنے دوست قاسم کے ساتھ گھر سے نکل گیا ہے کہہ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے شہر جا رہا ہے دوست کی شادی ہے اور وہاں اس کی شادی میں ہاتھ بٹاؤں گا۔'' اس کی بات سن کر مجھے ایک شدید جھٹکا لگا کہ کہیں وہ قاسم کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنی مہم پر تو نہیں روانہ ہو گیا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا اور مزید یہ کہ اس نے قاسم کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا میں خاموشی سے آگے چل دیا پھر کسی نہ کسی طرح فرید کی ماں سے میں نے فرید کے دوست کا پتہ پوچھا تو اس نے اس کا نام زبیر بتایا اور اس کا پتہ بھی بہر حال میں جلدی جلدی سکینہ کے پاس گیا اور اسے سب حال کہہ دیا میرے جانے سے سکینہ پریشان ہوگئی سکینہ نے مجھے اپنی دعاؤں سے رخصت کیا اور میں سیدھا لاری اڈے پہنچا۔ مسافر لاری جب شہر جانے کے لئے گاؤں سے روانہ ہوئی تو سہ پہر کے چار بج رہے تھے شہر پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ مزید لگ سکتا تھا۔

آخر کار شہر آ گیا، میں اڈے پر اترا تو شام ہو رہی تھی میں ایک تانگے پر بیٹھ گیا اپنے مطلوبہ جگہ جانے کے لئے راستے ویران تھے اور سڑک سنسان تانہ چلتا رہا گھوڑا دوڑتا رہا میری سب سے آخری منزل تھی رات کے آٹھ بجنے والے تھے تانگے میں صرف اور صرف دو ہی مسافر بچے تھے وہ بھی آگے ایک چوراہے پر اتر گئے تانگہ اب پہلے سے بھی زیادہ تیز دوڑ رہا تھا شاید خالی ہونے کی وجہ سے اچانک گھوڑے کے زین کی ایک کڑی کھل گئی تانگے والے نے فوراً تانگہ روک دیا۔ ''دھت تیرے کی تجھے بھی ابھی ہی ٹوٹنا تھا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اترا میں بھی نیچے اتر آیا وہ زنجیر جوڑنے میں منہمک ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا اسے خواہ مخواہ ہی بولنے کی عادت تھی۔ ایسے بڑبولے بعض مرتبہ بڑے کام کی بات منہ سے نکال دیتے ہیں۔ اور بعد میں پچھتاتے ہیں اس تانگے والے کے ساتھ بھی یہی ہوا زنجیر جوڑتے ہوئے اس کے منہ سے نکل گیا۔ ''ارے رابعہ کی زنجیر جلدی ٹھیک ہو جا آج تو تاریک جنگل کی سواری ملی ہے منہ مانگا کرایہ ملے گا۔''

میرا ماتھا ٹھنکا دنیا اتفاق سے بھری پڑی ہے قدموں تلے منزل دور ہو جاتی ہے اور دور منزل قدموں تلے آجاتی ہے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تاریک جنگل میں ہی کالی کا مندر تھا جہاں فرید بھالی کی راکھ رام داس کو دینے جا رہا تھا۔ ''چاچا تو کیا تاریک جنگل بھی سواری لے جاتا ہے۔'' میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

وہ اپنے آپ کو کوستے ہوئے بولا کہ اپنے آپ ہی زبان سے نکل گیا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھ چاچا مجھے بھی تاریک جنگل جانا ہے میں تجھے اس کی منہ مانگی رقم دوں گا مجھ سے

ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے سو کا نوٹ نکالا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ خوشی خوشی راضی ہوگیا میں نے ابھی اسے نوٹ نہیں دیا تھا پہلے میں یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ آیا وہ جن لوگوں کو آج رات تاریخ جنگل میں لے کر جانے والا ہے وہ میرے مطلوبہ افراد ہی تھے یا نہیں تانگے والے نے زنجیر جوڑ کر لگام کس دی۔ تانگہ ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اب وہ مجھے ایک کچی بستی کے ایک جھگی نما گھر میں لے گیا اس نے مجھے بتایا تھا کہ تاریک جنگل میں جانے والی پارٹی ادھر ہی آئے گی تانگے والا انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ بہرحال گھنٹہ گزرا تو دروازے کے باہر کسی نہ ہلکی سی سیٹی بجائی۔ "وہ آگئے۔" تانگے والے نے جس کا نام بعد میں شیدا معلوم ہوا تھا بے اختیار کہا میرا دل یکبارگی تیز تیز دھڑکنے لگا اور میں دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ تاریک جنگل میں جانے والی پارٹی فرید اور قاسم ہی ہوں۔ شیدا اس اٹھ کر باہر چلا گیا۔ پھر لوٹ آیا اس کے ہمراہ تین لڑکوں کو دیکھ کر میرا دل مسرت سے دھڑک اٹھا۔ ان میں دو تو فرید اور قاسم تھے جبکہ تیسرا لڑکا جو عمر میں مجھ سے بھی خاصا بڑا اور موٹا تازہ تھا میرے لئے اجنبی تھا۔ شاید فرید کا یہی دوست زبیر تھا۔ اور یقیناً فرید نے قاسم کے ساتھ ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور کوئی بعید نہیں اس نے ہی تاریک جنگل پہنچانے کی ترکیب بھی بتائی ہوگی۔ بہرحال وہ مجھے نقلی داڑھی مونچھوں کے پہچان نہ سکے۔ ان تینوں نے ایک گاہ مجھ پر ڈالی موٹا لڑکا کچھ زیادہ ہی چالاک اور ہوشیار تھا اس نے میرے سامنے ہی تانگے والے سے منہ بنا کر کہا۔ "تم نے تو ہم سے کہا تھا کہ تم صرف ہمیں ہی لے کر جاؤ گے تو پھر یہ کون ہے؟"

مجھے خدشہ ہونے لگا کہ یہ کوئی مسئلہ کھڑا نہ کردے۔ مگر تانگے والا بھی ہوشیار تھا، بولا۔ "کاکا پریشانی کی کوئی بات نہیں یہ میرا اپنا منڈا ہے۔ واپسی میں مجھے اکیلا نہ آنا پڑے اس لئے مدد کے لئے اسے ساتھ رکھ لیا۔" اس کی بات سن کر وہ موٹا مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے معصوم سی صورت بنالی مگر میں وزدیدہ نظروں سے فرید اور قاسم کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ فرید کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پوٹلی تھی مجھے پورا یقین تھا کہ بھالی کی راکھ اسی میں تھی۔

میں اپنے مقصد کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا مگر ابھی جلد بازی کر کے بنا بنایا کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی یہ تین تھے اور میں تنہا اس کا تیسرا پہلوان نما ساتھی مجھے خاصا لڑکا لگا۔ اس لئے میں مناسب وقت کے انتظار میں خاموش رہا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم مختصر سی تیاری کرنے کے بعد تانگے میں آبیٹھے فرید اور قاسم پچھلی سیٹ پر براجمان تھے اور وہ موٹا لڑکا اگلی سیٹ پر تانگہ چل پڑا۔ سفر طویل تھا اس لئے وہ درمیانی رفتار سے گھوڑے کو دوڑائے جا رہا تھا نصف گھنٹے تک تو سڑک پر تانگہ دوڑتا رہا۔ اس کے بعد بائیں طرف کے کچے میں اتر گیا۔

رات گہری ہوچکی تھی وہ تینوں سگریٹ پینے لگے موٹے نے مجھ سے جھوٹے منہ بھی سگریٹ کا نہ پوچھا تھا۔ حالانکہ اس نے تانگے والے کو سگریٹ کی آفر کی تھی۔ جو اس نے جھٹ قبول کر لی تھی۔ میں ویسے بھی سگریٹ نہیں پیتا تھا ہمارا یہ خفیہ سفر جاری تھا کیسی عجیب بات تھی اس تانگے میں ایک گروپ بدی کی قوتوں کو پروان چڑھانے کے ارادے سے براجمان تھا۔ اور دوسرا بدی کے خلاف حق کی قوت کے سہارے اسے نابود کرنے کے درپے تھا اور وہ میرے نیک ارادوں سے بے خبر تھے۔

بہرحال اب ہم میدانی علاقے سے گزر رہے تھے اچانک ہمیں سامنے کسی شخص کا ہیولا دکھائی دیا۔ "یہ کون ہے؟" مجھ سے پہلے اگلی سیٹ پر بیٹھے زبیر نے کہا ہمارے عقب میں بیٹھے ہوئے فرید اور قاسم نے بھی مڑ کر دیکھا شدیے نے بھی یقیناً اس پراسرار انسانی ہیولے کو دیکھ لیا تھا مگر اس نے تانگہ نہ روکا۔ میرا دل دھڑکنے لگا پھر دوسرے ہی لمحے میرے منہ سے نکلا۔

"ارے یہ کہاں غائب ہوگیا چاچا۔"

میری بات پر شیدے نے تانگہ نہ رکوا وہ پراسرار ہیولا غائب ہوچکا تھا۔

"واقعی وہ تو ہمیں دیکھ کر غائب ہوگیا۔" زبیر نے پریشان آواز میں کہا۔

"یونہی ہمارا وہم ہوگا بس آرام سے بیٹھے رہو۔" شیدے نے کہا۔

میں اس خیال سے لرز گیا کہ کہیں یہ بھالی کی بدروح کا تو ہیولا نہیں تھا پھر اگلے ہی لمحے میرے چہرے سے ایک سرد ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔

اچانک فرید نے چلا کر کہا۔" چاچا تانگہ روکو ......تانگہ روکو۔" ہم سب چونک گئے۔شیدے نے بھی گھوڑے کی لگامیں کھینچ لی ۔زبیر یہ...... یہ شریم ہے ہوشیار۔" اچانک فرید نے اپنی گردن موڑ کر میری طرف گھورتے ہوئے زبیر سے کہا۔ اور میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔"یہ کیا بول رہا ہے تو۔کیسے پتہ چلا۔" اس نے میری طرف ایک نظر دیکھ کر فرید سے کہا وہ پرجوش آواز میں بولا۔

"مجھے ابھی بھالی کی بدروح نے میرے کانوں میں سرگوشی کرکے بتایا ہے میری بات کا یقین کر زبیر یہ شریم ہی ہے۔"

وہی ہوا بھالی کی بدروح نے موقع پاتے ہی فرید کو میری اصل حقیقت سے آگاہ کردیا تھا میرا بھانڈا پھوٹ چکا تھا میں نے اچانک پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر فرید کی گود سے پوٹلی اچک لی اور تانگے سے چھلانگ لگادی یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ سب اپنی جگہ سن ہوکر رہ گئے مگر پھر دوسرے ہی لمحے تینوں بھی بیک وقت تانگے سے چھلانگیں ماردیں اور مجھے للکارتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے۔کیچڑ ہونے کی وجہ سے مجھے دوڑنے میں پریشانی ہورہی تھی مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔کیونکہ میرے تعاقب میں دوڑنے والوں کو بھی دوڑنے میں مشکل پیش آرہی تھی میں کئی بار گرتے گرتے بچا مگر میں نے اپنی رفتار نہ گھٹائی دوڑتے دوڑتے اچانک میں رک گیا کیونکہ آگے ایک بڑی نہر کا کنارہ تھا اور دوسری طرف جانے کا راستہ بند تھا یہ دیکھ کر میں پریشان ہوگیا فرید قاسم اور زبیر میرے نزدیک آتے جارہے تھے میں گم سم کھڑا پریشان تھا کہ اچانک مجھے قاری ندیم کی آواز سنائی دی۔"بیٹا پریشان کیوں ہو کامیابی تمہارے سامنے ہے، یہ پوٹلی کو کھول کر اس کی راکھ کو نہر میں بہادو بھالی کی بدروح خود بخود ختم ہوجائے گی جلدی سے یہ کام کرو کالی کا مندر اب زیادہ دور نہیں۔"

یہ سننا تھا کہ میں نے پوٹلی کھولی اور اس میں سے بھالی کے مردہ وجود کی راکھ نکال کر سب کی سب نہر میں بہادی۔راکھ کا نہر میں گرنا تھا کہ اچانک زور کا کڑکا ہوا اور بھالی کی ایک ایک تیز چیخ سنائی دی اس سے پہلے کہ فرید اور اس کے ساتھی میرے نزدیک آتے میں نے بھی نہر میں یہ جانتے ہوئے کہ تیرنا نہیں آتا چھلانگ لگادی میں نہر میں جا گرا۔ جیسے ہی میری ناک منہ میں نہر کا پانی گیا مجھے اپنا کچھ ہوش نہ رہا مدہوش ہونے سے پہلے پہلے شاید میرا یہ آخری خیال تھا کہ چلو مرتے مرتے بھالی کے مردہ وجود کی راکھ کو بھی میں نے نہر کے پانی میں بہا کر نیست و نابود کردیا فرید قاسم اور زبیر بھی کامیاب نہ ہوسکے اور شہزادی نقران جس کو بھالی نے اپنے سحر میں کرکے اس کی روح کو اذیت دے رہا تھا وہ بھی اب آرام سے رہے گی بس اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اچانک ہلکے ہلکے شور کی وجہ سے مجھے ہوش آرہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ میری آنکھیں کھل گئی اور میں حیران سا کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا تو کسمسا کر رہ گیا تب مجھے پتہ چلا کہ میں بندھا ہوا ہوں آہستہ آہستہ مجھے سب باتیں یاد آنے لگی۔

اور جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اپنے گاؤں میں پایا جہاں پر میرے اردگرد سب لوگ موجود تھے ۔پنچائیت کے سرپنچ چوہدری صاحب اور سب گاؤں والے اماں، بہن شہزادی، فرید قاسم اور زبیر یہ سب موجود تھے اور میں زمین پر بندھا ہوا بیٹھا تھا جب اپنے دائیں طرف دیکھا تو وہاں عثمان کو بھی بندھے ہوئے پایا۔عثمان کو بندھا ہوا دیکھ کر میں چونک پڑا کہ وہ بھی پکڑا گیا اور اسکے ساتھ ہی الگ رشیداں بھی کھڑی تھی غرض یہ کہ پنچائیت میں گاؤں کا ہر فرد بوڑھا بچہ جوان اور عورتیں سب موجود تھیں اور سب ہی ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد چوہدری صاحب نے کہا۔"شاباش فرید اور قاسم تم دونوں نے شریم کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہو جو کہ قاری ندیم صاحب کا قاتل ہے۔ہم سب گاؤں والوں کو تم دونوں پر فخر ہے۔ بہر حال ہم سب گاؤں والوں نے یہ

فیصلہ کیا ہے کہ ان دونوں قاتلوں کو پتھر مار مار کر ہلاک کردیا جائے کیونکہ یہ قصوروار ثابت ہوچکے ہیں۔"

یہ سنتا تھا کہ اماں، شہزادی اور رشیداں نے بہت سمجھانا چاہا، بہت منت کی مگر کوئی نہ مانا اماں چیختی چلاتی رہی مگر ان کی کوئی بات نہ سنی گئی سب گاؤں والوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا رکھے تھے اس سے پہلے کہ کوئی پتھر ہمیں مارا جاتا۔

کہ اچانک فضا میں ایک پروقار آواز گونجی۔

"ٹھہرو.....!" سب کی نظریں آواز کی سمت اٹھ گئیں ایک طرف قاری ندیم صاحب کے خادم خاص کریم بخش نمودار ہوئے قاری ندیم کے بعد وہی ان کی گدی پر براجمان تھے اور گاؤں والوں نے ان کو ہی اتنی عزت دی تھی جتنی قاری ندیم کو دیتے تھے کریم بخش چلتے ہوئے چوہدری صاحب کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "ٹھہرو گاؤں والو یہ ظلم نہ کرو۔ یہ دونوں بے چارے تو بے قصور ہیں اصل قصوروار اور قاتل فرید ہے، فرید اور اس کا ساتھ دینے والے قاسم اور زبیر بھی ہے مجھے ابھی نماز کے دوران قاری ندیم صاحب کی روح سے بات چیت ہوئی ہے اور انہوں نے ہی مجھے سب تفصیل سے بتادیا ہے جو میں اب تم سب کو سنانے والا ہوں۔" یہ کہہ کر کریم بخش نے شروع لے کر اب تک سب باتیں بتادیں۔ کہ کس طرح قاری ندیم نے مجھے شہر سے اس کام کے لئے بلایا تھا۔ اور کس طرح فرید نے قتل کیا۔ سوائے شہزادی نفران کے باقی سب باتیں کریم بخش نے بتادی۔

ان کی باتیں سن کر فرید قاسم اور زبیر بھاگنے لگے تو گاؤں والوں نے ان تینوں کو پکڑ لیا اور خوب دھلائی کی اور تینوں کو پولیس کے حوالے کردیا اس کے بعد سب گاؤں والوں نے اور چوہدری صاحب نے مجھ سے عثمان سے اور اماں سے اپنے کئے کی معافی مانگی پھر سے ہماری نئی زندگی شروع ہوگئی۔

میں واپس اپنے میڈیکل کالج آ گیا کالج میں ندیم نادر اور نور محمد نے پوچھا کہ اتنے عرصے کہاں غائب رہے تو میں نے ان کو بھی سب باتیں بتادی وہ بہت ناراض ہوئے کہ ہمیں کیوں نہ بتایا ہم بھی اپنے دوست کی مدد کو آجاتے۔

بہرحال میں نے ان کو کسی نہ کسی طرح منا ہی لیا اتنا کہہ کر شریم چپ ہوگیا۔

شریم کے چپ ہوتے ہی شاہان اور ناگنی چونک پڑے شاہان نے کہا۔ "شریم بھائی آپ کی کہانی تو بڑی ہی پراسرار اور حیرت ناک ہے۔ واقعی تم نے بہت ہمت کی۔" ناگنی نے کہا۔ "شریم بھائی پر ایک بات ابھی تک سمجھ نہ آئی کہ آپ کا یہ وجود یعنی جسم غائب کیسے ہوا اور آپ ہزاروں سال آگے کے دور سے یہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ ابھی تک ہمیں سمجھ نہ آئی۔"

ناگنی کی بات پر شریم بولا ابھی تو آگے کی کہانی ہے۔ جس میں یہ سب کچھ آجائے گا کہ میں کیسے غائب ہوا اور اس پرانے دور میں کیسے آیا۔ شاہان بھائی اور ناگنی آپ بھول گئے قاری ندیم نے بھالی کو نیست و نابود کرنے کے بعد مجھے شہزادی نفران کا مقبرہ ڈھونڈنے کو کہا تھا اور ابھی میں آپ کو وہی سنانے والا ہوں۔

تو میں پھر کالج میں آ کر پھر یونیورسٹی آ گیا میرے ساتھ ساتھ میرے تینوں دوست ندیم، نادر اور نور محمد بھی تھے۔ ہم سب کے اچھے نمبر آتے تھے اور ہم تینوں دوست ہی امریکہ روانہ ہوگئے۔

اسپیشلائزیشن کے لئے شاید قدرت کی رضا بھی میرے ساتھ تھی وہاں ہمارا ایک اور پاکستانی دوست بن گیا یعنی ہم پانچ دوست ہوگئے آخر کار ہم وہاں بھی کامیابی سے آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔

اور پھر اپنی زندگی کا پہلا اور مشکل ترین آپریشن میں نے امریکہ کے ہی اسپتال میں کیا تھا وہ ایک غریب انسان تھا گولیوں سے زخمی تھا قلب کو نقصان پہنچا تھا اور وہاں کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا کہ یہ آدمی کچھ ہی دیر کا مہمان ہے۔ اس وقت میں نے رسک لیا اور میرے ساتھ میرے چاروں دوست بھی تھے۔ میری عمر اس وقت تیس برس تھی جبکہ بڑی بڑی عمر کے تجربہ کار ڈاکٹرز وہ کیس رد کر چکے تھے پھر بھلا میری حیثیت ہی کیا تھی لیکن شاید قدرت کو میری کامیابی منظور تھی کہ حیرت انگیز طور پر وہ آپریشن کامیاب رہا۔ اور پھر میرا نام ہوا کے ساتھ ساتھ چاروں طرف پھیلتا چلا گیا۔

اور جب میں واپس پاکستان پہنچا تو میں ایک معمولی ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑا ہارٹ اسپیشلسٹ تھا جس کے ہاتھوں میں خدا نے کرشمات چھپا دیئے تھے۔ بس چاروں طرف سے مجھے آفرز آنے لگی بڑے بڑے ملکوں کی یونیورسٹیز میں لیکچر دینے کے لئے مجھے مدعو کیا جانے لگا۔ پیچیدہ ترین آپریشن کے لئے مجھے مختلف ممالک جانا پڑتا اور میرے بینک اکاؤنٹ میں ہزاروں لاکھوں ڈالرز کا اضافہ ہوتا گیا بہت تھوڑے عرصے بعد مجھے اتنا کچھ مل گیا تھا کہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً میرے لئے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

پھر میں نے اپنے گاؤں میں اپنا اسپتال قائم کرنے کا سوچا۔ جہاں کہ بیسیوں میل تک کوئی اسپتال نہ تھا مگر آبادی اب پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی تھی سو میں نے اپنی اس سوچ پر عمل درآمد بھی فوراً ہی کر ڈالا اور آخر کار میں نے اپنے گاؤں کے جنوب میں ایک عظیم الشان اسپتال کا افتتاح کر ڈالا۔

اس اسپتال کی تعمیر اور بہتری کے لئے حکومت نے میری ہر ممکن مدد کی حالانکہ حکومت مجھے سرکاری حیثیت دینے کے لئے تیار تھی۔ بڑے سے بڑا عہدہ دینے کے لئے رضا مند تھی مگر شروع سے ہی میری فطرت کچھ عجیب سی تھی۔ سو میں نے کسی کا کوئی احسان نہیں لیا اور نہ ہی خود کو کسی کی پابندی میں دینا گوارہ کیا سو سب سے الگ تھلگ اپنی دنیا بسالی تھی یعنی اپنی ایک الگ چھوٹی سی سلطنت اور ساتھ ساتھ مجھے خاص طور پر مزید میرے چاروں دوست سینئرز ڈاکٹرز کا تعاون حاصل رہا۔ یعنی ندیم عباس، نادر شاہ، نور محمد اور وہاب کا تھا جو ہر جگہ میرے ساتھ ہی تھے۔ اسپتال کا سارا عملہ بھی انہوں نے خود ہی ایڈجسٹ کرلیا تھا اور میں نے سکینہ بہن اور اس کے دونوں بچوں کو بھی وہاں ہی بلوالیا تھا مشکل وقت میں سکینہ بہن نے میری بہت مدد کی تھی اس کے لئے میں نے ایک اچھا سا مکان بنوا دیا تھا۔ اسپتال کا افتتاح ہوا تو سب اپنی اپنی جگہ مصروف ہوگئے چاروں طرف کی بستیوں اور گاؤں کے مختلف رئیسوں، چوہدریوں کے پیغام اور دعوت نامہ میرے نام آنے لگے روز روز کی دعوتوں سے میں اس قدر تنگ آگیا کہ کچھ عرصے کے لئے میں نے خود کو اسپتال میں پوری طرح ریزو کرلیا تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا آس پاس کے علاقوں سے ایسے مریض جن کے امراض خطرناک تھے یا شدید اور مختلف امراض میں مبتلا ہونے کے باعث دور دراز کے اسپتالوں میں ایڈمٹ تھے۔ اور دوری کے باعث مسلسل دہری پریشانیوں کا شکار تھے وہ بھی اب یہاں پر ٹرانسفر ہو رہے تھے اور پورا عملہ مصروف کار تھا۔

ایک رات مجھے ایک عجیب ہی خواب نظر آیا مجھے قاری ندیم کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ نظر نہیں آرہے تھے وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ "شریم تیار ہو جاؤ اب پھر تم پر ایک امتحان جو ادھورا تھا آنے والا ہے شہزادی نفران کا مقبرہ ڈھونڈنے کا۔" اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی لگتا تھا کہ یہ مجھے یاد دہانی کے لئے خواب نظر آیا تھا۔

بہر حال اگلے دن میں اپنے آفس میں تھا کہ اس روز ایک خاص ہی واقعہ ہوگیا ایک ایمرجنسی آپریشن آیا ہوا تھا بظاہر تو اس واقعہ میں کوئی حیران کن یا خاص بات نہیں تھی بلکہ یہ ایک قابل افسوس واقعہ تھا۔

چند مزدور اپنے ایک ساتھی کو لے کر آئے تھے۔ وہ خون میں لت پت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے دائیں کندھے پر کدال لگی تھی اور کندھے کی ہڈی کو چورہ چورہ کرگئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان صرف بے ہوش تھا۔ اور بظاہر وہ زخمی بھی نہیں تھا جب اسے آپریشن روم لے جایا جا چکا اور آپریشن شروع ہوگیا تو ان کے ساتھ جوان کا سپروائزر تھا میں نے اسے طلب کیا اور اس نے حادثے کے رونما ہونے کی جو وجہ یا کہانی کی صورت اس نے میرے گوش گزار کی وہ مجھے بڑی دلچسپ لگی۔

سپروائزر کا نام رحمان تھا میں نے اسے آفس میں بلایا۔ اور سوال جواب شروع کئے۔ "مسٹر رحمان آپ نے بتایا نہیں کہ اس کو کدال کیسے لگی۔" اس سوال کے جواب میں رحمان نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب ہم یہاں سے کچھ دوری پر کھدائی کا کام کر رہے ہیں۔ سبھی اپنی محویت میں کھدائی کر رہے تھے کہ اچانک یہ جوان چیخ پڑا پتہ چلا کہ دوسرے مزدور نے اس پر عقب سے حملہ کیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی کہ یہ کھدائی کر رہا تھا کدال کا وار کرنے کے لئے جیسے ہی

سامنے کی جانب جھپکا دوسرے مزدور نے عقب سے کدال کھینچ ماری اگر یہ جھک نہ گیا ہوتا تو کدال کندھے کے بجائے اس کی کھوپڑی پر پڑتی اور اس کی کھوپڑی ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ حملہ کرنے والا اس کا سگا بھائی تھا اور ان دونوں نے ایک دوسرے میں جان ہے اور اب غم کی شدت سے بار بار اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں یہ جو دوسرا نوجوان بے ہوش تھا نا اسی نے وار کیا تھا۔

"حیرت ہے جب اتنی ہی محبت تھی تو اس نے اس کو جان سے مارنے کی کوشش کیوں کی؟"

"یہ وار اس نے از خود نہیں کیا بلکہ نہ چاہنے کے باوجود وہ ایسا کر بیٹھا۔"

"مطلب تو مجھی معلوم نہیں مگر بے ہوشی سے قبل اس نے سرسری طور پر بتایا تھا کہ وہ کھدائی کر رہا تھا اس کا بھائی اس سے دو قدم آگے اپنے کام میں مگن تھا کہتا ہے کہ" اچانک جب کہ کدال میں نے سر سے بلند کر رکھی تھی مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے فضا میں ہی تھام لیا ہو میں نے زور لگایا مگر کدال نیچے نہ آئی پھر میں نے کدال چھوڑنا چاہی مگر باوجود کوشش کے چھوڑ نہیں پایا مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ بھائی کے سر میں لگے گی میں نے چیخ کر اسے خبردار کرنا چاہا مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل پائی پھر اچانک وہ بھائی کے کندھے میں اتر گئی۔"

میں بغور رحمان کی صورت دیکھ رہا تھا وہ پوری طرح سنجیدہ تھا اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات اس کے سچ کی گواہی دے رہے تھے میں نے بے یقینی کے سے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "رحمان کیا یہ بات قابل قبول ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے میں ہرگز نہیں مانتا اس کہانی کو حالانکہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا بھائی کی وجہ سے پھر بھی دل نہیں مان رہا تھا اس بات کو۔"

"آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوگا۔"

چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔ "اچھا یہ کھدائی کس سلسلے میں ہو رہی تھی۔"

رحمان مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں چھپے ہوئے طنزیہ تاثرات کو میں نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ "ایک خشک دماغ بوڑھا ہے اس کا خیال ہے کہ اس جگہ زمین کے نیچے صدیوں پرانا کسی شہزادی کا کوئی مقبرہ دفن ہے اور وہ اسے دریافت کرنا چاہتا ہے۔"

"ہوں پھر کیا کوئی آثار ملے۔" حالانکہ میں خود چونک گیا تھا شہزادی کے مقبرے کے نام سے کہ کہیں یہی تو نفران شہزادی کا مقبرہ نہ ہو۔ رات ہی قاری ندیم کی طرف سے ہدایت ملی اور آج صبح ہی یہ واقعہ ہو گیا۔

میری بات پر رحمان بولا۔ "نہیں ابھی تک تو کوئی آثار نہیں ملا اور شاید آئندہ پچاس سال تک کوئی آثار ملے بھی نا۔" اس کے بعد رحمان چلا گیا اور میں اس بے ہوش ہوجانے والے نوجوان سے ملا تو میری دریافت کرنے پر اس نے بھی وہی کہانی دہرائی جو میں رحمان کی زبانی سن چکا تھا۔ وہ سب تو واپس جا چکے تھے البتہ زخمی ہونے والا مزدور کم از کم تین چار ہفتے کے لئے روک لیا تھا اسے اپنے بھائی سے کوئی شکایت بھی نہ تھی کہ اس نے اس پر اتنا قاری وار کیا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔

پھر تقریباً ایک ماہ تک رحمان سے میری ملاقات نہ ہوئی اور تقریباً ایک ماہ گزر گیا زخمی ہونے والا مزدور اب تندرست تھا گو کہ اس کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا۔ مگر اب وہ بہت بہتر تھا سوا اسے ڈسچارج کیا جا سکتا تھا۔

اس کا بھائی اور رحمان اکثر آتے رہتے تھے مگر میری ان سے ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ زخمی ہونے والے مزدور سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی کھدائی کا کام بند ہو چکا ہے وجہ معلوم نہ تھی آخر ایک دن رحمان آیا اور میری اس سے ملاقات ہوگئی۔

"بس ڈاکٹر صاحب چند عجیب و غریب واقعات ظہور پذیر ہوئے اور وہ بوڑھا خوف زدہ ہو کر شہر ہی چھوڑ گیا۔ اور اسی وجہ سے کام درمیان میں ہی رک گیا۔"

میرے پوچھنے پر رحمان نے تفصیل بتائی۔ بھلا ایسے کیا عجیب و غریب واقعات تھے جو وہ اتنا گھبرا گیا کہ شہر ہی چھوڑ بھاگا رات کے وقت ہم کیمپوں میں سویا کرتے تھے اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنے کام کا آغاز کر دیتے تھے پچھلے چھ دنوں سے سب ہی ایک نامعلوم

سے خوف کا شکار تھے اور سب ہی کی متفقہ رائے تھی کہ اس علاقے میں کچھ نادیدہ وجود بھی موجود ہیں۔ جوان کے اردگرد چکراتے پھرتے ہیں۔

اکثر مزدوروں نے رات کو کچھ پراسرار انسانی ہیولے وہاں چکراتے، ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا۔ اور ایک رات تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ کوئی دوشیزہ تھی اس نے قدیم طرز کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ ایک مخصوص جگہ پر دائرے کی صورت میں چکرا رہی تھی اس کے جسم کے کھلے حصوں میں سے ایک عجیب قسم کی روشنی منعکس ہورہی تھی اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرے سے دودھیا رنگ کی سبزی مائل روشنی پھوٹ رہی تھی۔ فاسفورس نما اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہ چاند کی مدہم روشنی میں ہی مرغم ہوکر رہ گئی۔

اور تو اور رات کو اکثر کسی عورت کے رونے اور کراہنے کی آوازیں آتیں جب گمبھیر خاموشی چاروں طرف پھیل جاتی۔ اور باوجود کوشش کے ہم کسی عورت کو تلاش کرنے میں ناکام رہے پھر آخر کار وہ بوڑھا خوف زدہ ہوکر تمام سامان مشینیں اور اوزار وغیرہ سمیٹ کر بھاگ نکلا۔ پر اس کی وجہ کچھ سمجھ نا آئی کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔

”بہت سے لوگ ان واقعات کے گواہ ہیں اور اگر پھر بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ خود چار دن وہاں رہ کر کھدائی کروا کر دیکھ لیں۔ آپ کو خود بھی کچھ نہ کچھ نظر آ ہی جائے گا۔“

رحمان کی بات پر میں چونک پڑا کہ میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ وہاں کھدائی کرواؤں تا کہ اندازہ تو ہو کہ شہزادی کا جسم کہاں ہے کہیں اس جگہ تو شہزادی نفران کا مقبرہ نہیں۔“

بہرحال رحمان کے الفاظ پانی پھینکے ہوئے پتھر کی طرح میرے دماغ کی گہرائیوں میں بیٹھتے چلے گئے اور میں یک ٹیک رحمان کو دیکھنے لگ گیا لیکن میرا ذہن میری بصارت کی جانب متوجہ نہ تھی بلکہ کسی اور جانب متوجہ تھی یعنی شہزادی نفران کے مقبرے کی طرف۔

”آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ رحمان قدرے پریشان ہوگیا میرے زیرِ لب ایک مسکراہٹ ابھی آئی میں نے بدستور اس کے چہرے پر نظر جمائے اسے مخاطب کیا۔ ”رحمان ابھی ابھی تم نے کہا کہ“ میں خود کھدائی کروا کر دیکھ لوں کہ مجھے کچھ نہ کچھ نظر آ جائے گا۔“

”ہاں میں نے یہ اس لئے کہا تھا کہ ظاہر ہے آپ کو کھدائی کے دوران وہاں قیام کرنا ہوگا۔ یا آپ چاہیں تو ایسے ہی چار راتیں وہاں گزار لیں کوئی نہ کوئی تو پراسرار واقعہ پیش آ ہی جائے گا تو پھر آپ کو میری ہر بات پر یقین آ جائے گا۔“

”رحمان اگر میں کھدائی کروا کر وہ مقبرہ تلاش کرنا چاہوں تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

”مم...... مم میں کیوں جی۔“ میں نے صاف محسوس کیا کہ ایک لمحے کو رحمان کے چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی مگر جلدی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”کیا بات ہے رحمان کیا تم وہاں دوبارہ سے کھدائی کرنے سے خائف ہو۔“

”نہیں تو ڈاکٹر صاحب ایک تو آپ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں آپ کا اسپتال ہے اور اس اسپتال کو آپ کی ضرورت ہے بھلا آپ کو ویرانوں کی خاک چھاننے کی کیا ضرورت ہے؟“

”رحمان میں انسانی دلوں کا آپریشن کرتا ہوں اب میں نے سوچا کہ ایک آپریشن اس سنگلاخ زمین کا بھی کر کے دیکھ لو جہاں تم لوگ ناکام ہو چکے ہو۔ ممکن ہے کہ مجھے اس زمین کے دل تک رسائی ہوجائے۔“ میں نے کہا۔

”مگر ڈاکٹر صاحب نہ کوئی مشین ہے اور نہ ہی اوزار ہیں مزید کھدائی ہاتھوں سے تو نہیں کی جاسکتی اور کھدائی کے مکمل سامان پر تو بہت زیادہ اخراجات آئیں گے اسٹون ڈرلز، ڈرل مشین، جیکر مشین اور بھی بہت سامان...... یہ سب کہاں سے آئے گا ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”تم اتنے دنوں تک کدائی کرتے رہے ہو تمہیں معلوم تو ہوگا کہ مزید کتنی اور کھدائی ہوگی؟“

”ڈاکٹر صاحب وہ تو ابتدائی کھدائی تھی اصل کام

تو اب شروع ہوا تھا اور مزید کتنی کھدائی کرنا ہوگی اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہوسکتا ہے کہ ابھی مزید سینکڑوں فٹ گہرائی تک کھدائی کرنی پڑے۔"

میں چند لمحے خاموش رہا مجھے اب تو روپے کی فکر نہ تھی میں جدید سے جدید مشینری حاصل کرسکتا تھا اور میں وہ جگہ چیک کرنا چاہتا تھا کہ کہیں وہی جگہ شہزادی نفران کا مقبرہ نہ ہوں تاکہ میں شہزادی کی روح کو بھی بحالی کے طلسم سے نجات دلاسکوں میں نے رحمان سے کہا۔" رحمان کیا تم میرا ساتھ دوگے؟"

ڈاکٹر صاحب اگر آپ مشینری کا مناسب بندوبست کرلیں تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" رحمان نے کندھے اچکائے اور میں مسکرا اٹھا۔" تو ٹھیک ہے تم تمام مشینری اور ضروریات کی ہر چیز کی لسٹ تیار کرکے مجھے دو اور مزدوروں کو تیار کرو اب ہم جلد ہی کھدائی شروع کردیں گے۔"

مجھے اب فکر بھی نہیں تھی ماں عثمان کے ساتھ باہر تھی اور شہزادی کی شادی ہوچکی تھی اور اب میں اکیلا رہ گیا تھا۔

کھدائی کا یہ مقام اسپتال اور موئن جودڑو سے تقریباً دس بارہ کلو میٹر دور واقع تھا۔ یوں تو صحرائی علاقوں کے علاوہ ایسے علاقے بھی تھے مگر کم تھے یہ ایک پہاڑی خطہ تھا جس کے دونوں اطراف میں چٹانیں بکھری ہوئی تھیں یہ چھوٹا سا چٹانی خطہ اگر عبور کرلیا جاتا یا کسی بلند چٹان کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھا جاتا تو لق و دق صحرا ہی صحرا دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز میں اسی مقام پر کھڑا تھا۔ اس جگہ کے دامن میں گھاس اور جنگلی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں اس کے دامن میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔

بہرحال ہماری جو مطلوبہ جگہ تھی وہاں جگہ جگہ پر گڑھے پڑے ہوئے تھے مٹی اور پتھر کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے اور اس مقام سے کچھ دوری پر کسی کھنڈرات کے آثار نظر آتے تھے مگر انہیں ابھی دیکھنے کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا تھا کسی نے اس ویرانے کو آباد کرنے کی کوشش کی ہوگی پر نجانے ایسے کیا حالات رہے ہوں گے کہ وہ بنے بنائے مکان چھوڑ کر چلے گئے اب وہ مکانات کھنڈرات میں تبدیل ہوچکے تھے۔

تمام سامان اور مشینیں ارینج کرنے میں مجھے تقریباً ایک ماہ کی مدت لگی تھی خیمے لگ چکے تھے جنریٹر مناسب جگہوں پر فٹ کرلئے گئے تھے مشین چالوں تھیں اور کام شروع ہوچکا تھا آج ہی کام کا افتتاح ہوا تھا۔ شاید میں اس علاقے کی طرف کبھی نہ آتا مگر رحمان نے کچھ ایسے ایسے واقعات کا ذکر کیا تھا کہ مجھے تجسس میں ڈال دیا تھا اس سے ایک رات پہلے ہی قاری ندیم کی طرف سے مجھے شہزادی نفران کے مقبرے کی ہدایت دی گئی تھی۔

بس میں فیصلہ کرچکا تھا کہ اس جگہ کو چیک کرنا چاہئے شاید میری قسمت ساتھ دے اور میں شہزادی نفران کا مقبرہ پالوں۔

تقریباً پچاس فٹ تک کھدائی ہوچکی تھی۔ مزید ابھی جاری تھی مگر صورت حال کچھ ایسی تھی کہ جو اس زمین کی تو بانجھ ہونے کی گواہی دے رہی تھی ان دنوں سخت گرمی کے دن تھے سورج سے بھی آگ برستی تھی اور زمین بھی حبس اگلتی تھی شام کا اندھیرا پھیلتے ہی مشین روک دی گئی اور کام بند کردیا گیا تمام مزدور ایک جانب خس کی بنی ہوئی صفوں پر ہلکا ہلکا پانی چھڑک کر ان پر جا بیٹھے اور آپس میں محو گفتگو ہوگئے کھانا وغیرہ اسپتال سے ہی تیار ہوکر آتا تھا۔

رات تقریباً نو بجے کے قریب میرا ملازم شہاب کھانا لے کر آگیا میری جیپ ان دنوں اسی کے استعمال میں تھی۔ کھلی فضا میں دریاں بچھائی گئیں اور کھانا لگادیا گیا سب مزدور چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھ کر کھا رہے تھے میں رحمان اور شہاب ایک طرف بیٹھے کھانا کھا رہے تھے چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

"کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو میں نے رحمان کو مخاطب کیا۔" رحمان وہ جو اس طرف کھنڈرات نظر آتے ہیں وہ کیسے ہیں؟"

"ان کے بارے میں جی میرے پاس کوئی ٹھوس معلومات نہیں ہیں۔ روایات در روایات سنا ہے کہ۔"

(جاری ہے)



سچی محبت

محمد قاسم رحمان۔ہری پوری

محبوبہ کے سامنے عاشق کا روپ اچانک بدلا، اب وہ ایک خبیث آسیب بنا کھڑا تھا، جسے دیکھ کر محبوبہ انگشت بدنداں رہ گئی لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک منظر رونما ہوا جو کہ......

حقیقت سے چشم پوشی اور دل ناداں کا کہا ماننے والوں کے لئے...... سبق آموز کہانی

ایمن کو آج کیمسٹری کے لیکچر کی بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کیونکہ آج کا ٹاپک ہی بہت ٹف تھا۔ بیماری کی وجہ سے ایمن کی پچھلی کوئی کلاسز مس ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ پچھلے کئی Basic Concepts سے بالکل لاعلم تھی۔ اوپر سے کلاس کے دوران بار بار ایمن کی طرف حاشر دیکھ رہا تھا جس کی وجہ سے ایمن کو سخت کوفت ہورہی تھی، اللہ اللہ کرکے پیریڈ اور ہوا اور دھیرے دھیرے کلاس سے سارے اسٹوڈنٹس نکلتے گئے۔ صرف ایمن اور حاشر کلاس میں اکیلے رہ گئے ایمن اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور حاشر کے پاس آکر بولی۔ ”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے ہر وقت مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے ہو کیا تمہیں پتہ نہیں کہ میں تمہاری نظروں کی وجہ سے کتنی نروس ہوجاتی ہوں، لیکچر پر توجہ نہیں دے پاتی۔ ہاں اب سمجھ آئی مجھے پچھلے سمسٹر میں، میں نے ٹاپ کیا تھا، اس وجہ سے تم مجھ سے

جلنے لگے ہو اور میرا دھیان اسٹڈیز سے ہٹانا چاہتے ہو۔"

عاشر، ایمن کی ساری باتیں سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔" ایمن میں نے کب ایسا کیا ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میری محبت پر یقین کرلو، میری چاہت پر ایمان لے آؤ، میری محبت کو شک کی نگاہ سے مت پرکھو اور رہی بات جلنے کی تو میں تم سے کیوں جلوں گا کیونکہ حسد کروں گا جبکہ میری خواہش بھی یہ ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں، ہر مقابلے میں تم سب سے آگے رہو۔"

"واہ واہ؟" ایمن تالیاں مارتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے آپ کی کل تک میری دوستی کے خواہاں تھے۔ آج محبت کے دعوے دار بن کر مجھ سے میری چاہت کا تقاضہ کرنے لگے۔ کل کو کہو گئے کہ میں تمہارے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں دیکھو عاشر میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں جو تمہاری محبت کے جال میں پھنس جائے گی تم کسی اور پر ڈورے ڈالو سمجھ گئے ناں۔" ایمن پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"دیکھو ایمن اب تم میری محبت کی توہین کر رہی ہو۔ ہم پچھلے تین سالوں سے ساتھ پڑھ رہے ہیں کیا تم نے میرے کریکٹر میں کوئی خرابی دیکھی۔ ایمن کاش میں تمہیں اپنا دل کھول کر دکھا سکتا جو فقط تمہاری محبت سے لبریز ہے۔"

"اپنی بکواس بند کرو۔" ایمن غصے سے بولی۔" پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھ سے کوئی محبت وحبت نہیں کرتے بصرف میرے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور میں تمہارے جال میں پھنسنے والی نہیں دوسری بات کہ اگر تم مجھ سے محبت کرتے بھی ہو تو تمہاری محبت یکطرفہ ہے کیوں کہ میں کسی اور میں انسٹرسٹڈ ہوں۔"

"تم کس میں انٹرسٹڈ ہو، میں نہیں جانتا لیکن میں تمہیں اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ جتنا پیار میں تم سے کرتا ہوں اتنا پیار تم سے کوئی نہیں کرسکتا..... تم اپنے لئے میری چاہت کا اندازہ کبھی نہیں لگا سکتی۔" عاشر کے لہجے سے ایمن کے لئے محبت ٹپک رہی تھی۔

"مجھے تمہاری گھٹیا چاہت کا اندازہ لگانے کی ضرورت بھی نہیں میں جا رہی ہوں اور آئندہ کے بعد پلیز مجھ سے بات بھی مت کرنا آئی جسٹ ہیٹ یو۔ (میں تم سے نفرت کرتی ہوں)" ایمن اتنا کہہ کر کلاس روم سے باہر نکل گئی اور عاشر نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں اس کی پلکوں سے نکلتے ہوئے آنسو اس کے گالوں کو بھگونے لگے تھے۔

ایمن گھر واپس آئی تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ ایمن اپنی حد میں رہنے والی لڑکی تھی وہ کسی کو اتنا فری نہ کرتی تھی سوائے فراز کے۔ فراز جو اس کی محبت، اس کا عشق تھا۔

"ایمن کیا بات ہے منہ کیوں بنا ہوا ہے تمہارا۔" ایمن کے خراب موڈ کو اس کی امی نصرت بیگم نے بھانپ لیا تھا۔

"کچھ نہیں امی بس ویسے ہی...... سر میں ہلکا سا درد ہے ٹیبلٹ لوں گی تو آرام آجائے گا۔" ایمن نے نرمی سے کہا۔

"نصرت بیگم اس کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ "تمہیں پتہ ہے کہ آج ہاجرہ آپا آرہی ہیں۔"

"خالہ جان آرہی ہیں۔ اچانک کیوں؟"

"وہ تمہارے لئے راحیل کا رشتہ لے کر آرہی ہیں۔" نصرت بیگم نے کہا اور ایمن دنگ رہ گئی۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ راحیل بھائی کا رشتہ میرے لئے۔ پلیز آپ انہیں فوراً منع کردیں۔" ایمن الجھے ہوئے لہجے میں بولی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔

"منع کردوں؟ لیکن کیوں؟" نصرت بیگم حیرت سے بولیں۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم راحیل کو پسند کرتی ہو۔"

"فار گاڈ سیک امی...... میں راحیل بھائی کو پسند کرتی ہوں ایسا آپ نے سوچ بھی کیسے لیا وہ صرف میرے اچھے کزن اور دوست ہیں۔" ایمن نے کہا۔

"کیا......؟" تو کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" نصرت بیگم نے سوالیہ لہجے میں ایمن سے پوچھا۔ ایمن کے دل نے کہا۔ "یہ اچھا موقع ہے بتا دے ایمن بتا دے۔"

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے ایمن۔" نصرت

بیگم کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ ایمن کے حوصلے پست ہونے لگے لیکن پھر بھی اس نے ہمت کرکے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"کون ہے وہ؟ یونیورسٹی میں کوئی کلاس فیلو ہی ہوگا یقیناً...... یہ ساری کو ایجوکیشن کی غلطی ہے۔ میں نے پہلے ہی تمہارے باپ کو کہا تھا لیکن مجال ہے جو میری کسی بات کی اہمیت ہو اس گھر میں، ہر فیصلہ صرف باپ اور بیٹی نے ہی لینا ہے تو میری اس گھر میں ضرورت ہی کیا ہے۔" نصرت بیگم کا غصہ ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

"امی ریلیکس ہو جائیں پلیز! جیسا آپ سمجھ رہی ہیں ویسا بالکل بھی نہیں ہے وہ میرا کلاس فیلو نہیں ہے۔" ایمن نصرت بیگم کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"تو کون ہے وہ؟" نصرت بیگم مسلسل ایک ہی رٹ لگائے بیٹھی تھیں۔

"شام کو، میں آپ کو ملوا دوں گی اس سے ......اور آپ پلیز ابھی ریلیکس ہو جائیں اور خالہ کو فون کرکے بتا دیں کہ اب انہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایمن نصرت بیگم کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"ہائے اللہ میں اب اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

☆......☆......☆

حاشر کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے ابو ندیم علی آرمی ریٹائرڈ تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد دو تین کریانے کے بڑے اسٹور چلا رہے تھے۔

حاشر یونیورسٹی میں پہلے دن سے ہی ایمن کو دل وجان سے چاہتا تھا۔ جب اس نے ایمن کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اس کے دل کے مندر میں گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں تب سے اپنا ہر پل ہر لمحہ اس نے ایمن کی چاہت کی نظر کر دیا تھا۔ لیکن ایمن، حاشر کی محبت کو ماننے سے مسلسل انکاری تھی۔ لیکن حاشر نے ہمت نہ ہاری۔ اسے خود پر اور اپنی محبت پر یقین کامل تھا کہ ایک ایمن ضرور اس کی محبت کو تسلیم کرے گی اور اس کے پیار کا جواب پیار سے دے گی لیکن آج حاشر کی ساری امیدیں ٹوٹ گئی تھیں

درحقیقت وہ خود ہی ٹوٹ کر بکھر گیا تھا کیونکہ ایمن کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ ایمن کی خوشی کسی اور میں تھی حاشر کے ساتھ رہنے میں نہیں اور یہ احساس حاشر کے لئے بہت اذیت ناک اور درد ناک تھا لیکن حاشر کو ہر صورت میں ایمن کی خوشی عزیز تھی اس لئے اس نے اپنی محبت قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا کیوں کہ وہ محبت میں سودے بازی کا قائل نہ تھا حاشر کے دماغ میں مسلسل یہ ہی بات آرہی تھی کہ نجانے وہ کون خوش نصیب ہوگا جو ایمن کی محبت کا حق دار ٹھہرے گا۔

☆......☆......☆

"فراز، امی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔" ایمن نے کہا اور فراز اس وقت پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"تمہاری امی مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔" فراز حیرت سے بولا۔

"کیونکہ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" ایمن نے کہا۔

"کیا......تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا لڑکی۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا نہ کہ ابھی کسی کو کچھ نہیں بتانا اور تم نے اپنی امی کو بتا دیا۔ کیا میں وجہ جاننے کی جسارت کرسکتا ہوں؟" فراز کا موڈ سخت آف ہوگیا تھا۔

"کیوں کہ امی میرا رشتہ میرے کزن کے ساتھ کرنے والی تھیں اس لئے مجبوراً مجھے امی کو سب سچ بتانا پڑا کیونکہ اس وقت میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں تھا۔" ایمن نے جواب دیا پھر اس نے فراز سے پوچھا۔

"کیا میں وجہ جان سکتی ہوں کہ تم ہماری محبت کو اتنا پوشیدہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟ ارے جب میں لڑکی ہو کر اتنا نہیں ڈر رہی تو تم مرد ہو کر کس چیز سے خوف زدہ ہو۔" ایمن بے زاری سے بولی۔

"ہاں خوف زدہ ہوں کیونکہ میں پہلے خود کو کسی قابل بنانا چاہتا ہوں اپنا ایک برائیٹ کیریئر بنانا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں زندگی کا ہر وہ سکھ دے سکوں جس کی تم مستحق ہو۔ لیکن اس سے پہلے میں کسی کے سامنے بھی اپنی محبت کا ڈھونڈرا

نہیں پیٹنا چاہتا۔" فراز نے کہا۔ اس کے لہجے سے غصہ مترشح تھا۔

"دیکھو فراز تم اپنی جگہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ایک دفعہ امی سے مل لو۔ میں ان کی بیٹی ہوں اور ماؤں کے اپنی بیٹیوں کی شادی کو لے کر کتنے سپنے ہوتے ہیں یہ تم بھی جانتے ہوگے۔ ایک دفعہ میری امی کی تسلی کے لئے ان سے مل لو۔"

"اب مجھے ملنا ہی ہوگا۔" فراز عجیب سے انداز میں بولا۔ "اگر میرے ماں باپ زندہ ہوتے یا کوئی بھائی بہن ہوتے تو میں اتنا نروس فیل نہ کرتا اپنی شادی اور اپنی محبت کی بات خود کرنا واقعی بہت دشوار ہے۔ کم از کم میرے لئے۔" فراز نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے فراز اب میں جاتی ہوں ابھی پانچ بجے ہیں۔ شام ساڑھے چھ بجے تک ہمارے گھر آ جانا ...... آ ؤ گے ناں۔"

اور فراز نے اثبات میں ہلا دیا۔ ایمن وہاں سے چلی گئی فراز خود سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں ایمن آج رات کو آؤں گا میں لیکن تمہاری اس موٹی ماں سے ملنے نہیں بلکہ تمہیں لے جانے اپنی دنیا میں میرا ابھی تمہارے بغیر رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔"

اس شام ایمن اور نصرت بیگم نے فراز کا بہت انتظار کیا تھا۔ لیکن فراز نہ آیا تب نصرت بیگم نے ایمن کو خوب اچھی طرح لتاڑا اور ایمن دلبرداشتہ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر رونے لگی اور روتے روتے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلی صبح ایمن گھر سے غائب تھی نصرت بیگم اور جاوید صاحب کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب جوان جہاں لڑکی یوں گھر سے راتوں رات غائب ہو جائے تو اس کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے جاوید صاحب نے بہت مجبور ہو کر رپورٹ درج کروادی پولیس بھی آناً فاناً ایمن کو تلاش کرنے لگی۔

اور یوں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ایمن اپنے گھر سے غائب ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی میں جب حاشر کو اپنے ایک کلاس فیلو کی توسط سے پتہ چلا تو وہ بھی حیران سا ہو گیا ایمن کا یوں اچانک غائب ہو جانا کسی معمہ سے کم نہ تھا۔ حاشر کا دل چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ایمن کسی مصیبت میں ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایمن ایسی کس مصیبت کا شکار ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے اس نے گھر چھوڑ دیا۔

کل ایمن کا موڈ میری وجہ سے آف تھا اور کیا پتہ اس کے گھر چھوڑنے کی وجہ میں...... نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے......" حاشر مسلسل سوچے جا رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایمن یوں اچانک کہاں غائب ہو گئی ہے۔

☆......☆......☆

وہاں ہر سو کھنڈرات تھے۔ شکستہ ٹوٹی ہوئی دیواروں سے منحوسیت ٹپکتی تھی۔ دیواروں میں کئی جگہ مکڑیوں کے جالے بنے ہوئے تھے ایمن وہاں بے ہوش لیٹی ہوئی تھی پھر اچانک ایمن کو ہوش آ گیا اور اپنے آپ کو اس عجیب سے کھنڈر میں دیکھ کر ایمن کو حیرت کے جھٹکے لگنے لگے۔ وہ تو پچھلی رات، اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر سوئی تھی اور اب ایک ویران سے کھنڈر میں کیسے آ گئی؟ ایمن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اسنے باہر جا کر دیکھا وہاں ہر سو کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے ایمن نے پہلے کبھی یہ جگہ نہ دیکھی تھی شاید یہ جگہ شہر سے کافی دور تھی۔

اچانک ایمن کو سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا وہ شخص کافی دور تھا تھوڑی دیر تک وہ چلتے ہوئے ایمن کی نظروں کی حدود تک پہنچ گیا تھا۔ ایمن اسے دیکھ کر حیران وششدر رہ گئی کیونکہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ فراز تھا۔

لیکن اس وقت فراز بالکل بدلا ہوا تھا اس نے سرخ رنگ کا ایک لمبا سا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اس کے پیروں تک تھا۔ اس کے کوٹ کے درمیان میں ایک انتہائی ہیبت ناک کھوپڑی بنی ہوئی تھی اور اس سے نیچے کوٹ پر ایک اور تصویر تھی۔ جس میں فراز کی بانہوں میں ایک حسین وجمیل دوشیزہ تھی فراز کے ہونٹ دوشیزہ کی گردن سے لگے ہوئے تھے اور فراز کے چہرے پر بہت طمانیت بہت سکون

تھا جبکہ وہ دوشیزہ جس کے بال کھلے ہوئے تھے اس کے چہرے پر اذیت رقم تھی علاوہ ازیں کوٹ پر اور بھی خوف ناک نشان بنے ہوئے تھے۔

ایمن فراز کا یہ گیٹ اپ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”فراز یہ تم نے کیا حلیہ بنایا ہوا ہے اپنا اور یہ جگہ کون سی ہے؟“ ایمن نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نہیں...... مجھے فراز نہ کہو...... ڈمبالا کہو مجھے؟ میں ڈمبالا ہوں اور یہ جگہ ڈمبالا کی طاقتوں کا ایک کرشمہ ہے، یہ کھنڈرات نا ختم ہونے والے ہیں۔ تم یہاں سے کبھی باہر نہیں جا پاؤ گی۔“

”ڈمبالا“ جادو طلسمات، یہ کیا بکواس ہے۔ اگر تم فراز نہیں ہو تو فراز جیسے کیوں۔“ ایمن الجھن اور خوف کا شکار تھی اور میں یہاں پر کیسے آ گئی؟“

”تجھے میں بتاتا ہوں کہ اصل کہانی کیا ہے ورنہ تیری یہ الجھن کبھی سلجھ نہیں پائے گی۔ تو سن۔

تو نے شاید کبھی سنا ہے کہ قدیم زمانے میں کتنے ہی لوگ ایسے تھے جنہیں اس لئے زندہ جلا دیا گیا کیونکہ لوگوں کو لگتا تھا کہ وہ انسان نہیں ڈریکولا یا آسیب ہیں، تو ان میں سے کچھ لوگ اور انہی میں ایک میں بھی تھا۔ شروع سے ہی انسانی خون میری پہلی ترجیح تھی خاص کر جوان عورتوں کا گرم گرم لہو، مجھے وہ کیف وہ سرور دیتا ہے کہ بس۔“ یہاں تک بول کر وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

ایمن کو اب اس سے ڈر محسوس رہا تھا اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اور پھر مجھے بھی جلا دیا گیا لیکن میں زندہ رہا میں صدیوں سے زندہ ہوں اور آنے والی کئی صدیوں تک زندہ رہوں گا جانتی ہے کس کے لئے انسانی خون کے لئے، گرم گرم جوانی کا گرم گرم خون...... واہ کیسا کیف ملنے والا ہے مجھے۔“ اس کے پراسرار لہجے سے ایمن اندر تک کانپ رہی تھی۔ اس پر لرزہ طاری تھا۔

”اگر تم نے میرا خون ہی پینا تھا تو تم نے میرے ساتھ محبت کا کھیل کیوں کھیلا؟“ ایمن نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں کھیلا تیرے ساتھ محبت کا کھیل کیونکہ مجھے صرف تیرے خون کی پیاس نہ تھی تیری اس جوانی کی پیاس بھی تھی لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ اگر میں نے تیرے ساتھ رنگ رلیاں منالی تو میری شکتیاں ختم ہو جائیں گی لیکن میں تیرا خون ضرور پیوں گا اور وہ بھی کل...... اب میں جا رہا ہوں کل لوٹ کر آؤں گا اپنے بچھائے ہوئے اس طلسمی شہر میں۔“ اتنا کہہ کر ڈمبالا آگے بڑھ گیا ایک قدم اٹھایا اور پھر پیچھے مڑ کر بولا۔ ”تیرا خون بہت مزیدار ہوگا۔“

ایمن کو لگا اس کی زندگی کا ایک ہی دن باقی رہ گیا ہے اس کی نظروں کے سامنے حاشر کا چہرہ آنے لگا ایمن سوچنے لگی کس قدر محبت کرتا تھا یہ مجھ سے لیکن، لعنت ہو مجھ پر، کاش میں ایک مرتبہ حاشر سے مل کر اس سے معافی مانگ سکتی کاش۔

☆......☆......☆

ایک سرسبز پارک میں، ایمن حاشر کے روبرو کھڑی تھی۔

”ایمن تم کہاں غائب ہو گئی تھی۔“ حاشر نے پوچھا۔

”حاشر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں ایک شیطانی جال میں پھنس چکی ہوں تم مجھ سے محبت کے دعوے دار ہو ناں تو آج ثابت کر کے دکھاؤ کہ تمہاری محبت تمہاری چاہت سچی ہے۔“

اتنا کہہ کر ایمن غائب ہو گئی اور حاشر کی آنکھ یکدم کھل گئی۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ حاشر ویسے دن کے وقت سوتا نہیں تھا لیکن آج نجانے کیوں وہ تھوڑی دیر کے لئے سو گیا اور اس تھوڑی دیر میں حاشر نے یہی خواب دیکھا تھا۔

”کیا واقعی وہ کسی شیطانی جال میں پھنسی ہوئی ہے۔“ حاشر بڑبڑایا۔

”خیر جو بھی ہے مجھے جلد از جلد پتا لگانا ہوگا اور اس کے لئے مجھے حفیظ صاحب سے فوراً ملنا ہوگا۔“

اگلے دس منٹ میں حاشر حفیظ صاحب کے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ حفیظ صاحب اس محلے کی معزز ترین ہستی تھی وہ بہت ہی نیک بزرگ تھے اور خوابوں کے اسرار کے بارے میں بتاتے تھے اور محلے میں ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے پاس روحانی طاقتیں ہیں۔

کچھ ہی دیر میں حاشر حفیظ صاحب کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا انہیں پوری روداد سنا رہا تھا پوری بات سننے کے بعد حفیظ صاحب اپنی نشست سے اٹھے اور گھر کے اندرونی حصے سے دو موٹی موٹی کتابیں اٹھالائے اور ان میں سے کچھ صفحات ڈھونڈ کر ان کی ورق گردانی کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے دونوں کتابیں بند کرکے ایک طرف رکھ دی اور حاشر سے مخاطب ہوکر بولے۔"ہاں یہ سچ ہے واقعی ایمن ایک شیطانی جال میں پھنس چکی ہے وہ جس لڑکے کو پسند کرتی تھی وہ انسان نہ تھا ایک آسیب تھا جو نوجوان لڑکیوں کا خون پیتا ہے وہ صدیوں سے زندہ ہے اور اس وقت اس نے ایمن کو قید کر رکھا ہے اور وہ بھی ایسی جگہ پر، جس جگہ کوئی اور دیکھ ہی نہیں سکتا وہ طلسمی کھنڈرات ہیں جہاں تک پہنچنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں وہاں اس آسیب نے طلسمی علم کر رکھا ہے۔"

"اب کیا ہوگا حفیظ صاحب مجھے ایمن کی زندگی بچانی ہے۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے آپ پلیز! مجھے اس کا کوئی حل بتائیں۔"

"ایک حل ہے۔" حفیظ صاحب نے دھیمے اور میٹھے لہجے میں بولنا شروع کیا۔"وہ آسیب ڈمبالا کل ایمن کو مار دے گا اس کا خون پی لے گا لیکن ہمیں کل سے پہلے ایمن کو واپس لانا ہوگا۔ اگر اس نے اپنے طلسمی علم سے ان کھنڈرات کو پوشیدہ رکھا ہے تو قرآن پاک جیسی تاثیر دنیا کی کسی کتاب میں نہیں ہے میں آج رات ایک وظیفہ کروں گا اور تمہیں ایک پانی کی بوتل دوں گا اس وظیفے کی وجہ سے تم عالم خواب میں ان کھنڈرات میں چلے جاؤ گے اور ایمن کو وہاں سے لے کر آجاؤ گے وہ آسیب تمہارے راستے میں آئے گا تو اس پر وہ پانی پھینک دینا وہ ہمیشہ کے لئے جل کر خاکستر ہوجائے گا اور اس کے جلنے کے بعد تم اپنے آپ کو ایمن کے ساتھ اپنے کمرے میں پاؤ گے۔ لیکن کوشش کرنا کہ اپنے گھر والوں کو آج کہیں بھیج دو تاکہ ان کے دماغ میں کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔

☆......☆......☆

ایمن حاشر کو کھنڈرات میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس نے یہ تو سن رکھا تھا کہ دعا اگر دل سے مانگی جائے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے لیکن اتنی جلد قبول ہوتی ہے اس بات کا ایمن کو پتہ نہ تھا۔

"حاشر تم یہاں......" ایمن حیرت کا شکار تھی۔

"تم اپنی حیرت بعد میں ظاہر کرنا پہلے نکلو یہاں سے۔" حاشر نے کہا۔

"لیکن یہ طلسمی کھنڈرات ہیں، یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔" ایمن نا سمجھتے ہوئے بولی۔

"کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے۔" حاشر نے کہا، ایمن نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اچانک ہی وہاں پر ڈمبالا آ گیا وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ حاشر نے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور آناً فاناً بوتل کا پانی اس پر ڈال دیا۔ پانی نے پیٹرول کی مانند کام کیا اور اس آسیب ڈمبالا کا جسم جلنے لگا۔

تھوڑی سی دیر میں حاشر اور ایمن حاشر کے کمرے میں کھڑے تھے جہاں حاشر سویا تھا۔

"تمہارے پیرنٹس مجھے اس کمرے میں دیکھ کر کیا سوچیں گے؟" ایمن نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"میرے گھر والے نہیں ہیں گھر میں، انکل کے گھر گئے ہوئے ہیں۔" حاشر نے کہا۔

"ویسے حاشر تم نے میری زندگی بچائی اس کے لئے تمہارا بہت شکریہ۔"

"کیا تمہیں اب بھی میری محبت پر یقین نہیں۔" حاشر نے بہت امید و آس سے ایمن سے پوچھا۔

ایمن نے نظریں جھکالیں اس کی جھکی نظروں میں وہ سب کچھ تھا جسے دیکھنے کا حاشر کب سے متمنی تھا۔

کھڑکی کے باہر آسمان پر چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور تارے بھی مزید چمکنے لگے کیونکہ آج ایک بار پھر محبت کی جیت ہوئی تھی۔



جرم

احسان سحر۔میانوالی

اچانک گولی چلی اور پھر نوجوان کے بازو میں لگا کہ کسی نے بازو میں انگارہ بھردیا ہو وہ درد سے دوہرا ہوگیا ذہن پر دھند چانے لگی کہ پھر اچانک ایسا ہوا کہ……

اکثر جرم چھپانے والے لوگ کیسے کیسے کھیل کھیلتے ہیں……کہانی پڑھ کرتو دیکھیں

میں اپنی کار میں بیٹھا وقت گزاری کے لئے سگریٹ کے دھواں کے مرغولے بنا رہا تھا اس وقت میں نیو جرسی کے ایک علاقہ آرڈیل کے ایک رہائشی حصے کی ایک سڑک پر تھا۔ اور میری نظریں سامنے مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سڑک بالکل سنسان تھی جس پر ٹریفک برائے نام تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی کار مطلوبہ مکان سے کافی دور کھڑی کررکھی تھی۔ موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان بالکل صاف اور نیلا تھا اور اس موسم میں یہ مضافاتی علاقہ اور بھی حسین لگ رہا تھا جس مکان پر میری نظر تھی وہ دومنزلہ تھا اور اس کے گیراج میں ایک منی وین بھی کھڑی تھی۔

چھنی بیکٹ کے سابق شوہر پروفیسر لیسنگ نے آج صبح ہی میری خدمات حاصل کی تھیں میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ پروفیسر آج میرے

آفس آیا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا کمزور آدمی تھا اس کی رنگت بالکل زرد تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اس کی حالت سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے فاقے میں ہے۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ شخص کبھی مسکرایا ہی نہیں ہے۔ اس نے جب اپنا تفصیلی تعارف کرایا تو جواب میں مجھے بھی اپنا تعارف کرانا پڑا۔

"میرا نام جیکسن ڈون ہے......" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میری بات کاٹ کر وہ بولا۔ "میں تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہاری آنجہانی منگیتر جیسن بیکر کو بھی۔ میں انگلش کا پروفیسر ہوں، جین اور میں ایک ہی فیکلٹی میں تھے۔ افسوس کہ وہ بے چاری ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی مجھے اس کی موت کا دلی افسوس ہے۔"

اپنی منگیتر کا تذکرہ سن کر میں ایک دم اداس ہو گیا تھا۔ میں نے پروفیسر کو بتایا تھا۔ "ہماری شادی میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے کہ ایک ایکسیڈنٹ نے جین کو مجھ سے چھین لیا۔ اس واقعہ کو ڈیڑھ سال ہوگیا ہے لیکن آج بھی جین کی یاد میرے دل سے نہیں گئی۔" میں نے یہ کہہ کر سر جھکالیا۔

"ہاں، یادیں آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں۔" پروفیسر نے کہا۔

"خیر سے تم بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

اس نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک بڑا لفافہ نکال کر میری جانب بڑھایا۔ میں نے لفافہ کھولا تو اس میں ایک سات آٹھ سالہ بچے کی درجنوں تصویریں نکلیں۔ ان میں اس کی حالت ابتر تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے اور ہونٹوں پر مار پیٹ کے نشانات تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بچے پر بہت تشدد کیا گیا ہے۔ وہ تصویریں دیکھ کر میرے معدے میں گرہیں سی پڑنے لگیں ایک دو کلوز اپ اس کے بازوؤں کے بھی تھے جن میں پڑے ہوئے بڑے بڑے نیل صاف نظر آرہے تھے تصویروں میں وہ بچہ بری طرح رو رہا تھا اور کیمرے کی طرف دیکھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا بچے کی بے بسی دیکھ کر میرا دل لرز اٹھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے پروفیسر کی طرف دیکھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے ایلن۔ میری سابقہ بیوی جینی بیک نے اس کا یہ حشر کیا ہے وہ بے تحاشہ شراب پیتی ہے اور نشے کی حالت میں اسے مارتی پیٹتی ہے میں نے اپنے مظلوم بچے کی یہ تصویریں عدالت میں پیش کی تھیں جس کی بنیاد پر ہمارے درمیان طلاق ہوئی۔ طلاق کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے ایلن کو میرے حوالے کر دیا۔"

میں نے اس بچے کی تصویریں ایک بار پھر دیکھیں اور واپس لفافے میں رکھ دیں پروفیسر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "پروفیسر! کیا عدالت نے صرف تصویروں کی بنیاد پر یہ فیصلہ سنایا تھا یا کوئی شہادت یا گواہی بھی مانگی تھی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"ایلن کے اسکول کی پرنسپل مس میری ایمس نے بھی عدالت میں گواہی دی تھی۔" پروفیسر نے کہا۔ "اس نے ایلن کو کئی بار ایسی حالت میں کلاس اٹینڈ کرتے دیکھا تھا چنانچہ میں نے اسے پوری بات بتائی۔ اسی دوران ہمارا عدالت میں طلاق کا مقدمہ چل رہا تھا۔ مس میری نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عدالت میں گواہی دینے کے لئے تیار ہے۔ یہ اس کی گواہی تھی جس کی وجہ سے میں کامیاب ہوا اور اس شرابی عورت سے میری جان چھوٹی۔"

"ٹھیک ہے لیکن تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟" میں نے کسی حد تک بےزاری سے کہا۔ میں عام طور پر فیملی کیسز نہیں لیتا تھا کیونکہ ان میں مسائل زیادہ ہوتے تھے اور بھاگ دوڑ بھی زیادہ کرنی پڑتی تھی لیکن چونکہ ان دنوں میرا کام "مندا" تھا اس لئے میں نے پروفیسر سے اتنی بات بھی کرلی تھی۔

"ایلن کو اسکول چھوڑنے اور لینے میں خود جاتا ہوں۔" پروفیسر نے کہا۔ "لیکن آج مجھے اسے لینے میں کچھ دیر ہوگئی مجھ سے پہلے اس کی ماں جینی اسکول پہنچ گئی اور وہ ایلن کو اپنے ساتھ لے گئی۔"

"بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نے میرے بیٹے کو اغوا کرلیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ایلن کو وہی لے گئی ہے؟" میں نے پروفیسر سے سوال کیا۔

"اسکول کی پرنسپل مس میری نے ایلن کو اپنی ماں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" پروفیسر نے کہا۔

"یہ وہی پرنسپل ہے جس نے عدالت میں تمہارے حق میں گواہی دی تھی؟" میں نے پوچھا تو پروفیسر نے اقرار میں سرہلایا۔

"اس عورت یعنی پرنسپل نے پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟" میں نے پروفیسر سے پوچھا۔ جبکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ تمہاری سابقہ بیوی تمہارے بیٹے کو مارتی پیٹتی تھی۔

"ہاں ...... یہ سوال میں نے بھی اس سے کیا تھا۔" پروفیسر نے کہا۔ "لیکن مس میری کا خیال تھا کہ اس سچویشن کو میں زیادہ بہتر طریقے سے ہینڈل کرسکتی ہوں وہ ایلن کو مزید کوئی شاک نہیں دینا چاہتی تھی اس لئے اس نے مجھے مطلع کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔"

"لیکن مجھے تمہاری اس پرنسپل کی حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔" میں نے پروفیسر سے کہا۔ "جب وہ یہ بات جانتی تھی کہ ایلن کی ماں اسے مارتی پیٹتی ہے تو پھر اس نے ایلن کو اس کے ساتھ جاتے دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ وہ اطمینان سے بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی میرے خیال میں اس نے ایک سنگین جرم کیا ہے۔" پروفیسر اپنے کندھے جھٹک کر رہ گیا۔

"اور تم نے پولیس یا اپنے وکیل کے پاس جانے کی زحمت کیوں نہیں کی؟ میرے پاس آنے کا کیا جواز تھا؟"

"میرے خیال میں تمہارے پاس آکر میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ وکیل اس طرح کے معاملات میں بہت دیر کردیتے ہیں ویسے تمہاری فیس کیا ہے؟" پروفیسر نے سوال کیا۔

"ڈھائی سو ڈالر یومیہ۔ اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایسے کیسز نہیں لیا کرتا ہوں یہ ایک فیملی کیس ہے۔ اس میں ایک مظلوم بچے کو اس کی ماں سے چھین کر تمہارے حوالے کرنا ہے اور بس۔" میں کچھ مزید کہتے کہتے رک گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ اس مظلوم بچے کی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں اور میرے دل میں درد سا اٹھنے لگا پروفیسر میری بدلتی ہوئی کیفیت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہاری سابقہ بیوی اور ایلن کی ماں جینی بیکٹ سے جاکر ملتا ہوں اور اسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ تم سے مل لے۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں بات چیت کے ذریعے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکتے ہو۔"

پروفیسر بیکٹ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ آخرکار وہ راضی ہوگیا۔ اس نے مجھے ایک جینی کی تصویر دی اور ایک اپنے بیٹے ایلن کی پھر جینی کے گھر کا پتہ سمجھایا۔ مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ وہ بچہ جینی سے لے کر پروفیسر کو دینا تھا۔ میں نے پروفیسر سے کہہ دیا تھا کہ "میں اسکول کی مس، مس میری سے بھی ملوں گا پہلے تو اس نے منہ بنایا اور پھر بعد میں مجھے اسکول کا پتا دے دیا۔

پندرہ منٹ بعد میں جارج اسٹریٹ تھا۔ موسم بہت اچھا تھا کالج اسٹوڈنٹس سڑک پر گھوم رہے تھے وہ سبھی بہت خوش تھے شاید موسم نے ان کے موڈ پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔

اس وقت ان اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر مجھے بھی اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا تھا ان میں سے کوئی بھی طالب علم ایلن کی طرح پژمردہ، مایوس یا دل شکستہ نہیں تھا ایلن کی یاد آتے ہی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور میری نظروں کے سامنے اس کی وہ تصویریں گھوم گئیں جن میں وہ زخمی تھا۔

☆......☆......☆

مجھے آرڈیل پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ لگا تھا۔ یہ کوئی خوشگوار سفر نہیں تھا۔ یہاں آتے ہوئے راستے میں کئی جگہ ٹریفک جام ملا تھا۔ جس کی وجہ سے گاڑی رینگ

رینگ کرآگے بڑھی تھی۔ ایلیمینٹری اسکول ایک منزلہ عمارت میں واقع تھا۔ اسکول کے گیٹ پر بڑا سا خیر مقدمی بینر لگا ہوا تھا عمارت کے چاروں طرف گھاس اور کیاریاں بڑی نفاست سے تراشی گئی تھیں چند ایک بلند درخت بھی تھے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بجے تھے اور گیٹ کے باہر کوئی نہیں تھا۔

دروازہ مقفل تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چالیس سال کی ایک خوش اندام عورت نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر جب وہ مسکرائی تو مجھے بہت اچھی لگی اس کی مسکراہٹ، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سرخ لپ اسٹک والے ہونٹوں کے درمیان سفید دانت موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے وہ خاصی فٹ لگ رہی تھی۔ اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا تو میں نے اپنا مکمل تعارف کرانے کے بعد کہا۔ مجھے اس اسکول کی پرنسپل مس میری ایمس سے ملنا ہے ایلن نامی ایک بچے کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"میں ہی میری ایمس ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ اندر آجاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا اور میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اس کا دفتر بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ میں اس کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا وہ اپنی پرنسپل والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں...... اب کہو کیا کہنا ہے؟" مس میری کی مسکراہٹ ختم ہو چکی تھی، اس کے لہجے میں بے زاری نمایاں تھی۔

"پروفیسر برٹ کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے طلاق کے مقدمے میں گواہی دی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، دراصل پروفیسر کی بیوی جینی اس کے بچے پر بہت زیادہ تشدد کرتی تھی۔ میں نے ایلن کو کئی بار کلاس میں اس حال میں آتے دیکھا تھا کہ کبھی اس کا چہرہ سوجا ہوا ہوتا کبھی اس کے چہرے، آنکھوں اور بازوؤں پر مار پیٹ کے نشانات ہوتے، وہ ہر وقت خوف زدہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے باپ پروفیسر برٹ کے ساتھ آیا تو پہلے سے بھی زیادہ زخمی تھا۔ میں نے فوراً ڈی وائی ایف ایس یعنی Division Of youth and Family Services سے رابطہ کیا۔ تم تو جانتے ہو کہ میں بچوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے تو اس صورت میں یہ ادارہ ہر طرح کی مدد اور راہ فلائی فراہم کرتا ہے اور پھر لاپر تشدد کے کیسز میں پوری تفتیش اور جانچ پڑتال کرتا ہے قانوناً مجھے بھی ایسا کرنا تھا، ادارے کے لوگ آتے اور ایلن کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے اسے اس کی پھوپھی یعنی پروفیسر برٹ کی بہن کے حوالے کردیا اس واقعہ کے چند روز بعد پروفیسر برٹ میرے پاس آیا اور مجھ سے مدد کا طلب گار ہوا۔" یہ کہہ کر پرنسپل خاموش ہوگئی۔

"کیا تم پروفیسر کو طویل عرصے سے جانتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"سرسری طور پر جانتی تھی۔ لیکن اس سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات اسی وقت ہوئی تھی جب وہ مجھ سے مدد مانگنے آیا تھا۔" مس میری نے جواب دیا۔ دراصل اس کے پاس ایلن پر کئے جانے والے تشدد کی تصویریں تو تھیں لیکن کوئی گواہ نہیں تھا چنانچہ ایلن کے تحفظ کی خاطر میں عدالت میں گواہی دینے کے لئے تیار ہوگئی۔

"تم نے عدالت میں دے دی مگر کیا ایلن نے بھی دی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" پرنسپل نے کہا۔ "ویسے ایلن کو کسی نے بھی عدالت میں نہیں دیکھا تھا وہ اس کیس کے ایک ماہ بعد اسکول آیا تھا۔ ڈی وائی ایف ایس والے بھی عدالت میں ایلن کو پیش کرنا چاہتے تھے لیکن وہ بچہ بے حد خوف زدہ تھا شاید اس لئے انہوں نے یہ پیشکش ترک کردی البتہ ایلن کی طرف سے میں نے گواہی دے دی تھی۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس لئے کہ اس بچے سے سب سے زیادہ میں قریب ہوں۔" پرنسپل نے جواب دیا۔

''کل سہ پہر کو جو کچھ ہوا، تم نے وہ مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

''وہ دراصل ......'' کہتے کہتے وہ گڑبڑا گئی۔

پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور کہا۔ ''میں اسٹوڈنٹس کی قطار لگوا رہی تھی عام طور پر ان کے والدین جب انہیں لینے آتے ہیں تو میں گیٹ پر آجاتی ہوں کچھ بچے خود جاتے ہیں...... بسوں سے یا پیدل اور کچھ کو والدین لینے آتے ہیں چونکہ سب ایک جیسے یونیفارم میں ہوتے ہیں اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سا اسٹوڈنٹ کہاں ہے؟ اسی دوران میں والدین بھی ہم سے سوال و جواب کرتے رہتے ہیں بہرحال اسی شور و غل میں ایلن نکل گیا میری نگاہ اس پر اس وقت پڑی جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کار میں بیٹھ رہا تھا لیکن جب تک میں وہاں پہنچتی ، وہ کاروانہ ہو چکی تھی۔

''ابھی تم نے خود کہا ہے کہ تم بچوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کا قانون جانتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم نے ایلن کو اپنی شرابی اور دیوانی ماں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا تو فوری طور پر پولیس سے یا ڈی وائی ایف سی والوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

''میں نے سوچا کہ پروفیسر کو بلا لیتی ہوں۔ وہی اس مسئلے کا کوئی صحیح حل نکال سکتا ہے۔'' پرنسپل نے مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر کہا اور اپنی میز پر رکھے کاغذات اس طرح دیکھنے لگی جیسے ضروری کام کرنا ہوا ہے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب میں جا سکتا ہوں۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اٹھ گیا۔ میرے ذہن میں ابھی تک اسی خوف زدہ بچے کی تصویر تھی جس سے میرا دل دکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

مجھے ایلن اور جینی کے گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے کار میں پورے چار گھنٹے گزر چکے تھے سہ پہر ہو رہی تھی پھر میں نے جینی اور ایلن کو ایک ساتھ باہر آتے دیکھا جینی نہ تو خوف زدہ تھی نہ پریشان۔

اس نے ایلن کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی

فرمان الٰہی

اے ایمان والوں شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو اور جو شیطان کے نقش قدم پر چلے گا تو پس شیطان اسے فحاشی اور برائی کا ہی حکم دیتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو میں تم میں سے کبھی بھی کوئی پاکی حاصل نہ کرتا۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اسے پاکی عطا فرماتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (النور ۲۱)

(عبدالجبار رومی انصاری، لاہور)

ہنستا مسکراتا ایلن اپنی ماں کے ساتھ چلا آ رہا تھا مگر اس کی بائیں ٹانگ تھوڑی سی لنگڑا رہی تھی اس بچے کو لنگڑاتا دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اس ظالم عورت نے اس بچے کو نہ صرف اغوا کیا تھا بلکہ ایک بار پھر مار مار کر اس کی حالت بھی بگاڑ دی تھی، طلاق کے مقدمے اور بعد میں بچے کے حصول میں ناکامی کے بعد وہ گویا پاگل ہو گئی تھی اور اب بھی ایلن پر تشدد کر رہی تھی اب میں اس بچے پر مزید ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے خود سے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، پھر میں نے نہایت اطمینان سے جینی کی بڑھا۔

ابھی میں کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ جینی نے مجھے دیکھ لیا وہ اپنی منی وین میں کچھ سامان رکھ رہی تھی غالباً وہ اس بچے کو اغوا کر کے شہر سے دور لے جا رہی تھی وہ مجھے گھور رہی تھی لیکن نہ تو اس نے گھبرا کر اندر بھاگنے کی کوشش کی اور نہ مجھے للکارا البتہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں وہ بالکل خاموش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کی ہو گئی ہے اس وقت ہوا بالکل بند تھی جس کی وجہ سے درختوں کے پتوں کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی وہاں بچے بھی نہیں کھیل رہے تھے پورا علاقہ عجیب سے پر ہول

سناٹے میں ڈوبا تھا جینی کے بالکل سامنے پہنچ کر میں رک گیا۔ اسی لمحے ہوا پڑی۔ وہ اپنی سیاہ آنکھوں سے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی اس کے بال دھیمے سے ہوا میں مل رہے تھے وہ ایک بھاری بھرکم عورت تھی مگر بھاری ہونے کے باوجود پرکشش تھی اس کے جسم پر خاصا چست لباس تھا جو اس عمر کی عورتیں عام طور پر نہیں پہنتی لیکن وہ پہنے ہوئے تھی اور اچھی بھی لگ رہی تھی۔

''میں اپنے بچے کو کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔'' جینی نے مدھم لہجے میں کہا۔ مگر اس کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ ایک عزم تھا مجھے اس کی سانسوں میں الکحل کی بو واضح طور پر محسوس ہوئی۔

''مسز برٹ میرا نام جیکسن ڈون ہے۔ اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔''

''میں کہہ چکی ہوں کہ میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی کسی کو نہیں۔'' وہ دیوانگی کے عالم میں پھر بڑبڑائی اور میں مسز برٹ نہیں ہوں میرا نام جینی بیکٹ ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں ایلن کبھی مجھے دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنی ماں کو۔ پھر میں نے اس کے منہ سے عجب سی آوازیں سنیں جو عام طور پر تکلیف یا خوف کے عالم میں نکلتی ہیں اور اس کے خوف کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ سمجھ رہا ہے کسی بھی وقت اس کی پٹائی شروع ہونے والی ہے لیکن میں یہ عہد کر چکا تھا کہ اس بار اسے کسی کے ہاتھ پٹنے نہیں دوں گا چاہے وہ اس کی ماں جینی ہی کیوں نہ ہو۔

''تمہارے سابق شوہر برٹ نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔'' میں نے جینی سے کہا اور اپنی جیب سے پرائیویٹ سراغ رساں والا لائسنس نکال کر اسے دکھایا لیکن جینی نے اس لائسنس پر ایک نظر بھی نہ ڈالی اس کی نظروں میں نفرت اور حقارت تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں میں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''دیکھو جینی تمہارے سابق شوہر کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے بیٹے ایلن کو اغوا کر لیا ہے اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ تمہیں ایلن سے ملنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' میری بات سنتے ہی ایلن زور زور سے چیخنے اور رونے لگا۔ اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ اور ناک سے پانی بہنے لگا وہ سات سال کی عمر سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اتنا چھوٹا عمر کا بچہ واقعی بڑی اذیت اور کرب سے دوچار تھا۔

''یہ ایک کمینے شیطان کا بیٹا ہے۔ میں اپنے بچے کو کسی وحشی اور ظالم کے حوالے کبھی نہیں کروں گی۔'' یہ کہتے ہی جینی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر اس کے باوجود وہ نہ تو چیخی اور نہ ہی چلائی میں اس کے خاموش آنسو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں مجھ پر کچھ اس انداز سے جمی ہوئی تھیں کہ اگر میں نے یا کسی اور نے اس کے بچے کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گی لیکن اپنا بچہ کسی کو نہیں دے گی۔

''بے وقوف عورت وحشی وہ نہیں ہے بلکہ وحشی اور ظالم تو تم ہو۔'' میں اچانک ہی پھٹ پڑا تھا۔

میں بڑی دیر سے خود کو کنٹرول کر رہا تھا لیکن اب بات میری برداشت سے باہر ہو چکی تھی اس لئے میں خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا میں نے کہا۔ ''تم نے اس معصوم کو مارا پیٹا ہے نشے کی حالت میں اس پر تشدد کیا اس کے پورے جسم پر مار پیٹ کے نشانات ہیں۔''

اچانک میں نے محسوس کیا کہ جینی کی آنکھوں میں شدید حیرت ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کے مقابلے میں اور بھی زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔ میں نے جو کچھ بھی کہا غالباً اس کا اسے شدید صدمہ ہوا تھا شاید میری باتوں نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اسے اپنے کئے کا احساس ہو گیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ میرا خیال غلط تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے اپنے بیٹے کو نہیں مارا۔ بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے پر تشدد کر سکتی ہے؟'' اس نے بڑے عجیب سے انداز میں مجھ سے سوال کیا تو میں حیرت کے عالم میں اسے تکنے لگا۔

وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی ابھی تک میں نے ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی تھی جس سے ثابت ہوتا کہ وہ اپنے بیٹے ایلن کی دشمن ہے اس پر تشدد کرتی ہے اور نہ ہی میں نے ایلن کو اس سے شدید خوف زدہ دیکھا تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اس وقت بھی نشے میں تھی اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی میں کافی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر جینی نے اپنے بیٹے ایلن کی طرف گھوم کر کہا۔ ”ایلن آگے آؤ اور اس شخص کو اصل بات بتاؤ تمہیں کون مارتا ہے اور تمہارے ساتھ یہ سب کچھ کس نے کیا؟“

”لیکن ایلن کے اسکول کی پرنسپل مس میری ایمس نے مجھے بتایا ہے کہ ایلن پر تشدد تم کرتی ہو۔“ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ جھوٹی ہے مکار ہے، بدذات کہیں کی...... اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا ہے وہ غلط ہے۔“ کہتے کہتے جینی بیکٹ ایک بار پھر رونے لگی۔ اسے دیکھ کر ایلن بھی رونے لگا جینی نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں یہ آدمی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ یہ اصل بات معلوم کرنے آیا ہے تم اسے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔“

ایک لمحے کے لئے ایلن نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے رونا بند کر دیا تھا اس کی آنکھوں میں خوف ابھی تک نمایاں تھا میں اس بچے کی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا وہ کوشش کے باوجود سمجھ نہیں اور بول نہیں پا رہا تھا جینی نے پریشانی کے عالم میں ایلن کو دیکھا وہ جانتی تھی کہ اس وقت اگر ایلن نے کوئی بات نہ کی تو میں اسے جھوٹا سمجھوں گا لیکن میں اس صورت کا کسی طور اندازہ کر چکا تھا۔

”تم شکل وصورت اور بات چیت سے ایک اچھے انسان لگتے ہو۔“ جینی نے میری طرف منہ کر کے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم پروفیسر برٹ جیسے کمینے اور شیطان انسان کے لئے کیوں کام کر رہے ہو؟ کیا تم اسے جانتے نہیں وہ بہت ظالم انسان ہے جو نہ اپنی بیوی سے محبت کر سکتا ہے اور نہ اپنی اولاد سے۔“

”بہرحال میں پروفیسر کے کہنے پر یہاں آیا ہوں اور اس بچے کو یہاں سے لے کر جاؤں گا۔“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔

”تم نے اس بچے کو مارا تھا یہ بات عدالت میں بھی ثابت ہو چکی ہے اس لئے عدالت نے اس بچے کو تم سے لے کر پروفیسر برٹ کے حوالے کر دیا تھا اور تم اسے اسکول سے زبردستی اپنے ساتھ لے آئی ہو جو خلاف قانون ہے۔ یہ کسی طرح بھی اغوا سے کم نہیں ہے تم اسے اپنے ساتھ صرف اس لئے لائی ہو تا کہ اس پر مزید تشدد کر کے اپنے سابق شوہر سے انتقام لے سکو۔ لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“

ایلن کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے اس نے میری بات سن لی تھی جس سے ایک بار پھر وہ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا اس نے اپنی ماں کی ٹانگ پکڑ لی تھی جیسے مجھ سے تحفظ چاہ رہا ہو۔

”تم اسے اپنے ساتھ کہاں لے جا رہی ہو؟“ میں نے اس کی منی وین اور اس میں رکھے ہوئے سامان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہیں بھی کسی ایسی جگہ جہاں وہ کمینہ شیطان نہ آسکے، اور نہ تم جیسے کرائے کے غنڈے آسکیں۔ ایک ماں سے اس کی ممتا اور ایک اولاد چھینتے تمہیں شرم نہیں آئی؟“ اس نے ایلن کے سر پر شفقت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ایلن جس طرح اپنی ماں سے لگا کھڑا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں سے خوف زدہ نہیں ہے بلکہ اس کی پناہ میں راحت محسوس کر رہا ہے میں نے ایلن کی سبز اور معصوم آنکھوں میں دیکھا ان میں سچائی تھی اور جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت ہے۔

”ایلن تم مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ ممی کے پاس یا ڈیڈی کے پاس؟ تم کس سے ڈرتے

ہو؟" میں نے دیکھا کہ میرے اس سوال کے جواب میں جینی نے زیرلب کچھ کہا تھا "شاید پروفیسر کو گالی دی تھی۔" "آؤ میں تمہیں ڈیڈی کے پاس لے چلوں۔ ممی تو مارتی ہیں ناں؟" میں نے یہ کہتے ہوئے ایلن کی طرف قدم بڑھائے تو وہ خوف کے عالم میں جینی کی ٹانگ سے لپٹ گیا میں ساری پوزیشن سمجھ گیا تھا، میں جانتا تھا کہ نہ ایلن میرے ساتھ پروفیسر کے پاس جانے سے راضی ہوگا اور نہ میں اسے لے جاسکوں گا وہ اپنی ماں کی ٹانگ سے چمٹا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں سے سب کچھ بتادیا تھا اب مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی ایلن اپنی ماں سے نہیں بلکہ اپنے ڈیڈ سے خوف زدہ تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس پر تشدد اس کی ماں نے نہیں اس کے باپ نے کیا تھا وہی اسے مارتا پیٹتا تھا اور اس نے الٹا الزام جینی پر لگایا تھا۔

"پروفیسر بہت ظالم انسان ہے وہ میرے معصوم بچے کو بیس بال کے بیٹ سے مارتا ہے۔" جینی نے مجھے روندھے ہوئے گلے کے ساتھ مجھے بتایا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں جینی کی بات سن کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔ جینی کے الفاظ میری سماعت سے ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے پروفیسر اس سطح کا ذہنی مریض ہوگا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے جینی سے کچھ کہا، کیا کہا، یہ مجھے یاد نہیں، اس کے بعد میں تیزی سے گھوما اور اپنی کار میں جابیٹھا۔ جینی اور ایلن اپنی جگہ پر کھڑے تب کی طرح میری جانب دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆......☆......☆

میں نے اپنی کار پارکنگ لاٹ میں روکی، مس میری ایمس اپنی کار کے پاس کھڑی اس کا دروازہ کھول رہی تھی مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ میں نے کار سے اترتے ہی اس سے کہا۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔"

اس نے تیز لہجے میں کہا میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اکڑ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔

"ایلن کو اس کی ماں جینی ہیکٹ نے کبھی نہیں مارا۔ اس کی آنکھوں پر جو زخم ہیں وہ ایک دو دن پرانے ہیں اس کا مطلب ہے کہ اسے پرسوں سے پہلے مارا گیا تھا اور اس وقت وہ اسکول میں تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم نے ایلن کو اس حال میں دیکھا لیکن کسی سے کچھ نہ کہا اور کیا...... کیوں؟"

"تم پاگل ہو۔" مس میری ایمس نے ناگواری سے کہا۔ "مجھے دیر ہورہی ہے ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔"

"تم کہیں نہیں جاسکتی۔" میں نے غصے سے کہا تو جواب میں مجھے مس میری ایمس نے گالی دی اور میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "میں سچ جانتا ہوں جو کچھ تم جانتی ہو مجھے بتادو۔" پہلے تو اس کی آنکھیں شعلہ بنی رہی پھر وہ پرسکون ہوتی چلی گئی میں اس کی بدلتی ہوئی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

"مس میری ایمس مجھے بتاؤ میں تمہاری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، تمہیں کچھ نہیں ہوگا تمہارا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" میں نے اسے پرسکون دیکھا تو حوصلہ دلانا ضروری سمجھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔" اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ آخر وہ میرے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔

"کل ایلن کی ٹیچر نے اس کے چہرے پر، آنکھوں اور بازوؤں پر زخم دیکھے تو مجھے بھلایا میں نے اسے دیکھ کر کہا کہ ٹھیک ہے میں اس معاملے کو خود دیکھوں گی میں نے ایلن کو اس کی کلاس سے اپنے دفتر میں بلالیا اور پورا دن ہم نے باتوں میں گزارا۔ میں اسے اپنے ساتھ لونگ ڈرائیو پر بھی لے گئی اور اسے اپنے ساتھ لنچ بھی کرایا میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بچہ اس حالت میں کلاس میں جائے پھر میں نے اس کی ماں

جینی ہیکٹ سے رابطہ کیا۔"

"تم نے جینی ہیکٹ سے رابطہ کیا تھا۔" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔ مجھے کسی نہ کسی طرح اس مسئلے کا حل تو نکالنا تھا۔" مس میری ایمس نے کہا۔

"تم پولیس سے بھی تو رابطہ کر سکتی تھیں۔" میں نے کہا یا پھر چائلڈ ویلفیئر والوں سے۔"

"نہیں، میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔" مس میری ایمس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتی تھیں؟" میں نے غصے سے کہا۔ "پروفیسر برٹ نے اپنے بیٹے کو بیس بال کے بیٹ سے مارا تھا اتنے چھوٹے بچے کو اس وحشی نے اس بری طرح پیٹا تھا وہ بچے ابھی اپنا دفاع کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔" مس میری ایمس نے یکا یک رونا شروع کر دیا اور کہا۔ "پروفیسر برٹ نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے پولیس یا چائلڈ ویلفیئر والوں کو اطلاع دی تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔" وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھی لیکن میں اس کے پاس نہیں رکا بلکہ تیزی سے اپنی کار میں بیٹھا اور آندھی وطوفان کی طرح روانہ ہو گیا اب میں پروفیسر کی طرف جا رہا تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ اس وحشی وظالم کو ہلاک کر دوں گا یکا یک بارش شروع ہوئی اور جس نے چند لمحوں میں ہی طوفان کی شکل اختیار کر لی لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

میرے اندر جو طوفان اٹھ رہا تھا وہ باہر کے اس طوفان کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ میرے دل ودماغ میں شدید قسم کے دھماکے ہو رہے تھے اس کے ساتھ بارش بھی شدید تر ہوتی جا رہی تھی ونڈ اسکرین پر گویا پانی کا جھرنا بہہ رہا تھا۔ مجھے سڑک صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں نے اپنی کار کی رفتار کم نہیں کی۔

بارش اتنی شدید تھی کہ مجھے اپنی کار کی چھت پر طبلہ بجتا محسوس ہو رہا تھا سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا میں نے یونیورسٹی کے پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی روکی اس وقت مجھے ایک پولیس کار بھی نظر آئی لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی اور وہاں سے اتر کر موسلا دھار بارش میں بھیگتا ہوا اور پانی کے تالاب میں چھپ چھپ کرتا ہوا پروفیسر برٹ کے آفس طرف بڑھتا چلا گیا راہ داری میں مجھے دو پولیس والے بھی نظر آئے جو وہاں کھڑے کافی پی رہے تھے لیکن نہ انہوں نے میری طرف توجہ دی اور نہ میں نے ان کی طرف دھیان دیا۔ مجھے صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح برٹ کے پاس پہنچ جاؤں ایک کمرے کے باہر پروفیسر برٹ لیسنگ نام کی تختی لگی ہوئی تھی میں نے اس کا دوازہ ایک جھٹکے سے کھولو اور اندر پہنچ گیا اس وقت پروفیسر کے کمرے میں ایک کم عمر اسٹوڈنٹ بھی تھی ان دونوں نے ہی مجھے حیرت سے دیکھا میرے کپڑے بارش میں شرابور تھے۔

"پروفیسر مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا میں کوشش کے باوجود اپنے آپ پر قابو نہیں پا رہا تھا لڑکی نے جلدی سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی پروفیسر نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اب کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لمحے کو اس کمرے میں سناٹا محسوس ہوا لیکن پھر کھڑکیوں کے شیشے پر برسنے والی بارش کی آواز نے زندگی کا احساس دلایا میں نے پروفیسر کو سخت نظروں سے گھورا۔ اس نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ایلن کہاں ہے؟ اسے ساتھ نہیں لائے؟" میں نے انکار میں سر ہلایا تو اس نے کہا۔ "کیوں؟" اور تم اس قدر غصے میں کیوں نظر آ رہے ہو؟ کیا ہوا ہے ......بیٹھ جاؤ اور آرام سے بتاؤ۔"

یکا یک میں نے آگے بڑھ کر پروفیسر کا گریبان پکڑ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا اس کی کرسی تک لے گیا پھر میں نے اسے دھکا دے کر اس کی کرسی پر گرا دیا اور کہا۔ "تم بہت کمینے اور ظالم ہو، اپنے معصوم بچے پر تشدد کرتے تھے اور الزام جینی پر لگا دیا؟"

"کیا بکواس کررہے ہو؟" پروفیسر نے چیخ کر کہا وہ خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر میں دیکھ چکا تھا کہ اس انکشاف پر وہ حواس باختہ ہوگیا ہے۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مجھے اصل بات معلوم ہوچکی ہے۔" میں نے گرج کر کہا۔

"مجھے پوری بات بتاؤ۔" اپنی طرف سے ہی کہے جارہے ہو میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ......" کہتے کہتے وہ رک گیا۔"

"تم اپنے بیٹے ایلن پر تشدد کرتے تھے اور کئی سال سے مسلسل یہ جرم کررہے تھے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری اس حرکت سے تنگ آکر تمہاری بیوی نے تم سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا وہ اپنے بچے کو لے کر تم سے دور چلی جانا چاہتی تھی تم اسے طلاق تو دینا چاہتے تھے پر ایلن کو اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر تم نے ایک پلان بنایا ایلن کو مارا پیٹا اور اس کی تصویریں بنا کر عدالت میں پیش کردیا۔"

پرنسپل مس میری ایمس کو اس صورت حال کا اندازہ تھا تم نے اسے قتل کی دھمکی دے کر خاموش کردیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میری بات سن کر پروفیسر کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی وہ میز کے پیچھے اپنی گھومنے والی چیئر پر بیٹھا ہوا تھا اس کے ہاتھ گود میں تھے۔

"ایلن میرا بیٹا ہے۔" پروفیسر نے کہا۔ "میں اسے ماروں یا پیٹوں کسی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ جینی ایک شرابی عورت ہے میں اپنا بیٹا اس کے حوالے کیسے کرسکتا ہوں۔؟" یہ کہتے ہی یکایک پروفیسر اپنی جگہ سے اٹھا اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ میری طرف تھا اس وقت میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اپنی کار سے باہر نکلتے وقت میں نے اپنا پستول ساتھ کیوں نہیں لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ پروفیسر سے بات چیت کے دوران میں ایسی صورت حال بھی پیدا ہوسکتی ہے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا غلطی تو ہوگئی تھی۔

پروفیسر نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میرا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے بازو میں انگارے بھردیئے ہوں مجھے اتنا یاد ہے کہ گولی لگنے کے بعد کتابوں کی الماری سے ٹکراتا ہوا فرش پر گر گیا تھا اور میرے اوپر کتابیں گررہی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے بازو میں آگ لگی ہوئی ہے پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا بعد میں مجھے پوری بات بتائی گئی۔ جب میں پروفیسر کی گولی لگنے کے بعد گرا تھا تو پروفیسر نے میرا قصہ مزید پاک کرنے کے لئے مجھ پر مزید فائر کرنا چاہا لیکن اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور پولیس والے اندر داخل ہوئے یہ وہی پولیس والے تھے جنہیں میں نے پروفیسر کی طرف آتے وقت دیکھا تھا وہ کسی کام سے وہاں آئے تھے غالباً یونیورسٹی میں ان کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی جب انہوں نے فائر کی آواز سنی تو دوڑتے ہوئے پروفیسر کے کمرے میں آگئے اور اس طرح مجھے بچالیا گیا اور پروفیسر کو گرفتار کرلیا گیا۔

بہرحال وہ پولیس والے میرے محسن ثابت ہوئے ورنہ میں ہلاک ہوجاتا۔

میں کئی روز تک اسپتال میں داخل رہا۔ ہڈی بچ گئی تھی جس کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میں خوش قسمت تھا ورنہ اس طرح کے کیسز میں ہاتھ بالکل مفلوج ہوجاتا ہے چند ہفتوں میں میرا ہاتھ پہلے کی طرح کام کرنے لگا۔

جب میں بالکل ٹھیک ہوگیا تو مجھے عدالت میں پیش کیا گیا جہاں میں نے اپنا بیان دیا، اس کی روشنی میں جج نے یہ فیصلہ سنایا۔

"ایلن کو اس کی ماں جینی کے حوالے کردیا جائے، پروفیسر کو اپنے بیٹے کو ہراساں کرنے، اس پر تشدد کرنے اور مجھ پر غیرقانونی پستول سے حملہ کرنے کے جرم میں سزا ہوگئی۔



نادیدہ لوگ

عمران قریشی۔کوئٹہ

رات کے اندھیرے میں اچانک روشنی پھیل گئی اور پھر چند ہیولے نمودار ہوئے، ان کی انگارہ برساتی آنکھوں میں قہر و غضب واضح نظر آرہا تھا، آواز گونجی ہم تمہاری موت ہیں لیکن......

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے اور ہر قہقہہ پیغام بقا ہوتا ہے......ایک سبق آموز حقیقت

دینار ایکسپریس بند پھاٹک کے سامنے سے گزرنے لگی۔ ہوا کی شدت نے محسن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ وہ سبز جھنڈی کو ہلاتے ہوئے پٹری سے کچھ ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے پیچھے دو گاڑیاں اور ایک ٹرک پھاٹک کھلنے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ٹرین گزر گئی۔ اور پیچھے دھول کا غبار چھوڑ گئی۔ محسن نے پھرتی کے ساتھ پھاٹک کو کھولا اور ٹریفک پھاٹک سے گزر کر آگے بڑھنے لگا۔ سردی کی شدت میں دم بدم اضافہ ہورہا تھا۔ اسے وقفے وقفے کے ساتھ اپنے جسم میں کپکپی کی لہر اٹھتی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے جیب میں سے بیڑی باہر نکال کر سلگائی اور دھواں باہر اگل دیا۔ پٹری کے ساتھ چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس کی بوسیدہ دیوار پر سالخوردہ گھڑی لگی ہوئی تھی۔ رات کے پونے دس بجنے والے تھے۔ اسے اپنی نوکری بالکل پسند نہیں تھی۔ کام مشقت طلب نہیں تھا۔ لیکن محسن آرام طلب تھا۔

فیروز پور لائن کے اس ٹریک پر گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن چار پانچ جو بھی گزرتی تھیں۔ ان کے اوقات نہایت تکلیف دہ تھے۔ اسے رات قبر نما کمرے میں گزارنی پڑتی تھی۔ وہاں سردی دور کرنے کا انتظام نہیں تھا۔ کمرے کے ارد گرد دور تک سنسان اور چٹیل میدان تھا۔ جس میں خشک جھاڑیاں جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ خانہ بدوش ان جھاڑیوں کو جلانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ لیکن کاہلی کی بدولت وہ انہیں اکٹھا کرنے کی کوششیں نہیں کرتا تھا۔ اس

لئے رات نہایت بے سکونی کے عالم میں گزرتی تھی۔ گمسن نے بیڑی کو منہ میں دبایا۔ اور ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کمرے کی طرف چلا آیا۔ اس نے دروازے کو بند کر کے اسے تالا لگایا۔ اب رات کے بارہ بجے تک ریلوے ٹریفک معطل رہتا تھا۔ عموماً اس وقت کے دوران وہ پھاٹک سے کچھ دور واقع اپنے گھر کا چکر لگا آتا تھا۔ حالانکہ یہ خلاف قانون بات تھی۔ تاہم اس میں مضائقہ نہیں تھا۔

بہرحال اسے اپنے جسم کو گرم رکھنا ہوتا تھا اور گرمی کا سامان اس کے گھر میں تھا۔ پھر پھاٹک کو بند کرنا اور کھولنا ٹرین کی آمد اور گزر جانے کے بعد تک محدود ہوتا تھا۔ دس بجے کے بعد سے لے کر بارہ بجے تک کوئی بھی ٹرین فیروز پور لائن سے نہیں گزرتی تھی۔ اگر اس وقت کے دوران وہ گھر سے ہو کر واپس آ جاتا۔ تو اس کے خیال میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس نے بیڑی کا لمبا کش لیا۔ اور دھواں باہر اگلنے کے بعد لمبے ڈگ بھرتا ہوا مختصر ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے پیچھے واقع کوارٹروں کی طرف چلنے لگا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اسٹیشن کی عمارت سنسان پڑی تھی۔

عمارت کے پیچھے ایک لائن میں دس کے قریب کوارٹر بنے تھے۔ ان میں زیادہ تر خالی تھے۔ چوتھے نمبر کا کوارٹر اس کا تھا۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔ گمسن نے ہاتھ میں سلگتی ہوئی بیڑی کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر مکان کی چابی تلاش کرنے لگا۔ اسے چابی تلاش کرنے میں کچھ وقت پیش آئی۔ اس کی جیب میں مکان کی چابی کے علاوہ پھاٹک والے کمرے اور پھاٹ کی چابی بھی موجود تھی۔ تیسری دفعہ جیب میں ہاتھ مارنے کے بعد اسے چابی دستیاب ہو ہی گئی۔ اس نے عجلت کے عالم میں تالا کھولا۔ اور دروازے کو دھکیل کر صحن میں داخل ہو گیا۔ صحن کے اندر ایک طرف نیم کا ایک درخت اجڑا ہوا درخت لگا تھا۔ جس کے نیچے چارپائی رکھی ہوئی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی طرف پانی سے بھرا ہوا حمام تھا۔ اس کے ساتھ غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ صحن کے آگے برآمدہ تھا۔ جس کے آگے دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کی بتی جل رہی تھی۔ صحن میں داخل ہونے کے بعد گمسن نے دروازے کو کنڈی لگائی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں آمنے سامنے کی دونوں دیواروں کے ساتھ چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فرش پر کوئلے والی انگیٹھی پڑی تھی۔ اور اس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ والی چارپائی پر اس کی نوبیاہتا بیوی رجی رضائی اوڑھے ہوئے لیٹی تھی۔

گمسن کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ اس کی عمر پچیس سے تیس کے درمیان تھی۔ جسم نہایت صحت مند اور بھرا بھرا تھا۔ جسم کے نشیب و فراز قیامت خیز تھے۔ لیکن صورت واجبی تھی۔ گمسن نے نہایت بے زاری کے ساتھ اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ پھر تلخ لہجے میں بولا۔

"تو نے کپڑے تبدیل نہیں کئے۔ میں نے ڈیوٹی پر جانے سے قبل تجھے دس دفعہ تاکید کی تھی کہ بن سنور کر تیار ہو کر بیٹھنا۔ کالو ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ لیکن تو نے پہلے کبھی میری بات مانی ہے جو آج مانے گی۔ جلدی کر کپڑے تبدیل کر کے تیار ہو جا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

رجی نے نہایت پھرتی کے ساتھ چارپائی کے نیچے رکھا ہوا ٹرنک باہر نکالا اور اس میں سے سلوٹ زدہ سرخ رنگ کا سوٹ باہر نکال کر کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ گمسن کوئلے کی انگیٹھی کے پاس ہاتھ گرم کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ رجی نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد چارپائی پر رکھی ہوئی چادر کو اٹھایا۔ جس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس نے چادر کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا۔ اور سہمی سہمی نگاہوں سے گمسن کی طرف دیکھنے لگی۔

گمسن نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

"اب کالو کے گھر تک کیا ننگے پاؤں جائے گی۔ تجھے کب عقل آئے گی۔ میں تو تجھ سے شادی کر کے پشیمان ہوں۔ خالہ نے نہ جانے کون سے جنموں کا غصہ مجھ پر نکالا ہے۔ جو تجھے میرے پلے باندھ دیا۔"

رجی نے ہڑبڑا کر چارپائی کے پاس رکھی ہوئی جوتیاں پہنیں اور دوبارہ گمسن کی طرف دیکھنے لگی۔ گمسن نے آگے بڑھ کر بے دردی کے ساتھ اس کے ہاتھ کو تھاما۔ اور کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

دھند میدانی علاقے کا محاصرہ کرچکی تھی۔ اور اب دس قدم کے فاصلے پر موجود چیزیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سردی کی شدت میں بے انتہا اضافہ ہوگیا تھا۔ اور گھمن کے جسم پر قمیض شلوار کے علاوہ مناسب کپڑے موجود نہیں تھے۔ اس کے ہڈیوں سے بھرے ہوئے جسم میں کپکپی کی ہر دوڑی۔ اور وہ اپنی خالہ کو کوستے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔ دروازے کو تالا لگانے کی اب ضرورت نہیں تھی۔ مکان میں قیمتی سامان نہیں تھا۔ قیمتی سامان وہ رجی کی صورت میں ہمراہ لے جارہا تھا۔ رجی کے ہاتھ تھامے وہ چھپٹے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ یہ کالو کا گھر تھا۔ اس کا نام تو نہ جانے کیا تھا۔ لیکن لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں کام کرتا تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اور غیر شادی شدہ تھا۔ کوارٹر کے سامنے پہنچ کر گھمن نے دروازے پر لگی ہوئی کنڈی کو کھٹکھٹایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

کالو اس کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔ اس کا چہرہ نام کی مناسبت سے کالا بھجنگ تھا اور کالے رنگ کی وجہ سے ہونٹ خون کی مانند سرخ دکھائی دیتے تھے۔ سر پر بالوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ اور منہ سے دیسی شراب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اس نے ہوس زدہ نگاہوں سے رجی کے سراپے کا جائزہ لیا۔ پھر گھمن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تو نے آنے میں بہت دیر لگادی۔ میں کب سے تیرا انتظار کررہا تھا۔“ گھمن نے رجی کو صحن میں دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ بستر میں گھسی ہوئی آرام کررہی تھی۔ مجھے واپس آکر اسے تیار کرنا پڑا۔ چل اب اسے اندر لے جا۔ مجھے واپس پھاٹک پر بھی جانا ہے۔ صبح اسے واپس لے جاؤں گا۔“

کالو نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ٹین کے دروازے کو بند کرکے اسے کنڈی لگادی۔ گھمن تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کوارٹر میں چلا آیا۔ انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلے سرد پڑنے لگے تھے۔ اس نے چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کے تیل کی بوتل باہر نکالی۔ اور کوئلوں پر چھڑک کر پھونکیں مارنے لگا۔ کوئلوں سے نکلتا ہوا دھواں اس کی ناک کے ذریعے حلق میں گھستا چلا گیا۔ وہ بے تحاشا کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھوں سے آنسو باہر نکلنے لگے۔ اس نے اونچی آواز میں اپنی خالہ کو دو چار گالیاں دیں۔ پھر بستر پر رضائی اُوڑھ کر بیٹھنے کے بعد جیب سے بیڑی باہر نکال کر سلگانے لگا۔

☆......☆......☆

اس کی شادی کو ہفتہ بھر نہیں ہوا تھا۔ رجی اسے قطعی پسند نہیں تھی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن جمیلہ کو پسند کرتا تھا۔ پسند کرنے کی وجہ صرف اتنی تھی کہ جمیلہ میٹرک تک پڑھنے کے بعد قریبی اسکول میں ٹیچر لگ گئی تھی۔ شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی۔ مہینے کے آخر میں وہ اتنا کمالیتی تھی کہ ان کے گھر کا راشن پانی پورا ہوجاتا تھا۔ گھمن کو یہی بات پسند تھی۔ وہ کام سے گھبراتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی گھر چلانے میں اس کی مدد کرے۔ رجی حواس باختہ عورت تھی۔ اس کی پہلے بھی دو دفعہ شادی ہوچکی تھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر دونوں شوہروں کی اموات پراسرار طریقے سے ہوئی تھی۔

خالہ زینب نے جب شادی کی حامی بھری تھی۔ تو بات جمیلہ کی مناسبت سے طے پائی تھی۔ گاؤں کے مولوی کے ساتھ دو گواہوں کو بلایا گیا۔ اور نکاح نامے پر رجی اور گھمن کے انگوٹھے لگا کر انہیں رشتہ ازدواج میں باندھ دیا گیا۔ رخصتی کے وقت تک گھمن اس بات سے لاعلم رہا کہ اس کی شادی جمیلہ کے بجائے رجی کے ساتھ کردی گئی تھی۔ ایسی باتیں چھپ نہیں سکتیں۔ اس لئے رخصتی کے وقت خالہ زینب نے گھمن کو اکیلے کمرے میں بلایا۔ اور اپنے سر کی چادر کو اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ پھر روتے ہوئے بولیں۔

”میرے بچے مجھے معاف کردینا۔ اگر جمیلہ تیری شریک حیات بن جاتی تو گاؤں میں سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوتی۔ میں خودغرض کی ماری ماں اس لئے ایسا نہیں کرسکی کیونکہ وہ اس گھر کی واحد کفیل ہے۔ جس کی کمائی سے گھر چلتا ہے۔ وہ اگر بیاہ کر تیرے گھر چلی جاتی تو مجھے دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑجاتے۔ رجی اتنی پاگل بھی نہیں ہے۔ جو جمیلہ کی جگہ تیرے گھر کو سنبھال نہ سکے۔ تیرے پاس اچھی

سرکاری نوکری ہے۔ تجھ کو تو صرف گھر سنبھالنے والی زنانی چاہئے تھی۔ وہ رجی سنبھال لے گی۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ جیسا تو چاہے گا وہ ویسا ہی کرے گی۔ کافی دیر تک گھمن کو کچھ بھی سمجھ نہ آیا کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہو گیا ہے اور جب سمجھ میں آیا۔ تب وہ سوائے سر پیٹنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر پایا۔ لیکن خالہ کی خود غرضی کا بدلہ اس نے رجی سے لیا۔ اس کے صحت مند جسم میں کشش موجود تھی۔ راہ گزرتے ہوئے افراد اس کی شکل کو دیکھنے کے بجائے ہوس زدہ نگاہوں سے جسم کو دیکھتے تھے۔ شادی کے پہلے ہفتے ہی گھمن نے اس کے جسم کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کالو کے ساتھ اس کی دوستی کو دس سال ہو گئے تھے۔ اس کا گھمن کے گھر آنا جانا ایک معمول کی بات تھی۔ وہ رجی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتا تھا۔ گھمن اس کی دلی کیفیت سے آگاہ تھا۔

ایک دن تنہائی میں بیٹھ کر اس نے کالو کے ساتھ بات چیت کی۔ اور اسے بتایا کہ وہ رات کی بے آرام کر دینے والی نوکری سے خائف ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اسے دن کے وقت کوئی اچھا اور مناسب کام مل جائے۔ جس میں مشقت بھی کچھ کم ہو۔ کالو چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

”اگر میں اسٹیشن ماسٹر سے تیرے متعلق بات چیت کروں تو مجھے یقین ہے کہ وہ تیری تبدیلی دن کے اوقات میں کر کے کام میں بھی کمی کر دے گا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ میں ایسا کیوں کروں۔ تیرے پاس ایسا ہے ہی کیا ہے۔ جو مجھے سفارش کرنے کے لئے مجبور کرے۔“

گھمن بولا۔ ”میرے پاس تیرے مطلب کا بہت سا سامان موجود ہے۔ میں تیرا دل خوش کر سکتا ہوں۔ اگر تو مجھے یقین دلائے کہ تو میری نوکری کے اوقات میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔“

کالو مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ”تو پھر آج رات رجی کو میرے کوارٹر میں چھوڑ جا...... دو دن کے اندر تجھے رات کی نوکری سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔“ گھمن یہی چاہتا تھا۔ اس نے فوراً حامی بھر لی۔ اور رات کو رجی کو اس کے کوارٹر میں پہنچا دیا۔ اب اسے اس وقت کا شدت سے انتظار تھا جب اس کی تقدیر زیادہ نہیں لیکن کسی حد تک بدل جاتی۔ اور اسے آرام کرنے کا موقع میسر آ جاتا۔ بارہ بجے سے کچھ پہلے اس نے جسم کو اچھی طرح گرم کیا اور چابیاں سنبھالنے کے بعد گھر سے باہر نکل کر پھاٹک کی طرف چلا آیا۔

صبح سات بجے وہ رجی کو گھر لے آیا۔ رجی نے نہایت خاموشی کے ساتھ ناشتہ تیار کیا۔ دونوں نے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران گھمن اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ تب مجبور ہو کر اس نے رجی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”رات کو اس نے تجھے زیادہ تنگ تو نہیں کیا۔“

رجی نے اچانک ہی نگاہیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آج سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے یوں بدتمیزی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہو۔ اس کی سرد آنکھوں میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ بے اختیار گھمن نے نگاہیں جھکا کر زمین کو گھورنا شروع کر دیا۔ رجی نے بے اعتنائی کے ساتھ دستر خوان کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

گھمن نرم لہجے میں بولا۔ ”دیکھ رجی مجھے خود بھی یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ لیکن کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ یوں سمجھ ہم نے ایک رات کو کھو کر اور بہت سی راتوں کا سکون حاصل کر لیا ہے۔ تو پچھلی رات کو بھلا دے۔ ایسا سمجھ کہ وہ تیری زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔“

رجی نے دستر خوان کو سیدھے ہاتھ میں تھاما۔ اور الٹے ہاتھ میں خالی چائے کی دیگچی کو پکڑتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

”نہیں یہ سب کچھ پسند نہیں ہے۔ وہ نادیدہ لوگ میرے ہمدرد ہیں اور تجھے سمجھانے کے لئے آئیں گے۔“

گھمن نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے اس کی باتوں کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ سمجھنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اس لئے ہاتھ منہ دھو کر کالو کے کوارٹر کی طرف چلا آیا۔ کالو اسٹیشن ماسٹر کے گھر کی طرف جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ گھمن کو دیکھتے ہی پر جوش انداز میں بولا۔

رجی بہت جاندار عورت ہے۔ میں اسے تمام زندگی بھلا نہیں پاؤں گا۔" کھمن نے اسے یاددہانی کرانے کے لئے کہا۔

"تو اسٹیشن ماسٹر سے آج کے دن میرے متعلق بات چیت ضرور کرنا۔ مجھ سے اب رات کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔"

کالو نے اسے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔

"تو فکر نہ کر تیرا کام ہوجائے گا۔ میں شام کو تیرے ساتھ تفصیلی بات چیت کروں گا۔ ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر کے گھر جانا ہے۔" کھمن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کالو کے کوارٹر سے باہر نکل کر اپنے کوارٹر میں چلا آیا۔

رجی ناشتے کے بعد برتن دھونے میں مصروف تھی۔ وہ اس کے قریب ہی کچی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ رجی نے اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ اور خاموشی کے ساتھ برتن دھوتی رہی۔ وہ نہایت کم گو اور پراسرار شخصیت کی مالک تھی۔ شادی کے بعد سے اب تک اس نے بہت کم بات چیت کی تھی۔ لیکن گھر کے کام کاج کے لحاظ سے پھرتیلی عورت تھی۔ فرمانبرداری کے معاملے میں صف اول تھی۔ کھمن جیسا کہتا تھا وہ آنکھیں بند کرکے ویسا ہی کرتی تھی۔ چند لمحے زمین پر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد کھمن نے پوچھا۔

"تو صبح کن لوگوں کی بات کر رہی تھی کہ وہ نادیدہ ہمدرد لوگ سمجھانے کے لئے آئیں گے؟" رجی کے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ یکلخت رک گئے۔ اس نے کھمن کی طرف دیکھا اور بولی۔

"وہ میرے چاہنے والے ہیں۔ غلط کام برداشت نہیں کرتے۔ میرے پہلے دونوں شوہروں نے بھی ایسا کیا تھا۔ اس لئے انہیں ختم کردیا گیا۔ ان کی لاشیں گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے سے ملی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ اور سر پر بال بھی نہیں تھے۔"

کھمن نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"قاتل کا پتا نہیں چلا۔ گاؤں کا کوئی بندہ ہوگا۔" رجی نے برتن سمیٹے اور انہیں نیم کے درخت کے نیچے رکھی ہوئی چارپائی پر سوکھنے کے لئے ترتیب کے ساتھ رکھنے لگی۔

کھمن نے دوبارہ پوچھا۔

"تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ دو ایک جیسی موت کے بعد تو تجھ پر بھی گاؤں والوں کو شک کرنا چاہئے تھا۔" اس دفعہ اس نے جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف مڑتے ہوئے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"اسی لئے تو تجھے سمجھا رہی ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے غلط کاموں کو ترک کردے۔ ورنہ تیرے حق میں بھی اچھا نہیں ہوگا۔" اس کے لہجے میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ کھمن نے گھبرا کر منہ برآمدے کی طرف پھیرلیا۔ اور پھر خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ اسے رات جاگنے کے لئے دن کو آٹھ گھنٹے کی نیند پوری کرنا ہوتی تھی۔ اس لئے رضائی اوڑھ کر سونے کے لئے لیٹ گیا۔

شام کو مغرب سے کچھ پہلے اس کی ملاقات ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے سامنے کالو سے ہوئی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنیں چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی عمارت کا محاصرہ کررہی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے سامنے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر لگے ہوئے درخت کے نیچے لکڑی کا بنچ رکھا تھا۔ کھمن اور کالو اس بنچ پر بیٹھ گئے۔ کھمن نے جیب میں سے بیڑی نکالی اور ایک کالو کو تھمانے کے بعد ماچس سے انہیں سلگانے لگا۔ دور آسمان پر مرغابیوں کا جھنڈ قریب واقع جھیل کا رخ کررہا تھا۔ بیڑی سلگانے کے بعد اس نے کالو سے اپنی نوکری کے متعلق دریافت کیا۔ تو کالو بیڑی کا لمبا کش لگاتے ہوئے بولا۔

"میں نے اسٹیشن ماسٹر سے تیرے متعلق بات چیت کی ہے۔ وہ تجھے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے تیار ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی ریلوے کے بڑے افسروں کے ساتھ دوستی یاری ہے۔ وہ انہیں کہہ کر تیری نوکری کی تبدیلی کے آرڈر نکال لے گا۔ تیری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ اور کام بھی تجھے زیادہ نہیں کرنا پڑے گا۔" کھمن کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرنے لگے اس نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

"تیرے اندازے کے مطابق کب تک کام ہوجائے گا۔ دیکھ یار اب مجھ سے رات کے وقت ڈیوٹی نہیں دی جاتی۔ جتنا جلدی ممکن ہوجائے۔ میرے لئے بہتر

ہوگا۔" کالو مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ پرسوں ریلوے ہیڈ کوارٹر جارہا ہے۔ دو دن کا کام ہے۔ تیسرے دن آتے ہوئے اپنے ساتھ تیری تبدیلی کے آرڈر بھی لیتا آئے گا۔ تجھے تین چار دن تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔" گھمسن نے انکساری کے ساتھ سر اثبات میں چلایا۔ اور جانے کے لئے اٹھنے لگا۔ کالو نے ہاتھ بڑھا کر اسے دوبارہ بنچ پر بٹھالیا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"وہ اس کام کے لئے کسی بھی صورت میں راضی نہیں ہورہا تھا۔ ایسے کاموں کے لئے تو لوگ اس کے پاس روپوں کی گڈیاں لے کر آتے ہیں۔ وہ تب بھی ان کا کام نہیں کرتا۔ تیرے کام کے لئے تو وہ بغیر پیسہ لئے راضی ہوگیا ہے۔ لیکن بدلے میں اسے رجی کی ایک رات چاہئے۔"

گھمسن کے چہرے پر سوچ کے تاثرات ابھرے۔ اور وہ پریشان لہجے میں بولا۔

"آج وہ رجی کی رفاقت چاہتا ہے۔ کل کو میری تبدیلی کے آرڈر نکلوانے کے لئے ہیڈ کوارٹر کا کوئی اور افسر متمنی ہوگا تو مجھے بتا۔ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ کام ہوجائے تب بھی ایک بات ہے۔ اب تک تو معاملہ صرف امید پر ہی قائم ہے۔"

"کالو نے اس دفعہ کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

"شہر والوں کے پاس بھڑ کیلے کپڑوں والی زنانیوں کی کمی نہیں ہے۔ تیری رجی کو تو وہ گھاس بھی نہ ڈالیں۔ پھر کام تو سب اسٹیشن ماسٹر نے ہی کرنا ہے۔ اس لئے اسے خوش کرنا نہایت ضروری ہے۔ اچھی طرح سوچ لے۔ تیرے پاس رات دس بجے تک کا وقت ہے۔ اگر دل مانتا ہے تو رجی کو بنا سنگھار کرا کے اسٹیشن ماسٹر کے مکان پر پہنچادینا۔ وہ پرسوں شہر جارہا ہے۔ اور دیکھ اس کے ساتھ فضول کی بات چیت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ غصے کا بہت تیز ہے۔"

گھمسن نے بیڑی کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسلا۔ اور اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلا آیا۔ اسے کالو کی نیت میں فتور محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اس کے کام میں سنجیدہ نہیں تھا۔ ایسے ہی ٹال مٹول کررہا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس نے اسٹیشن ماسٹر کو رجی کے ساتھ رات بتانے کا کہہ کر خوب رقم ہتھیائی ہو۔ اس صورت میں گھمسن کا کام ہونا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال گھر پہنچنے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور رات کو اسٹیشن ماسٹر سے تفصیلی بات چیت کا ارادہ کرکے ریلوے پھاٹک پر چلا آیا۔ اس رات دنیارا ایکسپریس کچھ دیر سے پھاٹک سے گزری۔ گھمسن نے عجلت کے عالم میں پھاٹک کو کھولا۔ اور ٹریفک رواں دواں ہونے کے بعد کمرے کو تالا لگا کر کوارٹر کی طرف چلا آیا۔

رجی حسب معمول رضائی میں گھسی ہوئی آرام کررہی تھی۔ گھمسن نے غصیلے لہجے میں اسے تیار ہونے کے لئے کہا تو وہ سرد لہجے میں بولی۔ "میں نے تجھے صبح بھی خبردار کیا تھا کہ "وہ نادیدہ ہمدرد لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر تو نہیں مانے گا تو وہ تجھے سمجھانے کے لئے آئیں گے۔" گھمسن نے بے دردی کے ساتھ اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کردیا۔ پھر تلخ لہجے میں بولا۔

"تیری ماں کو سمجھانے کے لئے تو کوئی نہیں آیا تھا۔ کیا اس نے میرے ساتھ ناانصافی نہیں کی۔ چل زیادہ ٹرٹر نہ کر اور خاموشی کے ساتھ تیار ہوجا۔ اسٹیشن ماسٹر ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔"

رجی نے چارپائی کے نیچے سے ٹرنک باہر نکالا۔ اور کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ گھمسن نے دونوں ہاتھ کوئلے کی انگیٹھی پر رکھ دیئے۔ اور اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کرنے کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب کرنے لگا۔

"جناب رجی کا پاؤں بھاری ہے۔ اس لئے مجھے رات کو اس کے قریب رہنا ہوتا ہے۔" پھر اس نے فوراً الفاظ کو مسترد کردیا۔ اس صورت میں اسٹیشن ماسٹر رجی کو کبھی بھی اپنے پاس نہیں رکھے گا۔

اسے کچھ اور سوچنا چاہئے۔ لیکن الفاظ اس کے دماغ میں گڈمڈ ہونے لگے۔ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جھنجلا کر اس نے رجی کے چہرے پر ایک تھپڑ اور رسید کردیا۔ پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

"تو کیا مرے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے تبدیل کررہی ہے۔ مجھے پہلے ہی دیر ہوچکی ہے۔ اگر اسٹیشن ماسٹر سوگیا۔ تب اس کے ساتھ ہی ہماری تقدیر بھی سوجائے گی۔ جلدی ہاتھ چلا۔"

"رجی نے عجلت کے عالم میں کپڑے تبدیل کئے۔ اور جوتیاں پہن کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ گھمسن نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ اسٹیشن ماسٹر کا گھر عمارت کے عقب میں واقع تھا۔ اس کے گھر کی چھتیں سرخ ٹین سے بنی ہوئی تھیں۔ مکان کے سامنے کی طرف پودوں کی کیاریاں تھیں۔ جن کے پیچھے برآمدہ تھا۔ سامنے کا علاقہ باڑھ لگا بند کیا گیا تھا۔ باڑھ کے درمیان میں لکڑی کا دروازہ بنا تھا۔ اس کا گھر فیروز پور لائن کا سب سے خوب صورت گھر تھا۔ گھمسن کے دل میں اکثر خواہش مچلنے لگتی تھی کہ وہ اندر جا کر مکان کو دیکھے۔ رجی خوش نصیب تھی کہ اسے یہ موقع ملنے والا تھا۔ اس نے لکڑی کے دروازے کو کھولا۔ اور کچا علاقہ عبور کر کے برآمدے میں چلا آیا۔ وہاں گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ اس نے گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ پھر فوراً ہاتھ اٹھالیا۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بہتر مستقبل کا فیصلہ اس کے ہاتھوں میں ہی تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اسٹیشن ماسٹر نے کھوجتی نگاہوں کے ساتھ گھمسن کی طرف دیکھا۔ وہ سونے کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کے کھچڑی ہوتے ہوئے بالوں میں سفید رنگ کی آمیزش تھی۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں والا چشمہ لگا ہوا تھا۔ مونچھیں ہونٹوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ جن کے سروں کو تاؤ دے کر اوپر کیا گیا تھا۔ اس کے بارعب شخصیت کو محسوس کرتے ہوئے گھمسن کی گھگھی بند ہوگئی۔ اس نے بمشکل تمام حلق میں آنے والا تھوک نگلا اور مسکین نگاہوں کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے رجی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر ممیاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ رجی ہے جی۔ کالو نے آپ سے اس کے متعلق بات چیت کی تھی۔" اسٹیشن ماسٹر نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے رجی کے سراپے کا جائزہ لیا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔

"تو نے آنے میں بہت دیر لگادی۔ میں کب سے تیرا انتظار کررہا تھا۔" گھمسن بولا۔

آج دینار ایکسپریس کچھ دیر سے آئی تھی۔ کالو نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میری ڈیوٹی اسٹیشن کے قریب بنے ہوئے پھاٹک پر ہوتی ہے۔ حضور تمام رات جاگتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ بہت تکلیف دہ نوکری ہے۔" اسٹیشن ماسٹر نے بیزار ہونے والے انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کے لئے کہا۔ پھر رجی کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

"صبح سات بجے اسے یہاں سے لے جانا۔ اب میرا وقت برباد نہ کر اور پھاٹک پر جا کر ڈیوٹی دے۔" اس نے جواب سنے بغیر دروازہ بند کردیا۔ گھمسن نے بے چارگی کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ پھاٹک کی طرف چلا آیا۔ اسے اسٹیشن ماسٹر کے رویے سے یہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ کالو واقعی اس کے ساتھ ساز باز کررہا تھا۔ اور اس نے اسٹیشن ماسٹر سے اس کی نوکری کے متعلق بات چیت نہیں کی تھی اس نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ صبح خود اسٹیشن ماسٹر سے اپنی نوکری کے متعلق بات چیت کرے گا۔

☆......☆......☆

فیروز پور لائن کا پھاٹک سنسان پڑا تھا۔ دھند کی دبیز تہہ نے میدان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اب اگلی ٹرین نے رات کو بارہ بجے کے بعد ریلوے پھاٹک کا رخ کرنا تھا۔ اس وقت تک کے لئے وہ فارغ تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو کر اسے بند کردیا۔ پھر بتی جلا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں سبز اور سرخ رنگ کی جھنڈی کے علاوہ سرخ لالٹین پڑی تھی۔ جو اسے بوقت ضرورت ہمراہ لے جانی ہوتی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی دیوار کے پاس سالخوردہ لوہے کی میز رکھی ہوئی تھی۔ جس کے ارد گرد متروک شدہ آواز اور سامان پڑا تھا۔ باقی کمرہ خالی تھا۔ زمین پر بیٹھنے کے بعد وہ اسٹیشن ماسٹر سے اگلے دن کی گفتگو کا تانا بانا دماغ میں ترتیب دینے لگا۔

"جناب پھاٹک پر ڈیوٹی کے دوران گہری دھند کی وجہ سے مجھے ٹی بی ہونے کا خدشہ لاحق ہے۔ اس لئے میری نوکری کے اوقات کو دن میں تبدیل کردیا جائے۔" اس نے سر جھٹک کر بہانے کو رد کردیا۔ اگر اسٹیشن ماسٹر نے اس کا چیک اپ کروانے پر اصرار کیا۔ تو اس کے جھوٹ کا بھید کھل بھی سکتا تھا۔ اس کے بجائے اگر وہ یہ کہتا کہ رات کو نوکری کے اوقات

کے دوران وہ رجی کو اس کے مکان تک نہیں پہنچا سکتا۔

ایک دو دن کی بات الگ ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ یہ بہانہ اس وقت کارآمد ثابت ہوتا۔ جب اسٹیشن ماسٹر رجی کو پسند کر لیتا۔ اس صورت میں وہ گھمسن کی جائز اور ناجائز تمام شرائط ماننے کے لئے آمادہ ہو سکتا تھا۔ گھمسن کی سوچ کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ فیروز پور لائن سے قریب ترین آبادی بھی پانچ چھ میل سے کم فاصلے پر واقع نہ تھی۔ اور سردی کی بے انتہا بڑھتی ہوئی لہر کی بدولت ہوش و حواس سے بھرا انسان بھی اس وقت باہر نکلنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس دفعہ شدت پہلے سے کچھ زیادہ تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولنے کے بعد دروازے کے پٹ وا کر دیئے۔ تیز ہوا کا برفیلا جھونکا۔ کمرے میں گھستا چلا آیا۔ لیکن دروازے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہ دہلیز پار کر کے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا طاری تھا۔ سڑک کے پاس گاڑیوں کی اکادکا روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میدان ویران پڑا تھا۔ لیکن غور سے دیکھنے پر وہاں چند سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کچے کمرے کا رخ کر رہے تھے۔ گھمسن گھبرا کر کمرے میں گھس گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پھر دیوار کے کونے میں بیٹھ کر اپنا سر گھٹنوں کے درمیان میں چھپا لیا۔

☆......☆......☆

صبح اسٹیشن ماسٹر کی آنکھ گھنٹی کی آواز سے کھلی۔ اس نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ باہر ابھی تک اندھیرا طاری تھا۔ نہ جانے منہ اندھیرے کون اس کے مکان کی طرف چلا آیا تھا۔ اس نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی رجی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلنے لگے۔ گھمسن اپنی بیوی کو لینے کے لئے گھنٹہ قبل ہی مکان کی طرف چلا آیا تھا۔ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی جوتیاں پہنیں اور جسم کے گرد چادر لپیٹ کر دروازے کی طرف چلا آیا۔ دروازہ کھولنے پر اس نے کالو کو سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"جناب غضب ہو گیا۔ فیروز پور لائن کے پھاٹک کا چوکیدار صبح ساڑھے پانچ بجے والی گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ معاملہ انتہائی پراسرار نوعیت کا ہے۔ گاڑی گزرنے سے قبل اس نے معمول کے مطابق پھاٹک کو بند کیا۔ پھر لائن پر لیٹ کر جان دے دی۔" اسٹیشن ماسٹر نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اس میں کیا اسرار چھپا ہے۔ وہ اپنی نوکری سے خوش نہیں تھا۔ اور بیوی بھی پاگل تھی۔ اگر اس نے خودکشی کر لی۔ تو اس میں بھلا تعجب کی کیا بات ہے۔"

کالو پریشان لہجے میں بولا۔

"بات تعجب خیز ہے جناب۔ کیونکہ حیرت انگیز طور پر گھمسن کا چہرہ گاڑی کے پہیوں کے نیچے آنے سے بچ گیا اور اس کے چہرے سے آنکھیں نوچ کر باہر نکال لی گئیں، اس کے سر پر بال بھی موجود نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے استرا پھیر کر اسے صاف کیا گیا ہو۔

اب کی دفعہ اسٹیشن ماسٹر کی آنکھوں میں پریشانی کے سائے رقص کرنے لگے۔ اور وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "رجی کے پہلے دونوں شوہروں کی موتیں بھی ایسے ہی ہوئی تھیں۔ رات کو مختصر بات چیت کے دوران اس نے مجھے اپنی پہلی دونوں شادیوں کے متعلق تفصیل سے بتایا تھا۔ اس کی بات درمیان میں رہ گئی اور رجی اس کے پیچھے نمودار ہوئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے خوفزدہ نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر کالو سے مخاطب ہو کر بولا۔

"گھمسن کی لاش کو اسپتال بھجوانے کا انتظام کرو۔ اور اس سے قبل اسے قریبی گاؤں میں اس کی ماں کے پاس بھجوا دو۔ میں کپڑے تبدیل کر کے فیروز پور لائن کی طرف آتا ہوں۔" کالو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور رجی کا ہاتھ تھامے مکان سے باہر نکل گیا۔



جنون

طارق محمود۔ کامرہ اٹک

اچانک خوفناک شیر نے ان تینوں پر چھلانگ لگایا مگر یہ کیا وہ شیر برف میں دھنستا چلاگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ کو برف نے ڈھک دیا تو پھر اچانک……

جب انسان کی اپنی پر بن آتی ہے تو وہ موت سے بھی ٹکر لینے کا سوچتا ہے، سچی کہانی

کار آہستہ رفتار سے سڑک پر چلی جارہی تھی سڑک کے ساتھ ساتھ دونوں طرف پہاڑیاں جن پر پڑی ہلکی ہلکی برف بڑا خوب صورت منظر پیش کررہی تھی کار میں بیٹھے تین کھلنڈرے سے لڑکے اس منظر سے خوب لطف اندوز ہورہے تھے آسمان پر کالے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنے لگی تھی موسم اچانک خطرناک روپ اختیار کرنے لگا تو گاڑی چلانے والے نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی لیکن اب کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ برف باری شروع ہوچکی تھی کار کے سامنے سڑک پر برف کے

گالے گر رہے تھے اسی لئے کار کی رفتار مجبوراً آہستہ کر دی گئی۔

"میں تو کہتا ہوں کہ موسم ٹھیک نہیں اور رات بھی ہونے والی ہے اسی لئے کوئی ہوٹل وغیرہ دیکھ کر گاڑی روک لو۔" پیچھے بیٹھے لڑکے نے اونچی آواز سے کہا۔ اور ٹھیک اسی وقت سڑک کے بائیں طرف ایک ہوٹل کا بورڈ نظر آ گیا ڈرائیور نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی۔

"یہ لو یار میں بھی تو کوئی ہوٹل وغیرہ ہی دیکھ رہا تھا تاکہ رات وہاں گزار کر صبح فریش ہو کر یہاں سے چلیں پتہ نہیں آگے مزید کتنا سفر ہو۔"

ڈرائیونگ کرنے والے لڑکے نے آگے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا کیونکہ سامنے ہی ہوٹل کا بیرونی جنگلہ دار گیٹ آ گیا تھا جو کہ اتنا ہی کھلا تھا کہ ان کی کار بمشکل اس سے گزر کر اندر داخل ہو سکی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہوٹل کی عمارت کھڑی تھی جس کا کے فرنٹ پر ایک طویل برآمدہ تھا وہ لوگ کار کو برآمدہ کے ساتھ ہی باہر کی طرف بنے ہوئے شاید گاڑیوں کے لئے ایک سائبان کے نیچے لے گئے کار سے اپنا سامان نکال کر وہ ہوٹل کی طرف چل دیئے برآمدہ میں ایک آٹھ نو سال کا کیوٹ سا بچہ کھڑا ان کی طرف دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اسی وقت ہوٹل کے اندر سے کسی نے اونچی آواز سے پکارا" رضا...... زیادہ دیر باہر کھڑے نہ ہو ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

" بس ابو آ رہا ہوں...... کوئی آیا ہے۔"

کیوٹ سے لڑکے نے دروازے سے اندر منہ کر کے جواب دیا اتنی دیر میں وہ تینوں رضا کے پاس پہنچ گئے تھے اور ٹھنڈ کی وجہ سے کانپنے بھی لگے تھے۔

"ہائے...... میں بصیر...... یہ سلیم اور توقیر...... رات گزارنے کے لئے ہوٹل میں رک گئے۔" رضا ان تینوں کو لے کر اندر کی طرف چل پڑا اندر سے ایک آدمی نکل کر باہر کی طرف آ رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔

"ہم مسافر ہیں...... بس ایک رات کے لئے ہوٹل میں جگہ دے دیں۔" بصیر نے جلدی سے کہا تو وہ آدمی مسکرانے لگا۔

"کیوں نہیں میں اس ہوٹل کا مالک وارث ہوں اور یہ میرا بیٹا۔"

"رضا...... بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" بصیر نے وارث کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا اس کی بات پہ وارث، رضا اور پھر سب ہی ہنسنے لگے۔

ان کو ایک رات کے لئے بڑا سا کمرہ مل گیا تھا جس میں ایک بڑا اور ایک سنگل بیڈ کوئلے سے جلنے کی انگیٹھی گرم پانی کی ٹنکی جس کا پانی کچھ ہی دیر بعد گرم ہو گیا جس سے ان تینوں نے ہاتھ منہ دھو کر کچن کی طرف منہ کیا جہاں وارث اور اس کا بیٹا رضا کھانا تیار کئے ان لوگوں کا ہی انتظار کر رہے تھے کھانے میں دال ساگ اور انڈے تھے۔

"معذرت اس موسم میں اور کچھ پیش نہیں کر سکتا۔" وارث نے اتنا ہی کہا تھا کہ بصیر نے کہا۔

"کیوں شرمندہ کر رہے ہیں یہ بھی بہت کچھ ہے ہمارے لئے۔"

کھانا بہت ہی مزے کا تھا جس کی تعریف ان تینوں نے کی تو وارث اور رضا بہت خوش ہوئے، کھانا کھا کر وہ تینوں کمرے میں آ گئے جو انگیٹھی کے جلنے سے خوب گرم ہو رہا تھا۔ بصیر اور توقیر بڑے بیڈ پر لیٹ گئے اور سلیم نے سنگل بیڈ پر قبضہ کر لیا تھوڑی دیر بعد ہی اس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے بصیر اور توقیر ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے آنکھیں کھولے کچھ سوچ رہے تھے دونوں ہی نے ایک دوسرے کو جاگتا محسوس کر لیا۔

"توقیر کیا بات ہے میری طرح نیند نہیں آ رہی ہے کیا۔"

"ہوں......" بصیر کی آواز سن کر توقیر چونک اٹھا۔

"یار مجھے لگ رہا ہے اس وارث کو میں نے

پہلے کہیں دیکھا ہے۔لیکن اب یہ یاد نہیں آ رہا کہ کہاں دیکھا ہے۔''

''دیکھا ہوگا یار لیکن اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے۔'' بصیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یار اس آدمی کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی چبھن سی ہے کوئی گرہ سی ہے۔'' توقیر نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے تو بہت اچھا بندہ لگا ہے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اپنے بیٹے کو سنبھال رہا ہے دوسری شادی تک نہیں کی۔''

یہ باتیں کرتے کرتے دونوں سو گئے۔

بصیر کو ایسا لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو تیز ہوائیں اور کسی گاڑی کے ڈگمگانے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی باہر برف باری شروع تھی ایک عجیب سی آواز اسے سنائی دے رہی تھی بصیر اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور اس کا شیشہ صاف کر کے باہر دیکھنے لگا اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

چیخ کی آواز سن کر توقیر اور سلیم اٹھ گئے انہیں بھی باہر گڑبڑ کا احساس ہوا وہ دونوں ہی اٹھ کر کھڑکی پر پہنچے اور باہر کا منظر دیکھ کر ڈر گئے باہر ایک سفید بڑا سا شیر ان کی کار کے گرد گھوم رہا تھا ساتھ ہی وہ اپنا جسم گاڑی کے ساتھ اس طرح رگڑتا کہ گاڑی ہچکولے کھانے لگتی یہ دیکھ کر ان تینوں کی گھگھی بندھ گئی۔

سلیم ڈر کے پیچھے ہٹا اس کا ہاتھ میز پر رکھے گملے سے ٹکرایا جو کہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا فضا میں اس کی آواز گونج اٹھی وہ تینوں ڈر سے گئے بصیر نے پھر باہر دیکھا تو شیر غائب تھا اس کے بعد ان تینوں کو نیند نہیں آئی۔

''اوہ......نو......'' توقیر کے منہ سے اچانک شیر کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے نکلا۔

''کیا ہوا۔'' سلیم اور بصیر نے بیک وقت پوچھا۔

''مجھے یاد آ گیا...... یہ وارث ایک خطرناک قاتل ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔'' بصیر نے کہا جبکہ سلیم چپ چاپ ہونقوں کی طرح دونوں کا منہ دیکھنے لگا کیونکہ اسے دونوں میں ہونے والی باتیں معلوم نہ تھیں۔

''ہاں یار مجھے یاد آ گیا ابو نے ایک تھیسس پر کام کرنا تھا جس کے لئے انہیں پرانے اخباروں کی ضرورت پڑی جس کے لئے وہ لائبریری سے پرانے اخباروں کا ایک ڈھیر لے آئے انہی اخباروں میں ایک اخبار میں تانکا جھانکی کے دوران میں نے وہ خبر پڑھی۔''

''کون سی خبر۔'' دونوں ہی یک زبان ہو کر بولے۔

''ایک آدمی نے پانچ آدمیوں کو سوتے ہوئے بے دردی سے ذبح کر ڈالا نیچے تفصیل بھی تھی اور اس آدمی کی تصویر بھی۔'' توقیر نے سنسنی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''یار پہلی بات تو یہ کہ وہ اس قاتل کا ہمشکل ہوسکتا ہے اور دوسری بات پانچ قتل کرنے پر تو اس آدمی کو پھانسی بھی ہو چکی ہوگی۔'' بصیر نے دانش مندوں جیسا تجزیہ پیش کیا۔

''یار اسی لئے تو مجھے یہ وہ آدمی لگ رہا ہے کیونکہ میں اس کیس کے بارے میں تقریباً سارے اخبار پڑھے وہ آدمی آخر میں ایک عورت اور مرد کی گواہی پر رہا کر دیا گیا جنہوں نے عدالت میں گواہی دی کہ جس وقت یہ قتل ہوئے یہ آدمی اس جگہ سے کوسوں دور تھا۔''

اس بات پر کمرہ میں ایک سنجیدہ خاموشی چھا گئی۔

''اوئے اخبار میں اس آدمی کا نام تو ہوگا۔'' سلیم نے بھیانک خاموشی کو توڑا۔

''نام ہی تو مجھے یاد نہیں آ رہا۔'' توقیر نے بے بسی سے کہا۔

''دیکھو اگر یہ آدمی قاتل ہوتا تو اسے سزا

ضرور ملتی یہ قاتل نہیں تھا اسی لئے تو آزاد گھوم رہا ہے..... اور ویسے بھی مجھے تو یہ آدمی کہیں سے بھی قاتل نہیں لگتا اتنا اچھا آدمی قاتل نہیں ہوسکتا۔"

ان ہی باتوں میں رات گزر گئی لیکن وہ تینوں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے پوری رات برف پڑتی رہی جب انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو سفید برف کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہ آیا شیر کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اندر آگئے ناشتہ تیار تھا جو کہ اس دفعہ ڈائننگ روم میں لگایا گیا تھا ناشتہ کرتے ہوئے توقیر کی نظر سامنے دیوار پر لگی ایک تصویر پر چلی گئی جس میں وارث ایک عورت کے ساتھ ایک برف پوش پہاڑ پر کھڑا مسکرا رہا تھا وہ عورت شاید وارث کی بیوی تھی وہ تصویر دیکھ کر توقیر چونک اٹھا اور پھر جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے انہیں کچھ اشاروں میں جلدی اندر آنے کا کہہ کر کمرہ میں چلا گیا۔ بصیر اور سلیم نے اس کی بدحواسی محسوس کر لی تھی وارث اور ان کا بیٹا رضا نیچے دیکھتے ہوئے ناشتہ کرتے رہے بصیر اور سلیم بھی ناشتہ کرتے ہی کمرہ میں چلے آئے جہاں توقیر کمرہ میں پریشان ٹہل رہا تھا۔

"یہ وہی ہے اب مجھے پکا یقین ہوگیا ہے۔" ان کے اندر داخل ہوتے ہی توقیر نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"اس عورت کی تصویر لگی ہے اسی وارث کے ساتھ دیوار پر جس نے اس کی بے گناہی کی گواہی دی تھی۔"

اب کے باقی دونوں بھی پریشان ہوگئے۔

"کیا کرنا چاہئے اب۔" بصیر نے ہاتھ ملتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

"میں تو کہتا ہوں یہاں سے نکل چلیں۔"

توقیر نے مشورہ دیا اور پھر وہ باہر کا ماحول دیکھنے آئے لیکن اب بھی برف آسمان سے ایسے گر رہی تھی جیسے کہ اس کے بعد اس کو موقع نہیں ملتا۔

وہ تینوں پریشانی میں واپس آگئے اور پھر ایک رات اور بھی انہیں اسی ہوٹل میں جاگ کر گزارنی پڑی۔

دوسرے دن برف باری رک چکی تھی وہ تینوں ناشتہ کرنے کے بعد تیار ہو کر نکلے انہوں نے وارث کا شکریہ ادا کیا اور معقول معاوضہ دیا جو کہ اس نے بخوشی قبول کیا ان تینوں کو رضا نظر نہ آیا جس کو وہ کچھ دینا چاہتے تھے ڈرائیونگ بصیر نے سنبھالی۔ ابھی وہ کار کو تھوڑا سا آگے ہی لے کر گیا تھا کہ رضا اچانک دائیں طرف برف سے نکلا بصیر نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن گاڑی کی سائیڈ اسے بری طرح سے لگی اور رضا اڑتا ہوا برف کے اندر جا گرا۔

"اوہ......نو"

بصیر کے منہ سے نکلا اور اس نے گاڑی روک دی اور جلدی سے اتر کر رضا کی طرف بھاگا جو کہ برف کے اندر دھنس چکا تھا توقیر اور سلیم بھی آگئے انہوں نے مل کر رضا کو برف سے باہر نکالا جھٹکا بہت ہی شدید تھا جس نے رضا کی سانس سینے ہی میں اٹکا دی بصیر نے اس کے دل کے مقام پر کان رکھ کر دل کی دھڑکن چیک کرنے کی کوشش کی جو کہ بہت ہی آہستہ چل رہی تھی بصیر کا رنگ پہلے ہی متغیر تھا اور اب رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔

"جلدی کرو اسے اٹھا کر اسپتال تک لے کر جانا ہے۔"

بصیر نے رضا کو اٹھاتے ہوئے کہا تو توقیر اور سلیم اٹھانے کے لئے جھکے لیکن پھر اچانک ہی توقیر نے اسے چھوڑ دیا۔ "نہیں یہ راستے ہی میں مر جائے گا اور ہم پھنس جائیں گے اسے ادھر ہی چھوڑو اور نکل چلو۔"

باقی دونوں کو اس کی بات سمجھنے میں دیر نہ لگی وہ دونوں بھی رضا کو ادھر ہی چھوڑ کر توقیر کے پیچھے بھاگتے ہوئے کار تک جا پہنچے تو توقیر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اس نے ان کے بیٹھتے ہی کار دوڑا دی۔

ٹھیک اسی وقت وارث ہوٹل کی پچھلی سمت سے نمودار ہوا اور محتاط انداز سے ادھر ہی دیکھنے لگا ان لوگوں کو افراتفری میں بھاگتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا وہ گاڑی بھی سامنے سڑک کی بجائے دوسرے راستے کی طرف لے گئے تھے جو کہ کچھ ہی آگے جا کر برف نے مکمل بند کر دیا تھا ان کے وہاں سے نکلتے ہی وارث نے ہلکی سی سیٹی مار کر کسی کو اشارہ کیا اور خود چلتے ہوئے اس طرف آنے لگا جہاں سے وہ تینوں بھاگے تھے وارث کے پیچھے ہوٹل کے ایک کونے سے سفید رنگ کا بڑا سا شیر نمودار ہوا اور اس کے پیچھے چلنے لگا شیر نے کھلی فضا میں آ کر ہی کچھ محسوس کر لیا اور غرانے لگا اس کے غراتے ہی وارث نے شیر کی طرف دیکھا لیکن شیر نے دو تین جست لگائیں اور سید ھا رضا کے قریب جا پہنچا۔

وارث بھی گڑبڑ کر سمجھ گیا وہ بھی دوڑتا ہوا ادھر پہنچا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو یوں مردہ حالت میں پڑا دیکھا تو اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔

شیر کی ایک فلک شگاف دھاڑ نے اسے ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کیا وارث نے اپنے بیٹے کو اٹھایا اور ہوٹل کے پچھواڑے بھاگا چند ہی منٹوں بعد وہ گھوڑے پر سوار اپنے بیٹے کو گود میں بیٹھائے ایک طرف دوڑاتے چلا جا رہا تھا۔

''نہیں بہت مشکل ہے اگر تم اپنے بیٹے کو بڑے اسپتال تک پہنچا سکو تو اس کی جان بچ سکتی ہے گاڑی کی ٹکر سے اس کی سانس سینے میں اٹک گئی ہے۔'' اس چھوٹے سے اسپتال کے واحد ڈاکٹر نے رضا کو انجکشن اور سینے کی مالش کرنے کے بعد وارث سے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب بڑا اسپتال تو بہت دور ہے۔'' وارث کا دل ڈاکٹر کی بات سن کر ڈوب سا گیا۔

''وارث دیر نہ کرو۔'' ڈاکٹر نے کہا تو وارث اپنے بیٹے کو اٹھا کر وہاں سے نکل آیا لیکن اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں کیونکہ اسے معلوم تھا بڑے اسپتال تک پہنچنا مشکل تھا ایک تو فاصلہ بہت تھا اور دوسرا برف نے تمام راستے بند کر دیئے تھے اسے ان تینوں پہ بہت غصہ تھا اگر انہوں نے ٹکر ماری دی تھی تو کم از کم اسپتال تک تو رضا کو پہنچا دیتے آگے آگے گھوڑا دوڑ رہا تھا اور اس کے پیچھے شیر، اچانک وارث نے گھوڑا روک لیا۔

دائیں طرف پہاڑوں کے اندر ایک درہ سا جا رہا تھا جس کی طرف دیکھتے ہوئے وارث کچھ سوچنے لگا اس کے چہرہ پر کشمکش کے آثار سے تھے آخر اس نے اس درہ پر گھوڑا ڈال دیا اور پندرہ منٹ کے سفر کے بعد ایک غار کے سامنے گھوڑا روکتے ہوئے اپنے بچے کو اٹھا کر غار کے اندر بھاگتا چلا گیا۔

اس غار میں ایک جادوگر رہتا تھا جس سے کہ اس علاقے کے لوگ ڈرتے تھے اور اس سے دور ہی رہتے تھے لیکن اردگرد کے لوگ کچھ عقیدہ والے اس کے پاس اپنے مختلف الجھنوں اور پریشانیوں کے حل کے لئے آتے رہتے تھے۔

وارث غار کے اندر داخل ہو کر جادوگر کے سامنے جا کھڑا ہوا جو کہ آگ جلائے کوئی عمل کرنے میں مصروف تھا اس کو دیکھتے ہی اس نے اشارہ سے ایک طرف بیٹھنے کا کہا لیکن وارث اپنے بیٹے کو اٹھائے آنکھوں میں آنسو غصہ اور بے بسی چہرہ لئے ایک طرف ہوا ضرور لیکن بیٹھا نہیں۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔'' جادوگر نے عمل ختم ہوتے ہی وارث کو مخاطب کیا وارث نے اپنے بیٹے کے ساتھ ہوئے حادثہ اور پھر ڈاکٹر کی بات بتا دی۔ ''اس کے بعد تم کیا چاہتے ہو۔'' جادوگر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے بیٹے کی زندگی چاہئے چاہے جیسے ہی ہو۔'' وارث نے پتھر چہرہ بنا کر کہا۔

''اس کو ادھر لٹا دو۔'' جادوگر کے کہنے پر

وارث نے اپنے بیٹے کواس کے سامنے لٹادیا۔ ''تم اپنے بیٹے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو کچھ بھی۔''

''ہاں میں اپنے بیٹے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔'' وارث نے جادوگر کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

''تو پھر مجھے اس کو زندہ کرنے کے لئے اس آدمی کا سر چاہئے جس نے اسے ٹکر ماری ہے۔'' جادوگر نے سنساہٹ پھیلاتے ہوئے کہا۔ غار میں اچانک ہی سناٹا سا چھا گیا چند لمحے یوں ہی گزر گئے جادوگر کے چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

''لاؤں گا۔'' اک جنون بھرے لہجے میں جواب آیا۔

وارث اپنے اس بیٹے کے لئے کچھ بھی کرسکتا تھا ایک تو وہ اس کی اکلوتی اولاد تھا دوسرا اس کی محبوب بیوی کی آخری نشانی دس سال پہلے اس نے اپنی محبوبہ کو چھیڑنے پر پانچ آدمیوں کی گردن تن سے جدا کردی تھی رائنہ جس اسکول میں پڑھتی تھی وارث اسی اسکول میں مالی تھا۔

اس کے خیالوں میں رائنہ جو ایک خوب صورت لڑکی تھی آ بسی لیکن وہ ایک مالی سے کبھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی وارث نے روتے ہوئے گڑگڑا تے ہوئے یہاں تک کہ اپنا خون بہا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن رائنہ نہ مانی اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک رائنہ کا پیچھا کرتا رہا۔

وارث اور پھر ایک روز رائنہ کو ان پانچ غنڈوں نے اٹھانے کی کوشش کی چند آدمی کے جوانوں کی آنے کی وجہ سے وہ غنڈے بھاگ گئے جب وارث کو اس بات کا علم ہوا تو وہ سلگ اٹھا اور پھر ایک ہی رات میں ان پانچوں کی گردنیں کاٹ کر اس نے حق محبت ادا کردیا وہ گرفتار ہوگیا لیکن اس کے خلاف ثبوت کمزور تھے۔

اس واقعہ نے رائنہ کے دل میں وارث کے لئے محبت کا ایک دیا جلا ہی دیا رائنہ نے اپنے چچا سے جو کہ اس کے والدین کے مرنے کے بعد اس کا سرپرست تھا وارث کے بارے میں سب کچھ بتادیا ساتھ یہ بھی کہ وارث نے وہ قتل بھی اسی کی وجہ سے کئے اس کے بعد چچا اور رائنہ کی گواہی نے وارث کو موت کے پھندے سے اتار لیا اور کچھ عرصہ بعد ہی ان دونوں کی شادی بھی ہوگئی رائنہ بیٹے کو جنم دے کر اس دنیا سے چلی گئی وارث کے لئے رضا ہی اپنا سب کچھ تھا اور وہ اس کے لئے کچھ بھی کرسکتا تھا۔

وہ غصہ سے کانپتا ہوا غار سے نکلا باہر ہی شیر ٹہل رہا تھا۔

''چلو ان تینوں کو پکڑنا ہے۔'' وارث نے گھوڑے پر بیٹھ کر اونچی آواز سے کہا شیر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر زمین پر دیکھتے ہوئے ایک سمت بھاگنے لگا اس کے پیچھے ہی وارث بھی گھوڑے کو دوڑانے لگا۔

توقیر گاڑی بہت ہی تیز چلا رہا تھا نہ تو وہ جگہ جگہ پھیلی برف کا خیال کررہا تھا اور نہ ہی پھسلن کا اچانک برف کے ایک بڑے تودے سے ٹکرا کر گاڑی الٹتے الٹتے بچی اور ٹیڑھی ہو کر پھسلتی ہوئی سیدھی برف کے اندر جا گھسی وہ تینوں بہت مشکل سے گاڑی کے اندر سے نکلے پھر تینوں نے مل کر زور لگایا لیکن گاڑی کو برف سے نہ نکال سکے اس کے بعد اپنی جان بچانے کے لئے وہ برف پر اندھا دھند دوڑنے لگے توقیر ان سے بہت ہی پیچھے رہ گیا بصیر اور سلیم ایک پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئے توقیر انہیں آواز دیتا ہی رہ گیا۔

ان کے پیچھے توقیر ابھی پہاڑ کی چوٹی سے کچھ ہی فاصلہ پر تھا کہ اسے پہاڑی کے نکڑ پر ایک سفید سے شیر کی جھلک دکھائی دی توقیر ٹھٹک کر رکا اور جب شیر دو تین جست بعد اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو توقیر ڈر و حیرت سے مجسمہ بن کر کھڑا رہ گیا۔

اس کے عین پیچھے وارث گھوڑے پر سوار نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں ایک سفید چمکتی ہوئی تلوار تھی تلوار کے ایک ہی وار سے اس نے توقیر کی گردن اڑادی سر اٹھاتے ہوئے جب اس کی نظر توقیر کے چہرے پر پڑی تو اس نے غصہ سے تھوک دیا کیونکہ جب وارث نے ان کو بھاگتے دیکھا تھا تو کار توقیر چلا رہا تھا۔

''میں اس سر کو لے کر جارہا ہوں تم باقی دونوں کو ڈھونڈ کر لاؤ۔''

وارث نے توقیر کے جسم پر ایک نظر ڈالتے ہوئے شیر سے مخاطب ہو کر کہا، کٹی گردن سے خون نکل کر برف میں جذب ہو رہا تھا برف سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔

وارث توقیر کا سر لے کر جادوگر کے پاس واپس پہنچا، تو وہ اس کے بیٹے کو نیم برہنہ کئے اپنے سامنے سیدھا لٹا کر آنکھیں بند کئے کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

''میں سر لے آیا ہوں...... میں سر لے آیا ہوں۔'' وارث نے اونچی آواز سے کہا جادوگر نے اپنی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس سے سر لے کر کچھ پڑھتے ہوئے بالوں سے پکڑ کر سر کو کٹی گردن عین رضا کے دل پر رکھ دیا اور پھر چپ چاپ دوبارہ آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگا، وارث غار کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اس کے چہرہ پر اضطراری کیفیت تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اپنے بیٹے کو خود زندہ کر دیتا۔

''نہیں یہ اس کا سر نہیں ہے...... تم غلط لڑکے کا سر لے آئے ہو۔'' کافی دیر بعد جادوگر نے آنکھیں کھول کر وارث کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے خود دیکھا تھا اس کو گاڑی چلاتے ہوئے۔'' وارث نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے یہ وہ نہیں ہے جلدی جاؤ اس کا سر لے کر آؤ تمہارے پاس وقت کم ہے۔'' جادوگر نے غصہ سے کہا تو وارث ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

''توقیر کہاں گیا۔'' بصیر اور سلیم نے بہت دیر چلنے کے بعد ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں نے اپنی جان بچانے کی فکر میں توقیر کو بھلا ہی دیا جب انہیں توقیر کا خیال آیا اور وہ نہ نظر آیا تو دونوں پریشان ہو گئے اور توقیر کو ادھر ادھر آوازیں دیتے ہوئے ڈھونڈنے لگے کچھ دیر ڈھونڈنے کے بعد بھی جب وہ نہ ملا تو دونوں اس کا خیال چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے لگے۔

وہ ایک چھوٹا سا برفانی میدان تھا جس پر وہ دونوں بھاگ رہے تھے ان سے کچھ ہی فاصلہ پر شیر ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا شیر کی موجودگی محسوس کرتے ہی وہ شور مچا کر اور تیز بھاگنے کی کوشش کرنے لگے ان کے بھاگتے قدموں کے نیچے برف تڑخنے لگی شیر بھاگتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دونوں کے اوپر جا گرا تینوں کے برف پر گرتے ہی برف بیٹھ گئی اور ایک کھائی سی نمودار ہوئی وہ دونوں شیر سمیت اس کھائی میں غائب ہو گئے اسی وقت برف باری شروع ہو گئی جس نے کچھ ہی لمحہ میں اس کھائی کو دوبارہ بھر دیا جس کے اندر وہ تینوں بھی دفن ہو چکے تھے۔

وارث گھوڑے کو اس پہاڑی علاقہ میں ادھر ادھر دوڑاتا رہا لیکن اسے نہ ہی وہ نظر آئے اور نہ ہی شیر، وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا غصہ سے پاگل ہوا جارہا تھا آخر اس کے گھوڑے نے جواب دے دیا تو وارث پیدل ہی ان پہاڑوں میں بھاگنے لگا لیکن ان کو تو شیر سمیت زمین نے نگل لیا تھا، وارث انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے سچ میں ہی پاگل ہو گیا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دل اس قدر اداس پہلے کبھی نہ تھا
غم میرا اک رفیق تو تھا، زندگی نہ تھا
بکھری ہوئی تھی شہر میں چہروں کی بازگشت
جس شخص کی تلاش تھی، بس اک وہی نہ تھا

(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جانا نہ
زندگی تیری عطا تھی سو تیرے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی تیرا احسان جانا نہ

(انتخاب: نسیم ناز.....حیدرآباد)

آج دنیا نے ستم ڈھائے تو دل ٹوٹ گیا
تیری باتیں تیرا انداز وفا یاد آگیا
کاش ہم تم کو منالیتے نہ جانے دیتے
مدتوں بعد یہ احسان خطا یاد آیا

(انتخاب: فلک نسیم.....لاہور)

وہ پتھر جنہیں ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
جب ملی گویائی ہم ہی پر برس پڑے

(انتخاب: الیس حبیب خان.....کراچی)

جنون عشق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے
میری بربادیوں کا ہم نشینوں.....!
تمہیں کیا؟ مجھے بھی غم نہیں ہے.....!

(انتخاب: ساحل دعا بخاری.....بصیر پور)

اس کی باتوں کو بھلادیں یہ ممکن ہی نہیں
اس نے جو بھی کہا رونما ہونے کو ہے
اس کے چہرے کی اداسی سے ہی ظاہر ہے محسن
جیسے وہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہونے کو ہے

(محمد احمد راجپوت.....بورے والا)

ملے ایک بار بچوں یا پرندوں کو حکومت
کوئی ایسا طریقہ شہر میں ہو خوش حال سارے
بچا کر بھی کہاں لے جائیں گے ہم
یہیں رہ جائیں گے ہفتے مہینے سال سارے

(انتخاب: مہک عرفان.....کراچی)

رات کو جب بھی ماہتاب دیکھا تھا
میں نے تیرا ہی پھر خواب دیکھا تھا
تجھے دیکھا تو یہ محسوس ہوا مجھ کو
جیسے پھر ایک آفتاب دیکھا تھا

(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

دل کی آنکھ کھلتی ہے تو سراپا بدل جاتا ہے
محبت کی نظر سے انسان کیا سے کیا ہوجاتا ہے

(عبدالجبار رومی انصاری.....لاہور)

جب ابر ٹوٹ کے برستا ہے نونی
جب دل کے زخموں سے لہو رستا ہے
جب دل کی آگ آنکھ کو برساتی ہے
تم مجھے بہت یاد آتے ہو نونی

(سمیرا گل ناز یوسف.....کراچی)

سنا ہے لفظوں سے لوگ روٹھ جاتے ہیں
چلو پھر ہماری خاموشیاں ہی بہتر ہیں

(عروج ماہین طٰہٰ.....راولپنڈی)

عید ان کی تھی حسرتیں جو اپنی قربان کر گئے
فقط رسمیں نبھانے سے خدا راضی کب ہوا؟ کس سے ہوا؟

(انتخاب: تارہ.....لاہور)

اب تو اس کے بچھڑ جانے کا بھی ملال نہیں ہوتا
ادا ہر غم ہمیشہ پائیدار نہیں ہوتا
وہ بچھڑ گیا ہے تو یہ تقدیر کا فیصلہ تھا
وفا کے نام پر اب کوئی جذبہ بے دار نہیں ہوتا

(انتخاب: خالد پروانہ.....حویلیاں)

غزل کے ترتیب الفاظ سے الجھی تھی میری ذات
سلجھ گئے جب لفظ سارے بکھر گئی میری ذات

(انتخاب: شبیر احمد.....کراچی)

☆☆

غزل

ٹھوکر لگی تو اپنے ہی مقدر پر جاگرا
پھر یوں ہوا کہ آئینہ پتھر پر جاگرا
احساس فرض جب بھی ہوا نیند آگئی
چلنا تھا پھر صراط پر بستر پر جاگرا
بازی محبتوں کی جہالت نے جیت لی
وہ بن گیا خطیب جو ممبر پر جاگرا
خوشبو قصور وار نہیں اس کو چھوڑ دو......
میں پھول توڑتے ہوئے کانٹوں پر جا گرا
صحراؤں میں لیا پھرا اقبال پانی کا جستجو
جب پیاس مرگئی تو سمندر میں جاگرا
(عروج ماہین طٰہٰ......راولپنڈی)

بھایا نہ کسی کو کوئی دلنشیں ایسا ہوا کہیں؟
زمانہ بھی نہ ہو نکتہ چیں ایسا ہوا کہیں؟
برہنہ پا تھا رات تلاش آشیاں میں ایک مسافر
سوگئے شہر کے سارے مکیں ایسا ہوا کہیں؟
کرکے گھائل تیر نظر سے میرے دل ناتواں کو
ہے قاتل جلوہ نشیں اسی دل میں ایسا ہوا کہیں؟
رسوا کیا مجھے زمانے میں تیری کم نگاہی نے
گو سامنے تھی منزل یقیں ایسا ہوا کہیں؟
اے غازی یہ ہے معجزہ عشق رسولؐ کا
ہے درخشاں مشتعل عرش بریں ایسا ہوا کہیں؟
اعتبار لٹ گیا ابن الغرض کی گھمبیر چال میں واجد
جہاں تھے دستگیر بازو کٹے وہیں ایسا ہوا کہیں؟
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

کس نے پرکھا ہے مقام تاروں کا
سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
حوصلہ دیتے ہیں آج کل کے یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
یادوں کے سفر میں ہمیشہ سے تھا تنہا
بیگانوں سے پوچھ لیتا ہوں رستہ رہ گزاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ دیتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خارزاروں کا
بے رخی سے تیری یہ زخم ملے ہیں ہم کو
وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا
قسمت میں اپنی کچھ آنسو اور آہیں ہیں جاوید
موسم بدل گیا ہے آج سے پھر شراروں کا
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

ہم نے خوشیوں کی طرح دکھ بھی اکٹھے دیکھے
صفحہ زیست کو پلٹو گے تو یاد آؤں گا
اسی انداز میں ہوتے تھے مخاطب مجھ سے
خط کسی اور کو لکھو گے تو یاد آؤں گا
سرد راتوں کے مہکتے ہوئے سناٹوں سے
جب کسی پھول کو چومو گے تو یاد آؤں گا
اب تو یہ اشک میں آنکھوں سے چرا لیتا ہوں
ہاتھ سے خود انہیں پونچھو گے تو یاد آؤں گا
شال پہنائے گا اب کون دسمبر میں تمہیں
تم سیہ رنگ جو پہنو گے تو یاد آؤں گا
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

بچپن کے ہیں خواب سہانے، تتلی، پھول اور میں
کہاں سے لائیں اب وہ زمانے، تتلی، پھول اور میں
درد رتوں کی خوشبو ساجھی ایک ہی جیسا روگ
ڈھونڈ رہے ہیں ساتھ پرانے، تتلی، پھول اور میں
نفرت سے ہے نفرت ہم کو پریت ہماری ریت
پیار کے ہیں انمول خزانے، تتلی پھول اور میں
جیون راہ میں کون کہاں پر بچھڑے کیا معلوم
مل لیتے ہیں کسی بہانے، تتلی، پھول اور میں
چاند، ستارے، خوشبو، امتیاز شبنم اور صبا
قدرت کے شاہکار فسانے، تتلی، پھول اور میں
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

جو قسمت کے تارے سے ہیں کھیلتے
وہی تو شرارے سے ہیں کھیلتے
ڈبو کے وہ دریا میں کشتی میری
ابھی تک کنارے سے ہیں کھیلتے
کبھی بیٹھ کر بالکونی میں
وہ شب بھر ستارے سے ہیں کھیلتے
وہ انسان ہوتے نہیں ہیں بھلے
جو غربت کے مارے سے ہیں کھیلتے
تیری عمر کے بچے عامر زمان
ابھی تک غبارے سے ہیں کھیلتے
(عامر زمان عامر......بورے والا)

بارشوں کی بوندوں نے
خنک سرد ہواؤں نے
دل میں بیتی یادوں کا
میلہ اک لگایا ہے
مجھ کو اک بھیگا سا
لمحہ یاد آیا ہے
شام وہ جدائی کی
ڈوبتا ہوا سورج
دسمبر کی بارش میں
جب جدا ہوا تھا تو
ہاں......تیری جدائی کا
وہ لمحہ یاد آیا ہے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

سنو جاناں!
جب سے میں نے
اپنی زندگی کے موبائل میں
تمہیں ڈاؤن لوڈ کیا ہے
تب سے
خوشی اور غموں کے نوٹیفکیشن
مسلسل آنا شروع ہو گئے ہیں
جب بھی تمہاری یاد کی
مس کال آتی ہے
تو میری نیند و سکون کا پھر
گیم اوور ہو جاتا ہے!!
دکھ درد کا تو وائرس
اتنا پھیل گیا کہ
اب تو زندگی کے موبائل کو
چلانا بھی
بہت ہی مشکل ہو گیا ہے
اور حالت یہ ہو گئی ہے
کہ دل بار بار ہینگ ہو جاتا ہے
مجھے ڈر ہے
کہ کہیں
میری حیاتی کی بیٹری
''لو'' نہ ہو جائے
اس لئے میں آج
اپنی زندگی کے موبائل سے
تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
''انسٹال''
کر دیتا ہوں......
ہاں جاناں!!!
تمہارے خوابوں کی جو بھی تصاویر
میری پلکوں کی گیلری میں سیو تھیں
اور
دل کے انباکس میں جو بھی
تمہارے نام کے
میسجز محفوظ تھے
سب ڈیلیٹ کر دیئے میں نے
اپنی زندگی کے
موبائل سے اویس!
آج تمہیں
''انسٹال''
کر دیا ہے میں نے......!!!
(اویس نور بلوچ......میر پور ماتھیلو)

بہت زیادہ گفتگو کرتے نہیں ہم
آنکھ کے رستے گرتے نہیں ہم
سب شکایتیں خود سے ہیں
کسی کے آگے روتے نہیں ہم
نہیں ہے دام کسی کے پاس
کسی بھی مول بکتے نہیں ہم
اپنے رستے خود بناتے ہیں
کسی کے رستے چلتے نہیں ہم
دل کا سودا صرف تجھ سے ہے
کسی کے آگے بچھتے نہیں ہم
بہت برداشت ہے مجھ میں
آنسو صورت برستے نہیں ہم
(ظریف احسن)

ترمذی میں یہ قول نبیؐ ہے
راوی اس کا پدر علیؓ ہے
مسلم کے درجے مسلم پر
چھ حق ہیں کرنا تم ازبر
پہلا بھائی کو کرو سلام
شک نہ لانا کوئی مدام
دوسرا دعوت پہ جو بلائے
کوئی نہ پھر اس کو ٹھکرائے
تیسرا یہ کہ چھینک جو آئے
بھائی دعائے رحمت پائے
چوتھا ہو جو کوئی بیمار
لازم تم پہ ہے تیمار
پانچواں ہو جگ سے کوئی رخصت
اس کی پڑھو نماز میت
چھٹا تمہیں کوئی شے ہو پسند
بھائی کی خاطر کرے پسند
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

وقت کی عمر کیا بڑی ہوگی
اک تیرے وصل کی گھڑی ہوگی
دستکیں دے رہی ہے پلکوں پر
کوئی ساعت کی جھڑی ہوگی

کیا خبر تھی کہ نوک خنجر بھی
پھول کی اک پنکھڑی ہوگی
زلف بل کھا رہی ہے ماتھے پر
چاندنی سے صبا بڑی ہوگی
اے عدم کے مسافر ذرا ہوشیار
راہ میں زندگی کھڑی ہوگی
کیوں گرہ گیسوؤں میں ڈالی ہے
جاں کسی پھول کی اڑی ہوگی
التجا کا ملال کیا کیجئے!
ان کے در پہ کہیں پڑی ہوگی
موت کہتے ہیں جس کو اے ساغر
زندگی کی کوئی کڑی ہوگی
(عبدالجبار رومی انصاری......لاہور)

میری آنکھوں میں جو رہتا ہے سدا پانی لوگو......!
آؤ سن لو، مجھ سے اس کی کہانی لوگو......!
عشق کی بھی سرحدوں سے بڑھ کر عشق کیا تھا میں نے
یہ "ہجر زدہ آنسو" ہیں اسی کی نشانی لوگو!
زیست کے ہر موڑ پر غم سے ملاقات ہوئی
اور ہم کو آئی نہ کبھی، آنکھ چرانی لوگو......!
بعد از مرگ بھی ہمارا عشق رائیگاں ہی رہا......
ہماری موت پہ ہوتی تھی اسے بس حیرانی لوگو!
اس کے "اک پل" میں ہمارا حصہ کبھی نہ رہا......
ہم نے واری تھی جس پہ ساری جوانی لوگو......!
مجھے "جہنم واصل" کرکے وہ اپنی "جنت" میں مگن رہا
اس کو آئی نہ کبھی...... کوئی یاد پرانی لوگو!
اس نے چاہا ہی نہیں، مجھ کو اپنانا...... ورنہ......
"زندگی" پہ بھی اس کی "حکمرانی" لوگو......!
عذاب "جانکنی" کے سوا، اور کچھ بھی نہیں......!!!
ہم سے پوچھو، اس "عشق" کے "معانی" لوگو!!
اس کے "ہجر" کی "جلن"، جہنم سے کہیں بڑھ کر ہے
پر اس نے کبھی یہ بات نہ مانی لوگو......!!!
ہر دعا فلک سے بے نیل و مرام لوٹ آتی ہے۔دعا
ہم کو آئی نہ کبھی "تقدیر" منانی لوگو......!!!
(ساحل دعا بخاری......بصیر پور)

آج پھر ان کا دیدار کرنے کو جی چاہتا ہے
آج پھر ان سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے
رہتے تو وہ ہیں بہت دور ہم سے
آج پھر ان کے پاس جانے کو جی چاہتا ہے
کتنی شدت ہے چاہت کی پیاس میں
آج پھر پی کر مرجانے کو جی چاہتا ہے
مت پوچھ کتنی مشکل سے گزرتے ہیں دن اور رات
آج پھر ان کی بانہوں میں سوجانے کو جی چاہتا ہے
(انتخاب: عامر ملک۔ٹنڈوآدم)

ختم ہوتے ہوتے پھر سے پیار ہورہا ہے
اچانک ہی اس شخص کو مجھ پہ اعتبار ہورہا ہے
وہ دن بھی تھے ان کے پاس وقت نہ تھا میرے لئے
یہ دن بھی ہیں کہ میرا انتظار ہورہا ہے
مل رہا ہے میری ہر بات کا الفت سے جواب
انکار ختم ہوچکا اقرار ہورہا ہے
اک عرصہ رلایا ہم کو صبح و شام اس نے مگر
رلاتا ہے اب رقیبوں کو سمجھدار ہورہا ہے
میری نوازشوں کا اب جاکر اثر ہوا ہے
ہونٹ اس کے کھل گئے ہیں اظہار ہورہا ہے
جوشکوے تھے اک دوسرے سے بہت دور رہ گئے ہیں
زندگی گزر گئی ہے مگر ایسے نہیں ہوا تھا
جیسے کہ آج صائم کو خمار ہورہا ہے
(انتخاب: عمران۔دیپالپور)

تجھے پانے کی نہ جانے مجھے حسرت کیوں ہے
زندگی میں مجھے تیرے لئے ہی ضرورت کیوں ہے
میرے ہمدم تیری ہی سے ہے میں زندہ ہوں
جانے اس بات پہ اتنی تمہیں حیرت کیوں ہے
میں تو مجرم بھی نہیں پھر بھی سزا کاٹی ہے
تجھ میں انجان سی میرے لئے نفرت کیوں ہے
میری آنکھوں میں سدا تم ہی بسے رہتے ہو
تیری آنکھوں میں کسی اور کی صورت کیوں ہے
میرا دل توڑ کر میرا ہنستے ہو جو بے باکی سے
زخم دینے کی تمہیں اتنی مہلت کیوں ہے
جانے کس دور سے گزری ہے، زندگی میری
ہار جانے کی نہ جانے مجھے عادت کیوں ہے
(انتخاب: ڈاکٹر ندیم ساگر.....کھڈرو سندھ سے)

اسے کہہ دو! دل کو نہ ستائے میرے
سونے دے خوابوں میں نہ آئے میرے
میں کس طرح غم کو سمجھائے ہوئے ہوں
کبھی راز نہ لوگوں کو بتائے میرے
یاد ماضی غموں کو بھلانے دو مجھے
اب نہ کوئی محبت کے گیت سنائے مجھے
نہ جانے کس دیس میں جا بسے ہو
تھک گئی ہوں لوٹ آؤ آشیاں میں میرے
ہجر میں جل رہی ہوں اکیلی بیتاخ
کون ہے جو سینے سے لگے میرے۔
(انتخاب: عارف.....نواب شاہ)

اس بے نام سے رشتے کو کوئی نام تو دے جاؤ
کرنے کو ہمیں کوئی اہم کام تو دے جاؤ
نکال دے جو ہمیں اس موت کی کشمکش سے
جاتے ہوئے کوئی ایسا جملہ کلام تو دے جاؤ
وہ بھول گئے ہیں اپنی وہ ساری شان و شوکت
اس بے شان سے پہلے کو کوئی شان تو دے جاؤ
دے دے جو ہمیں صلہ ہماری محبت کا
جاتے ہوئے ہمیں کوئی ایسا دام تو دے جاؤ
تیرے ہجر وفراق کے تصور سے ہی روح تن سے جدا ہوتی جارہی ہے
جو ہمیں بچا کے شاہد، جاتے ہوئے زندگی کا کوئی ایسا پیغام تو دے جاؤ
(انتخاب: رخسار.....کھپرو سندھ سے)

ہم جن سے امید وفا کرتے رہے
وہ ہمیں رسوا سر بازار کرتے رہے
ہم جن کی زندگی کے لئے دعا مانگتے رہے ہر وقت
وہ ہماری موت کی دعا صبح شام کرتے رہے
اب غم کے ماروں کا ساتھ دے بھی تو کون
ہم کو اپنے ہی دکھ بے حساب دیتے رہے
اب ہم دنیا والوں پر یقین کریں بھی تو کیسے رابعہ
دنیا والے تو ہم پر ظلموں کی انتہا کرتے رہے
(انتخاب: افشیں.....کھڈرو سندھ سے)

☆☆

تیرا میرا سنگ چھوٹ نہ جائے
کہیں تو مجھ سے روٹھ نہ جائے
اس لئے دنیا سے دور رہتا ہوں
میرے دل کا چین کوئی لوٹ نہ جائے
سنبھل کر قدم رکھتا ہوں میں
دل کا کھلونا کہیں ٹوٹ نہ جائے
پیار کی دولت کو سینے سے لگاتا ہوں
کہیں کوئی لٹیرا آ کر لوٹ نہ جائے
پیار میں اسی لئے دنیا سے ڈرتا ہوں
کہیں پیار بھرا سپنا ٹوٹ نہ جائے
(انتخاب: حافظ سبحان...... کراچی)

میری نگاہیں ڈھلتا سورج
تیری راہیں ڈھلتا سورج
آج بھی تیرا رستہ دیکھیں
پیاسی آنکھیں ڈھلتا سورج
اب بھی تیرے لئے ہیں بے کل
ترستی بانہیں ڈھلتا سورج
اب بھی تیرے لئے بھرتا ہے
ٹھنڈی آہیں ڈھلتا سورج
کل سی مجھ کو یاد ہیں اب بھی
مدغم سانسیں ڈھلتا سورج
آج بھی آنکھ میں وہ منظر ہیں
تیری زلفیں ڈھلتا سورج
بولی میرے دوست ہیں اب بھی
سسکتی سانسیں ڈھلتا سورج
(انتخاب: سمرین نصیر...... چنیوٹ)

میرے قدم گر ریت کے ہوتے
تو ساحل کی پٹی تیرے نام کی ہوتی
میں چلتا بھی اس شان اداس سے
جنون تیرے اور منزل میری ہوتی
میں مصور کا قلم بن کر یوں بکھر جاتا
لکیر میری اور ہر تصویر بنی تیری ہوتی
میں آسمان پر بادل بن کر یوں چھا جاتا
ہر بارش میں نام تیرا اور بوند میری ہوتی
(انتخاب: ماہم...... ٹنڈو آدم)

خدا کرے میری ایسی تقدیر ہو جائے
وہ میرے ہاتھوں کی لکیر ہو جائے
وہ مجھے چھوڑ کے جانا چاہے جا نہ پائے
میرا وعدہ اس کے پاؤں کی زنجیر ہو جائے
وہ ساری دنیا ٹھکرا کے مجھ سے آ ملے
ایسا ہو کہ پیار کی اخیر ہو جائے
دنیا کی کوئی شے اسے چھو نہ پائے
وہ میری اور بس میری جاگیر ہو جائے
وہ بھی کچھ دیکھنے نہ پائے میرا سوا
خدا کرے اس کی آنکھوں میں میری تصویر ہو جائے
دیکھے ہیں جو خواب میں نے زندگی میں
دعا ہے ان کی وہ تعبیر ہو جائے
(انتخاب: یاسمین...... نواب شاہ)

غموں کی رانی ہے دوستوں
دل کی آگ بجھانی ہے دوستوں
اتنے اشک بہہ جاتی ہے آنکھوں سے
لوگ سمجھتے ہیں کہ پانی ہے دوستوں
جس خوشبو کا میں پاگل ہوں
یہی تو رات کی رانی ہے دوستوں
جو دل سینے سے لگائے بیٹھا ہوں
یہی اس کی نشانی ہے دوستوں
(انتخاب: آسیہ رفیق...... حیدر آباد)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کس طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
امتحان لیجئے میرا جب تک
شوق زور آزما نہیں ہوتا
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
چارہ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سو نہیں ہے کوئی
کیوں سنے عرض مضطرب عادل
فانی صنم آخر خدا نہیں ہوتا
(انتخاب: خوشی محمد...... پتوکی)

اک جھیل کنارے پل دو پل
اک خواب کا نیلا پھول کھلے
وہ پھول بہاریں لہروں میں
اک روز کبھی ہم شام ڈھلے
اس پھول کے بہتے رنگوں میں
جس وقت گزرنا چاہے چلے
اس وقت کہیں ان آنکھوں گہرے پن کی یاد تو ہے
اس جھیل سی گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہے
پھر جاتے رت یہ سمندر کی
ہر موج پریشان ہو جائے
پھر چاہے آنکھ دریچے سے
ہر خواب گریزاں ہو جائے
پھر چاہے پھول سے چہرے کا
ہر درد نمایاں ہو جائے
(انتخاب: ہما نصیر...... آزاد کشمیر)

اس نے پوچھا مجھے کبھی یاد کیا
میں نے کہا تجھے بھلایا کب تھا
اس نے پوچھا کبھی پورے چاند کو دیکھا
میں نے کہا تیرے چہرے سے نظر کب ہٹائی تھی
اس نے پوچھا برسات کب آتی ہے
میں نے کہا جب تیرے ہجر میں تڑپتا ہوں
اس نے پوچھا کب عید آتی ہے
میں نے کہا جب تمہاری دید ہوتی ہے
اس نے پوچھا عام کیسا ہے میرے بن جینا
میں نے کہا جیسے پھول کا ہے خوشبو کے بن رہنا
(انتخاب: عابد علی...... کراچی)

☆☆

وقت کے فرعون

شہزادہ چاندزیب عباسی

قبر میں دفن شخص کا موبائل اچانک بول اٹھا تو وہ شخص دھل کر رہ گیا کیونکہ قبر میں موجود شخص تو اپنے گھر میں موجود تھا وہ اچانک قبر کی گہرائی میں کیسے پہنچ گیا لیکن......

جرم وسزا کے خونی پالنا میں ڈولتی ہوئی اور خوف وہراس سے روشناس کراتی کہانی

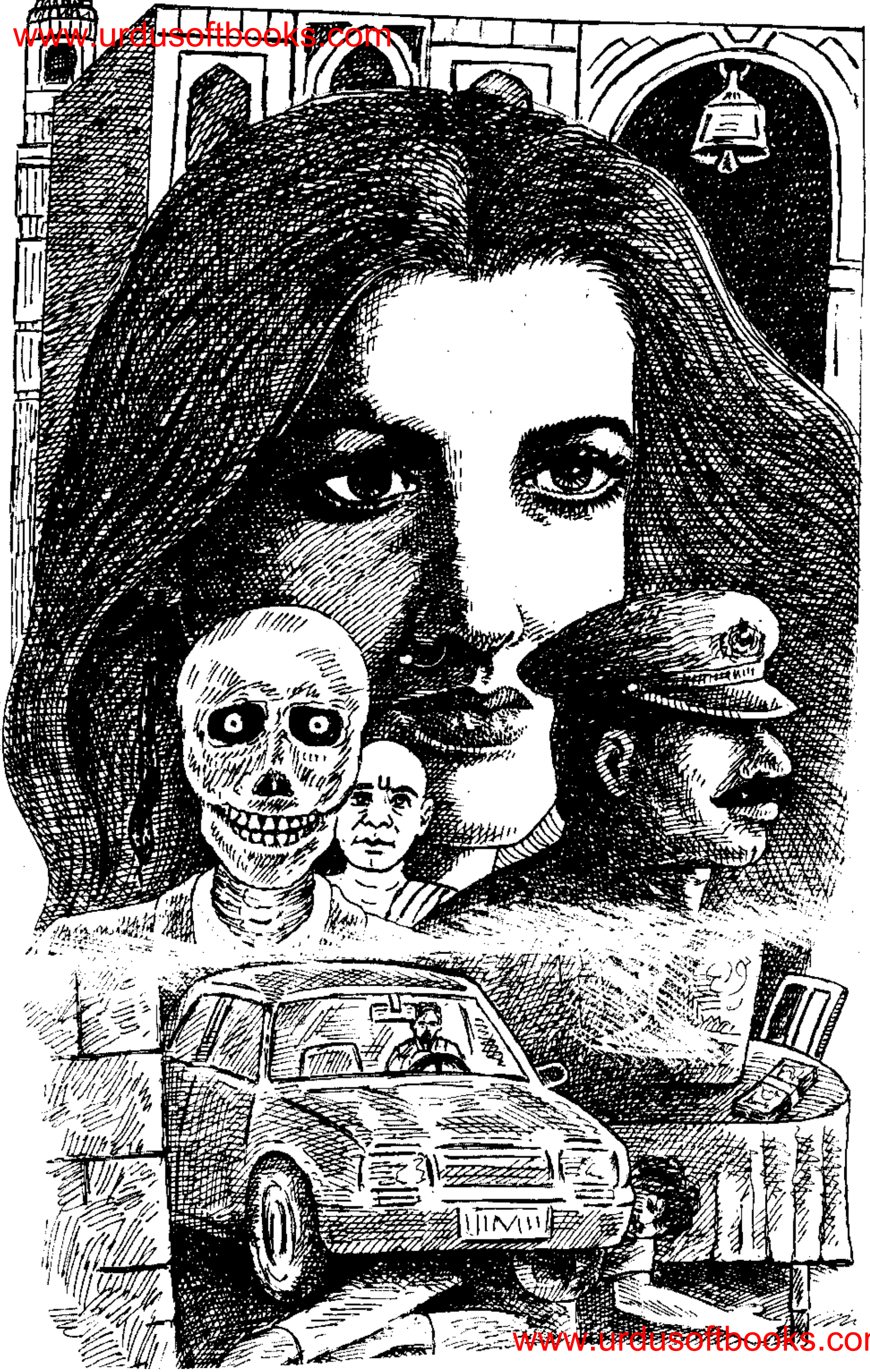
وہ دونوں ہاتھوں سے اس تابوت کو ٹٹولتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ "میں اس تابوت میں کیسے پہنچا۔" ڈر اور خوف سے اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی اور پھر تابوت میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہوا کی آمدورفت بھی تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لئے سانس لینے میں بھی دشواری ہورہی تھی اور جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اے سی کی خنک میں نرم وگداز بیڈ پر سونے والے عاشق چانڈیو کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے وہ جہنم میں پہنچ چکا ہو۔ نہ جانے وہ کب سے اس تابوت میں میں مقید تھا گھنٹوں ایک ہی جگہ پڑے رہنے سے اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ رات مشہور ومعروف ماڈل گرل زوبی کے اپارٹمنٹ میں نشاط انگیز لمحات گزارنے کے بعد وہیں سو گیا تھا وہ دونوں رات دیر تک جاگتے رہے تھے اس دوران وہ بنت انگور سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔

زوبی آتشیں سیال پینے سے محتاط رہی تھی جب کہ وہ اپنی بلانوش عادت کے باعث پیتا ہی رہا۔ اور پھر زوبی سے لپٹ کر وہیں سو گیا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ سونے سے پہلے اس نے لباس پہننا بھی گوارہ نہ سمجھا تھا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو تابوت میں پایا۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلا کر اس تابوت سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوششیں لاحاصل تھیں۔

تابوت شیشم کی مضبوط لکڑی سے بنا ہوا تھا تابوت کی اوپری سطح پر ہوا کی آمدورفت کے لئے چھوٹے چھوٹے سوراخ موجود تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بدحواسی سے چیختا چلاتا رہا۔ اور ہاتھ پاؤں ادھر ادھر مارے گھونسوں سے تابوت کی اوپری سطح توڑنے کی کوشش میں اپنے ہاتھ بھی زخمی کر ڈالے۔

بالآخر اپنی تمام تر کوششوں میں ناکامی کے بعد تھک ہار کر ہانپنے لگا کچھ دیر بعد حواس بحال ہوتے ہی اس نے اردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوتے ہی اسے اوپری سطح پر ہوا کی آمدورفت کے لئے موجود چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی موجودگی کا پتہ چلا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے عجیب سی ناگوار خوشبو کا احساس بھی ہوا۔

غور کرنے پر بھیانک انکشاف ہوا یہ کافور کی خوشبو تھی جو کفن پر لگائی جاتی ہے بدحواسی سے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوئے محسوس ہوئے اس کے بدن پر بن سلا لباس موجود تھا جب کہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بے لباس سویا تھا گویا اس تابوت میں



مقید ہونے سے پہلے اسے مردوں کی طرح کفن پہنا کر مشک کافور لگائی گئی تھی۔

مگر اسے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اس تابوت میں پہنچا کیسے؟ عاشق چانڈیو وڈیرا شمروز چانڈیو کا بیٹا تھا صوبہ سندھ کے دیہی علاقے اللہ بچایو کی تقریباً تمام زمین وجائیداد وڈیرا شمروز چانڈیو کی ملکیت تھی شمروز خان انتہائی جابر مغرور انسان تھا غریب اس کی نظر میں کیڑے مکوڑوں سے بدتر تھے۔ اس کے دونوں بیٹے عادت وخصلت میں اپنے باپ پر گئے تھے۔ وہاں کی کوئی بھی خوبصورت لڑکی جو کہ ان باپ بیٹوں کی نگاہ کو بھا جاتی اندھیرا پھیلتے ہی اسے ان کے کارندے ان کی خواب گاہ میں پہنچا دیتے۔ اور صبح اس لڑکی کی لاش جنگل کے کسی حصے سے مل جاتی۔

لڑکی کے ورثاء سب کچھ جانتے ہوئے بھی رودھو کے چپ ہو جاتے کہ علاقے کا پولیس اسٹیشن بھی شمروز کی زمین پر تھا جس میں سرکار سے زیادہ شمروز کا حکم ہی چلتا تھا۔ ایس ایچ او سمیت تھانے کا تمام عملہ ہروقت اس کی جی حضوری میں لگا رہتا شمروز چانڈیو گزشتہ دو دہائیوں سے اپنے حلقہ سے قومی اسمبلی کی سیٹ پر بلا مقابلہ منتخب ہوتا چلا آ رہا تھا بھلا اس کے مقابلے میں الیکشن میں حصہ لینے کی ہمت کس میں تھی۔ پچھلے الیکشن میں ایک بار اس حلقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے کوشش کی ہی تھی الیکشن سے پہلے ہی اس کے گھر ڈاکو گھس گئے اور لوٹ مار میں مزاحمت پر اسے گولی مار کر چلے گئے۔

ساٹھ سالہ شمروز اچھی صحت اور مالی آسودگی کی وجہ سے عمر سے بیس سال کم میں دکھتا تھا۔ چالیس سالہ ماموں چانڈیو اور پینتیس سالہ عاشق چانڈیو اس کے دونوں بیٹے اسی کی طرح بدکردار اور بے رحم تھے۔ دونوں بھائی اب تک غیر شادی شدہ تھے شادی کے حوالے سے جب کوئی جاننے والا یا دوست سوال کرتا تو وہ بڑی بے ہودہ منطق پیش کرتے کہ جب دودھ بازار سے ملتا ہو تو بھینس پالنا حماقت ہے۔ روشنیوں کے شہر کراچی میں بھی شمروز چانڈیو کی اچھی خاصی پراپرٹی تھی۔ تینوں باپ بیٹوں کا اکثر شہر جانا ہوتا تھا۔

زوبی نامی ماڈل گرل عاشق چانڈیو کی داشتہ تھی۔ عاشق چانڈیو نے شہر کے پوش ایریا میں رہائش کے لئے زوبی کو اپارٹمنٹ بھی گفٹ دیا تھا وہ مہینے میں دو تین بار زوبی سے ملنے جاتا اور اکثر رات وہیں رک جاتا گزشتہ روز بھی معمول کے مطابق نشاط انگیز لمحات گزارنے کے دوران بے تحاشہ شراب پی اور وہیں سو گیا۔

مگر جب آنکھ کھلی تو وہ زوبی کی خواب گاہ کے بجائے اس تابوت میں موجود تھا۔

جیسے جیسے وقت سرکتا جا رہا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اس تابوت میں حبس تھی گرمی اس قدر تھی کہ وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اسی وقت تابوت میں موبائل فون کی رنگ ٹون گونجنے لگی۔

وہ حیرت سے اچھل پڑا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے وہ خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ تابوت میں موبائل فون کی موجودگی کے احساس نے جہاں اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا وہیں یہ امید بھی ہو چلی تھی کہ شاید اب یہاں سے آزادی کی کوئی راہ نکل آئے اسی دوران اسے احساس ہوا کہ موبائل فون اس کے کفن جیسے لباس میں موجود ہے موبائل فون دائیں پہلو میں لباس میں اڑسا تھا مگر موبائل فون ہاتھ میں لینا بھی تو اتنا آسان نہ تھا وہ تابوت میں کچھ اس طرح فٹ تھا کہ معمولی سی جنبش بھی محال تھی۔ لگتا تھا تابوت اس کے قد و جسامت کو دیکھ کر بنایا گیا ہے بڑی مشکل سے بائیں ہاتھ کو دھیرے دھیرے سرکاتے موبائل فون تک پہنچاتے تقریباً دس منٹ لگ ہی گئے جب تک موبائل فون خاموش ہو چکا تھا بائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کے اگلے سرے سے موبائل فون تھام کر گرفت میں لیا اور چہرے کے قریب لایا یہ پرانا سا موبائل فون اس کا ہرگز نہیں تھا اس نے اسی نمبر پر کال بیک کی جس سے کال کی گئی تھی۔

بیل بج رہی تھی مگر وہ جو کوئی بھی تھا کال ریسو نہیں

کرر ہا تھا وہ کافی دیر تک کوشش میں لگا رہا مگر نا کام رہا تنگ آ کر اس نے دوبارہ اس نمبر پر ٹرائی کرنے کے بجائے اپنے باپ شمروز چانڈیو کا نمبر ملانا چاہا۔

اسی وقت دوبارہ اسی نمبر سے کال آئی اس نے عجلت میں کال ریسیو کی۔ نرم وگداز بیڈ سے تابوت تک کا سفر کیسا رہا۔ وہ جو کوئی بھی تھا خاصے شوخ لہجے میں بات کرر ہا تھا عاشق چانڈیو نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟“

میں تو زوبی کے اپارٹمنٹ میں تھا پھر اس تابوت میں کیسے پہنچا۔“

”عاشق چانڈیو تمہارے پاس موجود موبائل فون کی بیٹری ڈاؤن ہے بمشکل چند منٹ ہی بات ہو سکے گی اس لئے فضول سوالات میں وقت برباد مت کرو اگر موبائل فون آف ہو گیا تو تم اسی تابوت میں بھوکے پیاسے مر جاؤ گے اور ہاں ایک اور ضروری بات بتا رہا ہوں تم اس وقت جس تابوت میں موجود ہو وہ تابوت منوں مٹی کے نیچے ایک قبر میں موجود ہے۔“ سرد لہجے میں کہا گیا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی اور ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ ”کک کون ہو تم؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اچھا تو میرے بارے میں جاننا چاہتے ہو خیر تم مجھے پہچان لو تو پھر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تم باپ بیٹوں کے ظلم وستم اور ناانصافیوں کی داستان بہت طویل ہے نہ جانے تم لوگوں نے کتنے گھر اجاڑے کتنے بے گناہوں کا خون بہایا گھر کی چاردیواری میں رہنے کے باوجود تمہارے علاقے میں کوئی بھی عورت محفوظ نہیں تمہیں انسپکٹر سعود تو یاد ہوگا جس کا ایمان جب تم باپ بیٹے نے خرید نا سکے تو اسے تم نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف یہی نہیں اس روز تم نے رضیہ نامی عورت کو بھی بے آبرو کر کے قتل کر دیا۔“ دوسری طرف سے سرد لہجے میں کہا گیا۔

اس کی بات سنتے ہی عاشق چانڈیو کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ”تت تم ہو کون؟“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

میں انسپکٹر سعود کی روح ہوں زوبی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہونا اور زوبی کو بے ہوش کر کے باندھنے کے بعد تمہیں اس اپارٹمنٹ سے نکال کر تابوت میں منتقل کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں خیر تمہیں اغوا ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں تم باپ بیٹے مخالفین کو قتل کرنے سے پہلے آخری چانس دیتے ہو اور پھر دھوکے سے مار ڈالتے ہو برسوں پہلے تم نے ایسا ہی چانس انسپکٹر سعود اور رضیہ کو بھی دیا تھا اب یہ آخری چانس میں تمہیں دیتا ہوں موبائل فون کی بیٹری ڈاؤن ہے چند منٹ ہی چلے گی اور اس سم میں بیلنس بھی کم ہے اس لئے میں نے تمہاری کال ریسو نہیں کی تھی اپنا موبائل فون آف ہونے سے پہلے تم جسے چاہو اپنی مدد کے لئے پکار سکتے ہو۔ تمہارے پاس چوبیس گھنٹے کا وقت ہے اس دوران اگر تمہارے مددگار تم تک نہ پہنچ سکے تو میں تمہیں جہنم رسید کر دوں گا۔“

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا تم نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالا ہے۔“ وہ حلق کے بل چیخا۔ مگر دوسری طرف موجود نامعلوم دشمن رابطہ منقطع کر چکا تھا عاشق چانڈیو کا ذہن یہ ماننے کو تیار ہی نا تھا کہ موبائل فون پر اس سے کسی روح نے بات کی ہے وہ سوچنے لگا۔ ”بھلا کوئی روح بھی عام انسانوں کی طرح موبائل فون پر گفتگو کر سکتی ہے اور پھر انسپکٹر سعود کو تو برسوں پہلے ان باپ بیٹوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کیا تھا۔“

اس واقعہ کو برسوں بیت گئے تھے مگر اسے اب بھی اچھی طرح یاد تھا۔ ان دنوں عاشق چانڈیو کی عمر لگ بھگ بیس سال تھی عاشق اور مامون دونوں بھائی باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھے رضیہ رسول بخش کی اکلوتی بیٹی تھی قدرت نے اس کے حسن کی دولت سے خوب نوازا تھا یہی حسن اس کے لئے زحمت بن گیا دونوں وڈیرا رضیہ پر فدا ہو چکے تھے اور آتے جاتے اس پر فقرے کستے تھے۔

رسول بخش غریب مزارعا تھا ان وڈیروں سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا

رضیہ گھر پر تنہا ہی رہتی تھی اس لئے بھی اسے بیٹی کی زیادہ فکر تھی۔ اس مشکل کا حل اس نے کچھ اس طرح نکالا کہ اگلے ہی مہینے قریبی گاؤں کے ایک محنت کش نوجوان سے رضیہ کو بیاہ دیا اس کا شوہر مراد نیک سیرت انسان تھا شادی کے دوسرے ہی برس رضیہ نے ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیا۔

رضیہ کی شادی کا تیسرا سال تھا جب مراد کو اس وقت سانپ نے ڈس لیا جب وہ کھیتوں میں کام کرر ہا تھا۔ سانپ انتہائی زہریلی نسل کا تھا مراد نے لمحوں میں دم توڑ دیا۔ رضیہ کی دنیا ہی اجڑ گئی۔ مراد کے گھر والوں نے عدت گزارتے ہی اسے منحوس قرار دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ دوبارہ رسول بخش کے گھر آ گئی کچھ مہینے تو اس نے باپ کے کہنے پر گھر سے قدم باہر نہ نکالے مگر پھر اسے مجبوراً باہر نکلنا پڑا۔ اس کی بیٹی پانچ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے مستقبل کی خاطر وہ گاؤں کے تین چار گھروں میں کام کرنے لگی کیونکہ اکیلے رسول بخش کی کمائی سے بمشکل دال روٹی چلتی تھی جب کہ وہ اپنی بیٹی کو پڑھا لکھا کر معاشرے کا کارآمد فرد بنانا چاہتی تھی۔

یہیں سے اس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ عاشق چانڈیو اور مامون چانڈیو نے گھر آتے جاتے اس پر فقرے کسنے شروع کر دیئے ایک روز سہ پہر کو ایک گھر سے کام سے فارغ ہو کر گھر کی طرف جا رہی تھی کہ راستے میں عاشق اور مامون نے اس کا راستہ روک لیا ان کی آنکھوں میں ہوس کی چمک دیکھ کر وہ سٹپٹا گئی خدا اور رسول کے واسطے دے کر انہیں ان کے ناپاک ارادے سے باز رکھنا چاہا مگر ان پر شیطان گرتے ہوئے اسے پامال کرنے کی غرض سے کماد کے کھیت میں گھسیٹ کر لے جانا چاہا وہ مدد کے لئے چلائی۔ ارد گرد کھیتوں میں گاؤں کے چند افراد کام کر رہے تھے مگر مداخلت کی کسی میں ہمت نہ تھی اتفاق سے اسی وقت اسی راستے سے رسول بخش گزرا۔ بیٹی کی عزت خطرے میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بلی بھی اپنے بچوں کو خطرے میں دیکھ کر شیرنی بن جاتی ہے وہ تو پھر انسان تھا وہ دونوں بھائیوں پر پل پڑا۔ رسول بخش ساٹھ سالہ بوڑھا تھا مگر گاؤں کی تر و تازہ ہوا اور خالص غذا کی وجہ سے طاقتور بدن کا مالک تھا۔ وہ دونوں بھائیوں کا جم کر مقابلہ کرر ہا تھا اس سے پہلے کہ معاملہ بڑھتا ارد گرد موجود لوگوں کی مداخلت سے اس جھگڑے کا اختتام ہوا وہ بیٹی کو لے کر گھر آ گیا اسے خطرہ تھا کہ وڈیرے اس سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لیں گے مگر جب تین چار روز تک کچھ نہیں ہوا تو وہ بے فکر ہو گیا یہی بے فکری اسے لے ڈوبی۔

ایک روز رات کے اندھیرے میں تین چار ڈھاٹا پوش افراد دیوار پھلانگ کر اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں اسے اسلحہ کی زور پر اغوا کر کے حویلی لے جایا گیا دوسرے روز رسول بخش کی لاش دریا کے کنارے موجود درخت سے الٹی لٹکی پائی گئی لاش کی حالت سے ہی ظاہر تھا کہ قتل کرنے سے پہلے رسول بخش کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ درخت کے قریب وڈیرا شمروز کے دو کارندے مٹرگشت کرر ہے تھے۔ درخت کے ارد گرد جیسے جیسے پتہ چلتا گیا گاؤں کے لوگ پہنچنا شروع ہو گئے۔ رضیہ نے بیٹی کو پڑوسن کے گھر چھوڑا اور خود روتی پیٹتی وہاں جا پہنچا۔ گاؤں کے باسیوں نے رسول بخش کی لاش کو درخت سے اتارنا چاہا تو شمروز خان کے دونوں کارندوں نے سب کو تنبیہ کیا کہ اگر کسی نے رسول بخش کی لاش درخت سے اتاری یا اس معاملے میں زبان کھولی تو اسے عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔

انسپکٹر مسعود پچھلے دنوں ہی اللہ بچایو گاؤں کے پولیس اسٹیشن میں ٹرانسفر ہو کر آیا تھا وہ شادی شدہ اور آٹھ سالہ بیٹے کا باپ تھا۔ عائشہ سے اس نے محبت کی شادی کی تھی دونوں کے گھر والے اس شادی کے مخالف تھے اس لئے دونوں کے گھر والوں نے ان کا بائیکاٹ کرر کھا تھا۔ نہ ان کے ہاں کوئی آتا تھا اور نہ ان ہی انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت تھی۔

اسی لئے وہ ٹرانسفر ہوتے ہی عائشہ کو بھی ساتھ ہی یہاں لے آیا تھا۔ اور رہائش کے لئے اسی گاؤں میں کرائے پر گھر لے لیا تھا۔ اسے بھی پولیس اسٹیشن پہنچتے ہی

دریا کنارے موجود درخت سے لٹکی لاش کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً ہی جائے وقوعہ پر جانے کا قصد کیا اور سپاہیوں کو تیار ہونے کا حکم دیا ماتحتوں نے دبے دبے الفاظ میں منع بھی کیا اور سمجھانا چاہا کہ معاملہ وڈیرے شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کا ہے۔ مگر وہ فرض شناس اور دلیر پولیس آفیسر تھا۔ اس نے سپاہیوں کو جھڑک دیا اور تین پولیس کانسٹیبلوں سمیت جائے وقوعہ پر جا پہنچا۔ وہاں درجنوں افراد موجود تھے پولیس کو دیکھ کر وہاں موجود شمروز چانڈیو کے دونوں کارندے کھسک گئے۔

انسپکٹر سعود کے حکم پر سپاہیوں نے درخت سے لٹکی رسول بخش کی لاش اتاری۔ اور مقتول کا معائنہ کرنے لگا۔ رسول بخش کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کے سارے ناخن پلاس یا کسی اور شے سے انتہائی بے رحمی سے کھینچ کر نکالے گئے تھے۔ جسم کی تقریباً تمام ہڈیاں توڑ دی گئیں تھیں اور سینے میں خنجر پیوست تھا۔ رسول بخش کی خونچکاں لاش کا معائنہ کرنے کے بعد وہ اللہ بچایو گاؤں کے باسیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے کس نے قتل کرکے اس درخت سے لٹکایا ہے مگر جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔ مگر لگتا تھا کہ یہاں کے باسی گونگے اور بہرے ہیں۔ سب خاموش تھے کوئی بھی تو نہیں بول رہا تھا بلکہ لوگ اس سے نظریں چرا رہے تھے کچھ تو وہاں سے کھسکنے لگے تھے۔ ان کی بے حسی دیکھ کر انسپکٹر سعود غصے سے کھول اٹھا۔ اور غصے سے چلایا۔ ”تم لوگ برسوں سے یہاں رہ رہے ہو یہیں پیدا ہوئے یہیں پلے بڑھے۔ یہ شہر نہیں گاؤں ہے یہاں تم سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہو مقتول بھی یقیناً تمہارے گاؤں ہی کا ہے اس کی حالت سے صاف ظاہر ہے کہ اسے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کرنے کے بعد یہاں لٹکایا گیا ہے ظاہر ہے یہ سب کسی دوست نے نہیں اس کے دشمن نے کیا ہوگا۔ اگر تم لوگ سچائی چھپاؤ گے تو قانون کس طرح مقتول کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ یاد رکھو تمہاری خاموشی اور بزدلی میں ظالم کی طاقت اور ہتھیار ہے۔ مجھے سب سچ سچ بتاؤ یہ سب کس نے کیا۔ اسے قتل کرنے والا کون ہے؟ یقین جانو اس کا قاتل چاہے کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو میں اسے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا مگر اس کے لئے مجھے تم لوگوں کا تعاون درکار ہے۔“

اس کی جذباتی تقریر کا اثر ہوتا تو ایک طرف لوگ وہاں سے کھسکنے لگے تھے اسی اثناء میں انسپکٹر سعود کی نگاہ روتی ہوئی رضیہ پر پڑی۔ ”لگتا ہے مقتول سے تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ تمہارا سوگوار اور اداس چہرہ مقتول کے لئے بلک بلک کر رونا صاف بتا رہا ہے کہ اس سے تمہارا گہرا رشتہ ہے۔ بہن یقین جانو سچ بولنے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مجرم چاہے کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہوں اسے گرفتار کرنے کے ساتھ ساتھ میں تمہیں تحفظ بھی دوں گا۔“ اس نے شفقت سے رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے الفاظ نے روتی ہوئی رضیہ کو حوصلہ بخشا رضیہ کی روداد سن کر اس نے وڈیرا شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کے خلاف مقدمہ درج کیا اور لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کے بعد وہیں سے ان تینوں پولیس اہلکاروں کے ساتھ وڈیرہ شمروز کی حویلی جا پہنچا۔

حویلی کے گیٹ پر موجود گارڈ نے ان کی آمد کی اطلاع وڈیرے کو بھجوائی تو اس نے انہیں اندر ہی بلوالیا۔

”ہاں جوان کیسے آنا ہوا؟“ شمروز چانڈیو نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھے انسپکٹر سعود کو گھورا۔ تینوں سپاہی سعود کے قریب ہی رائفلیں اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔

”شمروز چانڈیو میں تمہیں اور تمہارے دونوں بیٹوں کو رسول بخش کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

شمروز چانڈیو نے اسے حیرت سے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کے سامنے وردی میں ملبوس انسپکٹر سعود پاگل ہو۔ ”تمہارا دماغ تو درست ہے۔ شاید تم نہیں جانتے تم کس سے مخاطب ہو۔“ وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھی اہلکاروں کی طرف غصے سے دیکھا۔ ”تم لوگوں نے اس پاگل کو نہیں سمجھایا؟“

"وڈیرا سائیں ہم نے صاحب سے بہت کچھ کہا ہاتھ جوڑ کر سمجھایا مگر انہوں نے ہماری نہ سنی بلکہ الٹا زبردستی یہاں لے آئے۔" ایک سپاہی نے بے چارگی سے جواب دیا تو سعود نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"انسپکٹر سعود یہ وڈیرے شمروز کی حویلی ہے۔ تمہارے آفیسر تک یہاں آ کر سلام کرتے ہیں یوں سمجھ کہ یہیں سے پولیس افسران کی ترقی اور ٹرانسفر کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے ہم سے ہاتھ ملا لو عیش کرو گے۔" شمروز چانڈیو نے نخوت سے کہا۔

انسپکٹر سعود نے بیلٹ میں اڑسی ہتھکڑی نکالی اور قدم آگے بڑھائے۔

"شمروز چانڈیو اس بار تمہارا واسطہ فرض شناس پولیس آفیسر سے پڑا ہے میں تمہیں گرفتار کر کے ہی یہاں سے لے جاؤں گا۔"

شمروز چانڈیو نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"اچھا" اور باآواز بلند چلایا۔ "اڑے بابا امام بخش کدھر ہے تم؟" چشم زدن میں تین مسلح افراد کمرے میں داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں موجود تھیں انہوں نے اندر آتے ہی انسپکٹر سعود پر رائفلیں تان لیں۔ "کیا حکم ہے سائیں۔" ایک دراز قد اور قوی ہیکل شخص نے مودب لہجے میں پوچھا۔ "اڑے بابا امام بخش یہ انسپکٹر ہمیں ہتھکڑی پہنانے یہاں آیا ہے اس کی مہمان نوازی کرنی ہے بابا۔"

پھر وہ سعود کے ساتھی اہلکاروں سے تحکمانہ لہجے میں مخاطب ہوا تم لوگ خاموشی سے یہاں سے چلے جاؤ اور ہاں یہ یاد رکھنا کہ تم یہاں اس انسپکٹر کے ساتھ آئے ہی نہیں تھے اور ناں ہی تمہیں علم ہے کہ انسپکٹر کہاں گیا اور جاتے ہوئے منشی سے چائے پانی لے جانا۔" اس کے حکم پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تینوں پولیس اہلکار سر جھکائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

جب کہ انسپکٹر سعود انہیں حیرت سے اس طرح دم دبا کر بھاگتے دیکھ رہا تھا۔ اتنا تو وہ جان ہی چکا تھا کہ اس کے ساتھی پولیس اہلکار شمروز چانڈیو کے زرخرید ہیں انسپکٹر سعود کے ہولسٹر میں بھی پسٹل موجود تھا مگر فی الحال مزاحمت بے فضول تھی تینوں مسلح افراد اس کی طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے ان کی انگلی کی معمولی سی جنبش اسے یقینی موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ اپنے ساتھی اہلکاروں کے ساتھ یہاں آتے وقت اسے اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ وہ اسے یوں تنہا چھوڑ کر پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے شمروز کے حکم پر اسے رائفلوں کی زد میں کمرے سے باہر لے جایا گیا اور احاطے میں موجود پجاروں کی پچھلی نشست پر بیٹھا کر دو رائفل بردار اس کے دائیں بائیں جا بیٹھے تیسرے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ان کے اس طویل سفر کا اختتام گھنے جنگل میں ہوا شمروز چانڈیو اپنے دونوں بیٹوں عاشق چانڈیو اور مامون چانڈیو سمیت وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک شخص ڈری سہمی رضیہ کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ رضیہ کا جگہ جگہ سے مسلا ہوا اور پھٹا ہوا لباس اور چہرے پر خراشوں کے نشانات صاف ظاہر کر رہے تھے کہ اسے انصاف مانگنے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ ان کے سامنے دو افراد دیوہیکل شکاری کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑے تھے جو بھونکتے ہوئے بار بار رضیہ اور انسپکٹر سعود پر جھپٹنے کی کوشش کر رہے تھے انہیں قابو میں رکھنے کے لئے ان دونوں افراد کو خاصی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی جو کہ ان کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑے تھے۔ نصف درجن مسلح افراد نے انسپکٹر سعود کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

شمروز چانڈیو آگے بڑھا اور اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ "انسپکٹر تم مجھے اور میرے بیٹوں کو گرفتار کرنے آئے تھے ناں اور یہ لڑکی اس نے ہمارے خلاف بیان دیا تھا اس پھول کو تو میرے بیٹے مسل چکے ہیں اس نے اپنے بیٹوں کی طرف اشارہ کیا جو خباثت سے ہنس رہے تھے۔ "اب تم میرے بیٹوں کے خلاف اس کی عصمت دری کا مقدمہ درج کرنا شرط یہ کہ یہاں سے زندہ بچ کر نکل گئے تو؟ اور ہاں گھبراؤ مت میں تمہیں زندگی بچانے کا ایک چانس دوں گا میرے کارندے کچھ دیر بعد تمہارے ہاتھوں

کی رسی کھول دیں گے تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ صحیح سلامت اس جنگل سے باہر نکل جاؤ جنگل سے نکلتے ہی تم آزاد ہو گے میرا وعدہ ہے کہ میرے کارندے جنگل سے نکلنے کے بعد تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے تمہارے یہاں سے دوڑنے کے دس منٹ بعد ہم ان کتوں کی زنجیریں کھول دیں گے تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ان کتوں سے چھپ کر جنگل کی حدود سے باہر نکلنا ہے میرا یہ بھی وعدہ ہے کہ جنگل میں میرا کوئی کارندہ تمہارے پیچھے نہیں جائے گا۔“ اس کے اشارے پر انسپکٹر سعود کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ رضیہ کو بھی اس کی طرف دھکیل دیا گیا۔ ”چلو بھاگو انسپکٹر میں صرف تین تک گنوں گا۔“

”اور تم اس دوران اس لڑکی سمیت جنگل سے نکلنے کی کوشش کرنا۔ اگر تم دونوں نے میرے اس چانس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو میرے تین کہتے ہی تم دونوں کو بلا تاخیر گولی ماردی جائے گی۔“

انسپکٹر سعود اتنا تو جان ہی چکا تھا کہ یہ کمینہ خصلت وڈیرا اس کی جان کے درپے ہے۔ مگر اسے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ شمروز چانڈیو اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنا چاہتا ہے اگر ان دونوں کو قتل کرنا ہی اس کا مقصد تھا تو اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کے ایک اشارے پر ان کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو سکتے تھے اسے یہی سمجھ آیا کہ وڈیرا اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنا چاہتا ہے وہ انسپکٹر سعود کو دوڑا دوڑا کر خوف زدہ کر کے مارنا چاہتا تھا شمروز چانڈیو کا دیا ہوا چانس ایک جوا تھا جس میں بچنے کا چانس صرف ایک فیصد تھا اور وہ یہ ایک فیصد چانس لینا چاہتا تھا اس کی جیت شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کی موت تھی۔ اگر وہ ایک بار اس جنگل سے بچ کر نکل جاتا تو شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکتا تھا۔

شمروز خان کے صرف ایک گنتے ہی اس نے رضیہ کا ہاتھ تھاما اور ایک طرف دوڑنے لگا عقب میں اس نے وڈیرے شمروز خان اور اس کے بیٹوں کے قہقہے بھی سنے مگر وہ انہیں نظر انداز کر کے رضیہ کا ہاتھ تھامے بھاگتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد انہیں ہوا کے دوش پر لہراتی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں وہ سمجھ گئے خونی کھیل کا آغاز ہو چکا ہے اب وہ رضیہ کا ہاتھ تھامے زگ زیگ کے سے انداز میں دوڑ رہا تھا مسلسل دوڑتے رہنے سے ان کا سانس پھول چکا تھا اور جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا کتوں کے بھونکنے کی آوازیں مسلسل قریب آتی جارہی تھیں وہ ان کتوں سے جتنا دور جانے کی کوشش کرتے اتنا ہی فاصلہ گھٹتا جارہا تھا۔ ”انسپکٹر صاحب اب مجھ سے مزید نہیں بھاگا جارہا ان کتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔“ رضیہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ مسلسل دوڑنے سے اس کی حالت غیر ہو چکی تھی اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

”بہن ہمت کرو ہم جلد ہی ان کتوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اگر ہم ایک بار جنگل سے نکل گئے تو پھر یہ تینوں باپ بیٹے قانون کی گرفت میں ہوں گے۔“ انسپکٹر سعود نے اسے تسلی دیتے ہوئے ایک بار پھر بھاگنے کے دوران اپنا راستہ بدلا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ رضیہ کو دی جانے والی تسلی جھوٹی ہے بل ڈاگز سے پیچھا چھڑانا آسان نہ تھا۔ یہ کتے انسانی بو سونگھ کر میلوں دور سے بھی مطلوبہ شخص کو ڈھونڈنے کی صلاحیت رکھتے ہیں دوڑتے ہوئے وہ ایک طرف مڑے ہی تھے کہ سرسراہٹ کی آواز سنائی دی اور ایک تیز دھار خنجر سنسناتا ہوا رضیہ کے پہلو میں پیوست ہو گیا وہ کربناک انداز میں چیختی ہوئی گری۔ ”رضیہ بہن خود کو سنبھالو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔ ”نہیں نہیں انسپکٹر صاحب اب یہ ناممکن ہے آپ خود جانتے ہیں۔“ اس نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے جواب دیا کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اب واضح سنائی دے رہی تھیں موت کے ہرکارے اور خون کے پیاسے کتے کسی بھی لمحے وہاں پہنچنے ہی والے تھے شمروز چانڈیو نے دھوکہ بازی کی تھی وعدے کے برخلاف کتوں کے ساتھ ساتھ اپنے کارندے بھی ان کے پیچھے دوڑا دیئے تھے ان ہی کارندوں میں سے کسی کا خنجر رضیہ کے پہلو میں پیوست ہوا تھا وہ رضیہ

www.urdusoftbooks.com

کو بچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا اگر شدید زخمی رضیہ کو اٹھا کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو یہ بھی ناممکن تھا رضیہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی مارا جاتا وہ اسی کشمکش میں تھا کہ کیا کرے کہ رضیہ کی گردن لڑھکی اس نے نم آنکھوں سے رضیہ کی لاش کو دیکھا اور پلٹ کر ایک طرف بھاگا بلاشبہ اس کا ارادہ غضب کا تھا گھنٹوں مسلسل دوڑنے کے باوجود بھی اس کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور نہ اس کی سانس پھولا تھا وہ دوڑنے کے دوران کئی بار راستہ بدل چکا تھا مگر ہر بار راستہ بدلتے ہی اسے عقب میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتیں اب تو اندھیرا بھی پھیلنے لگا تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا پھر بھاگتے بھاگتے اسے عقب میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی اور ایک تیز دھار خنجر سنسناتا ہوا اس کے پہلو میں پیوست ہوگیا وہ دلدوز انداز میں چیخا اور نشیب میں واقع کھائی میں گرتا چلا گیا شمروز خان اور اس کے بیٹوں کو دوسرے روز انسپکٹر سعود کی لاش اس کے گھر سے ملی تھی انسپکٹر سعود کی بیوی اور بیٹا غائب تھے وہ تینوں باپ بیٹے حیران تھے کہ شدید زخمی انسپکٹر سعود گھر تک کیسے پہنچا اتنا تو وہ اندازہ لگا ہی چکے تھے کہ مرنے سے پہلے انسپکٹر سعود نے بیوی اور بیٹے کو اس گاؤں سے بھاگنے کی تاکید کی ہوگی۔

یہ سب کچھ عاشق چانڈیو کو اچھی طرح یاد تھا مگر اس کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اسے انسپکٹر سعود کی روح نے اغوا کیا ہے اس کے خیال میں اسے انسپکٹر سعود کے کسی رشتے دار نے انتقاماً اغوا کیا تھا پھر اسے یاد آیا انسپکٹر سعود کا ان دنوں چھ سات سالہ بیٹا بھی تھا جسے انسپکٹر سعود کی بیوی اس کے قتل کے بعد لے کر فرار ہوگئی تھی۔ مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا اسے سب سے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی تھی۔ اغوا کار نے اسے ایک چانس دیا تھا۔ اسے اس چانس سے فائدہ اٹھانا تھا اس سے قبل کہ موبائل فون کی بیٹری ایم ٹی ہوتی موبائل فون اس کے پاس موجود تھا وہ پولیس کو کال کرسکتا تھا جو نمبر ٹریس کرکے اغوا کار تک پہنچ سکتے تھے یہ خیال آتے ہی اس نے شمروز چانڈیو کے دوست ڈی ایس پی عبید کا نمبر ڈائل کیا ڈی ایس پی عبید شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کے غیر قانونی کاموں میں معاون تھا اس کے عوض اسے وڈیروں سے اچھی خاصی رقم کا نذرانہ ہر ماہ ملتا تھا۔ ”سائیں حکم کرو صبح صبح کیسے یاد فرمایا۔“ اس کی آواز سنتے ہی ڈی ایس پی عبید نے فرماں برداری سے کہا۔ ”مگر سائیں یہ نمبر تو آپ کا نہیں ہے کیا نیا نمبر لے لیا ہے۔“

”ڈی ایس پی تم گھر پر آرام سے سو رہے ہو اور یہاں دشمن نے مجھے اغوا کرلیا ہے۔“ وہ غصے سے چلایا۔

”آپ کو کس نے اغوا کرنے کی جرأت کی ہے۔“ ڈی ایس پی نے حیرت سے استفسار کیا۔

”میں نہیں جانتا رات میں زوبی کے اپارٹمنٹ میں سویا اور جب آنکھ کھلی تو تابوت میں تھا۔“ پھر اس نے ڈی ایس پی کو بتایا کہ جاگنے کے بعد اس پر کیا بیتی اور موبائل فون پر اس کی اغوا کار سے کیا بات ہوئی۔

”اوکے سائیں آپ گھبرائیں مت میں کچھ کرتا ہوں۔“ ڈی ایس پی نے مودب لہجے میں کہا۔

پھر اس نے شمروز چانڈیو کے انجان نمبر کو کافی دیر بعد اٹھایا اور کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟ بابا سائیں مجھے کسی دشمن نے اغوا کرکے تابوت میں قید کرنے کے بعد قبر میں بند کردیا ہے۔“ وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔

شمروز چانڈیو کی دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے کس کی ہمت ہے جو شمروز چانڈیو کے بیٹے کو اغوا کرے کہیں تم نے زیادہ تو نہیں پی لی یا مجھ سے مزاح تو نہیں کررہے تمہیں تو معلوم ہی ہے مجھے مزاح بالکل پسند نہیں۔“ اس نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا۔

عاشق چانڈیو نے باپ کو بتایا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ ”تم فکر مت کرو۔“

شمروز چانڈیو نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے اتنا ہی کہا تھا کہ عاشق چانڈیو کا موبائل فون آن کرنا چاہا مگر اس کھٹارا سے موبائل فون کی پرانی سی بیٹری ایم ٹی ہوچکی تھی۔

ادھر عاشق چانڈیو کی کال سنتے ہی ڈی ایس پی

کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے عاشق چانڈیو کوئی عام انسان نہیں وڈیرے شمروز چانڈیو کا بیٹا تھا۔ جو اپنے حلقے کا ایم این اے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عاشق چانڈیو کے اغوا کی خبر پھیلتے ہی پولیس ڈپارٹمنٹ کی دوڑیں لگ جائیں گی اور یہی ہوا شمروز چانڈیو نے چیف منسٹر کو عاشق چانڈیو کے اغوا کے بارے میں بتایا چیف منسٹر نے پولیس کے اعلیٰ حکام کو چوبیس گھنٹے میں مغوی کو بازیاب کرنے کا حکم دیا اعلیٰ حکام نے ڈی ایس پی کو سختی سے ہدایت کی کہ عاشق چانڈیو کو جلد از جلد بازیاب کروانے کے ساتھ ساتھ اغوا کاروں کو کیفر کردار تک پہنچائیں۔ ڈی ایس پی سمیت علاقہ پولیس اہلکاروں کا تفتیش کا طریقہ روایتی ہے وہی پرانے طریقہ کار سے شک کی بنیاد پر زوبی کے اپارٹمنٹ ماڈل ٹاؤن پہنچے زوبی کو ہاتھ پاؤں باندھ کر اغوا کارنے اسٹور روم میں بند کر رکھا تھا زوبی نے بیان دیا کہ رات وہ عاشق چانڈیو کے ساتھ سوئی جب آنکھ کھلی تو خود کو اسٹور روم میں اس حالت میں پایا کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا گویا زوبی نے بھی اغوا کاروں کو نہیں دیکھا تھا اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ دونوں کو بے ہوش کرنے کے بعد اغوا کار نے عاشق چانڈیو کو اغوا کیا تھا ارد گرد سے شہر بھر کے کرمنل لوگوں کو گرفتار کر کے پوچھ گچھ کی گئی مگر نتیجہ صفر رہا۔

”عاشق چانڈیو کے اغوا کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی شمروز چانڈیو بار بار پولیس کے اعلیٰ حکام کو کال کر کے گرج برس رہا تھا چند ہی گھنٹوں بعد عاشق چانڈیو کے اغوا کا کیس ایک حساس ادارے کے سپرد کر دیا گیا عمر دراز اس ادارے کا باصلاحیت نوجوان تھا باپ کا بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا اس کی ماں گریجویٹ تھی ٹیچرنگ کے مقدس پیشے سے وابستہ رہ کر بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا میٹرک کے بعد اس نے چاہا کہ ملازمت کر کے ماں کا ہاتھ بٹائے مگر ماں کے منع کرنے پر مجبوراً پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ماں کی خواہش تھی کہ عمر دراز ڈاکٹر بنے مگر اس نے قانون نافذ کرنے والے اس ادارے کو چنا۔ ماں کو اس نے جب بتایا کہ وہ ایک حساس ادارے میں اپلائی کر چکا ہے تو ماں کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس نے بیٹے کو سمجھانا چاہا کہ اس کام میں جان جانے کا رسک بھی ہے مگر وہ ضد پر اڑا رہا۔ عمر دراز کا اس بارے میں کہنا تھا کہ جو رات قبر میں لکھی ہے وہ باہر نہیں گزاری جا سکتی۔ اپنی محنت اور دلیری سے وہ جلد ہی اعلیٰ افسران کی نظروں میں آ گیا اب مشکل کیس زیادہ تر اس کے ہی سپرد کئے جاتے تھے۔ اس روز وہ گھر پر ہی تھا کہ افسر اعلیٰ کے نمبر سے کال آئی اسکرین پر افسر اعلیٰ کا نمبر دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ افسر اعلیٰ بلا ضرورت کال نہیں کرتا تھا وہ ڈسپلن کے سخت اور سنجیدہ مزاج تھے۔

کیا حکم ہے سر؟ اس نے سلام کرتے ہوئے افسر اعلیٰ سے پوچھا۔ عمر دراز اللہ بچایو گاؤں کے ایم این اے وڈیرے شمروز چانڈیو کے بیٹے عاشق چانڈیو کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ گزشتہ روز وہ اندرون سندھ سے کراچی آیا ہوا تھا اور زوبی کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ افسر اعلیٰ نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

عاشق چانڈیو نے باپ اور ڈی ایس پی عبید کو کال کر کے بتایا ہے کہ اسے اغوا کرنے کے بعد تابوت میں بند کر کے کسی قبر میں رکھا گیا ہے اور اغوا کار نے اسے خود موبائل فون دے کر چیلنج کیا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹوں تک قانون نافذ کرنے والے اداروں سے رابطہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ عمر دراز نے افسر اعلیٰ سے تفصیلات معلوم کرنے کے بعد ڈی ایس پی عبید سے ملاقات کی ۔ ڈی ایس پی کی اب تک کی تفتیش کی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے وہ موبائل نمبر بھی نوٹ کیا۔ جس سے عاشق چانڈیو نے کال کی تھی پھر وہ ماڈل گرل زوبی کے اپارٹمنٹ گیا زوبی نے اسے وہی بتایا جو پولیس کو بیان دے چکی تھی۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے متعلقہ موبائل فون کمپنی کے آفس فون کیا اپنا تعارف کروانے کے بعد اس نے وہ موبائل نمبر دہرایا جس سے عاشق چانڈیو نے ڈی ایس پی عبید اور شمروز چانڈیو کو کال کی تھی۔

”مجھے اس نمبر کی لوکیشن چاہئے۔“ دوسری طرف

موجود شخص نے مودب لہجے میں کہا۔ ”سر اس قسم کی معلومات ہم کسی کو نہیں دے سکتے۔“ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ تم جانتے ہو تم کس سے بات کررہے ہو۔ مسٹر یہ اغوا کا معاملہ ہے ایک انسان کی زندگی خطرے میں ہے اور پھر میں اپنا تعارف بھی کرواچکا ہوں۔

”سر پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں کمپنی کا معمولی ملازم ہوں۔ مجھے کسی کو بھی کسی کے نمبر کی لوکیشن بتانے کی اجازت نہیں۔“ اس نے معذرتی لہجے میں وضاحت کی۔ اس بار عمر دراز نے اپنے ادارے کے افسر اعلیٰ کا نمبر ڈائل کیا۔ اور صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ مطلوبہ موبائل کمپنی کو پابند کیا جائے کہ اسے اغوا کار کے نمبر کی لوکیشن کے بارے میں بتائے۔ افسر اعلیٰ نے متعلقہ موبائل کمپنی کے ایم ڈی کو کال کرکے عمر دراز سے تعاون کی ہدایت کی۔ کچھ دیر بعد متعلقہ موبائل کمپنی کے نمائندے نے خود ہی عمر دراز کے نمبر پر کال کی۔ ”سر آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے نام پر نہیں ہے۔ اور اس وقت بند ہے صبح چھ بجے کے قریب اس نمبر سے دو کالیں کی گئی تھیں ایک کال ڈی ایس پی عبید کو شادمان ٹاؤن میں کی گئی تھی جب کہ دوسری کال اندرون سندھ اللہ بچایو میں شمروز چانڈیو کے نمبر پر کی گئی تھی اس نمبر کی لوکیشن بھی ٹریس کرلی گئی ہے جس وقت اس نمبر سے کال کی گئی اس وقت آپ کا مطلوبہ شخص اندرون سندھ اللہ بچایو میں ہی تھا۔“

عمر دراز ششدر رہ گیا اس کا ذہن عاشق چانڈیو کی لوکیشن سن کر چکرا گیا تھا عاشق چانڈیو کو کراچی ماڈل ٹاؤن کے علاقے سے اغوا کیا گیا تھا بھلا اغوا کار گھنٹوں میں اسے اندرون سندھ کیسے لے گیا۔ اور نہ صرف لے گیا بلکہ بقول عاشق چانڈیو کہ اسے تابوت میں ڈال کر قبر میں بھی دفن کردیا تھا۔ اس نے افسر اعلیٰ کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ افسر اعلیٰ نے اسے فوراً اندرون سندھ کے علاقے اللہ بچایو پہنچنے کی تاکید کی۔ اس نے روانہ ہونے سے پہلے ماں کو بتایا کہ وہ ایک کیس کے سلسلے میں اندرون سندھ کے علاقے اللہ بچایو جارہا ہے بیٹا میری مانو تو وہاں نہ جاؤ۔“ ماں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”پر کیوں ماں وہاں ایسی کیا بات ہے؟“ عمر دراز نے پوچھا۔

”نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا وسوسے سے ذہن میں اٹھ رہے ہیں پھر سنا ہے وہاں جنگل بھی ہے۔“ ماں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

وہ ہنسا۔ ”ماں میں کوئی بچہ نہیں اور پھر میں جنگل نہیں جارہا کیس کے سلسلے میں اندرون سندھ جارہا ہوں۔“ ماں کو اپنا خیال رکھنے کی خاطر وہ اپنی ذاتی جیپ میں اللہ بچایو کی طرف روانہ ہوا۔ ”اللہ بچایو اندرون سندھ کا سرسبز وشاداب علاقہ ہے۔ یہاں کی تقریباً تمام زمین وجائیداد شمروز چانڈیو کی ملکیت تھی۔ جس میں اس کے مزارع کام کرتے تھے۔ مشرق کی سمت گھنا جنگل تھا۔ جہاں سے شمروز چانڈیو کے کارندے غیر قانونی طور پر قیمتی درخت کاٹ کر لکڑی چوری کرتے تھے۔ جنگل سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر وڈیرے شمروز چانڈیو کی شاندار حویلی تھی۔ گیٹ پر موجود محافظ نے عمر دراز کے آنے کی اطلاع اندر دی۔ اور اجازت ملنے پر اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا کچھ دیر بعد 60 سالہ شمروز چانڈیو اپنے دوسرے بیٹے مامون چانڈیو کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ شمروز چانڈیو دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اور اپنی عمر سے دس پندرہ سال کم ہی دکھائی دے رہا تھا عمر دراز احتراماً صوفے سے اٹھا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”بیٹھو جوان شمروز۔“ چانڈیو نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے اس کا مصافحہ کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کیا اور مامون کے ساتھ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ شمروز چانڈیو کے رویے سے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ انتہائی مغرور اور فرعون سیرت انسان ہے اگر افسر اعلیٰ کی خفگی کا ڈر نہ ہوتا تو وہ اسی وقت شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں پر لعنت بھیج کر روانہ ہوجاتا، ہوں تو عاشق کی بازیابی کے لئے تمہیں بھیجا گیا ہے حیرت ہے تم اکیلے اسے کیسے تلاش کرلو گے جب کہ پولیس ڈپارٹمنٹ گزشتہ کئی گھنٹوں سے کچھ بھی نہ کرپایا۔

"شمروز چانڈیو نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

عمر دراز نے اسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "آپ ان باتوں کو چھوڑیں صرف اتنا بتائیں کہ آپ کی یا عاشق چانڈیو کی کسی سے دشمنی تو نہیں۔"

"بھلا کس کی ہمت ہے جو شمروز چانڈیو سے دشمنی کرے۔" اس نے نخوت زدہ لہجے میں جواب دیا تو عمر دراز کا خون کھول اٹھا باوجود انتہائی ضبط کے اس بار اس کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

"شمروز چانڈیو صاحب آپ کے بیٹے کو کسی دشمن نے ہی اغوا کیا ہوگا۔ بھلا کوئی پیار میں کسی کو اغوا کر کے تابوت میں بند کرتا ہے۔ بہر حال اتنا تو میں اندازہ لگا ہی چکا ہوں کہ آپ سے مزید گفتگو فضول رہے گی۔" اتنا کہتے ہی وہ اٹھا اور حویلی سے باہر نکل گیا۔ اب اس کا ارادہ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن جانے کا تھا۔ یہاں کا پولیس اسٹیشن ایک پرانی سی عمارت میں تھا۔ احاطے میں دو دست سپاہی کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ انہوں نے نیم وا آنکھوں سے اندر داخل ہوتے عمر دراز کو دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موندھ لیں کوریڈور میں ایک دبلے پتلے سپاہی سے تھانہ انچارج کا پوچھا۔ سپاہی نے سامنے ہی موجود ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اندر کمرے میں میز کے پیچھے ایک بڑی توند والا ایس ایچ او پھنسا بیٹھا تھا۔ ہاتھی کی جسامت کے اس پولیس اہلکار کے وزن سے بے چاری کرسی بھی چاں چوں کی آوازیں احتجاجاً نکال رہی تھی میز پر ایک بڑی سی ٹرے میں چکن پیس کے ٹکڑے پڑے تھے چکن پیس کا ٹکڑا چباتے ہوئے اس نے کمرے میں داخل ہوتے عمر دراز کی طرف دیکھا اوئے کون ہے تو اس طرح بغیر اجازت اندر گھسا چلا آرہا ہے؟"

"بغیر اجازت؟ کیا یہ پولیس اسٹیشن نہیں یہ تمہاری ذاتی رہائش گاہ ہے۔" عمر دراز نے استعجاب انگیز حیرت سے پوچھا۔

"اوئے زیادہ سیانا نہ بن دہشت گردی کی دفعات لگا کر ایسا اندر کروں گا کہ ساری زندگی جیل میں سڑتا رہے گا۔"

"وہ غصے کے مارے اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی موٹی توند پر بندھی پتلون نیچے کھسکنے لگی عمر دراز ہنسا۔ "پہلے اپنی پتلون تو سنبھالو مجھے بعد میں اندر کرنا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے پتلون تھام کر توند پر چڑھائی اور چلایا۔ "کرم الٰہی کہاں مر گیا ہے حرام خور۔"

فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح باہر موجود دبلا پتلا پولیس اہلکار اندر داخل ہوا۔ "کیا ہے صاحب جی۔ ایس ایچ او صاحب سب خود ہی کھا جاتے ہو تو تھوڑا اسے بھی کھلایا کرو عمر دراز کو اس وقت ایس ایچ او کو تپانے میں مزہ آرہا تھا اوئے اسے اندر کرو ایس ایچ او غصے سے چلایا۔

اسی وقت عمر دراز نے اپنا کارڈ ایس ایچ او کی طرف بڑھایا یہ کیا ہے اس نے کھا جانے والے انداز میں پوچھا اور سرسری انداز میں کارڈ پر نظر ڈالی۔ کارڈ پڑھتے ہی اس نے عمر دراز کو سیلوٹ کیا۔ "بیٹھئے صاحب اور صاحب کے لئے کوئی ٹھنڈا گرم لاؤ۔" عمر دراز کی حیثیت سے واقف ہوتے ہی اس کا رویہ تبدیل ہو گیا۔

"نہیں چائے گرم کی ضرورت نہیں فی الحال مجھے اس علاقے کے محل وقوع کے بارے میں آگاہ کرو۔ خاص کر قبرستان کے بارے میں بتاؤ کہ اس علاقے کا قبرستان کہاں ہے؟" وہ ایس ایچ او کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"قبرستان۔" ایس ایچ او کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "ہاں قبرستان اور پھر اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔" عمر دراز نے کہا۔

"صاحب اللہ بچایو کے علاقے میں دو قبرستان ہیں ایک اس پولیس اسٹیشن سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر مغرب کی سمت ہے جب کہ یہاں کا بڑا قبرستان جنگل کے قریب ہے یہ یہاں کا قدیم اور رقبے کے لحاظ سے بڑا قبرستان ہے۔"

"ہوں اچھا تو تم وڈیرے چانڈیو کے خاندان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" عمر دراز نے دوسرا سوال کیا۔

"جی وڈیرا سائیں شمروز چانڈیو بہت اچھے

انسان ہیں ان کے دو ہی بیٹے ہیں عاشق چانڈیو اور مامون چانڈیو دونوں ہی باپ کی طرح اچھے اور مخلص نوجوان ہیں۔'' ایس ایچ او نے جواب دیا تو عمر دراز کا جی چاہا قہقہہ لگا کر ہنسے وہ شمروز چانڈیو سے مل کر ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ انتہائی مغرور انسان ہے اور ہوسکتا ہے عام وڈیروں والی برائیاں بھی اس میں موجود ہوں تھانے سے کچھ فاصلے پر موجود قبرستان زیادہ رقبے پر مشتمل نہ تھا اور پھر اس قبرستان میں کوئی تازہ قبر بھی نہ تھی زیادہ تر قبریں پختہ اور پرانی تھیں۔ دراصل اسے ڈی ایس پی عبید کی عاشق حسین سے ہونے والی گفتگو سے شک ہوا تھا کہ ہوسکتا ہے اغوا کار نے عاشق چانڈیو کو یہاں کے کسی قبرستان میں دفن کررکھا ہے کیوں کہ عاشق چانڈیو نے ڈی ایس پی کو کال کرکے بتایا تھا کہ وہ جس تابوت میں موجود ہے اس تابوت کو اغوا کار نے کسی قبر میں دفن کررکھا ہے۔

جنگل سے کچھ فاصلے پر واقع قبرستان قدیم اور کافی پرانا تھا۔ یہاں قبروں کی تعداد بھی سینکڑوں میں تھی۔ بہت سی قبریں تو پتھر کی بنیں ہوئی تھیں بعض قبروں کے کتبوں پر تاریخ وفات 1850ء تک درج تھی۔

قبرستان کے آخر میں احاطے کی دیوار کے ساتھ درختوں کی باڑ سی تھی اس کی دوسری طرف جھونپڑی سی بنی ہوئی تھی جس کے اطراف مختلف اقسام کے پھولوں کی کیاریاں تھیں قبرستان کا یہ حصہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا شاید یہ گورکن کی رہائش گاہ ہے۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر صدا لگائی۔ ''کوئی ہے اندر؟'' مگر جواب نہ اور دو تین بار آوازیں لگانے کے بعد وہ بلا جھجک احاطے میں داخل ہوا اسی وقت جیسے جھونپڑی سے چاند طلوع ہوا۔ وہ انتہائی حسین وجمیل دوشیزہ تھی سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور چاند چہرہ اور سحرزدہ کردینے والی کالی آنکھیں وہ مبہوت سا اسے دیکھتا چلا گیا۔ ''بابو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا معیوب بات ہے۔''

لڑکی کی آواز بھی اسی کی طرح خوب صورت تھی یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ویرانے میں کوئل کوک رہی ہو۔ وہ شرمندہ سا ہوگیا۔ ''سوری دراصل یہاں کوئی ڈور بیل تو ہے نہیں اور ناں ہی کوئی دروازہ کہ میں دستک دیتا اور پھر میں نے تین چار بار آواز لگائی جواب ناں پاکر مجبوراً اندر آنا پڑا۔ ویسے تم جیسی خوب صورت لڑکی گورکن تو ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے تحیرزدہ لہجے میں کہا۔

قبرستان میں آتے وقت اس کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں اتنی خوب صورت لڑکی دکھائی دے گی۔ اس کا اپسرائی حسن اسے واقعی مبہوت کرچکا تھا۔ ''دراصل میں اندر نماز پڑھ رہی تھی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''یہاں کا گورکن کون ہے؟ مجھے اس سے ملنا ہے۔'' عمر دراز نے مدعا بیان کیا۔

''اوہ آپ بابا جان کا پوچھ رہے ہیں وہ باہر کسی کام سے گئے ہیں ویسے آپ کو ان سے کیا کام ہے قبر تو نہیں کھدوانی کہیں۔'' خدانخواستہ لڑکی نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ ''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں مجھے ان سے کوئی اور کام تھا۔'' یہ دوسری بات ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد میرا اپنا مرجانے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''کیا مطلب لڑکی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ کیا تم بتاسکتی ہو آج یا کل یہاں کوئی نئی قبر کھودی گئی ہو؟'' وہ بات پلٹتے ہوئے مطلب کی طرف آگیا۔

''نہیں تو پچھلے دو مہینوں سے یہاں کوئی قبر نہیں کھودی گئی۔''

''دراصل مجھے اس قبرستان کا معائنہ کرنا ہے۔'' عمر دراز نے کہا۔

''بابا کو تو ہوسکتا ہے دیر ہوجائے آپ چلیں میں آپ کو قبرستان کا چپہ چپہ دکھاتی ہوں۔'' لڑکی بولی اور دوپٹہ سر پر اوڑھ کر اس کے سنگ ہولی۔ قبرستان کافی وسیع وعریض تھا انہیں قبروں کے بیچ مٹرگشت کرتے کافی وقت بیت گیا۔ مگر ایسی کوئی قبر نہیں دکھائی دی جو نئی کھودی گئی ہو چلتے چلتے عمر دراز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں یہاں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''بابو جی ان مردوں سے کیا ڈرنا میں برسوں سے اس قبرستان میں ہوں۔''

''بھئی میرا مطلب ہے لوگ کہتے ہیں رات کے

وقت قبرستان میں نہیں جانا چاہئے کہ اس وقت وہاں روحیں وبدروحیں بھی ہوتی ہیں۔" عمر دراز نے وضاحت کی۔

"بابو جی بات دراصل یہ ہے کہ آج کل کے دور جدید میں خطرہ روحوں بدروحوں یا چڑیلوں سے نہیں زندہ انسانوں سے ہوتا ہے کہ انسان وجاندار ہے جو اپنے ہی ہم جنس کا دشمن ہے چاہے اس کی وجہ ذر، زمین، عورت ہو یا حسد ہو لڑکی نے بڑی گہری بات کہی۔ وہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا وہ قبرستان میں لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ جھونپڑی کے قریب آچکے تھے اچھا بھئی اب مجھے اجازت دو زندگی رہی تو دوبارہ ملیں گے اور تمہارے بابا سے بھی ملاقات کروں گا۔"

اس بات پر وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پلٹی اور جھونپڑی کی طرف جانے لگی عمر دراز نے آواز لگائی۔

"اے سنو۔ اب کیا ہے۔" وہ مڑی۔ "میں اتنی دیر تمہارے ساتھ رہا اور بنا تعارف کرانا بھول گیا میرا نام عمر دراز ہے تم نے اپنا نام بتایا ہی نہیں ویسے ان خوب صورت پھولوں کے بیچ رہنے والی اپسرا کا نام بھی اسی کی طرح خوب صورت ہوگا۔" اس کے ان الفاظ پر وہ شرما گئی۔

"بابا کہتے ہیں کسی اجنبی کو اپنا نام نہیں بتاتے۔" میں گزشتہ ایک گھنٹے یعنی پورے ساٹھ منٹ سے یہاں ہوں اس دوران ہم اس قبرستان میں گھومتے رہے باتیں کرتے رہے اور پھر ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں پھر ہم اجنبی کہاں رہے۔ اب تو اپنا نام بتادو۔" وہ اس کی جھیل سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ اب بھی اگر تم نے اپنا نام نہیں بتایا تو میں اپوزیشن کی کسی پارٹی کی طرح یہیں قبرستان میں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا۔"

"عائلہ" یہ کہہ کر وہ شرماتے ہوئے جواب دے کر تقریباً دوڑی ہوئی سی جھونپڑی میں داخل ہوگئی۔ اب تک کی تفتیش سے اتنا تو وہ جان ہی چکا تھا کہ عاشق چانڈیو کو اغوا کار نے اغوا کرنے کے بعد اسی گاؤں میں کہیں تابوت میں قید کر رکھا ہے اور اگر اغوا کار واقعی سچ کہہ رہا تھا کہ تابوت قبر میں ہے تو اس کے لئے سب سے مناسب جگہ قبرستان تھی جب کہ وہ خود دیکھ چکا تھا کہ دونوں قبرستانوں میں ان دنوں کوئی نئی قبر نہیں کھودی گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہیں ایسا تو نہیں اغوا کار کے ساتھ عاشق چانڈیو کے اغوا میں کوئی مقامی فرد شامل ہو مگر یہ ماننے کو اس کا ذہن تیار نہیں تھا بھلا اس علاقے کے باسیوں میں اتنی جرأت کہاں تھی یہ سیدھے سادھے دیہاتی لوگ پہلے ہی وڈیروں جاگیرداروں وغیرہ کے ظلم کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں اور پھر عاشق چانڈیو کو کراچی سے اغوا کرکے اندرون سندھ کے علاقے میں لاکر تابوت میں قید کرنا اور پھر عاشق چانڈیو کو چیلنج دے کر پولیس حکام کو کال کرنے کا موقع دینا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے بڑی ذہانت سے فول پروف منصوبہ بنایا تھا عاشق چانڈیو کو اغوا کرنے کے بعد اسے باپ اور پولیس سے رابطہ کا چانس بھی دیا تھا۔ اور یہ پھر اغوا برائے تاوان کا کیس بھی نہیں تھا۔ ورنہ اغوا کار اب تک اپنا مطالبہ پیش کرچکا ہوتا۔

عمر دراز کے خیال میں یہ دشمنی کا معاملہ تھا شمروز چانڈیو کا زیادہ تر وقت اسی گاؤں میں گزرتا تھا اور گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اس نے سوچا کوئی نہ کوئی مقامی فرد اسے اس سلسلے میں ضرور بتائے گا وہ قبرستان آتے وقت علاقے کا بازار دیکھ چکا تھا بازار میں اس نے سب سے پہلے ہیئر ڈریسر شاپ کا رخ کیا وہ جانتا تھا کہ گاؤں دیہاتوں میں زیادہ تر نائی برادری ہر ایک سے واقفیت رکھتی ہے۔ شیو کرواتے ہوئے اس نے اچانک ہی نائی سے پوچھا۔ "سنا ہے پچھلے دنوں شمروز چانڈیو کا بیٹا عاشق چانڈیو اغوا ہوگیا ہے کچھ اندازہ ہے کس نے اغوا کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کے دشمنوں کا کام ہو۔"

اس کے چہرے پر استرا چلاتے ہوئے نائی کا ہاتھ لحہ بھر کے لئے رکا۔ "پتہ نہیں بابو جی! ہم غریب لوگ اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں۔"

عمر دراز نے محسوس کیا اس کی بات سنتے ہی نائی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا جب کہ شاپ میں موجود اپنی باری کا انتظار کرنے والے تین چار افراد چونک گئے تھے

شیو کروانے کے بعد وہ شاپ سے باہر نکلا چائے کا موڈ ہو رہا تھا، یہاں آتے وقت وہ چھوٹا سا چائے کا چھپرا ہوٹل دیکھ چکا تھا چھپرا ہوٹل کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ویٹر کے فرائض انجام دیتے بارہ تیرہ سالہ لڑکے کو چائے لانے کو کہا اتنے میں میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص اس کے قریب آ بیٹھا۔ عمر دراز نے ایک نظر دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ شخص نشے کا عادی ہے۔ "صاحب پہلے تمہیں کبھی اس علاقے میں نہیں دیکھا کہیں تمہارا تعلق پولیس یا پھر کسی ایجنسی سے تو نہیں؟" وہ رازدرانہ انداز میں سرگوشی میں مخاطب ہوا تو عمر دراز چونک پڑا۔ "کیا مطلب؟"

"صاحب جس وقت آپ اس نائی سے عاشق چانڈیو کے بارے میں بات کر رہے تھے میں وہیں تھا آپ نے جب عاشق چانڈیو کے اغوا کی بات کی تو میں سمجھ گیا کہ آپ کا تعلق ایجنسی یا پولیس سے ہے۔"

عمر دراز ہنسا، نہیں یار دراصل میں پریس رپورٹر ہوں۔ ہم پریس والے ایسی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں اگر تمہیں اس بارے میں کوئی معلومات ہیں تو میں تمہیں معقول انعام دوں گا۔"

انعام کا سن کر اس شخص کی آنکھیں چمکنے لگیں اس اثنا میں چھوٹا چائے لے آیا عمر دراز نے اس شخص کے لئے بھی چائے کو کہا چھوٹا مڑا ہی تھا کہ اس شخص نے آواز لگائی ۔"اے چھورا میرے لئے چار پانچ کیک بھی لے آنا۔"

عمر دراز کے اثبات میں سر ہلانے پر چھوٹا واپس مڑ گیا۔

"صاحب میرا نام پرویز ہے اس نشے کی لت نے کہیں کا نہیں چھوڑا آج میرے پاس نشے کے پیسے نہیں، میں نے سوچا اگر آپ کو شمروز چانڈیو کے بارے میں معلومات دوں تو شاید آپ سے کچھ رقم مل جائے کیا کروں صاحب اب تو گھر والے بھی پیسے نہیں دیتے میری چوری چکاری کی عادتوں سے تنگ آکر انہوں نے بھی مجھے گھر سے نکال دیا ہے میرے ساتھ یہی ہونا چاہئے کہ برے کا انجام برا ہوتا ہے۔"

عمر دراز نے اسے دل ہی دل میں سراہا چاہے کتنا برا ہی سہی۔ صاف گو انسان تھا۔ جو خود اپنے عیب گن رہا تھا عمر دراز بولا۔"انعام میں تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر دوں گا تم شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کے بارے میں جس قدر جانتے ہو بتادو۔ خاص کر یہ کہ چانڈیو خاندان کی کسی سے دشمنی تو نہیں۔"

پرویز نے گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے ایک ہی گھونٹ میں ختم کی۔"شمروز چانڈیو اور اس کے دونوں بیٹے مامون چانڈیو اور عاشق چانڈیو تینوں کی فطرت ایک ہی جیسی ہے۔ غریبوں کو تو یہ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں شمروز چانڈیو کا باپ ان تینوں کی نسبت ایک اچھا انسان تھا اس وقت اس خاندان کے پاس زمین وجائیداد اس قدر نہ تھی اور نہ ہی دولت کی اتنی فراوانی تھی باپ کے مرنے کے بعد شمروز چانڈیو نے پرپرزے نکالے وہ سود پر ضرورت مندوں کو قرض دیتے وقت سادہ اسٹمپ پیپر پر انگوٹھا لگوالیتا سود بڑھتا چلا جاتا اور وہ دھوکے سے اس شخص کی زمین ہتھیا لیتا جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا وہ دنیا سے اٹھ جاتا یوں تقریباً تمام زمین اس خاندان کی ملکیت ہوگئی الیکشن میں بھی دھونس سے جیت جاتا ہے اس حلقہ میں کسی کی ہمت ہے جو شمروز چانڈیو کے مقابل کھڑا ہو اس لئے وہ بلا مقابلہ ہی منتخب ہوتا چلا آیا ہے۔

بیٹوں نے جوان ہونے کے بعد باپ کی طرح پرپرزے نکالے۔ علاقے کی کوئی بھی خوبصورت لڑکی جس پر ان باپ بیٹوں کی نظر پڑے اٹھالی جاتی ہے دوسرے روز اس لڑکی کی لاش ہی ویرانے سے ملتی ہے یوں سمجھ لو کہ پورا علاقہ ہی ان کا دشمن ہے۔ مگر کوئی چانڈیو خاندان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اب میں تمہیں ایک برس پرانا واقعہ سناتا ہوں برسوں پہلے عاشق چانڈیو اور مامون چانڈیو نے رضیہ نامی عورت سے دست درازی کی اتفاقاً رضیہ کا باپ اس وقت وہاں آپہنچا اور ان دونوں بھائیوں سے لڑ پڑا ان وڈیروں نے کچھ دنوں بعد رضیہ کے باپ رسول بخش کو قتل کر کے اس کی لاش دریا کنارے واقع ایک درخت سے لٹکادی۔ اور علاقے والوں کو خبردار کیا کہ نہ کوئی اس لاش کو درخت سے اتارے اور نہ ہی اس

بارے میں کوئی منہ کھولے۔

ان دنوں پولیس اسٹیشن میں ایک بہادر پولیس افیسر شہر سے ٹرانسفر ہوکر آیا تھا اس کے ساتھ اس کی بیوی اور بیٹا بھی تھا انہوں نے یہاں گھر لے لیا تھا انسپکٹر نے نہ صرف لاش درخت سے اتروائی بلکہ ان تینوں باپ بیٹے کو گرفتار کرنے حویلی جا پہنچا دوسرے روز اس بہادر انسپکٹر اور رضیہ کی لاشیں ملیں رضیہ کی لاش جنگل سے ملی تھی جب کہ اس انسپکٹر کی لاش اس کے گھر سے، انسپکٹر کے گھر والے غائب تھے گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ انسپکٹر نے مرنے سے پہلے بیوی کو جان بچا کر یہاں سے بھاگنے کو کہا تھا اس لئے وہ بیٹے کو لے کر نکل گئی سنا ہے شہر جا کر اس نے وڈیروں کے خلاف مقدمہ درج کروایا تھا اور انسپکٹر کی لاش بھی اس کی درخواست پر شہر بھجوائی گئی تھی مگر اپنے اثر ورسوخ سے وڈیرے بچ نکلے۔

’’ہوسکتا ہے عاشق چانڈیو کو اسی انسپکٹر کے بیٹے نے اغوا کیا ہو۔‘‘ پرویز نے برسوں پرانی داستان کے اختتام پر کہا۔

عمر دراز نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر پرویز کو دیا جسے اس نے انتہائی مسرت سے اچک لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’اچھا انسپکٹر صاحب میں چلتا ہوں۔‘‘ شاید پیسے ہاتھ میں آتے ہی اسے نشے کی فکر پڑ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ عمر دراز مزید کچھ پوچھتا وہ تیزی سے چھپر ہوٹل سے نکل کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

کچھ دیر ہوٹل میں بیٹھا رہنے کے بعد عمر دراز چائے کا بل دے کر ہوٹل سے باہر نکلا گاؤں کے دیگر افراد سے باتوں باتوں میں پرویز کے بتائے واقعہ کی تصدیق کے بعد تھانے جا پہنچا۔ موٹی توند والا ایس ایچ او تھانے میں ہی موجود تھا۔ ’’کیوں صاحب عاشق چانڈیو صاحب کا کوئی سراغ ملا۔‘‘ ایس ایچ او نے پوچھا۔

’’اس کا سراغ تو مل ہی جائے گا۔ اس وقت میں تم سے ایک دوسرے سلسلے میں ملنے آیا ہوں۔‘‘

عمر دراز نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’دوسرے سلسلے میں کیا مطلب؟‘‘ ایس ایچ او نے استعجاب انگیز حیرت سے پوچھا۔ ’’آج سے کئی سال پہلے رسول بخش نامی شخص کا قتل ہوا تھا ان دنوں اس پولیس اسٹیشن میں تھانہ انچارج کون تھا۔ رسول بخش کے قتل کی ایف آئی آر بھی اسی تھانے میں درج ہوئی تھی مدعی مقدمہ رسول بخش کی بیٹی رضیہ تھی اس ایف آئی آر کے دوسرے ہی دن رضیہ اور مقدمہ درج کرنے والے انسپکٹر کا بھی قتل ہوگیا۔ ان تینوں قتل کی وارداتوں میں شمروز چانڈیو ملوث تھا اور اس کے خلاف ان تینوں کے قتل کا مقدمہ درج ہوا تھا۔ ’’عمر دراز نے ایس ایچ او کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’آہستہ بولو صاحب دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بھلا شمروز چانڈیو کسی کا خون کرسکتا ہے۔ ’’ایس ایچ او نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں سنتری کھڑا اونگھ رہا تھا۔

’’میں جانتا ہوں شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹے فرشتہ صفت انسان ہیں تم مجھے صرف اس کیس کے بارے میں بتاؤ جو میں پوچھ رہا ہوں۔‘‘ عمر دراز نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

صاحب برسوں پرانی بات ہے بہرحال میں کوشش کرتا ہوں۔ فائل اسٹور روم میں ہوگی یہ کہ ڈھونڈنے میں کافی وقت صرف ہوگا۔‘‘ ایس ایچ او نے کاہلی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا کچھ دیر بعد ایک سپاہی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

’’صاحب آپ جانتے نہیں ایس ایچ او صاحب اسٹور روم میں آپ کے کام سے ہی گئے ہیں۔‘‘

ایس ایچ او کی واپسی دو گھنٹے بعد اس حال میں ہو کہ سانس پھولا ہوا تھا اور وردی گرد آلود ہو رہی تھی اس کے ہاتھ میں گرد آلود فائل اور اس کا پرجوش چہرہ دیکھ کر عمر دراز سمجھ گیا کہ اس کی مطلوبہ فائل مل گئی ہے۔‘‘ ’’صاحب بڑی مشکل سے فائل ڈھونڈی ہے۔ چار سنتری اور میں گھنٹہ بھر ڈھونڈتے رہے۔ پورا اسٹور روم چھان مارا پھر جا کر یہ فائل ملی۔‘‘ اس نے فائل عمر دراز کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

’’تھینک یو ظفر اقبال صاحب آپ واقعی ذہین

اوردلیر پولیس آفیسر ہیں۔" عمردراز نے اسے خوش کرنے کے لئے تعریف کی تو ظفر کا چہرہ کھل اٹھا، ظفر نے دروازے پر موجود سپاہی کو اپنے لئے چائے بسکٹ لانے کا کہا جب کہ عمردراز فائل کے مطالعہ میں منہمک ہو چکا تھا، جیسے جیسے وہ فائل پڑھتا جارہا تھا اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں اور ذہن سائیں سائیں کررہا تھا انسپکٹر کے قتل کے کیس میں نامعلوم ملزمان کو نامزد کر کے کیس کو اے کلاس میں داخل دفتر کردیا گیا تھا۔ انسپکٹر سعود کے قتل میں وڈیرے شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کے خلاف مقدمہ انسپکٹر کی بیوی عائشہ سعود نے درج کروایا تھا اس وقت کے تفتیشی افسر نے عدم ثبوت اور گواہوں کے نہ ہونے پر ان تینوں کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے 497/B کے تحت بے گناہ قرار دے کر صاف بچالیا تھا۔ فائل کے مطالعہ سے اتنا تو وہ جان ہی چکا تھا کہ یہ انسپکٹر سعود کے قتل کی فائل ہے جو اس کا باپ تھا اور مدعی مقدمہ اس کی ماں عائشہ تھی۔ مگر اسے حیرت اس بات پر تھی کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس کی ماں نے اس سے اس سچائی کو کیوں چھپایا۔ اسے اس کی ماں بچپن سے یہی بتاتی چلی آئی تھی کہ اس کے باپ انسپکٹر سعود اس کے بچپن میں ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال کر گئے تھے ان دنوں وہ کسی دیہات میں دیہات میں رہائش پذیر تھے عمردراز نے اس معاملے کی زیادہ کرید بھی نہیں کی تھی۔ اور پھر ان کا کسی رشتے دار کا یہاں آنا جانا بھی نہیں تھا ناں ہی وہ کسی کے گھر جاتے تھے اس کا سبب عائشہ نے یہ بتایا تھا کہ اس کی انسپکٹر سعود کے ساتھ محبت کی شادی تھی اس لئے دونوں ہی کے خاندان نے ان کا بائیکاٹ کررکھا تھا۔

برسوں بعد باپ کی موت کا سبب جانتے ہی اس کے دل میں انتقام کے شعلے جل اٹھے تھے۔ وہ یہ حقیقت جان چکا تھا کہ یہ وڈیرے باپ بیٹے اس کے باپ انسپکٹر سعود کے قاتل ہیں اور وہ اپنے باپ کے قاتل کی قانونی مدد کے لئے اس علاقے میں آیا تھا یہ قسمت کی ستم ظریفی تھی ایک طرف باپ کے خون کا قرض تھا تو دوسری طرف فرض تھا جسے نبھانے کا اس نے حلف اٹھایا تھا وہ باپ کے قاتلوں کے بارے میں جانتے ہوئے بھی قانون کے ہاتھوں مجبور تھا اور قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا "خیریت تو ہے سر آپ اس فائل کے مطالعے کے بعد گم صم ہو گئے ہیں ایسی کون سی اہم بات ہے فائل میں۔" اسے اپنے خیالات میں گم صم دیکھ کر ایس ایچ او ظفر اقبال نے استفسار کیا۔ "نہیں کچھ نہیں۔" وہ زندگی میں پہلی بار گڑبڑا سا گیا تھا اب اس کا ارادہ شمروز خان سے ملنے کا تھا۔

ادھر عاشق چانڈیو کو تابوت میں مقید ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے مسلسل چوبیس گھنٹوں سے ایک ہی جگہ پڑے رہنے سے اس کا جسم سن سا ہو چکا تھا اس دوران اس نے نہ کچھ کھایا اور ناں ہی پیا تھا بھوک اور پیاس سے جان لبوں پر آچکی تھی حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے کوئی ہے مجھے بچاؤ وہ گھنٹوں حلق پھاڑ کر چیختا رہا مگر اس کی چیخ وپکار لاحاصل رہی۔ مسلسل چیخنے چلانے سے اس کا گلا بیٹھ چکا تھا امید کی آخری کرن وہ موبائل فون جو اغوا کار کا تھا بیٹری ایم ٹی ہونے کی وجہ سے اب اس کے لئے بیکار تھا شمروز چانڈیو اور ڈی ایس پی عبید کو کال کرتے وقت اس وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے مگر پورا دن اور پھر رات گزر جانے کے بعد اب وہ مایوس ہو چکا تھا ویسے بھی تابوت میں نہ دن کا پتہ چل رہا تھا اور نہ رات کا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں سے اس تابوت میں قید ہے اب یہ امید بھی ناں تھی کہ پولیس اسے ڈھونڈ نکالے گی اس تابوت میں اس طرح بھوک پیاس سے مرنے کا تصور ہی ہولناک تھا۔ اچانک موبائل فون کی ٹون بجنے کی آواز سنائی دی تو وہ چونک پڑا۔ اور قریب پڑا اغوا کار کا موبائل فون اٹھالیا مگر وہ موبائل فون اسی طرح آف پڑا تھا۔ غور کیا تو معلوم ہوا آواز اس کے پاؤں کے قریب سے آرہی ہے موبائل فون دائیں پاؤں کی طرف تابوت سے تقریباً چپکا ہوا تھا کافی دیر کی جدوجہد سے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے کھسکاتا کھسکاتا موبائل فون آگے لایا اور دھیرے دھیرے

ہاتھوں کی انگلیوں سے آگے کر کے گرفت میں لینے تک کافی وقت صرف ہو چکا تھا اس دوران موبائل فون خاموش ہو چکا تھا یہ اسی طرز کا پرانا سا موبائل فون تھا اس نے عجلت میں شمروز چانڈیو کا نمبر ڈائل کیا مگر یہ دیکھ کر مایوس ہونا پڑا موبائل فون میں بیلنس نہیں تھا۔

اسی وقت موبائل فون دوبارہ بجنے لگا یہ کوئی نیا نمبر تھا اس نے عجلت میں کال ریسو کی اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ یہ موبائل فون بھی اغوا کار نے ہی تابوت میں چھپا کر رکھا ہو گا یقیناً اغوا کار بہت ہی شاطر تھا جو نہایت ہی مہارت سے اپنے پتے کھیل رہا تھا بہرحال اغوا کار کی کال سے امید کی ایک کرن اسے دکھائی دی تھی۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو۔" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ دوسری طرف سے اغوا کار نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں نے تمہیں زندگی بچانے کے لئے جو چانس دیا تھا اس کا وقت پورا ہو چکا ہے اب یا تو مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ یا پھر میرا ایک مطالبہ پورا کر کے اپنی جان بچالو۔"

"تم تم جو چاہتے ہو میں ماننے کو تیار ہوں بس ایک بار مجھے اس تابوت سے باہر نکالو۔" وہ گڑگڑایا۔

"عاشق چانڈیو تابوت سے باہر نکلنے کے لئے تمہیں میرا ایک مطالبہ پورا کرنا ہو گا تمہاری زندگی کی قیمت صرف دو کروڑ روپے ہے رقم ملتے ہی تمہیں تابوت سے نکال دیا جائے گا۔" اغوا کار کی طرف سے رقم کا مطالبہ سنتے ہی اسے زندگی بچانے کی امید دکھائی دی تھی ویسے بھی تابوت میں بھوکا پیاسا پڑا رہنے سے اس کی وڈیرانہ اکڑفوں نکل چکی تھی۔ اس لئے وہ اغوا کار سے نہایت عاجزی سے مخاطب ہوا میں اس تابوت میں ہوتے ہوئے کیسے تمہارا مطالبہ پورا کروں گا تمہیں مجھے تابوت سے نکالنا پڑے گا۔ تم میرے ساتھ بینک چلے جانا میں وہیں دو کروڑ روپے تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

دوسری طرف موجود اغوا کار استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "عاشق چانڈیو تم کسی چوہے کی طرح چوہے دان میں پھنس چکے ہو اس لئے دھونس دھمکی بھول کر چاپلوسی سے کام لے رہے ہو میں احمق نہیں جو رقم لینے سے پہلے تمہیں تابوت سے نکالنے کا رسک لوں۔ تم کیا سمجھتے ہو کراچی سے اغوا کر کے اندرون سندھ لانا اور پھر تمہیں تابوت میں ڈال کر قبر میں اتارنا کوئی آسان کام تھا میں تمہارے وہ راز بھی جانتا ہوں جو تمہارے اپنے بھی نہیں جانتے میرے علم میں ہے کہ کراچی کے ایک نجی بینک کے اکاؤنٹ میں اس سے کہیں زیادہ رقم موجود ہے یہ تمہارا خصوصی اکاؤنٹ ہے جو تم نے ٹیکس سے بچنے کے لئے کھولا ہے اس کے علاوہ اس اکاؤنٹ کی سب سے منفرد بات یہ ہے کہ تمہاری صرف ایک فون کال پر بینک منیجر کسی چیک کے بغیر تمہارے بھیجے ہوئے شخص کو رقم دینے کا پابند ہے۔ میں اس وقت کراچی میں اسی بینک سے کچھ ہی فاصلے پر ہوں۔ بینک جاتے ہی میں تمہاری بینک منیجر سے بات کرواؤں گا تم اسے مجھے دو کروڑ روپے دینے کی تاکید کرو گے۔ میری ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری کی تو اسی تابوت میں بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرو گے۔ اور ہاں تم بینک منیجر کو میرا نام ظہیر خان بتاؤ گے۔ ایک اور مزے کی بات اس وقت یہ موبائل فون جو تمہارے ہاتھ میں ہے اس میں تمہاری اپنی سم موجود ہے جو میں نے تمہیں زوبی کے اپارٹمنٹ سے اغوا کرتے وقت نکال لی تھی۔" اغوا کار کی بات سن کر وہ سناٹے میں آ گیا وہ واقعی انتہائی شاطر انسان تھا۔ عاشق چانڈیو کے اس اکاؤنٹ کا علم شمروز چانڈیو کے علاوہ کسی دوسرے فرد کو نہیں تھا تو پھر اغوا کار کو اس اکاؤنٹ کا کیسے علم ہوا یہ سوال چکرا دینے والا تھا کیا ہوا۔" عاشق چانڈیو چکرا گئے ناں۔" اغوا کار کی آواز دوبارہ ابھری یہ تو کچھ نہیں میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ منیجر اور تمہارے درمیان کون سا کوڈ ورڈ طے ہوا ہے شیر جنگل کا بادشاہ ہے یہی کوڈ ورڈ ہے ناں۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو اب بتاؤ تمہیں ڈیل منظور ہے۔

عاشق چانڈیو ایک ظالم اور سفاک انسان تھا طاقت اور دولت کے نشے میں ہمیشہ دوسروں پر ظلم و ستم ڈھاتا چلا آیا تھا مگر اس وقت موت کو سامنے دیکھ کر اس کی ساری بہادری اور دلیری ہوا ہو چکی تھی اس لئے مرے مرے لہجے میں بولا۔

"مجھے ڈیل تو منظور ہے مگر تم رقم وصول کرنے کے بعد جب تک مجھے آزاد کرنے آؤ گے میں بھوک اور پیاس سے مر جاؤں گا پہلے خدا کے لئے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔" وہ اس کی منت سماجت کرنے لگا اور گڑگڑانے لگا۔ اغوا کار نے سرد لہجے میں کہا۔ "یاد کرو عاشق چانڈیو جب تمہارے کارندے تمہارے حکم پر کسی بے بس اور لاچار لڑکی کو اٹھالاتے تھے۔ وہ بھی اسی طرح تمہیں خدا کے واسطے دیتی ہوگی اور ماضی میں جب تم نے اپنے مخالفین کو قتل کیا ہوگا انہوں نے بھی اسی طرح تمہیں خدا کے واسطے دیتے ہوں گے تم نے کسی واسطے پر کان دھرے؟ نہیں ناں تم تو اپنے وقت کے فرعون بنے ہوئے تھے میری بات یاد رکھنا وقت کا فرعون جو ہوتا ہے ناں اس کا انجام برا بہت ہوتا ہے۔"

"بہرحال تمہاری تسلی کے لئے بتا دیتا ہوں میرا ایک ساتھی وہیں ہے جہاں تم تابوت میں دفن ہو میں رقم ملتے ہی اسے فون کردوں گا وہ تمہیں آزاد کردے گا۔" اغوا کار نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

☆......☆......☆

واقع نجی بینک کا منیجر وسیم اختر آفس میں بیٹھا تھا کہ سیکریٹری نے اطلاع دی سر کوئی ظہیر خان نامی شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے اس کے شمروز چانڈیو کا حوالہ دیا ہے وڈیرے کا حوالہ سنتے ہی وسیم اختر نے ظہیر خان نامی شخص کو آفس میں بیٹھنے کی تاکید کی وسیم خان اسمارٹ اور خوبرو نوجوان تھا سر پر کیپ اور آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ چہرے پر گھنی داڑھی مونچھیں دائیں گال پر بڑا سا مسا ہونے کے باوجود وہ خوش شکل ہی دکھائی دیتا تھا اس کا سبب اس کا صاف ستھرا دودھ کی طرح اجلا رنگ وروپ تھا وہ وسیم اختر کے سامنے بیٹھتے ہی کہنے لگا۔ "مجھے وڈیرا سائیں نے بھیجا ہے عاشق چانڈیو صاحب کو کچھ رقم کی فوری ضرورت ہے۔"

"کتنی رقم؟" وسیم اختر نے پوچھا۔

"یہی کوئی دو کروڑ روپے۔" ظہیر خان نے جواب دیا۔ وسیم اختر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"دو کروڑ؟"

"ہاں دو کروڑ بات کرلو سائیں سے۔" ظہیر خان نے عاشق چانڈیو کا نمبر ڈائل کیا۔ "سائیں میں منیجر صاحب کے سامنے بیٹھا ہوں۔ آپ بات کرو۔"

"ہاں بات کرواؤ۔" عاشق چانڈیو نے دوسری طرف سے مضطرب لہجے میں کہا اسے اغوا کار سے بھی زیادہ جلدی تھی وہ چاہتا تھا کہ دو کروڑ روپے کی رقم لے کر اسے اغوا کار رہا کردے اور اس کی اس تابوت سے کسی نہ کسی طرح جان چھوٹے دو کروڑ کا کیا تھا وہ مہینوں میں دو کی جگہ دس کرور کما لیتا۔ وسیم اختر نے ظہیر خان سے موبائل لیا اسکرین پر عاشق چانڈیو کا ذاتی نمبر دیکھ کر تسلی کرنے کے بعد مخاطب ہوا۔ "عاشق چانڈیو صاحب اس طرح اتنی بڑی رقم نکلوانا رسک ہے آپ اچھی طرح سوچ لیں۔"

"بکواس بند کرو کیا تم نہیں جانتے تم کس سے مخاطب ہو فوراً رقم کا انتظام کرکے ظہیر خان کو فارغ کرو۔" عاشق چانڈیو غرایا۔

"جی سائیں آپ فکر مت کریں میں انتظام کرتا ہوں مگر؟" وسیم اختر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر کیا؟" عاشق چانڈیو نے غصے سے پوچھا۔

"سائیں اس طرح اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے کے سلسلے میں آپ سے کوڈ ورڈ مقرر ہوتے تھے وہ آپ دہرادیں۔" منیجر نے کہتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے میز کے نیچے موجود چھوٹا سا بٹن دبا دیا یہ حساس ترین ڈیوائس کو متحرک کرنے کا بٹن تھا۔ جو میز کے ساتھ منسلک تھی۔ یہ جدید ترین ڈیوائس سرگوشی میں بھی کی جانے والی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جب کہ وہ موبائل فون کا اسپیکر بھی کھول چکا تھا عام حالات میں شاید وہ ایسا نہ کرتا مگر معاملہ دو کروڑ کی بڑی رقم کا تھا۔ عاشق چانڈیو نے کوڈ ورڈز دہرانے کے بعد اسے دوبارہ تاکید کی کہ "جلد از جلد وہ ظہیر خان کو دو کروڑ روپے دے دے۔"

منیجر نے موبائل فون ظہیر خان کو لوٹا دیا۔ کوشش کے باوجود دو کروڑ کی رقم کا بندوبست ہونے میں 45 منٹ کا

وقت لگ ہی گیا ادائیگی 5000 کے نوٹوں میں کی گئی تھی اس لئے آسانی ہوئی۔

ظہیر خان رقم والا بیگ لے کر کرسی سے اٹھا تو وسیم اختر نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جسے نظر انداز کرتا ہوا ظہیر خان آفس سے باہر نکل گیا وسیم اختر کھسیانا ہو کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میز پر رکھے ٹیلیفون کی بیل بجی اس نے ریسور کریڈل سے اٹھایا۔ ”ہیلو کون؟“

”شمروز چاڈیو بول رہا ہوں سنو اگر کوئی عاشق چانڈیو کے اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے آئے تو مجھے اطلاع کئے بغیر ہرگز مت دینا چاہے خود عاشق چانڈیو تمہیں کہے کیوں کہ اسے پچھلے روز اغوا کرلیا گیا تھا۔“ شمروز چانڈیو کی بات سنتے ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی وہ مری مری آواز میں بولا۔ ”جی وہ ابھی ابھی چھوٹے سائیں کے حکم پر دو کروڑ روپے لے کر نکلا ہے۔“

”پکڑو اسے۔“ اس بار کسی دوسرے شخص نے چیخ کر کہا۔ وسیم اختر نے ریسور کریڈل پر پٹخا اور باہر کی طرف بھاگا۔ ظہیر خان بیگ اٹھائے دروازے سے باہر جا رہا تھا۔ ”پکڑو اسے یہ ڈاکو ہے۔“ وسیم اختر دروازے کی طرف دوڑتا ہوا چیخا۔ اس کے الفاظ سن کر ظہیر خان نے دروازے سے چھلانگ لگادی وہ انتہائی پھرتیلا تھا دو ہی جستوں میں بینک سے باہر کھڑی موٹر سائیکل تک پہنچ چکا تھا۔ گارڈ نے باہر نکل کر اس کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا اس کے ساتھ ہی فضا چیخوں سے گونج اٹھی۔

☆......☆......☆

عمر دراز شمروز چانڈیو کے سامنے بیٹھا ہوا تھا شمروز چانڈیو کہہ رہا تھا عاشق چانڈیو کو اغوا ہوئے دو دن گزر چکے ہیں تم بھی ان عام پولیس والوں کی طرح نکلے کوئی کھوج خبر نہیں۔ لگا سکے الٹا گاؤں بھر میں میری ہی جاسوسی کررہے ہو تم کیا سمجھتے ہو مجھے کچھ پتہ نہیں آفیسر اپنے کام سے کام رکھو شاید تم شمروز چانڈیو سے پوری طرح طرح واقف نہیں ہو۔ اس کے لب و لہجے پر عمر دراز کو غصہ تو بہت آیا مگر برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شمروز چانڈیو صاحب میں اپنا کام بخوبی کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں یہ بھی تنبیہ کرتا ہوں کہ مجھ سے بات کرتے وقت اپنے لب و لہجے پر قابو رکھنا۔“

شمروز چانڈیو نے اسے غصے سے دیکھا مگر بولا۔ ”کچھ نہیں اگر آپ اپنے بیٹے کو صحیح سلامت بازیاب کروانا چاہتے ہیں اور اغوا کار کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتے ہیں تو قانون سے محاذ آرائی کے بجائے تعاون کریں سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تم سے یا تمہارے بیٹے سے کوئی ہمدردی نہیں میں صرف اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ یہ کیس ڈپارٹمنٹ نے میرے سپرد کیا ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بات کررہا تھا۔

”آپ سے اغوا کار نے تاوان وغیرہ کے لئے کوئی رابطہ تو نہیں کیا۔“

”نہیں شمروز خان نے ناگواری سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

عمر دراز نے اس نمبر کو ڈائل کرنے کا سوچا جس سے عاشق چانڈیو نے ڈی ایس پی عبید اور اپنے باپ کو فون کیا تھا۔ مگر نمبر آف ہی تھا۔ عاشق چانڈیو کا اپنا پرسنل نمبر تو بتاؤ عمر دراز نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ اس سے کیا فائدہ اغوا کار نے اسے اس کا موبائل تو نہیں دیا ہوگا اغوا کار نے اسے اغوا کرتے وقت عاشق چانڈیو کا موبائل فون پھینک دیا ہوگا شمروز چانڈیو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے عاشق چانڈیو کا نمبر بتائیں ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے شاطر سے شاطر مجرم سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے اور وہ اپنی اسی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔“ عمر دراز نے ایک بار پھر سختی سے کہا تو شمروز چانڈیو نے اپنے مغوی بیٹے کا نمبر دھرا دیا۔

عمر دراز نے اپنے موبائل فون سے عاشق چانڈیو کا نمبر ڈائل کیا اس کا نمبر آن تھا دوسری بیل پر عاشق چانڈیو نے کال ریسیو کرتے ہی نحیف آواز میں کہا۔ ”تم ہر بار نمبر کیوں تبدیل کردیتے ہو۔ رقم تو تمہیں مل ہی گئی ہوگی اب تو مجھے آزاد کردو۔“

”رقم کیسی رقم۔“ عمر دراز چونکا۔

”ابھی تو تم نے بینک منیجر سے میری بات کروائی

تھی اور میں نے اسے تمہیں دو کروڑ دینے کا حکم دیا تھا اب تم کہہ رہے ہو کیسی رقم۔" عاشق چانڈیو نے جھنجلا کر کہا وہ عمر دراز کو اغوا کار سمجھ رہا تھا۔

"وہ گزشتہ دو دنوں سے بھوکا پیاسا تابوت میں بند پڑا تھا بھوک، پیاس اور نقاہت سے وہ اس حد تک اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا تھا کہ عمر دراز اور اغوا کار کی آواز میں موازانہ بھی نہ کر پایا۔ عاشق چانڈیو میں اغوا کار نہیں بلکہ تمہیں اغوا کار سے آزاد کروانے کے مشن پر ہوں۔ تم بتاؤ کہاں ہو اور رقم کا کیا چکر ہے اور پھر اغوا کار نے تمہارا پرسنل نمبر آن کرنے کی غلطی کیوں کی۔" عمر دراز نے پوچھا۔

عاشق چانڈیو کا نام سن کر وڈیرا شمروز چانڈیو چونکا اور عمر دراز سے موبائل لینا چاہا مگر عمر دراز نے اشارے سے منع کر دیا عاشق چانڈیو نے خود پر بیتی روداد سنانے کے ساتھ ساتھ بتایا کہ "اغوا کار اس وقت بینک منیجر سے دو کروڑ روپے لے رہا ہوگا۔" اغوا کار نے اس لئے اس کا ذاتی نمبر آن کرنے کا رسک لیا تھا کہ بینک منیجر سے عاشق چانڈیو کے ذاتی نمبر پر بات کروا سکے تا کہ بینک منیجر کو کسی قسم کا بھی شک نہ ہو۔ عاشق چانڈیو سے بات چیت سن کر اس نے اسی وقت بینک کا نمبر ملایا اور مختصر الفاظ میں وڈیرے کو سمجھا کر بینک منیجر سے بات کرنے کو کہا بینک منیجر نے جب کہا کہ "اغوا کار رقم لے کر بینک سے نکل چکا ہے۔" تو عمر دراز نے وڈیرے سے موبائل فون جھپٹ کر کہا تھا پکڑو اسے اور ساتھ ہی فوراً اپنے افسر اعلیٰ کو فون کر کے موجودہ صورت حال کے بارے میں بتایا افسر اعلیٰ نے اپنے ادارے کے جوانوں اور پولیس فورس کو فوراً بینک پہنچ کر اغوا کار کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

ادھر بینک کے منیجر وسیم اختر نے چیخ کر گارڈز کو ظہیر خان کو پکڑنے کو کہا۔ ظہیر خان بینک سے باہر موجود افراد کی آڑ لیتا ہوا دو ہی جستوں میں اپنی موٹر سائیکل تک پہنچ کر سوار ہو چکا تھا۔ اسی وقت گارڈ نے اس کا نشانہ لے کر گولی چلائی بالکل اچانک ایک راہ گیر ظہیر خان کے سامنے آ گیا۔ گولی راہ گیر کی پنڈلی میں لگی تھی راہ گیر کی چیخوں اور گولی چلنے کی آواز سے بینک سے باہر موجود افراد میں بھگدڑ مچ گئی لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بینک کے گارڈ کے لئے بھگدڑ کی وجہ سے گولی چلانا ممکن نہ رہا۔ ویسے بھی اس کی غلطی سے پہلے ہی ایک راہ گیر زخمی ہو چکا تھا اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر راہ گیر نے ایک ہی کک میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آندھی اور طوفان کی طرح وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پولیس فورس اور ادارے کے جوان بینک پہنچے تو ظہیر خان دو کروڑ کے ساتھ رفو چکر ہو چکا تھا بینک منیجر سر پکڑے بیٹھا تھا اس نے اپنے آفس میں موجود ڈیوائس سے ظہیر خان اور عاشق چانڈیو کی ریکارڈ کی جانے والی گفتگو پولیس اور ادارے کے جوانوں کو سنانے کے ساتھ ساتھ بینک میں نصب سی سی ٹی وی کیمرے کی کیسٹ بھی دے دی۔

عمر دراز کو بینک میں ہونے والی کارروائی کی رپورٹ دے دی گئی عمر دراز نے مطلوبہ موبائل کمپنی کا نمبر ڈائل کیا اپنا تعارف کروانے کے بعد عاشق چانڈیو کا نمبر دے کر نمبر کی لوکیشن طلب کی اتفاق سے اس وقت لائن پر موبائل کمپنی کا وہی فرد تھا جس نے پہلے بھی عمر دراز کو عاشق چانڈیو کی لوکیشن بتائی تھی۔ اس نے اس بار بھی کمپنی کے ایم ڈی سے اجازت لینے کی بات کی تو عمر دراز بھڑک اٹھا۔ "تمہارا دماغ تو درست ہے معاملہ دو کروڑ اور زندگی کا ہے، ایک انسانی جان خطرے میں ہے ایسے میں تمہیں ایم ڈی کی اجازت کی پڑی ہے۔" اس کے باوجود ملازم نے کال کر کے ایم ڈی سے اجازت طلب کی اور دوبارہ لائن پر آ گیا۔ اس نے عمر دراز کو لوکیشن بتائی تو وہ ششدر رہ گیا۔ یہ لوکیشن گاؤں کے وسط میں واقع چھوٹے قبرستان کی تھی ادھر تابوت میں قید پڑا عاشق چانڈیو بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکا تھا مسلسل دو دنوں سے تابوت میں ایک جگہ پڑے رہنے سے جسم فالج کے مریض کی طرح سن ہو چکا تھا اور درد اور اذیت کی کسیلی لہریں پورے وجود میں سرایت کر چکی تھیں ایک طرف اغوا کار سے امید تھی کہ وہ دو کروڑ ملتے ہی اسے رہا

کردے گا تو دوسری طرف عمر دراز کا آسرا تھا کہ حساس ادارے کا وہ دلیر آفیسر اس کی جان بچالے گا طویل انتظار کے بعد اسے اغوا کار کے نمبر سے کال آئی اس بار بھی اس نے نئے نمبر سے کال کی تھی اغوا کار انتہائی شاطر انسان تھا جس نمبر سے کال کر رہا تھا ایسے دوسری بار استعمال نہیں کرتا تھا۔

"تمہیں رقم مل گئی ہے اب تو مجھے جانے دو۔" عاشق جانڈیو گھگھیایا۔

"عاشق جانڈیو تم بے فکر رہو۔ میں وعدے کا پابند ہوں تمہیں رہائی ملے گی ضرور مگر زندگی سے۔" دوسری طرف سے اغوا کار نے سفاک لہجے میں کہا۔

"یہ دھوکہ ہے فریب ہے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخا اغوا کار قہقہہ ابھرا تم نے بھی تو کسر کوئی نہیں چھوڑی تھی یاد کرو انسپکٹر سعود اور رضیہ کو تم باپ بیٹوں نے آخری چانس کا نام دے کر جنگل سے نکلنے کو کہا اور ان کے پیچھے شکاری کتوں کے ساتھ ساتھ اپنے مسلح کارندے بھی لگا دیئے حالاں کہ تم نے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ ان کے پیچھے صرف کتے ہوں گے یاد کرو ان کی درد و اذیت میں ڈوبی آخری چیخیں ان کے خونچکاں جسم تو تمہیں بخوبی یاد ہوں گے یہی نہیں تم لوگوں کے ہاتھوں میں بہت سے بے گناہوں کا لہو ہے اور پھر میں نے تمہیں چوبیس گھنٹوں کا چانس بھی دیا تھا مگر تم اور پولیس کچھ بھی تو ناں کر سکے۔ گڈ بائی عاشق جانڈیو۔" سفاک لہجے میں کہا گیا۔

عاشق جانڈیو جو پہلے ہی جان بلب تھا پاگلوں کی طرح چیخ و پکار کرنے لگا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس ویرانے اور اندھی قبر میں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں اپنے وقت کا فرعون اپنی شان و شوکت بھول کر فریادیں کر رہا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اسے خدا بھی یاد آ چکا تھا۔ وہ اس آخری وقت توبہ کر رہا تھا جب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا اسی وقت گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی یوں لگ رہا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہو پہلے قبر کی سلیں ٹوٹیں اور ٹوٹ کر منوں مٹی کے ساتھ تابوت پر گریں تابوت سلیوں اور منوں مٹی کے بوجھ سے پچک چکا تھا اس کی آخری چیخیں گڑگڑاہٹ اور گرد و غبار کے طوفان میں دب سی گئیں تھیں۔

عمر دراز چھوٹے قبرستان پہنچا تو وہاں سناٹے کا راج تھا ایک کچی قبر اسے دور سے ہی دکھائی دی جو اندر کو دھنس چکی تھی گورکن تو اس چھوٹے قبرستان میں کوئی نہیں تھا عمر دراز نے فوراً گاؤں کے پولیس اسٹیشن فون کر کے ایس ایچ او کو حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اپنے افسر اعلیٰ کو فون کر کے موجودہ صورت حال کا بتایا۔ علاقہ پولیس اور ایمبولینس دونوں ایک ساتھ ہی پہنچے تھے۔ ایس ایچ او مزدور بھی ساتھ لایا تھا گھنٹہ بھر کی مشقت سے قبر سے مٹی اور ٹوٹی سلیں نکال دی گئیں تابوت سلیوں اور منوں مٹی کے وزن سے پچک چکا تھا۔ عاشق جانڈیو کی خونچکاں لاش اس پچکے تابوت سے نکال کر ایمبولینس میں منتقل کر دی گئی۔ لاش کی حالت خاصی خراب تھی مگر صاف ظاہر تھا کہ مقتول کو کچھ لمحے پہلے قتل کیا گیا تھا عمر دراز اپنی ذہانت سے دوبار قاتل تک پہنچ گیا تھا مگر قاتل ذہانت میں عمر دراز سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ وہ دونوں بار چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔ ایک بار بینک میں جب اس کے کہنے پر پولیس نے ریڈ کیا اور منیجر نے اسے رقم سمیت روکنے کی کوشش کی اور دوسری بار یہاں اس قبرستان میں جب وہ نمبر ٹریس کر کے یہاں پہنچا تو قاتل عاشق جانڈیو کو جہنم رسید کر چکا تھا اسے حیرت تھی کہ قاتل اتنی جلدی اللہ بچایو آ کر عاشق جانڈیو کو کیسے قتل کر سکتا ہے کیا واقعی قاتل اس کے باپ انسپکٹر سعود کی روح ہے یہ سوال اس کے ذہن کو چکرانے کے لئے کافی تھا۔

اپنے بیٹے کے بہیمانہ قتل سے شمروز جانڈیو غضب ناک ہو رہا تھا قاتل تو سات پردوں میں چھپا تھا سامنے تھا نہیں لہٰذا وہ پولیس حکام پر گرج برس رہا تھا اس کیس میں ناکامی پر عمر دراز کو افسر اعلیٰ سے بھی ڈانٹ پڑی تھی عمر دراز ذہین اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا اپنے باپ کے قاتل ان وڈیروں سے اسے نفرت تھی مگر فرض کے

ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے اغوا کار کو پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا ایک طرف تو اسے اغوا کار کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تھا تو دوسری طرف اسے عاشق چانڈیو جیسے شیطان کے عبرت ناک انجام سے خوشی حاصل ہوئی تھی۔ شمروز چانڈیو ایک بااثر شخص تھا اور پھر اس کے خلاف کوئی ثبوت بھی تو نہیں تھا۔ اس لئے اب تک کوئی بھی ایماندار پولیس آفیسر اس پر ہاتھ نہ ڈال سکا تھا شمروز چانڈیو بیٹے کو سپرد خاک کر کے رات کے پہر غم بھلانے کے لئے شراب پی رہا تھا شراب کی خالی بوتل نیچے پڑی تھی دوسری بھی آدھی ہو چکی تھی وہ عادی شراب نوش تھا۔ اس قدر پینے کے باوجود بھی آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ صرف آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ گلاس میں موجود آتشیں سیال حلق میں انڈیل کر دوسرا پیگ بھرنے کے لئے بوتل اٹھائی ہی تھی کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ ناگواری سے موبائل فون نکالا اور اسکرین پر انجانا نمبر دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کا یہ نمبر سیکرٹ تھا جو اس کے فیملی ممبر کے پاس بھی نہیں تھا چند خاص بااثر شخصیات کی ہی اس خاص نمبر تک رسائی تھی کون ہوسکتا ہے اس نے سوچا اور فطری تجسس کے تحت کال رسیو کی اور غراہٹ آمیز لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”ہیلو کون؟“

”تمہاری موت۔“ دوسری طرف موجود شخص نے اطمینان سے جواب دیا تو وہ بھڑک اٹھا۔

”شاید تم نہیں جانتے کہ تم کس سے مخاطب ہو۔“ دوسری طرف موجود شخص ہنسا۔

”میں تمہیں بخوبی جانتا ہوں۔ تم وقت کے فرعون ہو۔ لیکن تم مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں۔“ کچھ دیر کے لئے خاموشی سی چھا گئی۔ پھر اسپیکر سے آواز دوبارہ ابھری۔ ”تمہیں اپنا بیٹا تو یاد ہوگا ہی ابھی اس بے چارے کو مرے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے تمہارے اس بیٹے کو میں نے ہی جہنم رسید کیا ہے اب تمہارے دوسرے بیٹے مامون چانڈیو اور تمہاری باری ہے۔“

اس کی بات سنتے ہی شمروز چانڈیو غصے سے چیخنے چلانے لگا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو تم بچ جاؤ گے میں تمہارا خون پی جاؤں گا ایک بار میرے سامنے تو آؤ پھر دیکھو میں تمہارا کیا حال کرتا ہوں۔“

”شمروز چانڈیو تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تم باپ بیٹوں نے مل کر انسپکٹر مسعود رضیہ کو قتل کیا تھا یاد ہے ناں؟“ سرد لہجے میں کہا گیا۔ ”تم ہو کون کیا تم انسپکٹر مسعود کے بیٹے یا رشتہ دار ہو۔“ شمروز چانڈیو نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔

”تمہارے دونوں ہی اندازے غلط ہیں میں انسپکٹر مسعود کی روح ہوں۔“

”تم غلط کہتے ہو بھلا روح بھی موبائل فون پر بات کرسکتی ہے۔“ شمروز چانڈیو غرایا۔

”جھوٹ سچ کیا ہے تم جلد جان جاؤ گے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور رابطہ منقطع ہوگیا وہ کوئی عام شخص تو تھا نہیں کہ فون پر دی جانے والی دھمکی سے ڈر جاتا۔ نہ جانے کتنے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو اس نے تڑپا تڑپا کر مارا تھا۔ کتنی عورتوں کو عصمت سے محروم کیا تھا وہ بھلا فون پر دی جانے والی دھمکی سے کیسے مرعوب ہوجاتا۔ پریشانی تو اسے تب ہوئی جب ایک نجی نیوز چینل پر اسے دی جانے والی دھمکی کا ذکر کیا گیا۔

سونے پر سہاگہ چینل والوں نے اس کی اور اس نامعلوم شخص کی فون پر ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ بھی چینل پر سنادی۔ اسے حیرت تھی کہ اپنے بیڈ روم میں اس نے عاشق چانڈیو کے قاتل سے جو گفتگو کی تھی اس کی بھنک میڈیا کو کیسے لگی اور پھر اس گفتگو کو ریکارڈ کر کے کس نے میڈیا تک پہنچایا۔ یہ چکرا دینے والے سوالات تھے ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ گارڈ نے عمر دراز کے آنے کی۔ اطلاع دی تو وہ جھلا اٹھا اسے نا جانے کیوں عمر دراز سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے پہلے دن سے ہی حساس ادارے کا آفیسر عمر دراز ناپسند تھا۔ ”بلاؤ اسے۔“ خاصے ناگوار لہجے میں اس نے عمر دراز کو بلانے کی اجازت دی۔ کچھ دیر بعد ہی عمر دراز اس کے سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ”وڈیرا سائیں آپ کی

زندگی خطرے میں ہے۔ اس لئے ڈپارٹمنٹ نے آپ کی سیکورٹی کے لئے میری ڈیوٹی لگائی ہے۔"

"مجھے تمہاری سیکورٹی کی ضرورت نہیں۔" اس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ عمر دراز صوفے سے اٹھا۔ ٹہلتے ہوئے اپنے سولجر کٹنگ بالوں پر ہاتھ پھیر کر مسکرایا، وڈیرا سائیں مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے کہ آپ کی سیکورٹی کے لئے اپنا سکون برباد کروں۔ مگر افسر اعلیٰ کے حکم پر مجبور ہوں۔ اگر آپ کو سیکورٹی کی ضرورت نہیں تو آپ اس بارے میں افسر اعلیٰ سے بات کریں تو اچھا ہے مگر میرے تو خیال میں افسر اعلیٰ اس بات کے لئے قطعی رضا مند نہیں ہوں گے آخر آپ ہمارے دیس کے قابل فخر لیڈر ہیں اور ہو سکتا ہے اللہ نہ کرے کبھی آپ کو ملک کی باگ ڈور بھی سنبھالنا پڑے۔ استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا عمر دراز کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب کہ شمروز چانڈیو زخمی شیر کی طرح ٹہلنے لگا۔ وہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھا گزشتہ چند دنوں سے اس پر مصیبتوں کے پہاڑ نازل ہو رہے تھے۔ پہلے بیٹے کا اغوا پھر اس کا قتل پھر فون پر جان سے مارنے کی دھمکی اور سونے پر سہاگہ نجی چینل پر اس دھمکی اور فون کال کا سنایا جانا اب عمر دراز نامی اس بلا کا اس کے سر پر ہر وقت نازل رہنا اسے سخت ناپسند تھا۔ حقیقت میں اس نے خود کو زندگی میں پہلی بار بے بس محسوس کیا تھا۔

شام کے قریب وہ ذاتی محافظوں کے ساتھ گھر سے نکلا۔ اس کے آگے پیچھے گارڈز کی دو گاڑیاں تھیں جب کہ وہ خود BMW میں ان دو گاڑیوں کے بیچ تھا۔ سب سے پیچھے بڑے ٹائروں والی جیپ میں عمر دراز تھا دراصل وہ الیکشن مہم کے سلسلے میں قریبی قصبے تک جا رہا تھا گاڑیوں کا یہ قافلہ جب کچی اور ناہموار سڑک سے ہوتا ہوا قصبے کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچا تو اچانک تڑتڑاہٹ کی گونج دار آواز سنائی دی کھلبلی سی مچ گئی۔ مسلح گارڈز گاڑی سے اتر کر اس سمت لپکے جہاں سے فائرنگ کی گئی تھی جب کہ شمروز چانڈیو نے چلا کر ڈرائیور کو واپسی کا حکم دیا زندگی میں پہلی بار اسے ڈر اور خوف کا ادراک ہوا تھا۔ اسے حقیقی معنوں میں جان کے لالے پڑ گئے تھے واپس حویلی پہنچ کر وہ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ اسکرین پر اس بار بھی نیا نمبر تھا۔ کال ریسو کرتے ہی اسی شخص کی آواز ابھری۔ جس نے اسے پہلے کال کرکے دھمکی دی تھی۔

"شمروز چانڈیو گولیوں کا وہ برسٹ تمہیں مارنے کے لئے نہیں صرف ڈرانے کے لئے تھا اور پھر جس مقام پر فائرنگ کی گئی تھی وہاں دونوں طرف میدانی علاقہ تھا۔ تمہارے محافظ کوشش کے باوجود مجھے اس لئے بھی تلاش نہ کر پائے کہ میں ایک روح ہوں۔ جو کسی انسان کو دکھائی نہیں دیتی۔ دوسرا ثبوت ابھی اسی جگہ اسی مقام پر تمہیں دوں گا جہاں تم موجود ہو۔ تم اس وقت حویلی کے احاطے میں ہو احاطے کے اطراف بلند و بالا دیواریں ہیں جن پر چڑھنا کسی انسان کے لئے ناممکن ہیں اور اگر بالفرض کوئی چڑھ بھی جائے تو تمہارے محافظوں سے بچ نہیں سکتا۔ گویا یہاں تمہاری اجازت کے بینا، چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ مگر ابھی اسی وقت اسی احاطے میں تم پر گولیاں چلیں گی اس کی باتوں سے اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر اپنے محافظوں کو ہوشیار کرتا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گولیاں چلیں اور اس کے قدموں کے قریب سے گرد سی اڑی بلاشبہ وہ جو کوئی بھی تھا اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ اس کے بالکل پاؤں کے قریب گولیوں نے دائرہ سا بنا دیا تھا۔ ان گولیوں سے اسے ذرا برابر بھی گزند نہیں پہنچی مگر وہ دہشت زدہ ضرور ہو گیا تھا اس کے محافظ فائرنگ کرنے والے اس دشمن کی تلاش میں احاطے کے چاروں طرف پھیل گئے مگر حملہ آور تو کیا کسی بلی کے بچے کو بھی نہ ڈھونڈ سکے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے حملہ آور نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہو۔ خود عمر دراز بھی وہاں موجود حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے مغربی سمت کیاری کے قریب چھوٹا سا سایہ دیکھا تھا جو لمحہ بھر میں وہاں سے چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا عمر دراز اس کیاری کے قریب پہنچا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ادھر شمروز چانڈیو دہشت زدہ سا کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ موبائل فون کے اسپیکر سے پراسرار حملہ آور کی آواز اب تک ابھر رہی تھی اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دوبارہ موبائل فون کان سے لگایا۔ ”تت تم کہاں ہو؟“ اسپیکر سے ہنسی کی آواز ابھری۔ ”سامان سو برس کا پل بھر کی خبر نہیں۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ موت ہمیشہ انسان کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ میں بھی تمہارے قریب ہی ہوں۔ یاد رکھنا اب گولی ادھر ادھر نہیں سیدھی تمہارے سر یا دل میں چھید کرے گی۔“ اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

اس دوران عمر دراز موبائل فون کمپنی سے لوکیشن معلوم کر چکا تھا موبائل فون کمپنی کی ٹریسنگ رپورٹ کے مطابق حملہ آور یہیں آس پاس تھا عمر دراز خود چکرا گیا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے کیا واقعی حملہ آور اس کے باپ کی روح ہے۔ مگر یہ ماننے کو اس کا ذہن تیار نہیں تھا۔

وہ وڈیرے باپ بیٹے اس کے باپ کے قاتل تھے۔ یہ حقیقت سامنے آنے کے بعد سے جب بھی اس کی نظر وڈیروں پر پڑتی اس کا خون کھول اٹھتا۔ مگر وہ فرض کے ہاتھوں مجبور تھا۔ رہا اس پراسرار حملہ آور کا معاملہ تو اس کی وجہ سے اس کا افسر اعلیٰ بار بار اسے تنبیہ کر رہا تھا کہ عمر دراز اب تک اسے گرفتار کیوں نہیں کر پایا۔ شمروز چانڈیو تو اب ڈر کے مارے اپنے کمرے سے بھی بہت کم نکلتا تھا۔ مگر آخر کب تک وہ عام انسان تو تھا نہیں کہ گھر پر بیٹھ جاتا۔ وہ ایک کرپٹ سیاستدان تھا جو سیاست کی آڑ میں اپنے غیر قانونی دھندے جاری رکھے ہوئے تھا۔ شہر میں بھی اس نے کئی ایکڑ سرکاری زمین قبضہ کر کے بیچ کھائی تھی۔ اس روز شمروز چانڈیو ایک پارٹی میں مدعو تھا۔ اسے بطور چیف گیسٹ بلایا گیا تھا یہ پارٹی شہر میں تھی ہائی وے کے قریب دو ایکڑ کے رقبے پر مشتمل اس فارم ہاؤس میں سیکورٹی کے انتظامات انتہائی سخت تھے شمروز چانڈیو کے ذاتی محافظ بھی چوکس کھڑے تھے شمروز چانڈیو ابھی ابھی اسٹیج پر پہنچا تھا۔ اسٹیج سے کچھ فاصلے پر درجنوں شاہانہ طرز کی کرسیاں تھیں جن پر معززین شہر تشریف فرما تھے۔ وہ سب شمروز چانڈیو کی اصلیت سے بے خبر تھے۔ ان ہی کرسیوں میں سے ایک پر شمروز چانڈیو کا بیٹا مامون چانڈیو بھی اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ پارٹی شروع ہونے سے پہلے بڑے بڑے نامور فنکاروں نے اپنے اپنے فن کے جوہر دکھائے تھے۔ اس وقت اسٹیج سے کچھ فاصلے پر ایک اسمارٹ سا نوجوان جوکر بنا ہوا لوگوں کو ہنسا رہا تھا اس کا چہرہ مختلف اقسام کے رنگوں میں رنگا ہوا تھا کبھی وہ کسی ماہر بازی گر کی طرح قلابازیاں کھاتا کبھی لطیفے سنا کر اور اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا اس وقت بھی وہ جوکر ڈانس کرتے ہوئے گا رہا تھا اکڑ بکڑ بمبے بو، اسی نوے پورے سو، سو میں لگا دھاگا چور نکل کے بھاگا۔

نہ جانے کیوں یہ جوکر عمر دراز کے ذہن میں کھٹک رہا تھا وہ جوکر کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ ادھر اس جگہ سے سو گز کے فاصلے پر احاطے سے باہر جھاڑیوں کے جھنڈ کے قریب تین فٹ کا ایک بونا بیگ لٹکائے مین ہول کا ڈھکن کھول کر اندر جا گھسا بونے کا پورا جسم اور چہرہ لمبے لمبے گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا وہ کوئی چھوٹے قد کا بن مانس لگ رہا تھا یہ متروک گٹر لائن تھی جو اس وقت خشک تھی مگر اس کے باوجود سیلن بدبو اور کیچڑ کے باعث کسی انسان کا اس میں چلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ یہاں حشرات الارض بھی تھے مگر وہ ان سب سے بے نیاز آگے بڑھتا جا رہا تھا اس کے چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس راستے سے بخوبی واقف ہے۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جگہ لوہے کی سیڑھی دکھائی دی جو اوپر کی طرف جا رہی تھی وہ پھدک کر اوپر جا چڑھا۔ یہاں مین ہول کا ڈھکن تھا جسے بونے نے معمولی سا سرکا کر باہر جھانکا سامنے اسٹیج پر شمروز چانڈیو صاف دکھائی دے رہا تھا جوکر مٹکتا ہوا شمروز چانڈیو کے قریب جا پہنچا۔ سب جوکر کی شوخیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس وقت بھی وہ بچوں کی طرح گنگنا رہا تھا اکڑ بکڑ بمبے بو، اسی نوے پورے سو، سو میں لگا دھاگا۔

اسی وقت بونا بن مانسن ڈھکن سرکا کر باہر آیا اب اس کے ہاتھوں میں سٹین گن نظر آ رہی تھی جس سے تڑتڑاہٹ کی آواز سے گولیاں چلیں گولیاں چلنے کی آواز سے وہاں بھگدڑ مچ گئی عمر دراز سمیت سب کی نگاہ اس عجیب الخلقت بونے پر پڑ چکی تھی۔ جو ہوائی فائرنگ کرکے چھلاوے کی طرح گٹر میں کود چکا تھا۔ شمروز چانڈیو کے نجی محافظ اور پولیس کمانڈوز اس گٹر کی طرف بھاگے عمر دراز بھی ان کے پیچھے تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے بھگدڑ مچ گئی لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر دوڑے۔ اس افراتفری میں جوکر بھاگتے ہوئے مامون چانڈیو کے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی ساخت کا پسٹل تھا۔ "گڈ بائی مامون چانڈیو۔" کہتے ہوئے اس نے گولی چلا دی فائر کے ہولناک دھماکے سے فضا مامون چانڈیو کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھی۔ یوں لگتا تھا کہ بونا کوئی جادوئی عمل جانتا ہے یا کوئی چھلاوہ یا بھوت ہے اردگرد کے علاقے سمیت پوری گٹر لائن میں اس کا نام ونشان نہ تھا اور پھر سیلن کیچڑ بدبو کے باعث اس گٹر لائن میں چلنا بھی ناممکن تھا ادھر گولی چلنے اور مامون چانڈیو کی چیخ کی آواز سن کر عمر دراز جو کہ مین ہول کے قریب تھا مڑ کر دیکھا مامون چانڈیو لاش میں تبدیل ہوکر زمین پر پڑا تھا۔ جب کہ جوکر بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر فارم ہاؤس کے گیٹ سے نکل چکا تھا۔

عمر دراز اس کے پیچھے دوڑا وہ فارم ہاؤس کے دروازے سے باہر نکلا تو جوکر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرکے وہاں سے نکل چکا تھا عمر دراز آج کسی حال میں بھی اس پراسرار قاتل کو پکڑنا چاہتا تھا اتفاق سے جیپ ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں اردگرد کوئی دوسری گاڑی موجود ناں تھی اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے جیپ میں چھلانگ لگائی اور تیز رفتاری سے اس سمت روانہ ہوگیا۔ جس طرف جوکر موٹر سائیکل دوڑا رہا تھا۔ جوکر نے عمر دراز کی جیپ تعاقب میں دیکھ کر دائیں طرف موجود کچے راستے پر موٹر سائیکل دوڑا دی۔ عمر دراز نے بھی اسٹیئرنگ موڑا وہ آج ہر حال میں اسے پکڑنا چاہتا تھا اس کچے اور ناہموار راستے پر تیز رفتار جیپ بری طرح ڈگمگا رہی تھی اچانک ہی جوکر نے پیچھے مڑ کر دائیں ہاتھ سے فائر کیا تھا گولی جیپ کے اگلے ٹائر میں لگی اور تیز رفتار جیپ قابو سے باہر ہوکر کچے راستے کے کنارے موجود درخت سے ٹکرائی۔ عمر دراز کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور وہ ہوش وخرد سے محروم ہوگیا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک ڈاکٹر اور اس کے ادارے کا ایک جوان موجود تھے۔ مجھے یہاں کون لایا۔ وہ اٹھ بیٹھا سر وہ کوئی جوکر تھا آپ کو ایمرجنسی میں پہنچا کر خود اچانک غائب ہوگیا البتہ وہ جانے سے پہلے استقبالیہ کاؤنٹر پر آپ کے نام لیٹر دے گیا تھا جو ہم نے آپ کے ادارے کے جوان کو دیا ہے آپ کو اس جوکر کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ بروقت آپ کو ناں صرف اسپتال لایا بلکہ جانے سے پہلے آپ کا تعارف بھی کروا دیا کہ آپ کا تعلق حساس ادارے سے ہے۔ آپ کے سر میں بہت گہری چوٹ لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا اگر عین وقت پر آپ کو اسپتال نہ لایا جاتا تو آپ کی جان بھی جاسکتی تھی ڈاکٹر نے کہا اور اس کا معائنہ کرکے روم سے باہر نکل گیا۔

"بھئی بہت خوش قسمت ہو جو قاتل بھی تمہارا خیال رکھتے ہیں۔" اس کے ادارے کے جوان مدثر نے کہا تو وہ جھینپ پڑا۔ مدثر نے جوکر کا لیٹر بھی اسے دیا لکھا تھا۔ "عمر دراز صاحب ناں صرف میں آپ کا نام جانتا ہوں بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ حساس ادارے کے باصلاحیت بہادر اور ایماندار آفیسر ہیں جب آپ میرے تعاقب میں تھے مجھے آپ پر گولی چلانے کا بہت بار موقع ملا۔ مگر میں ایک اچھے آفیسر سے اپنے وطن کو محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خود کو بچانے کے لئے مجھے مجبوراً جیپ کے ٹائر پر فائر کرنا پڑا۔ مگر جیپ درخت سے جا ٹکرائی اور آپ کا خون تیزی سے بہنے لگا۔ آپ کی جان خطرے میں تھی اتفاقاً اسی وقت ایک مقامی شخص سوزوکی میں اس کچے راستے سے گزرا۔ اس ہمدرد انسان نے آپ کو اسپتال پہنچانے کی حامی بھرلی۔ یہ اسپتال جائے

حادثہ سے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر تھا آپ کو ایمرجنسی تک چھوڑ کر جا رہا ہوں فقط والسلام جو کر۔

ادھر ماموں چانڈیو کو پوسٹ مارٹم کے بعد سپرد خاک کر دیا گیا تھا شمروز چانڈیو اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ تقریب میں شرکت کی غرض سے شہر آیا اور دوسرے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس پراسرار قاتل نے اسے اس دونوں بیٹوں سے محروم کر دیا تھا اب تو اسے ڈر کے مارے نیند بھی نہیں آتی تھی کہ کہیں وہ قاتل اسے سوتے میں دبوچ نہ لے۔ اپنے وقت کا فرعون بے بس اور لاچاروں پر ظلم و ستم ڈھانے والا اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔

اس سلسلے میں اس نے چیف منسٹر اور ہوم منسٹر تک کو دہائی دی کہ پولیس اور حساس ادارے اب تک اس کے بیٹے کے قاتلوں کو پکڑ نہیں سکے اب اسے اپنی جان کا خطرہ ہے۔

ادھر عمر دراز اسپتال سے گھر پہنچا اس کے سر پر پٹی دیکھ کر عائشہ تڑپ اٹھی۔ ''میں نے تمہیں شروع میں ہی منع کیا تھا کہ ایسی خطرناک نوکری کی کیا ضرورت ہے جس میں انسان کی جان ہر وقت خطرے میں رہے۔'' وہ ماں سے لپٹ گیا۔ ''ماں تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ تمہارا بیٹا وطن کے رکھوالوں میں شمار ہوتا ہے اسی وطن کی وجہ سے تو ہماری عزت ہے۔ مگر مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم نے مجھ سے اتنی بڑی بات کیوں چھپائی کہ میرے باپ کی موت قدرتی نہیں قتل تھا۔ اور میرے باپ کے قاتل وڈیرا شمروز اور اس کے بیٹے تھے۔''

عائشہ دھک سے رہ گئی۔ اس نے برسوں سے جو راز بیٹے سے چھپایا تھا وہ کھل چکا تھا عمر دراز نے ماں کو بتایا کہ ''اللہ بچایو میں اس پر کیا گزری۔''

عائشہ کہنے لگی۔ ''بیٹا یہ سب میں نے تمہارے بھلے کے لئے کیا تھا اگر تم سچائی جان جاتے تو آج اس مقام پر نہ ہوتے بلکہ انتقام کے چکر میں پڑ کر اپنا مستقبل تباہ کر دیتے۔ میں نے انسپکٹر سعود سے محبت کی شادی کی تھی وہ بھی تمہاری ہی طرح بہادر اور دلیر تھا۔ ان دنوں تم چھوٹے تھے جب سعود کا ٹرانسفر اللہ بچایو گاؤں میں ہوا۔ انہوں نے وہیں کرائے کا گھر لے کر ہمیں بھی بلوا لیا وڈیرے شمروز اور اس کے بیٹوں نے رسول بخش کو قتل کر کے اس کی لاش درخت سے لٹکا دی۔

وہاں کے باسیوں میں سے کوئی بھی ان کے جرم کی گواہی دینے کو تیار نہیں تھا تب سعود کے حوصلہ دلانے پر رضیہ نے ان کے خلاف مقدمہ درج کروایا سعود تین چار اہلکاروں کے ساتھ انہیں گرفتار کرنے حویلی جا پہنچا۔ جہاں وڈیروں نے سعود کو دھوکے سے پکڑ لیا۔ سعود کے ساتھی اہلکار وڈیروں کے ہاتھوں بک چکے تھے سعود کو وڈیرے گن پوائنٹ پر جنگل لے گئے۔ انہوں نے رضیہ کو بھی اغوا کر لیا اور اسے پامال کرنے کے بعد سعود کو اور رضیہ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر جنگل میں بھاگنے کے لئے مجبور کیا۔ وڈیرے نے آخری چانس کا دھوکہ دے کر کہا کہ ان کے پیچھے صرف شکاری کتے ہوں گے۔ اگر وہ جنگل سے بچ نکلے تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ مگر مکار وڈیرے نے ان کے پیچھے اپنے مسلح کارندے بھی لگا دیئے۔ رضیہ جنگل میں ماری گئی۔ سعود اس کے کارندوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہونے کے باوجود گھر تک آ پہنچے اور مجھے کہا کہ عمر دراز کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ ورنہ وڈیرا تم دونوں کو مروا دے گا پھر وہ میری نظروں کے سامنے دم توڑ گئے تمہاری زندگی بچانے کی خاطر مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا کراچی آ کر میں نے ان وڈیروں کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی اور سعود کی لاش بطور وارث شہر منگوانے کے بعد یہاں سپرد خاک کیا میں پرانا علاقہ چھوڑ کر نئے محلے میں رہنے لگی کہ تم سچائی جان کر انتقام کے چکر میں نہ پڑ جاؤ۔''

وہ سچائی جاننے کے بعد ماں کی عظمت کا قائل ہو گیا کہ اسی کی وجہ سے آج وہ اس مقام تک پہنچا تھا دوسرے روز وہ افسر اعلیٰ کے بلوانے پر ان سے ملنے گیا۔ تمام روداد سنانے کے بعد کہا کہ اس کے باپ کا قاتل وڈیرا غریب لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے لئے اب تک آزاد ہے۔ اس نے افسر اعلیٰ کو شمروز چانڈیو کی اصلیت

کے بارے میں بتایا تب افسر اعلیٰ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں سب کچھ جانتا ہوں مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہوں۔ تمہیں شمروز چانڈیو کی سیکورٹی کے لئے ایک بار پھر بھیجا جارہا ہے تم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے خلاف ثبوت حاصل کرنے ہیں۔" وہ افسر اعلیٰ کی بات سن کر خوشی سے کھل اٹھا۔ اور دوسرے ہی روز اندرون سندھ کے اس علاقے اللہ بچایو میں جا پہنچا۔

وہ جس وقت وہاں داخل ہوا سہ پہر کا وقت تھا وہاں آتے ہی اسے عائلہ ہونے والی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ عائلہ وہ لڑکی تھی جس نے پہلی ہی ملاقات میں اس کے دل کے تاروں کو چھولیا تھا اس سے پہلے بھی اسے بارہا عائلہ کی یاد آئی مگر ان دنوں عاشق چانڈیو اور پھر دوسرے مسئلوں میں الجھ کر اس سے ملنے کا وقت ہی نہیں نکال سکا تھا دوبارہ اس بستی میں قدم رکھتے ہی عائلہ سے ملنے کو اس کا دل مچل سا گیا۔ دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے قدم بے اختیار جنگل کے قریب واقع بڑے قبرستان کی طرف اٹھ گئے۔

وہ شہر خموشاں کے گیٹ پر جیپ روک کر اندر داخل ہوا۔ اہل قبور کو سلام کرنے کے بعد فاتحہ خوانی کی اور عائلہ کے جھونپڑی نما مکان کی طرف لپکا۔ قریب پہنچ کر صدا لگائی۔ "کوئی ہے۔"

مگر جواب ندارد اس نے سوچا کہیں پہلے کی طرح نماز تو نہیں پڑھ رہی۔ احاطے میں داخل ہوا جھونپڑی کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا جھری سے جھانکا تو دم بخود دیکھتا چلا گیا وہ جائے نماز پر دوزانو ہو کر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر موجود تقدس اور نور کے ہالے نے اس کے چہرے کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا وہ الٹے قدموں پلٹا اور باہر آ گیا کہ مبادا اس طرح بغیر اجازت اندر آنے پر عائلہ برا نہ منائے کچھ ہی دیر بعد عائلہ باہر نکلی۔ "کیا آج پھر کسی قبر کی تلاش میں آئے ہیں۔" اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"دراصل پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا میرا کچھ کھو گیا تھا وہی لینے آیا ہوں۔" عمر دراز نے بھی شوخ لہجے میں جواب دیا۔ "کیا کھو گیا تھا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میرا دل جو تم نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے دیکھو کسی کی چیز اس طرح چرانا جرم ہے۔" وہ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مخاطب ہوا تو وہ شرما گئی۔ "وہ بابا آج بھی گھر پر نہیں ہیں۔" عائلہ نے گڑبڑا کر نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس وقت بابا سے نہیں تم سے ملنے آیا ہوں۔ وقت آنے پر بابا سے بھی مل لوں گا۔" اس نے جسارت کرتے ہوئے عائلہ کی پرحرارت مرمریں کلائی تھام لی۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے عائلہ کا دل سینے میں اس تیزی سے دھڑکنے لگا گویا ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا اس نے اسے بدتمیز کا خطاب دیتے ہوئے کلائی چھڑائی تو وہ ہنس پڑا۔ "اس خطاب کا مطلب ہے کہ تم بھی مجھے پسند کرنے لگی ہو۔ میرا انتظار کرنا۔" اس نے ایک بار پھر شوخ لہجے میں کہا تو عائلہ گھبرا کر مڑی اور خدا حافظ کہہ کر اندر چلی گئی۔ جب کہ وہ مسرور سا واپس لوٹ گیا۔

عائلہ پہلی ہی ملاقات میں عمر دراز کی خود میں دلچسپی بھانپ چکی تھی مگر جان بوجھ کر انجان بنی رہی کہ ان دونوں میں معاشرتی لحاظ سے بہت فرق تھا۔

عمر دراز قبرستان سے سیدھا شمروز چانڈیو کی حویلی پہنچا۔ اسے شمروز چانڈیو سے کوئی ہمدردی یا لگاؤ نہیں تھا۔ کہ شمروز چانڈیو اس کے باپ کا قاتل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی بے رحم انسان تھا۔ جس نے نجانے کتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا تھا اتنا تو وہ اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ اس وڈیرے کا دشمن بھی اس کے ظلم کا کوئی ستایا ہوا ہی ہوگا جس نے انتقام اس کے دونوں بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اب گن گن کر شمروز چانڈیو سے بدلے لے رہا تھا وہ خود بھی تو شمروز چانڈیو سے نفرت کرتا تھا کہ وہ اس کے باپ کا قاتل تھا۔ مگر وہ اس کے خلاف کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اور ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی نہیں کرسکتا تھا بظاہر اس بار بھی اسے ادارے نے اس کی حفاظت کے لئے بھیجا تھا۔ مگر اس بار وہ

افسرِ اعلیٰ کی۔ مشاورت سے شمروز چانڈیو کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنے حویلی آیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس پراسرار قاتل کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر کے اپنی وردی پر لگا داغ بھی دھونا چاہتا تھا۔ اس روز شمروز چانڈیو کے بیڈ روم میں اس سے بات چیت کے دوران عمر دراز نے بڑی ہوشیاری سے چائے پیتے ہوئے صوفے کے نیچے بگ نصب کردیا تھا یہ جدید ترین حساس ڈیوائس تھی۔ جو انتہائی مختصر تھی اور کسی بھی شے پر باآسانی چپک جاتی تھی اب اس کمرے میں سرگوشی میں بھی ہونے والی گفتگو وہ اپنے کمرے میں باآسانی سن سکتا تھا اسے شمروز چانڈیو نے برابر والا کمرہ دے رکھا تھا۔ دراصل ان دنوں اس کی حویلی میں عجیب قسم کے واقعات پیش آنے لگے تھے کبھی حویلی کے درودیوار پر خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ تو کبھی بکرے کی سری احاطے میں پڑی دکھائی دیتی۔ ایک بار تو حد ہوگئی شمروز چانڈیو صبح جب سو کر اٹھا تو اس کے بیڈ روم میں گوشت پوست سے عاری انسانی کھوپڑی پڑی تھی اس جیسا سفاک شخص بھی دہشت زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ کوشش کے باوجود اس پراسرار دشمن کا سراغ کسی کو بھی نہ مل سکا تھا۔ اسی خوف ودہشت کے باعث وہ عمر دراز جیسے ناپسندیدہ شخص کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ عمر دراز کو اب تک اس حساس ڈیوائس سے کوئی کام کی بات پتہ نہ چل سکی تھی۔

ایک روز آرام کے اوقات میں اپنے کمرے میں موجود ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا اس کے کانوں میں ہیڈ فون لگے ہوئے تھے اس ہیڈ فون کا تعلق شمروز چانڈیو کے کمرے میں نصب حساس ڈیوائس سے تھا۔ اچانک ہیڈ فون سے موبائل فون کی رنگ ٹون کی آواز ابھری پھر شمروز چانڈیو کی آواز سنائی دی۔ ”تم آخر ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟“ اس کی آواز میں شکست خوردگی نمایاں تھی دو نوجوان بیٹوں کی موت اور پے در پے قاتلانہ حملے اور حویلی میں عجیب وغریب خوف زدہ کردینے والے واقعات نے اس کے مضبوط اعصاب کو توڑ ڈالا تھا۔ قدرے توقف سے اس کی آواز ابھری۔ ”دیکھو جو ہوا اسے بھول جاؤ میں انسپکٹر سعود اور رضیہ کو دوبارہ زندہ تو نہیں کرسکتا مگر تم جو تاوان مانگو گے دوں گا۔“ پھر اس کی تحیر زدہ آواز ابھری۔

”کیا موبائل فون کا اسپیکر کھول دوں مگر کیوں؟ اچھا اچھا بھئی تم ناراض مت ہو۔ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی کروں گا۔“ پھر غالباً شمروز چانڈیو نے کال کرنے والے کے مطالبے پر موبائل فون کا اسپیکر کھول دیا تھا کیوں کہ دوسری طرف موجود شخص کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ”میں انسان نہیں روح ہوں اور روح کو دولت وجائیداد کا لالچ نہیں ہوتا۔ یہ سب زندہ انسانوں کے کام کی چیزیں ہیں۔ عاشق چانڈیو سے بھی میں نے رقم تمہیں مالی نقصان پہنچانے کی وجہ سے لی تھی میں تمہیں اب بھی معاف کرسکتا ہوں مگر ایک شرط ہے؟“ دوسری طرف موجود شخص نے کہا۔ ”کل رات بارہ بجے تم اسی جنگل میں آؤ گے۔ جہاں تم نے انسپکٹر سعود اور رضیہ کو دوڑا دوڑا کر مارا تھا۔ یاد ہے ناں وہ جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے اور تم نے ان کی جان لینے کے لئے اپنے مسلح کارندے اور شکاری کتے ان کے پیچھے لگادیئے تھے۔“

شمروز چانڈیو نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”مم مگر میں وہاں آ کر کروں گا کیا؟“

انسپکٹر سعود کی روح کے دعویدار نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”موت سے اتنا ڈر رہے ہو کہ تمہارا موبائل فون والا ہاتھ بھی کانپ رہا ہے تم مجھے دیکھ رہے ہو۔“ شمروز خان نے حیرت سے استفسار کیا ہاں میں اس وقت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوں تم کریم کلر کے کارٹن کے لباس میں ملبوس ہو۔ میری کال آنے سے پہلے تم شراب پی رہے تھے اور پھر میری آواز پہچانتے ہی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے مگر تم چاہتے کیا ہو۔“ شمروز چانڈیو نے رو دینے والے لہجے میں پوچھا۔

ادھر ان کے مابین ہونے والی گفتگو سے عمر دراز خود بھی حیران تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”کیا واقعی شمروز چانڈیو ایک روح سے محو گفتگو ہے۔“

ادھر وہ کہہ رہا تھا۔ ”شمروز چانڈیو اگر جان کی

سلامتی چاہتے ہو کل رات ٹھیک بارہ بجے اکیلے جنگل میں آ ؤ تمہیں وہاں پہنچ کر چلا چلا کر کہنا ہے کہ "انسپکٹر سعود کی روح مجھے معاف کردو۔" یاد رہے کل میری برسی ہے اگر تم کسی کو ساتھ لائے یا نہیں آئے تو میں تمہیں معاف کرنے کا ارادہ ترک کرکے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"مگر میں یہاں ابھی تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔" شمروز چانڈیو نے کہا۔

"نہیں تم نے مجھے جنگل میں قتل کیا تھا اسی لئے جنگل میں آکر کل رات بارہ بجے معافی مانگو گے کیوں کہ کل میری برسی ہے۔" کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر شمروز چانڈیو کی آواز ابھری۔ "میں کل ضرور آؤں گا۔ اور کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گا مگر تم بھی وعدے پر قائم رہنا اس کے بعد مجھے پھر کبھی تنگ نہیں کرنا۔" اس کے لہجے میں ڈر اور خوف پنہاں تھا۔

"میں وعدہ خلاف نہیں۔" عجلت میں کہا گیا۔ اور خاموشی چھا گئی۔

عمر دراز سمجھ گیا کہ رابطہ منقطع ہوگیا ہے دوسرے روز رات بارہ بجے سے پہلے عمر دراز بڑے قبرستان سے ہوتا ہوا جنگل کے اس حصے میں داخل ہوا جہاں شمروز چانڈیو کو بلایا گیا تھا وہ ایک گھنے درخت پر چڑھا اور درخت کی گھنی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا ویسے بھی اس گھپ اندھیرے میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے بھلا کون دیکھتا وہ بھی اس گھنے درخت کی شاخوں پر جب کہ احتیاطاً اس نے بلیک سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا جنگل کی ویرانی بڑھتی جارہی تھی اور گھپ اندھیرا چھاتا جارہا تھا جنگلی جانوروں اور درندوں کی آوازیں تو پہلے بھی سنائی دے رہی تھیں مگر تاریکی بڑھتے ہی ان آوازوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جنگل کے باسی اپنی موجودگی کا اظہار کررہے تھے اب تو ان آوازوں میں الو کی کرخت آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس دور سے دکھائی دیں جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ کی سست رفتاری کی وجہ جنگل کی ناہموار زمین اور اندھیرا تھا پھر جیپ اس درخت سے کچھ فاصلے پر رکی۔ اور اس میں سے شمروز چانڈیو نمودار ہوا۔ "میں آگیا ہوں۔ انسپکٹر سعود کی روح کہاں ہو تم؟" وہ چلایا اس بار اس کے لہجے میں خوف کے بجائے اعتماد محسوس کرکے خود عمر دراز بھی چونک گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شمروز چانڈیو دس قدم آگے بڑھا اور ایک بار پھر آواز لگائی۔ "کہاں ہو تم؟" کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ اور نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ ہمارا دشمن انسپکٹر سعود کی روح کا ناٹک کررہا ہے وہ جیسے ہی سامنے آئے تم لوگ گولی چلا دینا اوکے۔" مختصر پیغام دینے کے بعد اس نے موبائل فون دوبارہ جیب میں رکھ لیا، وہ اس وقت اس درخت کے نیچے کھڑا تھا جس کی گھنی شاخوں میں عمر دراز چھپا بیٹھا تھا۔ اس لئے موبائل فون پر کی جانے والی اس کی گفتگو اسے صاف سنائی دی تھی۔ "کہاں ہو تم؟" وہ ایک بار پھر چلایا۔ پانچ چھ منٹ خاموشی چھائی رہی۔ اس بار شمروز چانڈیو حلق پھاڑ کر چلایا۔ "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں کہاں ہو تم سامنے آؤ۔" تین چار منٹ بعد آواز گونجی۔ "شمروز چانڈیو میں تمہارے قریب ہی کھڑا ہوں مگر تم مجھے نہیں دیکھ سکتے افسوس تو اس بات کا ہے تم اپنی کمینی فطرت سے باز نہیں آئے تمہاری کالے شیشوں والی جیپ کی پچھلی نشست پر دو شوٹر موجود ہیں جن کے ہاتھوں میں جدید ساخت کی رائفلیں موجود ہیں حالانکہ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جنگل میں اکیلے ہی آنا مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ کتے کی دم سو سال بھی نلکی میں رہنے کے بعد ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔"

جیپ کی ہیڈ لائٹس جو کہ اب تک روشن ہی تھیں ان کی روشنی میں شمروز چانڈیو کے چہرے پر گھبراہٹ اور حیرت کے آثار صاف نمایاں تھے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ارد گرد سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا شمروز چانڈیو سے مخاطب شخص دور دور تک نظر ہی نہیں

آرہا تھا۔ عمر دراز خود حیرت میں پڑ کر سوچنے لگا کہ کہیں مخاطب واقعی روح تو نہیں۔

"نن نہیں میرے ساتھ تو کوئی نہیں۔" شمروز چانڈیو کی لڑکھڑائی آواز صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

وہی آواز دوبارہ گونجی۔ شمروز چانڈیو جھوٹ مت بولو لیکن یہ بھی جان لو کہ تمہارے وہ شوٹر جو تم مجھے مارنے کے لئے لائے تھے اب زندہ نہیں رہے یقین ناں آئے تو جیپ میں جا کر دیکھ لو۔" شمروز چانڈیو اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا اور جیپ تک دوڑتا ہوا پہنچا۔ عقبی نشست کا دروازہ کھولا تو دکھ سے رہ گیا۔ جیپ کی عقبی نشست پر موجود اس کے دونوں شوٹر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے دونوں کارندوں کی لاشیں دیکھ رہا تھا اس کے سلیم اور رفیق نامی یہ دونوں کارندے تھے جو اس کے اشارے پر نہ جانے کتنے بے گناہ افراد کا خون کر چکے تھے یہ دونوں اس کے وہی کارندے تھے جو برسوں پہلے جنگل میں انسپکٹر سعود اور رضیہ کو بھی اس کے حکم پر قتل کر چکے تھے اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کوئی اتنی آسانی سے ان دونوں کو مار سکتا ہے وہ انتہائی سفاک اور درندہ صفت تھے اور اتنے جی دار تھے کہ چھ سات افراد بھی مل کر ان پر قابو نہ پا سکتے تھے ان میں سے ایک کے گلے میں تیز خنجر پیوست تھا کیا واقعی پراسرار قاتل انسپکٹر سعود کی روح ہے یہ سوچتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب وہیں کھڑے کھڑے سوگ مناتے رہو گے یا آگے بھی بڑھو گے وہی آواز دوبارہ ابھری۔ وہ مرے مرے قدموں سے آگے بڑھا۔

"تم کیا چاہتے ہو۔ بلند آواز میں کہو۔ انسپکٹر سعود کی روح میں تمہارا قاتل ہوں مجھے معاف کر دو اور برسوں پہلے تم نے انسپکٹر سعود اور رضیہ کو جس طرح قتل کیا تھا اس کا اعتراف کرتے ہوئے بتاؤ کہ اس روز کیا ہوا تھا۔" شمروز چانڈیو خوف اور دہشت سے کپکپاتے لہجے میں چلایا۔

"انسپکٹر سعود کی روح مجھے معاف کر دو آج سے برسوں پہلے میں نے اور میرے بیٹوں عاشق اور مامون نے رسول بخش کا قتل کیا تھا جب انسپکٹر سعود مجھے گرفتار کرنے پہنچا تو میں نے اسے دھوکے سے اغوا کر لیا اس کے ساتھی سپاہیوں کا منہ میں رشوت کے نوٹوں سے بند کر چکا تھا۔ انسپکٹر کو میرے کارندے جنگل میں لے آئے ہمارے خلاف مدعی مقدمہ رضیہ تھی۔ جسے میں نے زبردستی اغوا کروالیا میرے دونوں بیٹوں نے اس کی عزت لوٹی پھر ان دونوں کو جنگل میں میرے کارندوں نے میرے ہی حکم پر قتل کیا تھا میرے خلاف مقتول کی بیوہ نے مقدمہ درج کروایا مگر اس وقت پولیس نے رشوت لے کر داخل دفتر کر دیا۔"

"بس شمروز چانڈیو اتنا ہی کافی ہے تم نے جرم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ انسپکٹر سعود کی روح سے بھی معافی مانگ لی اب قبرستان میں جاؤ۔ گیٹ سے گھستے ہی رضیہ کی قبر ہے جو تمہارے ظلم کا شکار ہوئی تھی اس کی قبر پر بھی جا کر اسی طرح اعتراف جرم کر کے معافی مانگو۔" وہی آواز دوبارہ گونجی مگر وہ ہکلایا اگر مگر کچھ نہیں جان بچانی ہے تو جیسا میں کہہ رہا ہوں کرو۔ ورنہ اس بار سخت لہجے میں کہا گیا اور شمروز چانڈیو لرزتے قدموں سے آگے بڑھا جیسے ہی وہ کچھ فاصلے پر پہنچا عمر دراز احتیاط سے درخت سے اترا اور درختوں کی آڑ لے کر اس کا تعاقب دبے قدموں کرنے لگا۔ کوشش کے باوجود وہ اب تک بولنے والے کو نہیں دیکھ پایا تھا اب تو وہ بھی سوچنے لگا تھا کہ کہیں واقعی شمروز چانڈیو سے اس کے باپ کی روح سچ مچ میں تو مخاطب نہیں۔

شمروز چانڈیو قبرستان میں داخل ہوا رات نصف سے زائد بیت چکی تھی شہر خموشاں میں اس وقت مہیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شمروز چانڈیو کے عقب میں چلنے والے عمر دراز کا دل بھی قبرستان کے پراسرار ماحول کی وجہ سے تیزی سے دھڑک رہا تھا خود شمروز چانڈیو کی تو یہ حالت تھی کہ وہ ڈر اور خوف سے کپکپا رہا تھا اس کی حالت سے ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت خوف و دہشت سے گر کر مر جائے گا۔ وہ بڑے غور سے قبر کے کتبے دیکھتا ہوا قدم آگے بڑھا رہا تھا قبرستان کے گیٹ سے چند قدم کے

فاصلے پر اسے رضیہ کی قبر نظر آ رہی گئی قبر کے کتبے پر تاریخ وفات درج تھی رضیہ کی قبر پر پہنچ کر اس نے بلند آواز میں یہاں بھی اعتراف جرم کیا اور رضیہ کی روح سے معافی طلب کی رضیہ کی قبر کے ساتھ ایک ٹوٹی پھوٹی قبر سے اچانک ایک کفن پوش مردہ نمودار ہوا۔ اس کے آگے کے دونوں دانت لمبے نوکیلے اور منہ سے ابھرے ہوئے تھے بالکل ڈریکولا کی طرح اور منہ سے خون ٹپک رہا تھا ناک پکوڑے کی طرح پھولی ہوئی اور آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے اس سے دس قدم کے فاصلے پر قبر کے کتبے کی آڑ میں موجود عمر دراز کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر سرایت کر گئی اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ ایک بہادر اور دلیر افیسر تھا جوان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا مگر اس وقت ایک خوف ناک مردے کو خود سے چند قدم کے فاصلے پر دیکھ کر وہ خود بھی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ ادھر شمروز چانڈیو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے سامنے موجود اس خوف ناک مردے کو دیکھ رہا تھا جو دونوں ہاتھ پھیلائے دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا تھا شمروز چانڈیو الٹے قدموں پیچھے ہٹتا ہوا پشت کے بل گرا پھر جب اٹھا تو اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا اس نے پسٹل کی نال کا رخ مردے کی طرف کیا اور ٹریگر دباتا چلا گیا گولی کی آواز سے قبرستان گونج اٹھا مگر کوئی بھی گولی اس مردے کو نہیں لگی اس نے خالی پسٹل مردے کی طرف پھینکا اور پلٹ کر بھاگا وہ دوڑ رہا تھا اور مدد کے لئے چیخ و پکار کر رہا تھا۔

عمر دراز نے مداخلت کے لئے قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کے سر کے پچھلے حصہ سے کوئی ٹھوس چیز ٹکرائی تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے جھلملائے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین بوس ہو گیا ادھر شمروز چانڈیو جان بچانے کے لئے پاگلوں کی طرح چیختا ہوا جنگل میں داخل ہو چکا تھا وہ خوف ناک مردہ کسی عفریت کی طرح ان کے پیچھے تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہو کر دس بیس گز رہی دوڑا تا تھا کہ لڑکھڑا کر گر پڑا نیچے گرتے ہی اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا اور وہ ہوش و خرد سے محروم ہو گیا شمروز چانڈیو کو ہوش آیا تو وہ درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا قریب ہی کھڑا کفن پوش مردہ اس کے جسم پر بیلٹ برسا رہا تھا اسی بیلٹ کی ضربات اسے ہوش میں لانے کا باعث بنی تھیں بیلٹ کے ایک سرے پر بھاری اور نوکیلا بکل تھا جہاں جہاں بیلٹ کی ضرب لگی تھی وہاں سے خون رس رہا تھا اور جسم میں درد اور اذیت کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔

کفن پوش مردے سے کچھ فاصلے پر تین فٹ کا بن مانس جیسا بونا کھڑا تھا۔ جس کے چہرے اور جسم پر لمبے لمبے گھنے بال تھے بونا ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں عجیب سا لگ رہا تھا درخت کے اطراف پانچ خونخوار کتے اس کی طرف دیکھ کر بھونکتے ہوئے لپکنے کی کوشش کر رہے تھے قریب کھڑا بونا بن مانس انہیں پچکار کر باز رہنے کا اشارہ کر رہا تھا شمروز چانڈیو خوف زدہ نظروں سے کبھی کفن پوش مردے اور بونے بن مانس کو دیکھ رہا تھا اور کبھی ان پانچ خون خوار بل ڈاگ کتوں کو۔ میں نے تو تمہاری ساری باتیں مان لی تھیں اب تو مجھے چھوڑ دو وہ جان بچانے کے لئے اس خونی مردے کے آگے فریاد کرنے لگا۔

مردے کی عجیب سی کھر کھراتی ہوئی آواز فضاء میں گونجی شمروز چانڈیو یاد کرو تم وقت کے فرعون بن بیٹھے تھے تم نے طاقت کے زعم میں کتنے گھر اجاڑے۔ ہوس کی خاطر کتنی معصوم لڑکیوں کو بے آبرو کیا۔ اور بیٹی کی عزت بچانے والے رسول بخش کو بے رحمی سے قتل کر دیا انصاف مانگنے والی اس کی بیٹی رضیہ کو اپنے بیٹوں سے بے آبرو کرانے کے بعد انسپکٹر مسعود سمیت قتل کروایا خود کو وقت کا فرعون سمجھ کر تم یہ بھی بھلا بیٹھے کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔

ادھر عمر دراز سر پر چوٹ لگنے کے باعث چند لمحے بے حس و حرکت پڑا رہا پھر ہوش و حواس لوٹتے ہی اس سمت بھاگا جہاں جان بچانے کے لئے شمروز چانڈیو دوڑا تھا وہ جیسے ہی جنگل میں داخل ہوا اسے درخت سے بندھا ہوا شمروز چانڈیو نظر آ گیا درخت کے اطراف پانچ خوف ناک قسم کے کتے بھونک رہے تھے جب کہ شمروز چانڈیو کے سامنے وہی کفن پوش ڈریکولا ٹائپ مردہ کھڑا تھا عمر دراز نے ہولسٹر سے پسٹل نکالا نشانہ باندھ کر چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ زمین اس کے پاؤں تلے سے سرک

گئی اور وہ سر کے بل الٹا لٹک کر اوپر اٹھتا چلا گیا اب وہ ایک درخت کی مضبوط شاخ سے الٹا لٹکا جھول رہا تھا۔اس کے دائیں پاؤں میں شکنجہ کسا ہوا تھا اچانک شکاریوں کے مخصوص پھندے میں پاؤں پھنس کر فضا میں الٹا لٹکنے کے باعث اس کے ہاتھ سے پسٹل نکل چکا تھا کفن پوش مردے نے مڑ کر صرف ایک نظر دیکھا اور پھر دوبارہ شمروز چانڈیو کی طرف متوجہ ہوگیا شمروز چانڈیو تمہارے جرم میں برابر کے شریک تمہارے بیٹے عاشق چانڈیو اور مامون چانڈیو اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اب تمہاری باری ہے آج سے برسوں پہلے اسی دن بیس نومبر کو رات کے اندھیرے میں جنگل میں اسی مقام پر رضیہ اور انسپکٹر سعود کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا پر تم نے آخری چانس کا کہہ کر انہیں بھاگنے پر مجبور کیا اور ان کے پیچھے شکاری کتے اور اپنے مسلح کارندے دوڑا دیئے اتفاق سے آج بھی بیس نومبر ہے میں تمہیں بھی آخری چانس دیتا ہوں جان بچا سکتے ہو تو بچالو۔ اگر تم ان کتوں سے بچ نکلے تو میں تمہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

اس نے شمروز چانڈیو کے گرد بندھی رسیاں کھول دیں۔”مجھے معاف کردو۔“ وہ اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔

”شمروز چانڈیو اٹھو اور بھاگو ورنہ میں تمہیں ابھی اسی وقت گولی ماردوں گا۔“ اس نے پسٹل کی نال کا رخ اس کی طرف کیا شمروز چانڈیو اٹھا اور جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگا ابھی وہ دس قدم ہی بھاگا تھا کہ بونے نے سیٹی بجائی کتے بھونکتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے وہ عادی شراب نوش اور عیاش انسان تھا اور پھر عمر کے اس حصے میں تھا جب بدن کی طاقت کم ہونے لگتی ہے چند قدم بھاگتے ہی اس کا سانس پھولنے لگا کتے اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ایک کتے نے جست لگائی اور اسے اپنے بھاری بھرکم وجود تلے لیتے ہوئے گرا دوسرے کتے بھی ہلا بول چکے تھے۔”بچاؤ بچاؤ“ وہ چیخنے چلانے لگا جب کہ کتے اس کے جسم کو بھنبوڑ رہے تھے وہ درد اور اذیت کی شدت سے تڑپتے ہوئے چیخ وچلا رہا تھا۔ بالآخر اس کی لرزہ خیز چیخیں مدہم ہوتے ہوئے اس وقت تھم گئیں جب ایک کتے نے اس کا نرخرہ بھنبوڑ ڈالا۔ کتے اب بھی وقت کے فرعون کے جسم سے ضیافت اڑا رہے تھے۔

خونی مردہ اب درخت سے لٹکے عمر دراز کی طرف متوجہ ہوا۔ان باپ بیٹوں نے نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کو زندگی سے محروم کیا تھا ان میں سے ایک انسپکٹر سعود بھی تھا جو تمہارا باپ تھا تمہیں تو میرا احسان ماننا چاہئے کہ میں ان وقت کے فرعونوں سے تمہارے باپ کا بھی انتقام لے لیا ہے تم اس کی سیکورٹی پر مامور تھے۔ تمہارے افسران اعلیٰ تم سے اس فرعون کے قتل کی باز پرس کریں گے اس ڈسک میں شمروز چانڈیو کا اعتراف ہے وہ اعتراف جو اس نے جنگل میں تمہاری موجودگی میں کیا تھا اس وقت تم درخت پر چھپے بیٹھے تھے پھر دوسری بار اس نے رضیہ کی قبر پر اعتراف جرم کیا تھا جسے میں ریکارڈ کر چکا ہوں اس نے اپنے لباس کی جیب سے ایک ڈسک نکال کر درخت کے تنے کے قریب رکھی اور پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر عمر دراز کی طرف پھینکا۔ خنجر سنسناتا ہوا عمر دراز کے قریب اس شاخ میں پیوست ہوگیا۔جس سے بندھا وہ الٹا لٹکا ہوا تھا تم اس خنجر سے اپنی رسی کاٹ سکتے ہو یہ کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ عمر دراز نے اسے پکارا۔”ٹھہرو تم جو کوئی بھی ہوا تنا تو میں جان ہی چکا ہوں کہ روح ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہو مانا کہ شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹے قاتل تھے بہت بڑے مجرم تھے مگر تم نے بھی قانون اپنے ہاتھ میں لیا ہے میں تمہیں بے نقاب کر کے ہی دم لوں گا۔“

کفن پوش مردے نے ہنستے ہوئے کہا۔” دیکھیں گے۔“اور ان کتوں کے قریب پہنچ گیا جو اب بھی وقت کے فرعون کے جسم سے بچا کھچا گوشت بھنبوڑ رہے تھے اس نے کتوں کا نشانہ لیا۔اور ٹریگر دباتا چلا گیا گولیاں پانچوں کتوں کے سر میں لگی تھیں بے شک وہ شارپ شوٹر تھا۔ بونا اور کفن پوش مردہ آگے پیچھے چلتے نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

عمر دراز نے جھولتے ہوئے فضا میں غوطہ لگایا

درخت کی اس شاخ کو ایک ہاتھ سے تھام لیا جس شاخ سے وہ لٹکا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے شاخ میں پیوست خنجر نکال کر شکنجے میں پھنسے پاؤں کی رسی کاٹی اور نیچے گرتے گرتے قلابازی لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

پراسرار قاتل یا روح ایک بار پھر عمر دراز کو مات دے کر شمروز چانڈیو جیسے وقت کے فرعون کو عبرت کا نشان بنا چکا تھا ایک طرف تو اسے اس کیس میں ناکامی کا افسوس تھا کہ پراسرار قاتل اس کے ہاتھ نہ آیا تھا تو دوسری طرف وقت کے فرعون کے عبرت ناک انجام سے خوشی پہنچی تھی، اب اس کا اس علاقے میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا مگر وہ یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار پھر عائلہ سے ملنا چاہتا تھا تا کہ اس سے مل کر اسے بتا سکے کہ اگلی بار وہ اس کے بابا سے اس کا ہاتھ مانگنے آئے گا۔ وہ قبرستان پہنچا پہلے کی طرح عائلہ کو پکارا دو تین بار پکارنے پر جب کوئی باہر نہیں آیا تو وہ مسکراتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا مگر وہاں کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ ”شاید اپنے بابا کے ساتھ باہر گئی ہو، اس نے سوچا اور وہیں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا کچھ دیر بعد بوریت محسوس کر کے ٹہلتے ہوئے وقت گزاری کے لئے جھونپڑی کا جائزہ لینے لگا یہ بانس اور چٹائیوں سے بنی ہوئی پندرہ بائی پندرہ کی کشادہ جھونپڑی تھی ایک طرف دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ایک طرف بڑا سا ٹرنک پڑا تھا تو دوسری طرف شوکیس میں برتن ترتیب سے رکھے تھے۔ اب کہ ایک کونے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا میلے کپڑوں کے اس ڈھیر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں یہ جوکروں والا ڈریس تھا۔ بالکل ویسا ہی ڈریس جو مامون چانڈیو کے قاتل جوکر نے اسے قتل کرتے وقت پہن رکھا تھا۔

عمر دراز نے آگے بڑھ کر وہ ڈریس اٹھایا غور سے دیکھنے کے بعد وہیں رکھا اور پھر ٹرنک کی طرف بڑھا اس بڑے سے ٹرنک میں کمبل اور دھلے ہوئے کپڑے رکھے تھے اسے جن چیزوں کی تلاش تھی وہ سب سے نیچے رکھی ہوئی تھیں یہ ایرو شوٹر تھا ساتھ میں زہر میں بجھے ہوئے تیر بھی تھے ٹرنک میں اسے ڈریکولا والا وہ ماسک بھی مل گیا جو اس پراسرار قاتل نے پہن رکھا تھا ماسک کے ساتھ کفن جیسا لباس بھی تھا دس بارہ سمیں اور چار پرانے طرز کے موبائل فون ہر موبائل فون میں سم بھی موجود تھی اندھیرے میں دیکھنے والا چشمہ اور تو اور حساس ترین ڈیوائس اور مختصر ترین ساخت کا جدید ترین ڈیجیٹل کیمرہ اور پسٹل بھی موجود تھا یہ سب دیکھنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ ”کیا عائلہ کا باپ گورکن وہ پراسرار قاتل ہے۔“ کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد اس نے سب کچھ پہلے کی طرح ترتیب سے رکھا اور خاموشی سے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

افسر اعلیٰ شمروز چانڈیو کے قتل پر برہم تھا۔ اور اس پر خوب گرج برس رہا تھا کہ میں نے تمہیں وہاں شمروز چانڈیو کے خلاف ثبوت حاصل کرنے بھیجا تھا تم ناں صرف ناکام رہے بلکہ اس پراسرار قاتل کو بھی نہ پکڑ سکے جو بڑی آسانی سے شمروز چانڈیو کو قتل کر کے نکل گیا جب افسر اعلیٰ دل کی بھڑاس نکال چکا تو عمر دراز نے اسے ڈسک تھما دی۔ وہ بھڑک اٹھا یہ کیا ہے آج خود دیکھ لیجیے عمر دراز نے آہستگی سے جواب دیا۔ افسر اعلیٰ جیسے جیسے ڈسک میں ریکارڈ مناظر دیکھتا چلا گیا اس کے چہرے کے تاثرات نارمل پڑتے گئے ڈسک میں شمروز چانڈیو کا اعتراف جرم بھی تھا مگر شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کو قتل کرنے والا یہ کفن پوش مردہ کون ہے افسر اعلیٰ نے استعجاب انگیز حیرت سے پوچھا۔

عمر دراز مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھا۔ ”سر وہ ایک روح ہے آپ خود ڈسک میں دیکھ رہے ہیں مقتول شمروز چانڈیو اسے روح کہہ رہا ہے اور روحیں قانون کی گرفت میں نہیں آسکتیں اس کے جواب سے افسر اعلیٰ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا جب کہ وہ مسکراتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

ستر اسی سالہ نورانی چہرے والے وہ نحیف و نزار بزرگ غار میں مشغول تھے جب کہ ایک طرف بیٹھی عائلہ کسی گہری سوچ میں تھی اسے نہ جانے کیوں بار بار عمر دراز کے شوخ جملے یاد آ رہے تھے وہ صرف دو بار ہی

اس سے ملا تھا اور دل و دماغ پر چھا گیا تھا وہ اس کے خوابوں کے شہزادے کی طرح تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ کسی کے کھنکھارنے کی آواز سن کر سر اٹھایا اور دھک سے رہ گئی جھونپڑی کے دروازے پر عمر دراز ایستادہ تھا مگر آج اس کے چہرے پر شوخی کے بجائے گھمبیر تاثر تھی۔ ایک ہاتھ میں ہتھکڑی اور دوسرے میں پسٹل لئے وہ غضب ناک نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ”آپ؟“ وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

”ہاں میں عاشق چانڈیو اور مامون چانڈیو اور پھر شمروز چانڈیو اور اس کے دو گرگوں کو قتل کرنے والے قاتل کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔“

”کون قاتل؟“ عائلہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”عائلہ ان تینوں کی قاتل تم ہو۔ اس روز جب میں تمہاری غیر موجودگی میں جھونپڑی میں داخل ہوا تو جوکروں والا وہ لباس میں میلے کپڑوں کے ڈھیر میں دیکھ چکا تھا جو تم نے شمروز چانڈیوں کے اعزاز ہونے والی تقریب میں پہنچا تھا۔ اور جوکر بن کر سب کی توجہ اس بونے پر سے ہٹائی تھی جب بونے کی ہوائی فائرنگ سے بھگدڑ مچی تو تم نے مامون چانڈیو کو قتل کردیا وہ پسٹل بھی میں ٹرنک میں دیکھ چکا ہوں جو جنگل میں کفن پوش مردے کے بھیس میں تمہارے پاس تھا پھر ڈیجیٹل کیمرہ حساس ڈیوائس، ایروشوٹر زہر میں بجھے تیر اور مختلف نیٹ ورک کی بغیر نام والی سمیں اور موبائل فون ان ثبوتوں کے علاوہ وہ خنجر جو تم نے رسی کاٹنے کے لئے پھینکا تھا اس خنجر کو رسی کاٹنے کے بعد محفوظ کرنے کے علاوہ اس پر موجود فنگر پرنٹ بھی محفوظ کروالئے تھے مجھے یقین ہے تمہارے فنگر پرنٹ خنجر والے فنگر پرنٹ سے میچ کر جائیں گے تمہارے خلاف میرے پاس اس اتنے ثبوت ہیں کہ تمہارے پاس اعتراف جرم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اس لئے جیل جانے کے لئے تیار ہوجاؤ اور وہ بونا کہاں ہے جو قتل کی ان وارداتوں میں تمہارا شریک جرم تھا۔“

عمر دراز نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”وہ میں ہوں۔“ مردانہ آواز گونجی اس نے دروازے کی طرف دیکھا تین فٹ کا بونا ٹائپ شخص کھڑا تھا بیس بائیس سالہ وہ کلین شیو بونا دور سے دیکھنے پر چار پانچ سالہ شریر بچہ لگ رہا تھا۔ ”فراز تم کیوں آئے؟“ عائلہ نے اسے ڈانٹا۔

فراز نامی اس بونے نے کہا۔ ”نہیں بہنا ایک بھائی مشکل وقت میں اپنی بہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اور میں تو تمہارے جرم میں برابر کا شریک ہوں تو سزا بھی برابر ملنی چاہئے۔“ دونوں کے چہروں پر افسردگی اور سر جھکے ہوئے تھے۔

وہ بزرگ نماز پڑھ چکے تھے اور اب ان ہی کی طرف متوجہ تھے۔ ”اب صاف صاف بتاؤ سچائی کیا ہے تم دونوں نے پانچ افراد کا قتل کیوں کیا تم جانتے ہو قتل جیسے سنگین جرم کی کم از کم سزا پھانسی ہے۔“ عمر دراز نے غصے سے کہا۔

عالیہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ”شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کے کرتوت تو تم جان ہی گئے ہوگے وہ تمہارے باپ کے ساتھ ساتھ رضیہ اور رسول بخش کے بھی قاتل تھے میں مقتولہ رضیہ کی بیٹی عائلہ ہوں، ماں کے اور نانا کے قتل کے بعد مجھے بابا اشرف نے سہارا دیا یہ اس قبرستان کے گورکن تھے ان کا ایک ہی بیٹا ندیم تھا جو حصول روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا، دس برس بعد لوٹا تو مالی طور پر مستحکم ہوچکا تھا اس نے ایک پوش علاقے میں رہائش اختیار کی اور بابا اشرف کو بھی ساتھ رکھنا چاہا مگر وہ اپنے آبائی علاقے کو چھوڑنے کے لئے رضامند نہ تھے یہاں بابا اشرف کے باپ دادا کے علاوہ بیوی کی قبر بھی تھی ان کی یادیں تھیں بہرحال انہوں نے مجھے ندیم انکل کے گھر بھجوادیا میں ان کے بچوں کے ساتھ پرورش پاتی رہی وہیں تعلیم بھی حاصل کی، ندیم انکل کے پڑوس میں ریٹائرڈ کرنل اسلم صاحب رہتے تھے فراز کرنل اسلم کے تین بیٹوں میں سے ایک ہے نہ جانے کیوں اس کا قد بڑھ نہ پایا شاید یہ کوئی بیماری تھی اس کے بھائیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی اس کا مذاق اڑاتے خود اسلم صاحب کا رویہ بھی اس سے سرد تھا حالانکہ قد نہ بڑھنے میں اس کا قصور نہیں تھا میں بڑی بہنوں کی طرح اس کا خیال رکھنے لگی۔ فراز نے بھی مجھے بہن کا درجہ دیا یہ

اپنی قد کی کمزوری سے پیش نظر ایک بہادر اور باہمت انسان ہے اس نے اپنے قد کی کمی تعلیم اور غیر نصابی سرگرمیوں سے پوری کی۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ نہ صرف مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہے بلکہ مارشل آرٹ کے انٹرنیشنل سطح پر ہونے والے مقابلوں میں حصہ لے کر چیمپئن شپ بھی جیت چکا ہے اس نے جب مجھے ہروقت جلتے کڑھتے آنسو بہاتے دیکھا اور استفسار پر میری روداد سننے کے بعد کہا کہ گڑیا رونے والے کمزور ہوتے ہیں ظالم کے آگے رونا گڑگڑانا خاموشی اختیار کرنا اسے مزید طاقتور بناتا ہے۔ اس دنیا میں جینا ہے تو اپنے حق کے لئے لڑنا سیکھو۔ خود کو اس قابل بنالو کہ ظالم تم پر ظلم ڈھانے سے پہلے سو بار سوچے۔"

فراز نے مجھے سیلف ڈیفنس کی تربیت دی پھر ہم دونوں بابا اشرف کے پاس آگئے یہیں ہم نے شمروز چانڈیو کے خلاف منصوبہ بنایا چند مہینے تو ہم ان باپ بیٹوں کی ریکی کر کے ان کے معمولات سے باخبر ہوتے رہے۔ زوبی عاشق چانڈیو کی داشتہ تھی۔ میں نے اسے ایک کروڑ کا لالچ دینے کے ساتھ ساتھ اپنی روداد بھی سنائی اس طرح ایک عورت نے دوسری عورت کا ساتھ دیا۔ ویسے بھی زوبی عاشق چانڈیو سے بے زار تھی کہ وہ جنسی مریض اس سے جانوروں سے بدتر سلوک کرتا تھا، شروع شروع میں اس نے ڈرا دھما کا کر زوبی کو زیر کیا تھا اور اسے ہمیشہ اپنا زیر اثر رکھنے کے لئے اپنے ہی اپارٹمنٹ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہفتہ میں دوبار زوبی سے ملنے جاتا تھا زوبی نے نشاط انگیز لمحات میں اس سے اس کے خفیہ بینک اکاؤنٹ سمیت بہت سی باتیں اگلوالیں۔ ویسے بھی وہ اتنی پی چکا تھا کہ اسے ہوش ہی نہ رہا تھا اور پھر شراب میں خواب آور دوا بھی زوبی ملا چکی تھی میں نے اور فراز نے زوبی کی مدد سے نصف شب کے بعد بے ہوش عاشق چانڈیو کو تابوت میں ڈال کر گاڑی میں منتقل کیا یہ گاڑی فراز کے ایک دوست کی تھی سفر کے دوران پولیس سے بچنے کے لئے فراز پہلے ہی جعلی ڈیتھ سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا تھا اگر پولیس ہمیں روکتی تو ہم کہتے تابوت میں میرے باپ کی لاش ہے مگر خوش قسمتی سے ہم بغیر کسی رکاوٹ کے گاؤں پہنچ گئے راستے میں دوبارہ ہم نے عاشق چانڈیو کو خواب آور انجکشن بھی لگایا یہاں آکر رات کے اندھیرے میں ایک پرانی قبر میں عاشق چانڈیو والے تابوت کو رکھ کر دفن کر دیا اس کام میں گاؤں کا ایک نوجوان ہمارا مددگار تھا کہ وہ بھی ان وڈیروں کے ظلم کا ستایا ہوا تھا عاشق چانڈیو اس کی بہن کو پامال کر چکا تھا تابوت کی مختلف جگہوں میں ہم نے پلاننگ کے تحت تین موبائل فون رکھے جن میں سے ایک میں اس کی اپنی ذاتی سم بھی تھی تابوت رکھنے کے بعد جو سلیب رکھ کر مٹی ڈالی گئی وہ کمزور سلیپ تھی۔ پھر فراز نے عاشق چانڈیو کو کال کر کے چانس دینے کا ڈرامہ کیا چوبیس گھنٹے بعد پلاننگ کے تحت اسی کے نمبر پر کال کر کے ہم نے دو کروڑ کی ڈیمانڈ کی میں نے چہرے پر ماسک لگا کر نقلی داڑھی مونچھیں لگائیں اور مردانہ ڈریس میں ظہیر خان بن کر بینک گئی بینک منیجر نے عاشق چانڈیو کے پرسنل نمبر پر بات کی تسلی ہونے کے بعد مجھے دو کروڑ دیئے۔ مگر تمہاری حاضر دماغی سے خفیہ اکاؤنٹ سے دو کروڑ نکلنے کا راز کھل گیا۔ مگر پولیس کے پہنچنے سے پہلے ظہیر خان یعنی میں فرار ہوگئی۔ ایک کروڑ اسی رقم سے زوبی کو دے دیئے گئے بچنے والی ایک کروڑ کی رقم ہم نے رکھ لی کہ شمروز چانڈیو سے انتقام کے لئے دولت ضروری تھی بینک سے نکلنے کے بعد میری کال پر فراز نے گاؤں کے اسی نوجوان جس نے قبر کھودی تھی کی مدد سے بھاری بھرکم پتھر اٹھا کر قبر پر مارے۔ سلیپ کمزور تھی۔ قبر بیٹھ گئی یوں وقت کا ایک فرعون اپنے انجام کو پہنچا۔

اسی دوران تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تم نئی قبر کی تلاش میں تھے مجھے اس بات سے شک ہوا فراز نے باتوں باتوں میں ایس ایچ او سے تمہاری سچائی اگلوائی۔ شمروز چانڈیو کی حویلی میں بکرے کی سری دیواروں پر خون اور دیگر اقسام کے ڈرانے والی کارروائیوں میں ہمارا ہاتھ تھا۔ ہم شمروز خان کی حویلی کے دو ملازمین کو رقم کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا چکے تھے جو ہمارے کہنے پر اس قسم کی

کارروائیاں کرتے تھے شمروز چانڈیو کی حویلی میں اس کے بیڈروم میں حساس ڈیوائس ہم نے اس کے کارندے سے رکھوائی۔ پھر اس روز شمروز چانڈیو کی گاڑی پر فائرنگ فراز نے کی تھی یہاں پر اس کا بونا ہونا ہمارے کام آیا۔ اس کی حویلی میں جب شمروز چانڈیو احاطے میں موبائل فون پر فراز سے بات کررہا تھا فراز احاطے میں موجود کیاری کی آڑ میں تھا۔ اسے ڈرانے کے لئے اس کے قدموں میں فراز نے گولی چلائی اس بار بھی وہ اپنی پھرتی اور چھوٹے قد کی وجہ سے کسی کی نظر میں نہیں آیا جوکر کا بھیس بدل کر اسٹیج پر میں گئی تھی فراز متروک کنٹرلائن کے ذریعے بن مانس کا ماسک پہن کر پہنچا اس کی ہوائی فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی اور میں جوکر کے بھیس میں مامون چانڈیو کو جہنم واصل کرکے بھاگی تم میرے پیچھے تھے۔

مجبوراً مجھے جیپ کا ٹائر برسٹ کرنا پڑا بدقسمتی سے تم بے ہوش ہوگئے تمہاری جان بچانے کی غرض سے ایک مقامی فرد سے لفٹ لے کر تمہیں اسپتال پہنچایا گیا اور تمہارے نام لیٹر لکھ کر میں وہاں سے نکل گئی اسی دوران فراز تمہارے بارے میں جان چکا تھا کہ تم انسپکٹر سعود کے بیٹے ہو۔

تم دوسری بار مجھ سے ملنے آئے میں تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی بھانپ چکی تھی مگر انجان بنی رہی۔ جب تم نے شمروز چانڈیو کے بیڈروم میں ڈیوائس نصب کی تو ہم پہلی نصب کی گئی ڈیوائس سے یہ بات جان چکے تھے کہ شمروز چانڈیو کو بلانے کے لئے جب میں نے کال کی تو تمہیں بلوانے کی غرض سے اس کے سیل فون کا اسپیکر میں نے کھلوایا کہ تم وہاں آؤ دراصل میں تمہیں پسند کرنے لگی تھی اور آخری بار دیکھنا چاہتی تھی تم درخت پر چھپے پہلے سے جنگل میں موجود فراز تم پر نظر رکھے ہوئے تھا وہیں ایک درخت پر جدید ترین اسپیکر نصب تھا جو بغیر وائر کے متحرک ہوجاتا تھا اسی لئے تم بولنے والے فراز کو نہ دیکھ سکے شمروز چانڈیو کے جیپ میں بیٹھے شوٹر کو میں نے ہی ایئر شوٹر میں لگے زہر میں بجھے تیروں سے واصل جہنم کیا قبرستان میں، میں ہی مردے کا ماسک پہنے ہوئے تھی میری آواز بدل کر بولنے کی مہارت میرے کام آئی اور کوئی نہ جان سکا کہ میں لڑکی ہوں۔

تمہیں شکنجے میں درخت سے فراز نے لٹکایا یوں وقت کے فرعون تینوں باپ بیٹے اپنے انجام کو پہنچے۔ ہمارے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں عاشق چانڈیو سے ملی رقم نے بڑا ساتھ دیا کہ اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے مطلوبہ اشیاء ہم نے منہ مانگی رقم پر خریدی گویا ہم نے اس کے دوکروڑ ان وقت کے فرعونوں کے خاتمے پر صرف کئے پھر جو ہوا وہ تم خود جانتے ہو۔" روداد ختم کرنے کے بعد اس نے نم آنکھوں سے عمر دراز کو دیکھتے ہوئے ہتھکڑی پہننے کے لئے دونوں ہاتھ آگے کئے۔

عمر دراز نے اپنے ہاتھ میں موجود ہتھکڑی کو غور سے دیکھا۔ "اوہ ہتھکڑی کا سائز بڑا ہے تمہارے لئے مجھے اسپیشل ہتھکڑی منگوانی پڑے گی۔" "اسپیشل ہتھکڑی لے کر اندر آجائیں یعنی عمر دراز نے مڑکر آواز لگائی تو عمر دراز کی والدہ عائشہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

عائشہ کو دیکھ کر عائلہ اور فراز کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "کیوں میری ہونے والی بہو کو تنگ کرتے ہو" عائشہ نے پیار سے عمر دراز کے سر پر چپت رسید کی تو عائلہ اور فراز نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ عمر دراز آگے بڑھا اور عائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ شمروز چانڈیو اور اس کے بیٹوں کے قتل کی فائل اے کلاس میں داخل دفتر کردی گئی ہے کیوں کہ ان تینوں کو کسی روح نے قتل کیا ہے اب ظاہر ہے کسی روح کو کوئی کیسے گرفتار کرسکتا ہے اور رہا تمہیں ہتھکڑی پہنانے کا معاملہ تو ماں ہم دونوں کو پیار کی ہتھکڑی میں باندھ کر شادی کے بندھن میں باندھنا چاہتی ہیں تاکہ تم میری جیل ......" ارے بھئی میرے گھر میں ہمیشہ میری پسند کے کھانے بناتی رہو۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا تو عائلہ نے شرما کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔ جب کہ فراز ہرے کا نعرہ بلند کرکے ناچنے لگا۔